معارف القرآن

5

تصنیف

حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

سورۃ النساء

5

تصنیف

استاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ
سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی و مہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبر 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ⑤

اپنی بات	۷	حدیث نبوی اور متعہ	۱۰۳
سورۃ النساء کا تعارف	۹	حرمت متعہ از روئے اجماع	۱۰۶
مخلوق کی پیدائش اور پھیلاؤ	۱۲	روافض کے پاس جواز متعہ کے دلائل	۱۰۷
یتیموں کے مال کی حفاظت	۱۷	روافض کے اشکالات کا جواب	۱۰۹
چار عورتوں کے ساتھ شادی	۲۱	بیحیائی کی مرتکب لونڈی کی سزا	۱۱۶
عورتوں کے مہر کی ادائیگی کا حکم	۲۵	شریعت کے احکامات پر عمل	۱۲۲
مال یتیم کے بارے قرآنی ہدایات	۳۰	باطل طریقے سے مال کھانا	۱۲۶
والدین واقارب مالوں میں حق میراث	۳۹	چند غیر شرعی معاملات کا تذکرہ	۱۳۰
میراث کے احکام	۵۶	بڑے گناہوں سے اجتناب، چھوٹے	۱۳۵
لڑکیوں کو حصہ دینے کی اہمیت	۶۰	عورتوں کی خواہش کاش ہم مرد ہوتیں	۱۳۷
میراث میں شوہر بیوی کا حصہ	۶۴	مولی الموالات کی میراث	۱۴۲
حدود اللہ کی پابندی	۶۷	مردوں کی عورتوں پر حاکمیت	۱۴۵
بدکار عورت کی سزا	۷۰	حقوق اللہ اور حقوق العباد	۱۵۱
توبہ کی اہمیت وفضیلت	۷۲	والجار ذی القربیٰ والجار الجنب	۱۵۸
زبردستی وارث بننے کی ممانعت	۸۰	والصاحب بالجنب	۱۵۹
وہ عورتیں جن سے نکاح حرام	۸۷	مختال اور فخور	۱۶۱
شوہر والی عورتوں سے نکاح حرام ہے	۹۴	ایمان نہ لانے والوں پر وبال۔ ظلم	۱۶۹
متعہ اور اسلام	۹۹	ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ	۱۷۰
قرآنی تعلیمات اور متعہ	۱۰۰	حالت نشہ میں نماز۔ غسل، تیمم	۱۷۴

تیمم کی مشروعیت کا سبب	۱۸۰	علماء کی اطاعت	۲۵۴
یہود کی قبیح و شنیع حرکات	۱۸۲	استحسان	۲۶۰
وراعنالیابالسنتھم وطعنافی الدین	۱۸۹	مصالح مرسلہ	۲۶۱
یہود کی قباحتیں، شرک، خودستائی	۱۹۲	استصحاب	۲۶۱
ان اللہ لایغفران یشرك به	۱۹۹	شرعی فیصلے سے انحراف، منافقین	۲۶۲
یہودیوں کی جسارت، ملعون قرار	۲۱۴	اطاعت رسول اور مسئلہ استشفاع	۲۷۱
کفار کا انجام، اہل ایمان کا اعلیٰ مقام	۲۲۳	نبی کریم ﷺ کے روضہ پر استشفاع	۲۷۶
ظلاظلیلاً کا مفہوم	۲۲۷	مکین گنبد خضراء کی زیارت کا سفر	۲۸۰
امانتیں امانت والوں کے سپرد	۲۲۹	عام لوگوں کی قبروں پر جانے کا حکم	۲۸۷
اداروں کے اموال کی حفاظت	۲۳۴	قبر مصطفےٰ ﷺ سید القبور	۲۸۹
نااہلوں کو عہدے دینا خیانت ہے	۲۳۵	مانعین زیارت قبر النبی ﷺ	۲۹۱
بلا اجازت کسی کے گھر نظر ڈالنا ممنوع	۲۳۷	مصطفوی فیصلہ دل سے ماننا	۲۹۵
قرآن وحدیث کے خلاف فیصلے	۲۳۹	عصمت انبیاء علیہم السلام	۲۹۸
ظالمانہ فیصلوں کی وجہ سے مصائب	۲۴۰	جانوں کے قتل، گھروں سے خروج	۲۹۸
تقویٰ کے بغیر انصاف نہیں ہو سکتا	۲۴۱	جہاد فی سبیل اللہ اور دفاعی تیاری	۳۰۹
انصاف کے فیصلے کرنے والے	۲۴۲	میدان جہاد، مسلمانوں کی فتح شکست	۳۱۶
حکمرانوں کی ذمہ داریاں	۲۴۳	جہاد، منافقین کا طرز عمل	۳۲۲
حاکموں کو ضروری تنبیہ	۲۴۳	اطاعت رسول، اللہ کی اطاعت	۳۴۱
حاکم کیسے شخص کو بنایا جائے؟	۲۴۴	من یطع الرسول فقد اطاع اللہ	۳۴۲
اللہ، رسول اللہ اور حکمران کی اطاعت	۲۴۶	راز کی بات اڑانے کی ممانعت	۳۴۶

بے تحقیق خبریں پھیلانے کے نقصانات	۳۵۰	تعاقب دشمن میں سستی نہ کیجائے	۴۲۰
نبی کریم ﷺ کو جہاد کرنے کا حکم	۳۵۲	حق فیصلہ کرنے کا حکم	۴۲۲
نیکی اور بدی میں تعاون کرنیوالے	۳۵۴	خیانت کاروں کی وکالت ممنوع	۴۲۶
سلام اور سلام کا جواب	۳۵۸	گناہ گار توبہ کرلے، اللہ بخشنے والا	۴۳۱
توحید باری اور محشر میں حشر	۳۶۱	گناہ گار کے گناہ کا نقصان	۴۳۳
منافقین اور دشمنوں کے ساتھ رویہ	۳۶۲	خیر والی سرگوشیاں	۴۳۸
مؤمنوں پر کافروں کا تسلط	۳۶۹	رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کا انجام	۴۳۹
قتل خطاء کے احکامات	۳۷۲	اجماع امت بھی حجت ہے	۴۴۲
احکام دیت۔ دیت کی تعریف	۳۷۸	شرک وشیطان کی دوستی کا انجام	۴۴۴
قتل عمد کی سزا	۳۸۴	ایمان واعمال صالحہ پر جنت	۴۵۳
واقعہ کی تحقیق ضروری ہے	۳۸۸	حضرت ابراہیم حنیف وخلیل ہیں	۴۵۸
عربی زبان میں ضرب کے معانی	۳۹۰	یتیم بچے بچیوں کے حقوق	۴۶۴
اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب	۳۹۲	اقسام صلح، صلح کی تین اقسام	۴۷۲
مجاہدین اسلام اور قاعدین میں فرق	۳۹۴	آسمانوں، زمینوں کا مالک اللہ ہے	۴۷۵
مجاہدین کی فضیلت	۳۹۸	سچی گواہی دینے کا حکم	۴۷۹
دارالکفر سے دارالایمان کی طرف ہجرت	۴۰۱	اللہ، رسولوں، کتابوں پر ایمان	۴۸۱
سفری نماز	۴۱۰	مرتد کی بدنصیبی	۴۸۴
نماز قصر کا طریقہ۔ سفر میں سنتیں	۴۱۲	منافقوں کے حالات	۴۸۶
صلوٰۃ الخوف	۴۱۵	کفار کی دوستی سے ممانعت	۴۹۲
ہر حال میں ذکر اللہ، نماز وقت پر		لایحب اللہ الجھر بالسوء	۴۹۶

مظلوم کو اونچا بولنے کا حق دیا گیا	۴۹۶	کفار اور راہ حق سے روکنے والوں کا انجام	۵۱۹
زیادتی کرنیوالوں کو معاف کرنیوالے	۴۹۸	رسول برحق پر ایمان لانا ہی بہتر ہے	۵۲۰
اللہ پر اور تمام رسولوں پر ایمان	۴۹۹	غلو اور انتہا پسندی	۵۲۱
یہود و نصاریٰ کے جرائم کی فہرست	۵۰۳	مسیح و ملائکہ کو عبد کہلوانا عار نہیں ہے	۵۲۶
اہل کتاب راسخین فی العلم کا مقام	۵۰۹	برھان اور نور سے کیا مراد ہے؟	۵۲۸
چند جلیل القدر انبیاء کرام کا تذکرہ	۵۱۲	ایمان باللہ اور اعتصام باللہ	۵۲۹
انبیاء و رسل کی تعداد	۵۱۴	کلالہ کی میراث	۵۳۱
انبیاء کرام کے اسماء، عمریں، مدت	۵۱۵	لفظ کلالہ کی تحقیق	۵۳۲
رسالت محمدی کے سب سے بڑے گواہ	۵۱۷	کلالہ وہ ہے جس کا ولد و والد نہ ہو	۵۳۶

اپنی بات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ امۡتَنَّ عَلٰی عِبَادِہٖ بِنَبِیِّہِ الۡمُرۡسَلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ وَ کِتَابِہِ الۡمُنَزَّلِ الَّذِیۡ لَا یَأۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِہٖ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ

بندہ عاجز و مسکین نے کئی سال پہلے دو تفاسیر بیک وقت لکھنا شروع کی تھیں، ان میں ایک کا نام ”معارف الفرقان“ رکھا گیا تھا، دوسری کا ”مطالعہ قرآن“ ”معارف الفرقان“ عام طرز تفسیر کے مطابق تھی، جب کہ مطالعہ قرآن سوالاً جواباً تھی، جو تفسیری کام میں اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مرضی کے بغیر انسان کوئی کام انجام نہیں دے سکتا، اس دوران میرا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا، جس کے باعث قریباً پانچ ماہ صاحب فراش رہا، کاروبار زندگی معطل ہو گیا یہاں تک کہ کمپیوٹر پر کام کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا، لیکن اس دوران بھی کام موقوف نہیں کیا تھا، ایک انگلی کے ساتھ ایک ایک حرف تلاش کرتے ہوئے اس کار خیر کو جاری رکھا، یہ بھی میرے اللہ کا احسان و فضل تھا ورنہ اس حالت میں یہ کام بھی بہت مشکل تھا، چارپائی سے اٹھا تک نہیں جاتا تھا، سہارے کے بغیر اٹھنا مشکل تھا، تکلیف کے باعث بعض اوقات چیخ بھی نکل جاتی تھی۔

پانچ ماہ بعد جب طبیعت سنبھلی تو حوصلے ٹوٹ چکے تھے، دو تفاسیر پر کام جاری رکھنا مشکل دکھائی دے رہا تھا، اب ایک ہی عزم بالجزم کیا کہ اب دونوں تفاسیر کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا جائے، چنانچہ مطالعہ قرآن کو ”معارف الفرقان“ کا نام دیا گیا اور دونوں تفاسیر کو ایک کر دیا گیا، اس کی ایک جھلک قارئین کو جلد اوّل اور دیگر جلدوں کی زیارت سے دکھائی دے گی، پھر مطالعہ قرآن میں چیدہ چیدہ مقامات کی تفسیر لکھی گئی تھی، جسے احباب کی مشاورت سے آخری جلدوں میں جا کر تبدیل کر دیا گیا تھا، پھر جب دوبارہ اس تفسیر پر کام شروع کیا تو اب مضامین پھیلتے گئے، پہلے والی صورت حال برقرار نہ رہ سکی، سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ دو جلدوں پر پھیل گئی، سورۃ آل عمران کے مضامین اتنے پھیل گئے کہ ایک مکمل جلد بن گئی، بسیار کوشش کے باوجود اس کے مضامین کو مختصر نہیں کیا جا

سکا، مضامین کو مختصر کیا جاتا تو مفاہیم سمجھ میں آنا مشکل ہو رہا تھا، اس لیے جو جو مضامین اس میں شامل کیے گئے انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا، بہت سے مضامین نئے شامل کیے گئے جن کا تفسیر میں شامل ہونا از حد ضروری تھا، شامل کرنے کے بعد انہیں نکالا جانا بہتر نہیں لگ رہا تھا۔

اب پانچویں جلد کا آغاز اس وقت ہو رہا ہے جب کہ ایک اور اعصاب شکن مشکل کا سامنا ہے، وہ یہ کہ گزشتہ ایک دو ماہ سے کمپیوٹر خراب ہے، ماہرین کی کوشش کے باوجود اس میں سدھار نہیں آسکا، بہت پریشانی کے بعد اللہ تعالیٰ نے کرم نوازی فرمائی کمپیوٹر تو بالآخر ٹھیک ہو گیا لیکن میری ۳۵ سالہ تحریری محنت رائیگاں دکھائی دینے لگی، وہ یوں کہ کمپیوٹر میں سارا تحریری کام محفوظ تھا، جو کمپیوٹر کی خرابی کے ساتھ داؤ پر لگ گیا، قیمتی چیزوں کو محفوظ کرنے والے خزانے پر ایسی افتاد پڑی کہ ماہرین بھی ہاتھ کھڑے کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن پوری کوشش جاری ہے کہ سابقہ تیار شدہ مواد کسی طرح دوبارہ ہاتھ آجائے، تفسیر ''معارف الفرقان'' کی سولہ جلدیں بھی داؤ پر لگ چکی ہیں، لیکن یہاں تھوڑی سی گنجائش اس صورت میں موجود ہے کہ انٹرنیٹ پر موجود قرآن و حدیث والے مواد میں میری تفسیر ''معارف الفرقان'' بھی موجود ہے، موجودہ کام میں نے وہیں سے حاصل کیا ہے، اس میں مزید مواد شامل کیا گیا ہے، لیکن پریشانی موجود ہے، میرے خیال میں پہلی مرتبہ کوئی کام کرنا آسان ہوتا ہے جب کہ ضائع شدہ کام کو دوبارہ سرانجام دینا مشکل ہے، ہمت جواب دے جاتی ہے، لیکن اپنے پروردگار کی بارگاہ میں امید ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ ہمت ارزانی فرمائے گا اور یہ کار خیر پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

الحمدللہ! معارف الفرقان کی پانچویں جلد کی تکمیل کے دوران جس پریشانی کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا ہے وہ بہت حد تک ختم ہو گئی ہے، ضائع شدہ مواد دوبارہ حاصل ہو گیا ہے، پانچویں جلد بڑے سائز میں سوا پانچ سو صفحات پر پھیل گئی ہے، خیال تھا کہ دس پاروں تک مواد آجائے گا لیکن نہیں صرف سورۃ النساء اس میں آسکی ہے، بارگاہ رب العالمین میں دعا کیجیے کہ وہ اس عظیم الشان کام کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچائے۔ خادم ا ال م، م ح م ولی دار شری د ح نوٹی، حال وارد حدود ٹ، مری
۳۰، اکتوبر ۲۰۲۵ء بروز جمعرات، پونے آٹھ بجے علی الصبح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ النساء کا تعارف

سوال سورۃ النساء کا تعارف کروائیے، اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ نیز اس میں بیان کیے گئے مضامین کا خلاصہ بیان فرمائیے۔

جواب اس سورت کا نام سورۃ النساء ہے جو اس کی پہلی آیت میں مذکور ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء جب نازل ہوئیں تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، اس سورت میں عورتوں کے احکام بہ کثرت بیان کئے گئے ہیں اس وجہ سے اس سورت کا نام سورۃ النساء ہے۔

سورت نساء ترتیب تلاوت میں چوتھے نمبر پر ہے اور ترتیب نزول میں ۹۲ نمبر پر ہے، اس سورت میں کل ۲۴ رکوع ہیں آیات ۱۷۶ ہیں، اس میں الفاظ تین ہزار سات سو بیس (۳۷۲۰) ہیں، اس میں کلمات تین ہزار نو سو چالیس (۳۹۴۰) اور حروف سولہ ہزار چھ سو ستر سٹھ (۱۶۶۶۷) ہیں۔

یہ سورۃ بالاتفاق مدنی ہے، اس میں امانتوں کی ادائیگی سے متعلق آیت مکی ہے، اس کا نزول جنگ اُحد کے بعد ہوا، اس معرکہ میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے شہید ہو جانے کے بعد بیوہ گان اور یتیموں کی کفالت اور ورثاء پر تقسیم میراث کے مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی، اسی بناء پر سورۃ النساء کے نزول کی ابتدا ہوئی، سنہ ۵ ہجری تک اس کا نزول جاری رہا۔

سورۃ النساء کو نسائے کبریٰ کہا جاتا ہے جب کہ سورۃ طلاق کو نسائے صغریٰ کہا جاتا ہے، سورۃ البقرہ میں یہودیوں کی بری حرکات اور ان پر انہیں ملنے والی سزاؤں کا ذکر کیا گیا، آل عمران میں نصاریٰ کی شر انگیزیوں اور ان کی طرف سے دائر کیے گئے اعتراضات و شبہات کا رد کیا گیا، النساء میں زمانہ جاہلیت میں رائج مظالم کا رد کیا گیا۔

سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران میں احکامات اُخرویہ کا ذکر تھا جب کہ سورۃ النساء میں مسائل دنیویہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ سورۃ آل عمران میں بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے عقائد باطلہ کی تردید کی گئی جنہوں نے حضرت سیدنا عیسیٰ بن مریم کو معبود مانا اور انہیں ابن اللہ قرار دیا، سورۃ النساء

میں عام لوگوں کی طرف سے شرکیہ نظریات قائم کرنے کی تردید کی جارہی ہے، سورۃ آل عمران کا اختتامی پیغام تھا کہ تقویٰ اختیار کیجیے، سورۃ النساء کی ابتدائی آیات میں ہی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے، بندگان خدا کو بتایا گیا کہ اللہ کے حقوق کی ادائی میں بھی تقویٰ اختیار کیا جائے اور بندگان خدا کے حقوق کی ادائی میں بھی تقویٰ اختیار کیا جائے۔

قرآن کریم میں سات بڑی سورتیں ہیں، انہیں اہل علم و عرفان نے سبع طوال کا نام دیا ہے، سورۃ النساء ان سات میں شامل ہے، سورۃ بقرہ میں کلام کا زیادہ تر رُخ تقویٰ اور توحید کے ساتھ یہود کی اصلاح کی طرف تھا، جب کہ سورۃ آل عمران میں تقویٰ، توحید اور اصلاح عقائد کے ساتھ نصاریٰ کی اِصلاح اور ان کے دماغوں میں اٹھنے والے اشکالات کا جواب دیا گیا۔

سورۃ نساء میں عربوں کی اصلاح کے معاشرتی پہلو پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے، سورۃ البقرہ اور آل عمران میں بیان کردہ مضامین کی تلخیص بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے، مدینہ منورہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، مختلف قبیلے اسلام میں داخل ہوئے، جوں جوں اہل قبائل کی تعداد میں اضافہ ہوا توں توں معاشرتی مسائل بھی جنم لیتے گئے، میدان کارزار میں شہادت کا رتبہ پانے والے عظیم رتبے پر فائز ہوگئے لیکن ان کے ورثاء، یتیموں اور بیواؤں کی دیکھ بھال سے متعلق معاملات پیش آئے، وراثتی مسائل، نکاح وطلاق کے مسائل واحکام کی طرف توجہ دی گئی، یتیموں کے اَموال کی حفاظت پر بڑی توجہ مرکوز کی گئی، شادی بیاہ سے متعلق احکامات بیان کیے گئے، عورتوں کے حقوق کی نگہبانی، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی، عورت زمانہ جاہلیت میں مظلومیت کی زندگی بسر کرتی تھی، شفقتوں، رحمتوں اور وراثت سے محروم تھی، اسلام نے اس پر شفقت ورحمت کی چادر ڈالی، کسی بھی طور عورتوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا، اسلام نے اسے تمام حقوق دینے کا اعلان کیا۔

عیسائی عورتوں کو وراثت میں حصہ دینے کی بجائے جانوروں کی طرح بولی لگا کر بیچ دیتے تھے، ہندو اس سے بدتر سلوک کرتے تھے، شوہر کی چتا کے ساتھ اسے بھی زندہ جلا دیتے تھے، اسلام نے ان مسائل کا حل پیش کیا، اسے فروخت کی بجائے ایجاب وقبول کے ذریعے منکوحہ بنانے کی اہمیت بیان

کی، اسے جلانے کی بجائے عزت واحترام دینے کی تلقین کی۔

خلاصہ مضامین سورۃ النساء: سورۃ النساء کی آیت نمبر ایک اور آیت نمبر ۶ میں رشتہ داروں سے حسن سلوک، یتیموں کے حقوق کی ادائیگی اور تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے، آیت ۷ سے ۱۴ تک وراثت کے احکام بیان کیے گئے ہیں، آیت ۱۵ اور ۱۸ میں بے حیائی اور فحاشی کے خاتمے کے لیے احکامات دیے گئے ہیں، آیت ۱۹ سے ۲۵ تک ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے نکاح کرنا جائز ہے اور جن سے نکاح ممنوع ہے، آیت ۲۶ سے ۳۱ میں اعمال صالحہ بجالانے کا ذکر ہے، جرائم وگناہوں سے توبہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، مال مسلم کو ناحق کھانے کی ممانعت کی گئی ہے، خون مسلم بہانے کی ممانعت کی گئی ہے، آیت ۳۲ سے ۴۰ تک خاندانی مسائل، معاشرتی احکام، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی وحسن سلوک اور بخل کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، آیت ۱۴۱ سے ۵۹ میں ایمان وعمل صالح کی نصیحت کی گئی ہے، یہود کی شر انگیزیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان سے خبر دار کیا گیا، سورۃ النساء کی چند آیات میں منافقین کی سرزنش کی گئی، جہاد کی تلقین کی گئی، دارالحرب میں گھرے ہوئے مسلمانوں کے احکام بیان کرنے کے ساتھ منافقوں سے خبر دار کیا گیا ہے، سورۃ النساء میں یتیموں کے بارے میں اہم احکامات بیان کیے گئے ہیں، منافقین کی شر انگیزیوں اور ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو چوکنا کیا گیا ہے۔

فضائل سورۃ النسآء: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سات سورتوں کو سیکھ لیا تو وہ بڑا عالم ہے۔ (احمد، حاکم، در منثور) واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا توراۃ کے بدلہ میں مجھے سات لمبی سورتیں اور دو سو آیات عطا کی گئیں، ہر سورۃ سو (آیات) یا اس سے زائد پر مشتمل ہے اور مثانی ہر وہ سورت ہے جو دو سو آیات سے کم ہے اور مفصل سے بڑی ہو۔ (شعب الایمان بیہقی، در منثور)

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات کوئی چیز پائی جب صبح ہوئی تو پوچھا گیا یارسول اللہ! درد کا اثر آپ پر ظاہر ہے آپ ﷺ نے فرمایا خبر دار! جس طرح تم مجھے دیکھ رہے ہو الحمد للہ میں ٹھیک ہوں میں نے سات لمبی سورتوں کی قرأت کی ہے۔ (ابو یعلیٰ، ابن خزیمہ، ابن حبان،

حاکم، شعب الایمان، در منثور) حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات لمبی سورتیں سات رکعتوں میں پڑھیں۔ (مسند احمد، در منثور)

عبد الرزاق رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اہل و عیال سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گزاری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو کھڑے ہوئے اپنی طبعی حاجت کو پورا فرمایا پھر آپ مشکیزے کے پاس تشریف لائے اس کو اوندھا کر کے تین مرتبہ اپنی ہتھیلیوں کو دھویا پھر وضو فرمایا اور سات لمبی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں۔ (در منثور)

ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے سورۃ نساء کے بارے میں سنو کیونکہ میں نے قرآن کو پڑھا (اس حال میں) کہ میں چھوٹا تھا۔ (حاکم، در منثور) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جو شخص سورۃ نساء کو پڑھے وہ یہ بھی سیکھے کہ کون کس کس کو ورثہ سے روکتا ہے (یعنی وراثت سے) مطلب یہ ہے کہ علم الفرائض (میراث کے احکام) کو بھی سیکھے (در منثور)

مخلوق کی پیدائش اور پھیلاؤ

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَّنِسَآءً وَّاتَّقُوا اللهَ الَّذِي تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيباً {۱} النساء

جواب ترجمہ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ داری کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچو بیشک اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ڈریں، تقویٰ اختیار کریں، یہ تقویٰ اس ذات کی عبادت بجا لانا ہے جو وحدہ لاشریک ہے، اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی قدرت کاملہ سے آگاہ فرمارہا ہے کہ اس ذات عالی نے تمہیں ایک جان سے وجود دیا ہے، یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا ہے۔ علامہ واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں خطاب اہل مکہ کو ہے، جب کہ عام مفسرین رحمہم اللہ اہل اصول اس بات پر متفق ہیں کہ خطاب عام تمام مکلفین کے لیے ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اسی بات کو سب سے درست قرار دیا ہے، کیونکہ یہاں الناس جمع ہے جس پر الف لام استغراقی داخل ہے، پھر یہاں خلقکم ذکر فرمایا ہے، یہ علت تمام مکلفین میں پائی جاتی ہے، کیونکہ تمامی مکلفین آدم علیہ السلام سے پیدا کیے گئے ہیں، جب یہ علت عام ہے تو حکم بھی عام ہے، پھر یہ بات ہے کہ تقویٰ کا مکلف بنانا صرف اہل مکہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ تمام عالم کے حق میں عام ہے، سب کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب الناس سب کے حق میں عام ہے تو تقویٰ کا حکم بھی سب کے حق میں عام ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں خطاب عام بنی آدم کو ہے، کیونکہ الناس اسم جمع ہے، اس پر الف لام داخل کیا گیا ہے جو استغراق کا معنیٰ دیتا ہے۔ اتقوا ربکم میں بظاہر یہ سمجھا جارہا ہے کہ یہ خطاب مردوں کو ہے، جب کہ تغلیباً عورتیں بھی اس میں شامل ہیں، اگر عورتوں کو اس خطاب میں شامل نہ سمجھا جائے تو پھر وہ کسی شرعی حکم کی مخاطب نہیں ہو سکیں گی، کیونکہ قرآنی اسلوب بیان میں زیادہ تر احکامات میں خطاب مذکر کے صیغوں کے ساتھ ہے، ان کے ذیل میں عورتیں بھی شرعی احکام کی مخاطب ہوتی ہیں۔ نفس واحدہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ان کی پیدائش سے پہلے جنات اور فرشتوں کی پیدائش ہوئی تھی، سب انسانوں کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام ہی سے ہوئی، انسانوں کی ابتدا انہی سے ہوئی۔

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا: حضرت آدم علیہ السلام سے ان کی بیوی حضرت حوّا کو بھی پیدا کیا، آپ علیہ السلام سوئے ہوئے تھے کہ بائیں طرف کی پسلی کی پچھلی طرف سے حضرت حوّا کو پیدا کیا، آپ علیہ السلام بیدار ہوئے تو

آپ علیہ السلام نے حضرت حوا کی طرف دیکھا، تو وہ حضرت آدم کو اچھی لگیں، حضرت آدم علیہ السلام ان سے مانوس ہوئے اور وہ حضرت آدم علیہ السلام سے مانوس ہوئیں۔ (ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں خُلِقَتِ الْمَرْأَةُ مِنَ الرَّجُلِ، فَجُعِلَ نَهْمَتُهَا فِي الرَّجُلِ، وَخُلِقَ الرَّجُلُ مِنَ الْأَرْضِ، فَجُعِلَ نَهْمَتُهُ فِي الْأَرْضِ، فَاحْبِسُوا نِسَاءَكُمْ، عورت مرد سے پیدا کی گئی ہے اس لئے اس کی حاجت و شہوت مرد میں رکھی گئی ہے اور مرد زمین سے پیدا کئے گئے ہیں اس لئے ان کی حاجت زمین میں رکھی گئی ہے، پس تم اپنی عورتوں کو روکے رکھو۔ (ابن کثیر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ لَنْ تَسْتَقِيمَ لَكَ عَلَى طَرِيقَةٍ، فَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ، وَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهَا، كَسَرْتَهَا وَ كَسْرُهَا طَلَاقُهَا، بے شک عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، وہ کسی طریقہ سے تیرے لیے سیدھی نہ ہو سکے گی اگر تو اس سے نفع اٹھانا چاہتا ہے تو اس کے ٹیڑھے پن کے ساتھ ہی نفع اٹھا اور اگر تو اسے سیدھا کرنے گیا تو اسے توڑ ڈالے گا، توڑنے سے مراد طلاق ہے۔ (مسلم، باب الوصیۃ بالنساء،)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد ہے، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، إِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے اوپر والی پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے پس اگر تو اسے بالکل سیدھی کرنے کو جائے گا تو اسے توڑ دے گا اور اگر اسے چھوڑ دے گا تو ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی، عورتوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ (مسلم، ابن کثیر)

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَّنِسَآءً: بَثَّ کا معنیٰ پھیلایا اور جدا کیا، مِنْهُمَا یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حوّا سے بطریق توالد و تناسل بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اطراف واکناف عالم میں پھیلا دیے، باوجودیکہ ان کی اقسام مختلف ہیں، ان کی صفات مختلف ہیں، ان کے رنگ روپ مختلف ہیں، ان کی زبانیں اور بولیاں مختلف ہیں، وجود دے کر پھیلانے والے رب کی طرف پھر انہیں لوٹ کر جانا ہے، وہ ذات عالی ان سب کو ایک میدان میں جمع کرے گی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ: کہ تم اللہ سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر آپس میں ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو۔ جس نے حق مار لیا ہو یا حق دینے میں دیر لگا دی ہو اس سے کہتے ہو کہ تو خدا سے ڈر اور میرا حق دے۔ حقوق مانگنے کے سوا دوسری ضروریات کے لیے بھی ایک دوسرے سے یوں کہتے ہو کہ اللہ کے لیے میرا یہ کام کر دو، خدا کے لیے مجھے یہ دے دو جس خدا تعالیٰ کے نام سے اپنے کام چلاتے ہو اس سے ڈرو اور گناہوں سے بچو۔ (انوار البیان)

صلہ رحمی کا حکم اور قطع رحمی کا وبال: پھر فرمایا وَالْاَرْحَامَ ارحام رحم کی جمع ہے، عربی میں رحم بچہ دانی کو کہا جاتا ہے جس کے اندر ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے پھر یہ کلمہ مطلقاً رشتہ داری کے تعلقات کے لیے استعمال ہونے لگا، زمانہ اسلام سے پہلے بھی اہل عرب کے نزدیک رشتہ داری کے تعلقات باقی رکھنا اور انہیں خوبی کے ساتھ نباہنا بہت اہم کام تھا، تعلقات باقی رکھنے کو صلہ رحمی اور تعلقات توڑ دینے کو قطع رحمی کہتے ہیں، اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو باقی رکھا صلہ رحمی پر بڑے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا اور قطع رحمی پر وعیدیں بیان فرمائیں۔ (انوار البیان)

اہل عرب آپس میں صلہ رحمی کے تعلقات کو یاد دلایا کرتے تھے اور قسم دلا کر کہتے کہ اے فلاں تجھے رحم کی قسم ہے تو ہماری رعایت کر اور قطع رحمی نہ کر۔ اس آیت شریفہ میں عرب کی اس عادت کو یاد دلایا ہے اور فرمایا کہ تم قرابت داری کے حقوق ضائع کرنے سے ڈرو۔ آپس میں ایک دوسرے کو رحم کا واسطہ دے کر جو سوال کرتے ہو اس واسطہ کی لاج رکھو اور آپس کے حقوق ضائع نہ کرو۔ صلہ رحمی کی شریعت اسلامیہ میں بھی بہت اہمیت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جسے پسند ہو کہ اس کا رزق زیادہ کر دیا جائے اور اس کی عمر بڑھا دی جائے تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ (بخاری، انوار البیان)

اپنے قرابت داروں سے ملنا جلنا اور شریعت کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے آنا جانا، لینا دینا یہ سب صلہ رحمی میں شامل ہے۔ حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ جس قوم میں کوئی بھی شخص قطع رحمی کرنے والا ہو ان پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔ (مشکوٰۃ المصابیح، انوار البیان)

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہو گا (ایضاً) سنن ابو داؤد میں ہے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں رحمن ہوں، میں نے لفظ رحم کو اپنے نام سے نکالا ہے جو شخص صلہ رحمی کرے گا میں اسے اپنے سے ملالوں گا اور جو شخص قطع رحمی کرے گا میں اسے اپنے سے کاٹ دوں گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح، انوار البیان)

آج کل قطع رحمی کا گناہ بہت عام ہے جو لوگ دینداری کے مدّعی ہیں نمازوں کے پابند ہیں تہجد گزار ہیں وہ بھی اس گناہ میں مبتلا رہتے ہیں، کسی کا بہن کے گھر آنا جانا نہیں، کوئی بھائی سے روٹھا ہوا ہے، کوئی چچا سے ناراض ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ماں باپ سے ہی تعلقات صحیح نہیں، لوگوں کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ غیروں کے ساتھ گزارہ کر سکتے ہیں اچھے تعلقات رکھ سکتے ہیں مگر اپنوں کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے معمولی سی باتوں کی وجہ سے قطع تعلق کر بیٹھتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ آپس کے تعلقات درست رکھے جائیں ایک دوسرے سے جو قصور اور کوتاہی ہو جائے اس سے درگزر کرتے رہیں اور صلہ رحمی کی فضیلت اور دنیاوی و اُخروی منفعت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کا دست مبارک پکڑ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے فضیلت والے اعمال بتا دیجیے آپ نے فرمایا یَا عُقْبَةُ صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ وَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ ظَلَمَكَ، کہ اے عقبہ! جو شخص تمہارے ساتھ قطعی رحمی کا معاملہ کرے اس سے تعلقات جوڑے رکھو اور جو تمہیں نہ دے اسے دیتے رہو اور جو شخص تم پر ظلم کرے اس سے اعراض کرتے رہو یعنی اس کے ظلم کی طرف دھیان نہ دو) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یوں فرمایا: ”وَاعْفُ عَنْ مَّنْ ظَلَمَكَ (جو شخص تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دو)۔ (الترغیب والترہیب، انوار البیان)

جو شخص یوں کہتا ہے کہ رشتہ دار میرے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو میں بھی کروں گا ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں وہ تو بدلہ اتارنے والا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تعلق جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو بدلہ اتار دے بلکہ تعلق جوڑنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کا برتاؤ کیا جائے تب بھی وہ صلہ رحمی کرے۔ (صحیح بخاری، انوار البیان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ مہمان کا اکرام کرے اور جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ صلہ رحمی کرے اور جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے۔ (صحیح بخاری، انوار البیان)

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً: بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگران ہے، جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو وہ اس سب سے باخبر ہے، تمہارے افعال سے بھی آگاہ ہے اور تمہارے اقوال کو بھی جانتا ہے، تم نیک اعمال بجالاؤ تو بھی جانتا ہے اور برے اعمال سرانجام دو تو بھی جانتا ہے، وہ تمہارے دل کے بھید اور رازہائے سربستہ پر بھی مطلع ہے، وہ ایسی ذات ہے جو تمہاری جلوتوں اور خلوتوں سے باخبر ہے، اس کے وعدوں پر یقین لانا اور وعیدوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

یتیموں کے مال کی حفاظت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَآتُوا الْيَتَامٰى أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلٰى أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا {٢} النساء

جواب ترجمہ: اور یتیموں کو ان کے مال دے دو، اور اچھے مال کو خراب مال سے تبدیل نہ کرو، اور ان (یتیموں) کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ، بیشک یہ بڑا گناہ ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت قبیلہ غَطفان کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس کے پاس اس کے یتیم بھتیجے کا بہت سا مال تھا، یتیم بھتیجا جب بالغ ہوا تو اس نے چچا سے اپنا مال مانگا، اس کے چچا نے اسے مال دینے سے انکار کر دیا، چنانچہ یہ دونوں معاملہ نبی ﷺ کے پاس لے گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جب چچا نے یہ آیت سنی تو اس نے کہا کہ، أَطَعْنَا اللهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ، نَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الْحُوبِ الْكَبِيرِ، یعنی ہم نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کی ہم گناہ کبیرہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور اس نے بھتیجے کو اس کا مال حوالے کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ وَرَجَعَ بِهِ هٰكَذَا فَإِنَّهُ يَحُلُّ دَارَهُ جو شخص حرص نفسانی سے بچ گیا اور اس نے اس طرح اپنے غلط مؤقف سے رجوع کیا، تو وہ اپنے گھر میں آباد ہو گیا ہے یعنی جنت میں یتیم نوجوان نے جب اپنا مال اپنے قبضے میں کر لیا تو اس نے اس مال کو اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ، ثَبَتَ الْأَجْرُ وَبَقِيَ الْوِزْرُ یعنی اجر تو جڑ پکڑ گیا یا ثابت ہو گیا اور بوجھ باقی رہ گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! قَدْ عَرَفْنَا أَنَّهُ ثَبَتَ الْأَجْرُ، فَكَيْفَ بَقِيَ الْوِزْرُ وَهُوَ يُنْفِقُ فِي سَبِيلِ اللهِ؟ یہ تو ہم جان گئے کہ اَجر ثابت ہو گیا، لیکن بوجھ کیسے باقی رہ گیا جب کہ وہ راہِ خدا میں مال خرچ کرتا ہے؟ تو نبی ﷺ نے جواب دیا کہ ثَبَتَ الْأَجْرُ لِلْغُلَامِ وَبَقِيَ الْوِزْرُ عَلَى وَالِدِهِ اجر تو لڑکے کے لیے ثابت ہوا لیکن بوجھ والد پر باقی رہا۔ (اسباب النزول)

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے یہاں یتیموں کے بارے میں جو حکم دیا ہے یہ ان کے اولیاء اور اوصیاء اور ہر اس شخص کے لیے ہے جو یتیم کے ساتھ کسی درجہ کی بھی رشتہ داری و تعلق داری رکھتا ہے۔ جس طرح یہ حکم اولیاء، اوصیاء اور دیگر رشتہ داروں کے لیے ہے اسی طرح یہ حکم عمومی طور پر اسلامی جماعت کو بھی دیا گیا ہے تاکہ وہ بزور طاقت و قوت یتیم کا مال اس تک پہنچانے میں اپنا نمایاں کردار ادا کرے، تاکہ یتیم کا مال وصول کر کے اس تک پہنچانے میں کسی طرح کی کمی بیشی اور ٹال مٹول سے کام نہ لیا جائے۔

یتامیٰ: یتیم کی جمع ہے، انسانوں میں یتیم اُسے کہا جاتا ہے جس کی چھوٹی عمر میں اس کا والد فوت ہو جائے، جانوروں میں یتیم وہ ہے جس کی ماں مر جائے، یتیم کا لفظ یتم سے لیا گیا ہے، یتم کا معنیٰ منفرد

اور یگانہ ہے، اسی سے دُرّ یتیم بنا ہے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ یتیم کا لفظ اپنے معنیٰ کے اعتبار سے ہر چھوٹے بڑے پر بولا جاسکتا ہے، لیکن بلوغ سے پہلے پہلے تک یتیم کا لفظ اسی بچے پر بولا جاتا ہے جس کا والد فوت ہو گیا ہو، جب تک وہ سمجھداری کی عمر کو نہیں پہنچتا، مقصود یتیم کے مال کی حفاظت کی ترغیب دینا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یتیمی حلم و دانش کے بعد نہیں ہے، یہ شرعی تعلیم ہے لغوی نہیں ہے، کیونکہ جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو اس پر چھوٹی عمر کے احکامات جاری نہیں ہوتے، یہاں یتامیٰ سے مراد چھوٹے بچے ہی ہیں، شریعت اور دین کہہ رہا ہے کہ یتیموں کے مال کی حفاظت کیجیے، اسے بالغ و سمجھدار ہونے کے بعد مال مکمل طور پر سپرد کیجیے، اس کے مال میں کسی قسم کی حرص و طمع نہ رکھیے۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ: برے مال کو اچھے مال سے تبدیل نہ کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ یتیم بچے جو تمہاری پرورش اور نگرانی میں ہیں جن کا مال تمہارے قبضہ میں ہے ان کے اچھے مال کو خود اپنے حصے میں اور اپنے گھٹیا مال کو اس کے عوض اس کے حساب میں لگا کر حساب پورا نہ کر دو، اپنی اولاد کی خاطر لوگ یتیم کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ اچھی جائیداد اور اچھا مال جو یتیموں کی ملکیت ہو اسے اپنا بنا کر اپنے نام رجسٹری کروالیتے ہیں اور یتیم بچوں کو گھٹیا مال دے دیتے ہیں۔ (انوار البیان)

اور بعض مفسرین نے **وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ** کا یہ معنی بھی بتایا ہے کہ اپنے حلال مال کو چھوڑ کر یتیموں کا مال نہ کھاجاؤ جن کا کھانا تمہارے لیے حرام ہے، اگر ایسا کروگے تو طیب کو چھوڑ کر خیانت کر کے دوسرے کا مال کھانے والے بن جاؤ گے اور یہ مال چونکہ تمہارے لیے حرام ہو گا اس لیے خبیث ہو گا، یہ معنی بھی لفظ قرآنی سے بعید نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ جب اپنا گھٹیا مال یتیم کے حصہ میں لگا کر اس کا اچھا مال لینا حرام ہے تو یہ تو بدرجہ اَولیٰ حرام ہو گا کہ ان کا مال بالکل ہی بلا بدل کے کھالیا جائے۔ (انوار البیان)

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے حضرت ابو صالح رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رزق حلال جو تمہارے لیے مقدر کیا گیا ہے اس کی آمد سے پہلے رزق حرام کے حصول میں جلدی نہ کرو، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے

حرام مال کو اپنے حلال مالوں کے ساتھ نہ بدلو۔ فرماتے ہیں کہ اپنے حلال مالوں میں فضول خرچی نہ کرو اوران کے حرام مال نہ کھاؤ۔ سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ کمزور جانور دے کر موٹا جانور نہ حاصل کرو۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اور ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بے کار مال دے کر عمدہ مال حاصل نہ کرو۔

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے لوگ ایسا کر لیا کرتے تھے کہ یتیموں کی بکریوں کے ریوڑ میں سے عمدہ بکری لے لی اور اپنی دُبلی پتلی بکری دے کر گنتی پوری کر دی، کھوٹا دِرہم اس کے مال میں ڈال کر کھرا نکال لیا اور پھر سمجھ لیا کہ ہم نے تو بکری کے بدلے بکری اور دِرہم کے بدلے درہم لیا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ: اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاجاؤ، مجاہد اور سدی سے منقول ہے کہ یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، انہیں یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملانے سے روک دیا گیا ہے، ملانے کی صورت یہ ہے کہ ولی یتیم کا مال بطور قرض لے لے اور اس طرح اس کا مال ولی کے ذمہ دین ہو جائے اور پھر ولی اس مال اور اس کے منافع میں سے کھانے کا جواز پیدا کر لے۔ (احکام القرآن للجصاص)

یتیم بچے جن لوگوں کی پرورش میں ہوتے ہیں ان میں جن کا مزاج خیانت والا ہوتا ہے ایسے لوگ مختلف طریقوں اور تدبیروں سے یتیموں کے مالوں کو اپنے مالوں میں ملا کر کھا جاتے ہیں کچھ لوگ تو غفلت اور بے دھیانی میں ایسا گزرتے ہیں کہ گھر کی مشترکہ ضرورتوں میں مال خرچ کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یتیم بچے پر اس کے اپنے ذاتی مال میں سے کتنا خرچ ہوا اور اس کے مال میں سے مشترکہ ضروریات میں دوسروں پر کتنا خرچ ہوا ہے؟ اور کچھ لوگ قصداً اِرادۃً ایسا کرتے ہیں کہ یتیم بچوں کے بالغ ہونے سے پہلے ہی ان کے مال کو کسی نہ کسی طرح اپنے نام میں یا اپنی اَولاد کے نام میں لکھوا دیتے ہیں پھر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو اسے اپنے مال میں سے ذرا بہت ملتا ہے یا بالکل ہی محروم ہو جاتا ہے۔ (انوار البیان)

یہاں یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ شامل کر کے کھانے کی ممانعت دکھائی دے رہی ہے، لیکن دوسرے مقام پر یتیم کے مال کی حفاظت کرنے والے شخص کو غریب و فقیر ہونے کی صورت میں اس قدر اجازت دی گئی ہے جس سے اس کی گزر اوقات ہو سکے، **مَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ**،

اگر وہ فقیر ہے تو عمدہ طریقہ سے اس کے مال میں سے استعمال کر سکتا ہے، کھانے کی اجازت سے مراد اس کے مال سے مطلق فائدہ اٹھانا ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا: یہ کارروائی بڑے گناہ کی بات ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے یہ بڑا گناہ ہے، آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بالغ ہو جانے اور سمجھ بوجھ کے آثار ظاہر ہونے کے بعد یتیموں کو ان کے مال واپس کرنا واجب ہو جاتا ہے، خواہ وہ اس کا مطالبہ نہ بھی کریں اس لیے کہ واپسی کا حکم مطلق ہے، اس میں کوئی شرط نہیں ہے کہ یتیموں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہونے پر انہیں واپس کیا جائے، بلکہ واپس نہ کرنے پر عذاب کی دھمکی سنائی گئی ہے، آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جس کے پاس کسی اور کا مال ہو اور وہ اسے واپس کرنا چاہے تو اس کے لیے مستحب طریقہ یہ ہے کہ واپسی پر لوگوں کو گواہ بنائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جب تم مال ان کے سپرد کرو تو اس پر لوگوں کو گواہ بنالو۔ (احکام القرآن للجصاص) حوب: گناہ کو کہتے ہیں، کبیرا فرما کر اس میں مبالغے کو ظاہر فرمایا ہے کہ یتیم کے مال کے ساتھ وہ طریقہ اختیار کرنا جو نہیں کرنا چاہیے یہ گناہ کبیرہ ہے۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

چار عورتوں کے ساتھ شادی

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا {٣}

جواب ترجمہ: اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کر لو۔ اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔ {النساء}

شانِ نزول: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ أَنَّ رَجُلًا كَانَتْ لَهُ يَتِيمَةٌ فَنَكَحَهَا، وَكَانَ لَهَا عَذْقٌ، وَكَانَ يُمْسِكُهَا عَلَيْهِ، وَلَمْ يَكُنْ لَهَا مِنْ نَفْسِهِ شَيْءٌ فَنَزَلَتْ فِيهِ: {وَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَى} أَحْسِبُهُ قَالَ: كَانَتْ شَرِيكَتَهُ فِي ذَلِكَ الْعَذْقِ وَفِي مَالِهِ، ایک شخص ایک یتیم لڑکی کی پرورش کرتا تھا، اس نے صرف اس غرض سے اس کے ساتھ نکاح کر لیا کہ وہ ایک کھجور کے درخت کی مالکہ تھی ورنہ اس کے دل میں اس لڑکی کی کوئی اُلفت نہ تھی، اس کے حق میں یہ آیت اُتری، اس حدیث کے ایک راوی ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ لڑکی اس درخت اور دوسرے مال اسباب میں اس مرد کے ساتھ حصہ دار تھی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَآءِ: یعنی اگر تمہیں اس بات کا خدشہ ہے کہ تم ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے جو تمہاری پرورش اور سرپرستی میں ہیں اور تمہیں ڈر ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری محبت نہ ہونے کی وجہ سے تم ان کے حقوق ادا نہ کر سکو گے، تو تم ان کے علاوہ دوسری عورتوں کے ساتھ نکاح کر لو **مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَآءِ** عورتوں میں سے جو تمہیں اچھی لگیں یعنی، دین، مال، حسب و نسب اور حسن و جمال جیسی دیگر صفات جو نکاح کی ترغیب دیتی ہیں، ان صفات کی حامل عورتوں میں سے جس کے ساتھ نکاح کرنے کا اختیار حاصل ہو، اپنی خواہش اور صوابدید کے مطابق نکاح کر لو، نکاح کے انتخاب کے لیے بہترین صفت دین ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَمِينُكَ عورت سے چار صفات کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال، اس کے حسن و جمال، اس کے حسب و نسب اور اس کے دین کی وجہ سے، تیرے ہاتھ خاک آلودہ ہوں، تو دین دار عورت سے نکاح کرنے کی کوشش کر، اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ نکاح سے قبل عورت کو منتخب کر لے، بلکہ شارع علیہ السلام نے تو یہاں تک مباح کیا ہے کہ انسان جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اسے ایک نظر دیکھ لے تاکہ یہ نکاح بصیرت کی بنیاد پر ہو۔ (تفسیر السعدی)

مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا

يَا ابْنَ أُخْتِي هِيَ اليَتِيمَةُ تَكُونُ فِي حَجْرِ وَلِيِّهَا تُشَارِكُهُ فِي مَالِهِ، فَيُعْجِبُهُ مَالُهَا وَجَمَالُهَا، فَيُرِيدُ وَلِيُّهَا أَنْ يَتَزَوَّجَهَا، بِغَيْرِ أَنْ يُقْسِطَ فِي صَدَاقِهَا، فَيُعْطِيهَا مِثْلَ مَا يُعْطِيهَا غَيْرُهُ، فَنُهُوا أَنْ يُنْكِحُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يُقْسِطُوا لَهُنَّ، وَيَبْلُغُوا بِهِنَّ أَعْلَى سُنَّتِهِنَّ مِنَ الصَّدَاقِ، وَأُمِرُوا أَنْ يَنْكِحُوا مَا طَابَ لَهُمْ مِنَ النِّسَاءِ سِوَاهُنَّ،

بھانجے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک یتیم لڑکی اپنے ولی کی پرورش میں ہو اور ترکہ کی رو سے اس کی جائیداد میں حصہ دار ہو اور ولی کو اس کا مال اور جمال تو پسند آئے مگر وہ اسے اتنا مہر دینے پر آمادہ نہ ہو جتنا اسے دوسرے لوگ دیتے ہیں تو وہ اس سے نکاح نہ کرے، ہاں اگر اتنا ہی دے دے تو پھر نکاح کر سکتا ہے، ورنہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے جو انہیں پسند ہو نکاح کر لے اور چار تک ایسی بیویوں کی اجازت دی گئی۔ (بخاری) حضرت قیس بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اسلام لایا تو میری آٹھ بیویاں تھیں، میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ بات بتائی تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ اِخْتَرْ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا تو ان آٹھ میں سے چار کو منتخب کر لے۔ (ابن ماجہ)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، آپ ﷺ نے اسے فرمایا خُذْ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا (ابن ماجہ۔ کتاب النکاح) ان میں سے کوئی سی چار پسند کر لو (باقی چھوڑ دو)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے، جس کے نام قرعہ نکلتا اسے اپنے ہمراہ لے جاتے اور آپ ﷺ ہر بیوی کی باری ایک دن اور ایک رات مقرر کرتے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الہبہ)

البتہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ بالکل الگ ہے کیونکہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات امت کی مائیں ہیں جو کسی دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی تھیں، لہٰذا جتنے نکاح آپ ﷺ کر چکے تھے وہ سب آپ ﷺ

کے لیے حلال اور جائز قرار دیئے گئے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اسلام میں تعددِ ازواج کی کوئی حد نہیں اور قرآن میں جو دو دو تین تین، چار چار کے الفاظ آئے ہیں یہ بطور محاورہ زبان ہیں یعنی دو دو کی بھی اجازت ہے، تین تین کی بھی اور چار چار کی بھی، اور اسی طرح پانچ پانچ اور چھ چھ کی بھی فصاعداً۔ یہ استدلال دو وجہ سے غلط ہے: ایک یہ کہ اگر اجازتِ عام ہی مقصود ہوتی تو صرف فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النسآء:۳) کہہ دینا ہی کافی تھا، چار تک تعین کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور دوسرے یہ کہ سنت نے چار تک حد کی تعیین کر دی تو پھر اس کے بعد کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی دوسری بات کرے، جیسے کہ اوپر سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: یعنی اگر تم کو اس کا ڈر ہو کہ کئی عورتوں میں انصاف اور مساوات کے مطابق معاملہ نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو یا صرف لونڈیوں پر ایک ہو یا زیادہ بس کرو یا ایک منکوحہ کے ساتھ ایک یا چند لونڈیوں کو جمع کر لو۔ یعنی صرف ایک عورت سے نکاح کرنے میں یا فقط اپنی لونڈی یا اپنی لونڈیوں پر قناعت کرنے میں یا ایک نکاح کے ساتھ ایک لونڈی یا چند لونڈیوں کو جمع کرنے میں اس بات کی توقع ہے کہ تم بے انصافی اور خلاف عدل سے محفوظ رہو کیونکہ زوجات کے جو حقوق ہیں وہ اپنی مملوکہ لونڈی کے نہیں کہ ان میں عدل نہ ہونے سے تم پر مواخذہ ہو نہ ان کے لئے مہر ہے نہ معاشرت کے لئے کوئی حد مقرر ہے۔ جس کے کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ کھانے پینے اور لینے دینے میں ان کو برابر رکھے اور رات کو ان کے پاس رہنے میں باری برابر باندھے اگر برابری نہ کرے گا تو قیامت کو وہ مفلوج ہو گا، ایک کروٹ گھسٹتی چلے گی اور کسی کے نکاح میں ایک (آزاد عورت) اور ایک لونڈی ہو تو لونڈی کو حرہ سے نصف باری ملے گی اور جو لونڈی اپنی ملک میں ہو اس کا باری میں کوئی حق مقرر نہیں مالک کی خوشی پر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یہاں خوف سے مراد علم ہے، یعنی اگر تمہیں اس بات کا پتہ ہو کہ تم لوگ ان یتیم عورتوں کے حق میں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر تم دوسری عورتوں سے شادی کر لو۔ اقساط کا معنیٰ عدل

وانصاف ہے۔اس آیت مبارکہ میں چھوٹی عمر کی یتیم لڑکی سے نکاح کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ طَابَ لَكُم سے ایک مراد یہ ہے کہ جن کی طرف تمہارا میلان ہو، دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو تمہارے لیے حلال ہوں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا: یعنی ایک بیوی یا لونڈیوں پر اکتفا کرنا اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بندے کو کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جہاں اس سے ظلم وجور کے ارتکاب کا خدشہ ہو اور اسے اس بات کا خوف ہو کہ وہ اس معاملے کے حقوق پورے نہیں کر سکے گا، خواہ یہ معاملہ مباحات کے زمرے میں کیوں نہ آتا ہو تو اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس معاملے میں کوئی تعرض کرے، بلکہ وہ اس میں بچاؤ اور عافیت کا التزام کرے کیونکہ عافیت بہترین چیز ہے جو بندے کو عطا کی گئی ہے، چونکہ اکثر لوگ اپنی بیویوں پر ظلم کرتے ہیں اور ان کے حقوق غصب کر لیتے ہیں، خاص طور پر حق مہر (اکثر) بہت زیادہ ہوتا ہے یہ مہر ایک ہی بار پورے کا پورا ادا کرنا باعث مشقت ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا اور ان کو تاکید کی کہ وہ اپنی بیویوں کو مہر ادا کریں۔(تفسیر السعدی)

تَعُوْلُوْا عول سے ہے، عول کے دو معنیٰ ہیں ایک معنیٰ ہے میلان (مائل ہونا) دوسرا معنیٰ ہے ظلم، عربی زبان میں جب ترازو کا پلڑا ایک طرف جھک جائے تو اس وقت عال المیزان بولتے ہیں، حاکم جب ظلم کرے تو اس وقت کہا جاتا ہے عال الحاکم، حکمران نے ظلم کیا ہے، یہاں وہ میلان مراد ہے جس سے منع کیا گیا ہے، جو عدل وانصاف کے مقابلے میں ہو۔

عورتوں کے مہر کی ادائیگی کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا {۴} النساء

جواب ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیا کرو۔ہاں! اگر وہ خود اس کا کچھ حصہ خوش

دلی سے چھوڑ دیں تو اسے خوشگواری اور مزے سے کھالو۔

شانِ نزول: ① ابو صالح رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی جب اپنی لونڈی کی شادی (کسی اور مرد سے) کرتا تھا تو اس کا مہر اسے دینے کی بجائے خود لے لیتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات سے منع فرمایا اور یہ آیت وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً نازل فرمائی۔ (عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، در منثور)

② حضرمی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی کسی کو اپنی بہن نکاح میں دیتا تھا تو اس آدمی کی بہن کو اپنے نکاح میں لے لیتا تھا اور (آپس میں) مہر نہیں لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً۔ (ابن جریر، در منثور)

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً: یعنی جن عورتوں کے ساتھ تمہیں نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے تم لوگ انہیں خوش دلی اور اطمینان قلبی کے ساتھ مہر ادا کرو، مہر ادا کرنے میں ٹال مٹول نہ کرو اور اسے ادا کرتے وقت اس میں کچھ کم نہ کرو، اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر عورت مکلف (یعنی بالغ اور عاقل) ہو تو مہر اس کو ادا کر دیا جائے گا اور عقد کے موقع پر عورت مہر کی مالک بن جاتی ہے، کیونکہ حق مہر کی اضافت اس کی طرف جاتی ہے اور اضافت تملیک کا تقاضا کرتی ہے۔ (السعدی)

صَدُقات (فتحہ ص اور ضمہ د) صدقہ کی جمع ہے، اس کا معنیٰ مہر ہے۔

ابن عباس اور قتادہ نے نِحْلَةً کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ بیان کیا ہے، کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے دین میں فرض کی ہے، نحلہ ادا کرنے سے اسے تعبیر فرمایا گیا ہے، باوجودیکہ یہ لازم ہے، یہ لفظ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ کمال رضامندی کے ساتھ مہر ادا کیا جائے، خوشدلی کے ساتھ دیا جائے، گویا کہ یوں کہا گیا کہ انہیں تم لوگ خوشدلی اور اطمینان قلبی کے ساتھ مہر ادا کرو۔ کلبی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نحلہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے، کیونکہ نحلہ کا معنیٰ عطیہ ہے اور یہ خطاب خاوندوں سے کیا گیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ خطاب اولیاء سے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اپنی بیٹیوں کے مہر لیا کرتے تھے، آج تک عربوں کی اکثریت کی یہی عادت چلی آرہی ہے، ایسا کرنا حرام کام ہے، جس طرح

خاوندوں کے لیے حرام ہے کہ وہ بیویوں کی رضامندی کے بغیر ان کا مہر کھائیں۔

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس مفہوم کی بنا پر یہ جائز ہے۔ کیونکہ مہر کو اس لیے نحلہ کا نام دیا گیا ہے کہ نحلہ، عطیہ کو کہتے ہیں اور عام طور پر جب کوئی شخص کسی کو عطیہ دیتا ہے تو خوش دلی کے ساتھ دیتا ہے اسی مفہوم کے تحت مہر کو نحلہ، کا نام دے کر گویا مردوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ عورتوں کو مہر خوشدلی کے ساتھ دیں جس طرح عطیہ دینے والا خوشدلی کے ساتھ کسی کو عطیہ دیتا ہے۔

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا: اگر شادی شدہ عورتیں اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ اپنے خاوندوں کے لیے چھوڑ دیں یعنی حق مہر سے **نَفْسًا** یعنی اگر بیویاں برضاورغبت مہر کا کچھ حصہ چھوڑ کر یا ادائیگی میں مہلت دے کر یا مہر کا کوئی عوض قبول کر کے شوہروں کے ساتھ نرمی کرتی ہیں، انہیں ایسے کرنے پر تم کسی برے طریقے سے مجبور نہیں کرتے، تو پھر اس سے متعلق یہ حکم دیا گیا کہ تم اسے کھا سکتے ہو۔

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا: تو کھاؤ تم اس کو ذوق شوق سے یعنی اس صورت میں تمہارے لیے کوئی حرج اور کوئی نقصان نہیں۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ عورت بالغ اور عاقل ہے تو اپنے مال میں تصرف کا پورا اختیار رکھتی ہے، خواہ وہ صدقہ ہی کیوں نہ کر دے، لیکن اگر بالغ اور عاقل نہیں ہے تو اس کے عطیہ کا حکم معتبر نہیں نیز عورت کا سرپرست اس مہر میں سے کچھ حصہ لینے کا حق دار نہیں سوائے اس کے کہ عورت برضاورغبت خود اسے کچھ عطا کر دے۔

زیر بحث آیت کئی معانی پر مشتمل ہے، اول یہ کہ مہر عورت کے لیے ہوتا ہے، وہی اس کی حق دار ہوتی ہے، اس پر ولی کا کوئی حق نہیں ہوتا، دوم یہ کہ مرد مہر کی رقم خوش دلی کے ساتھ عورت کو ادا کرے سوم یہ کہ اگر عورت مرد کو مہر ہبہ کر دیتی ہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے اور مرد کو اسے قبول کر لینا مباح ہے قول باری **فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا** اس کی دلیل ہے چہارم یہ کہ عورت کی طرف سے مہر کی رقم ہبہ کر دینے کے جواز کے لیے مہر پر اس کے قبضہ کر لینے اور قبضہ نہ کرنے کی دو حالتیں یکساں حکم کی حامل ہیں، اس لیے کہ قول باری **فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا** دونوں حالتوں پر دلالت کرتا

ہے، نیز قبضہ کرنے سے پہلے ہی ہبہ کر دینے کے جواز پر بھی یہ قول باری دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ قول باری فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا سے مراد مہر کی وہ صورتیں ہیں جن میں اس کا تعین ہو چکا ہو یعنی یا تو وہ سامان کی صورت میں ہوں جس پر عورت نے قبضہ کر لیا ہو یا قبضہ نہ کیا ہو، یا نقدی یعنی درہم و دینار کی صورت میں ہو جس پر اس کا قبضہ ہو چکا ہو، لیکن اگر مہر مرد کے ذمے دین کی صورت میں ہو تو پھر اس کے ہبہ کے جواز پر آیت کی کوئی دلالت نہیں ہے، کیونکہ جو چیز کسی کے ذمے لگ چکی ہو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے مزے سے کھالو، اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اس بارے میں آیت کی مراد صرف ان چیزوں تک محدود نہیں ہے جو کھائی جا سکتی ہوں یعنی ماکولات میں سے ہوں اور غیر ماکولات اس مراد میں داخل نہ ہوں، اس لیے کہ اگر آیت کی مراد یہ ہوتی تو پھر ضروری ہوتا کہ کھالینے کا حکم مہر کے ساتھ اس وقت خاص ہوتا جب کہ مہر ماکولات میں سے ہوتا، حالانکہ آیت میں خطاب کے مفہوم سے خود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ صرف ماکولات تک محدود نہیں ہے اور یہ کہ غیر ماکولات اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ قول باری وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً مہر کی تمام صورتوں کو شامل ہے خواہ وہ ماکولات کی جنس میں سے ہوں یا غیر ماکولات کی۔

اور قول باری فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ان تمام صدقات کو شامل ہے جن کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے یہ دلالت حاصل ہوئی کہ اس بارے میں لفظ اکل کا جو کھالینے کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ مقصد اس میں ہے کہ عورت کی طرف سے بطیب خاطر مہر یا اس کا ایک حصہ چھوڑ دینے کی صورت میں مرد کے لیے وہ مباح قرار پاتا ہے۔

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا عورت اپنے شوہر کو مہر ہبہ کر سکتی ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، زفر رحمہ اللہ، حسن رحمہ اللہ بن زیادہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب عورت بالغ ہو چکی ہو اور اس میں عقل آگئی ہو تو اس کا ہبہ وغیرہ کی صورت میں اپنے مال میں تصرف جائز ہے خواہ وہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔

امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ باکرہ عورت کا اپنے مال میں کوئی تصرف اور مہر کے کسی حصے سے اپنے شوہر کو بری کر دینا جائز نہیں ہے۔ مہر معاف کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، باپ کے سوا اور کوئی ولی یہ قدم نہیں اٹھا سکتا، آپ نے مزید فرمایا کہ شوہر والی عورت کا اپنے گھر اور غلام وغیرہ کی فروخت جائز ہے، خواہ شوہر کو یہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ اس کا سودا ٹھیک ٹھاک رہا ہو، اگر بیع میں خریدار کے لیے سہولت کو مد نظر رکھ کر قیمت وغیرہ میں کمی کر دی گئی ہو تو یہ بیع عورت کے تہائی مال سے جاری ہو گی اگر عورت صدقہ یا ہبہ کرے گی تو وہ اپنے تہائی مال میں سے زائد کے اندر ایسا نہیں کر سکے گی۔

امام مالک نے یہ بھی فرمایا کہ اگر عورت شوہر کے بغیر یعنی بیوہ یا مطلقہ ہو تو اس صورت میں وہ اپنے مال میں اسی طرح تصرف کر سکتی ہے جس طرح ایک مرد اپنے مال میں تصرف کرتا ہے اوزاعی کا قول ہے کہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر جا کر بس جانے والی عورت کا کوئی عطیہ اس وقت تک درست نہیں ہو گا، جب تک کہ ایک سال نہ گذر جائے اور کوئی بچہ نہ پیدا ہو جائے۔ لیث کا قول ہے کہ شوہر والی عورت کا اپنے مال میں نہ تو کوئی صدقہ درست ہے اور نہ ہی اپنے غلام یا لونڈی کو آزاد کر دینا، البتہ تھوڑا بہت مال وہ خرچ کر سکتی ہے جس کا خرچ کرنا رشتہ داری کے تعلقات برقرار رکھنے یا رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زیر بحث آیت درج بالا اقوال کے فساد اور بطلان کا فیصلہ اور ہمارے اصحاب کے قول کی صحت کی گواہی دے رہی ہے کیونکہ قول باری ہے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا اللہ تعالیٰ نے اس قول میں باکرہ اور ثیبہ کے درمیان نیز شوہر کے گھر میں ایک سال کی مدت گذار لینے والی اور نہ گذارنے والی عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، اب اس معاملے میں باکرہ اور ثیبہ کے درمیان فرق کرنا صرف اسی صورت میں درست ہو گا، جبکہ کوئی ایسی دلالت موجود ہو جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آیت صرف ثیبہ کے بارے میں ہے باکرہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے عورت کے باپ کے ذریعے مہر کے ہبہ کو جائز قرار دیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ عورت کا پورا مہر اس کے حوالے کر دو الا یہ کہ وہ خود اس میں سے کچھ حصہ یا پورے

کا پورا چھوڑ دے، اس طرح آیت باپ کے ذریعے مہر کے ہبہ کے بطلان کا فیصلہ دیتی ہے، کیونکہ اسے تو مہر کی پوری رقم بیٹی کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، الّا یہ کہ وہ بطیب خاطر (خوشی سے) اسے چھوڑنے پر ضامند ہو جائے، اللہ نے باپ کی خوش دلی کی شرط نہیں لگائی اس طرح امام مالک نے ایک طرف اس بات کی ممانعت کر دی جس کی اللہ تعالیٰ نے عورت کے لیے بطیب خاطر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی تھی اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے عورت کی خوش دلی کے بغیر جس بات کی ممانعت کر دی تھی انہوں نے باپ کی شرط لگا کر اسے جائز کر دیا۔

یہ طرز فکر دراصل کسی دلیل کے بغیر آیت پر دو پہلوؤں سے اعتراض کرنے کے مترادف ہے: اول یہ کہ ظاہر آیت تو ہبہ کے جواز کی متقاضی ہے لیکن اسے اس سے روکا جا رہا ہے۔ دوم یہ کہ باپ کے ذریعے بیٹی کے مہر کے ہبہ کا جواز پیدا کر دیا گیا ہے جبکہ امر الٰہی یہ ہے کہ عورت کو اس کا پورا مہر دے دیا جائے الّا یہ کہ وہ بطیب خاطر اسے چھوڑ دینے پر رضامند ہو جائے۔ (احکام القرآن)

مال یتیم کے بارے میں قرآنی ہدایات

سوال ان آیات کریمات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا {۵} وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا إِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَأْكُلُوْهَآ إِسْرَافًا وَّبِدَارًا أَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا {۶} النساء

جواب ترجمہ: اور ناسمجھ (یتیموں) کو اپنے وہ مال حوالے نہ کرو جن کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی کا سرمایہ بنایا ہے، ہاں ان کو ان میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے مناسب انداز میں بات کر لو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے لائق عمر کو پہنچ جائیں، تو اگر تم یہ محسوس کرو کہ ان

میں سمجھ داری آچکی ہے تو ان کے مال انہی کے حوالے کر دو۔ اور یہ مال فضول خرچی کر کے اور یہ سوچ کر جلدی جلدی نہ کھا بیٹھو کہ وہ کہیں بڑے نہ ہو جائیں۔ اور (یتیموں کے سرپرستوں میں سے) جو خود مال دار ہو وہ تو اپنے آپ کو (یتیم کا مال کھانے سے) بالکل پاک رکھے، ہاں اگر وہ خود محتاج ہو تو معروف طریق کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھالے۔ پھر جب تم ان کے مال انہیں دو تو ان پر گواہ بنالو، اور اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا: اور نا سمجھ (یتیموں) کو اپنے وہ مال حوالے نہ کرو جن کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی کا سرمایہ بنایا ہے، سفہاء سفیہ و سفہ کی جمع ہے، یہ لفظ بدن کی خفت پر بولا جاتا ہے، ثوب سفیہ عربی زبان میں اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو برے طریقے سے بنا گیا ہو، یہ لفظ نفس کی خفت میں استعمال کیا جاتا ہے، عقل کے نقصان میں استعمال کیا جاتا ہے، دنیوی واُخروی معاملات کے نقصان میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیوی نقصان کے بارے میں فرمایا کہ **وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ** تم لوگ اپنے اموال بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو، اخروی نقصان کے بارے میں فرمایا **وَأَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا**۔ یہاں اولیاء کو خطاب کیا گیا ہے کہ وہ فضول خرچ یتیموں کو اپنا مال حوالے نہ کریں، جنہیں مال کے بارے میں کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی نا سمجھی کی وجہ سے مال کو اڑا دینا ہے اور ضائع کر دینا ہے، ان مالوں کی نسبت اولیاء کی طرف کی گئی ہے باوجود یکہ یہ مال یتیموں کا ہے، گویا کہ یہ مال انہی کا ہے، کیونکہ اس مال کی حفاظت و نگہبانی انہی لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی تاویل و تفسیر میں اہل علم کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ کوئی شخص اپنا مال اپنی اولاد کے درمیان تقسیم نہ کرے اور پھر خود ان کا دست نگر بن جائے، جبکہ اس کی اولاد کو اس کا دست نگر ہونا چاہیے اور عورت بیوقوف ترین مخلوق ہے، اس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کی اس کے ظاہر اور اس کی حقیقت کے مقتضیٰ کے مطابق تفسیر کی ہے اس لیے کہ قول باری **أَمْوَالَكُمُ** اس بات کا متقاضی ہے کہ اپنا مال نادانوں کے

حوالے کرنے کی نہی کا خطاب ہر شخص کو ہے، اس لیے کہ حوالہ کر دینے کی صورت میں گویا اپنا مال ضائع کر دینا ہے کیونکہ نادان لوگ مال کی حفاظت اور اس میں اضافہ کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، نادان لوگوں سے آپ کی مراد بچے اور عورتیں ہیں جو مال کی حفاظت کے لیے نااہل ہوتے ہیں، نیز اس امر پر امر پر بھی دلالت ہو رہی ہے کہ ایک شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے مال کا کسی ایسے فرد کو وکیل اور کارپرداز بنادے، جس میں نادانی اور بیوقوفی کی صفت پائی جاتی ہو اور نہ ہی ان جیسے لوگوں کو اپنے مال کے متعلق وصیت کرے، نیز یہ دلالت بھی ہو رہی ہے کہ ایک شخص کے ورثاء کم عمر ہوں تو اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنے مال کے متعلق کسی ایسے شخص کو وصیت کرے جو امانت دار ہو اور ان ورثاء کی خاطر اس مال کی دل و جان سے حفاظت کر سکتا ہو۔

اس میں یہ دلالت بھی موجود ہے کہ مال کو ضائع کرنے سے روکا گیا ہے اور اس کی حفاظت دیکھ بھال اور نگرانی واجب کر دی گئی ہے، اس لیے کہ قول باری ہے الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتادیا ہے کہ اس نے ہمارے جسموں کی زندگی اور قیام کا ذریعہ مال کو بنادیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو مالِ دنیا میں سے کوئی حصہ عطا کیا ہے، اس پر اس میں سے اللہ کا حق یعنی زکوٰۃ و صدقات ادا کرنا لازم ہے پھر باقی ماندہ مال کی حفاظت اور اسے ضائع ہونے سے بچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

اس طرح اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اصلاح معاش اور حسن تدبیر کی ترغیب دی ہے، یہ بات اللہ نے اپنی کتاب عزیز میں کئی مواقع پر بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ قول باری ہے وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ اور بلاضرورت خرچ نہ کرو بیشک بلاضرورت مال اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں، نیز قول باری ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا، اپنے ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر نہ رکھو، اور نہ ہی اسے پوری طرح پھیلا دو کہ پھر ملامت زدہ اور تھکا ہارا بن کر بیٹھ رہو) نیز قول باری ہے وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا، اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول

خرچی نہیں کرتے اور نہ ہی کنجوسی (احکام القرآن) الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا ، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان اموال کا نگران و محافظ بنایا ہے، اس لیے انہیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جانے نہ دو جو ان کے ضیاع کا سبب بن جائیں۔

آیت کریمہ میں مال کی تعریف کی گئی ہے، بہترین مال نیک آدمی کا مال ہے، اسلاف تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ مال مومن کا ہتھیار ہے، وہ کہتے تھے کہ اگر میں مال چھوڑ کر جاؤں جس پر اللہ تعالیٰ میرا محاسبہ کرے یہ بہتر ہے اس بات سے کہ میں لوگوں کا محتاج بن جاؤں، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیوی واخروی مصالح مال کے بغیر حاصل نہیں کیے جاسکتے، مال ہی کے ذریعے منافع حاصل کیے جاسکتے ہیں اور مضرتوں و نقصانات کو دور کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مال کے لیے خیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے فضول میں مال اڑانے سے ممانعت کی ہے، فضول میں مال اڑانے والوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا ہے۔

وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ: یعنی انہیں ان اموال میں سے کھلاؤ اس لیے کہ یہاں حرف، فی، حرف ''من'' کے معنی میں ہے اس لیے کہ حروف پر آگے پیچھے صفات کا ورود ہوتا رہتا ہے جس کی بناپر بعض حروف بعض دوسرے حروف کے قائمقام ہو کر ان کے معنی دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ میں معنی ، مع اموالکم، کے ہیں، یعنی ان کے اموال اپنے اموال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اموال کو بے وقوفوں کے حوالے کر دینے سے روک دیا ہے جو ان اموال کی حفاظت کا کام سرانجام نہیں دے سکتے اور یہ حکم دیا کہ ہم انہیں ان اموال میں سے ان کی خوراک اور لباس کا بندوبست کریں، اگر آیت سے مراد ہمیں اپنے اموال انہیں حوالے کرنے سے روکنا ہے جیسا کہ آیت کا ظاہر اس کا مقتضی ہے تو پھر اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اپنی بیوی اور نادان اولاد اور بیویوں کا نان و نفقہ ہم پر واجب ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہمیں حکم ہے کہ ہم ان پر اپنے اموال میں سے خرچ کریں۔

اگر آیت کی تاویل وہ ہے جسے ان لوگوں نے اختیار کیا ہے جن کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ بات ہے کہ ہم ان کے اموال اس وقت تک ان کے حوالے نہ کریں جب تک ان میں سفاہت کی

صفت موجود ہو تو پھر اس صورت میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کے اموال میں سے ان پر خرچ کریں، یہ بات دو وجوہ سے ایسے لوگوں پر پابندی پر دلالت کرتی ہے اول یہ کہ انہیں ان کے اموال سے دور رکھا گیا ہے دوم ان پر خرچ کرنے اور ان کی خوراک اور لباس کی خریداری کے سلسلے میں ہمیں ان کے اموال میں تصرف کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا: ان سے بھلی بات کہو) مجاہد اور ابن جریج کا قول ہے کہ **قَوْلًا مَّعْرُوفًا** سے مراد نیکی اور صلہ رحمی کرنے کے لیے موزوں اور جائز طریقے پر ان سے مناسب الفاظ میں وعدہ کر لینا ہے، اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد بھلے الفاظ میں ان سے گفتگو کرنا اور اس کے لیے نرم لہجہ اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ قول باری ہے **فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ** اور تم یتیم پر سختی نہ کرو، یا جس طرح یہ قول باری ہے **وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا**، اگر تمہیں ان سے پہلو تہی کرنا پڑے اس انتظار میں کہ تیرے پروردگار کی طرف سے وہ کشایش آئے جس کی تمہیں اُمید ہو تو ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔

ایک قول یہ بھی ہے یہاں، قول معروف سے تادیب وتنبیہ نیز راست رَوی اور نیکی کی بدایت اور اخلاق حسنہ کے حصول کی راہنمائی مراد لینا بھی جائز ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد ہمیں یہ نصیحت کرنا ہے کہ تم ان کے لیے اپنے اموال میں سے خوراک وپوشاک کے اخراجات ادا کرو تو اس موقع پر ان سے بھلے اور مناسب الفاظ میں گفتگو کرو اور انہیں اپنی بیزاری کا اظہار کر کے نیز انہیں ذلیل کر کے اور نظروں سے گرا کر ان کی ایذا رسانی نہ کرو جیسا کہ ارشاد باری ہے **وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا**، اور جب تقسیم ترکہ کے وقت رشتہ دار، یتیم اور مساکین آجائیں تو انہیں بھی اس میں سے کچھ حصہ دو اور ان سے عمدہ انداز میں گفتگو کرو، یعنی مناسب الفاظ میں گفتگو اور اظہار بیزاری اور احسان جتانے سے پرہیز نیز یہ قول باری بھی ہے **لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ** اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر برباد نہ کرو، یہ بھی درست ہے کہ مذکورہ بالا تمام معانی آیت **وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا** میں مراد ہوں۔ (احکام القرآن للجصاص) یتیم کے مال کا نگران

اور نگہبان عمدہ الفاظ ادا کرے، جس سے یتیم کا دل خوش ہو جائے، ولی اسے جتائے کہ تمہارا مال میرے پاس ہے، میں اس کا نگران اور امین ہوں، جب تم بالغ اور سمجھدار ہو جاؤ گے تو میں تمہارا مال تمہارے سپرد کر دوں گا۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ: علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ " بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثابت بن رفاعہ اور اس کے چچا کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ اس طرح ہے کہ رفاعہ فوت ہوا اور اس نے اپنا چھوٹا بچہ چھوڑا تو ثابت کا چچا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میرے بھائی کا بیٹا یتیم ہے وہ میری پرورش میں ہے اس کے مال سے میرے لیے کیا حلال ہے اور میں اسے کب مال دے دوں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (الجامع لاحکام القرآن)

یہاں اللہ تعالیٰ اس وقت کی تعیین فرما رہے ہیں کہ یتیم کے اولیاء، اوصیاء کس وقت اس کا مال اس کے سپرد کریں، اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ایک نکاح کی عمر کو پہنچنا اور دوسرا اس میں رشد و سمجھ بوجھ کا معلوم کرنا، ان دونوں باتوں کا جانچنا ضروری ہے تاکہ ان کا مال ان کے سپرد کرنا جائز ہو جائے، فرمایا کہ تمہارے پاس جو یتیم ہیں ان کے حالات کی ٹوہ لگاتے رہو، ان کی آزمائش کرتے رہو، کیا وہ اپنے مالوں کو سنبھال سکتے ہیں، مال ان کے سپرد کیا جائے تو کیا وہ اسے اچھے طریقے سے خرچ کر سکتے ہیں، نکاح کی عمر کو پہنچنے تک ان کو آزماتے رہو، یعنی بالغ ہونے کی عمر تک ان کو پرکھتے رہو، کیونکہ یہی وہ عمر ہے جس میں وہ نکاح کر سکتا ہے۔

بلوغ کی پانچ نشانیاں ہیں، ان میں تین نشانیاں لڑکی اور لڑکے دونوں میں مشترک ہیں، ان میں ایک احتلام، دوسری مخصوص عمر، تیسری زیر ناف بالوں کا اگنا، ان میں دو صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، ایک حیض ہے اور دوسری حاملہ ہونا ہے، اس میں علماء کے مابین صرف عمر کے بارے میں اختلاف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بلوغ کی عمر پندرہ سال ہے، یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے، احناف رحمہم اللہ کے نزدیک اسی پر فتویٰ ہے، یہ اکثر اہل علم کا قول ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بلوغ کی عمر سترہ سال ہے۔ (تفسیر کبیر، المقتطف فی عیون التفاسیر)

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک لڑکے کے لیے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لیے سترہ سال بلوغت کا معیار ہے جمہور کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی عمر جنگ اُحد میں چودہ سال تھی وہ جہاد کے لیے آئے تو آپ نے قبول نہیں کیا اور ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں جنگ خندق میں پیش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا۔ (شامی) اور لڑکے کے بلوغ کے لیے کم از کم عمر بارہ سال ہے اور لڑکی کی نو سال عمر ہے، اگر وہ اس عمر میں بلوغ کا دعویٰ کریں اور مشاہدہ ان کے دعویٰ کی تکذیب نہ کرے تو ان کے دعویٰ کو مان لیا جائے گا۔ (در مختار مع رد المختار ج ۵)

فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ: اٰنَسْتُمْ تم دیکھو، تم پرکھو، تم پہچانو، مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنستم کا معنیٰ تم محسوس کرو۔ رُشْدًا وہ سمجھ بوجھ کی عمر جس میں اسے مال خرچ کرنے اور مال کو نقصان وافتاد سے بچانے کا پتہ ہو۔ **فَادْفَعُوْا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ**، ایسی عمر کو پہنچ جائے تو اب ان کے مال ان کے سپرد کرنے میں تاخیر نہ کی جائے، امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک اس میں رشد اور سوجھ بوجھ کا پتہ نہ چلے تب تک مال بالکل اس کے حوالے نہ کیا جائے۔

وَلَا تَأْكُلُوْهَآ إِسْرَافًا وَّبِدَارًا أَنْ يَّكْبَرُوْا: یتیموں کے مالوں کو فضول خرچی کر کے نہ کھاجاؤ اور اس ڈر سے نہ اڑادو کہ یہ بڑا ہو جائے گا تو اپنا مال مانگ لے گا اور ضابطہ کے مطابق اس کو دینا پڑے گا یہ سوچ کر اس کے بالغ ہونے سے پہلے ہی اپنی ذات یا اپنی اولاد پر یا احباب و اصحاب پر خرچ نہ کر ڈالو۔ اس لیے عجلت نہ کرو کہ یتیم سمجھدار ہو کر ہم سے اپنا مال وصول کر لیں گے، اس لیے ان کے سمجھدار ہونے سے پہلے پہلے جیسے چاہیں ان کا مال اڑائیں۔ اسراف: مالی امور یا دنیوی امور میں میانہ روی سے نکلنے کو کہا جاتا ہے، سرف المال (فضول خرچی) مال کو اس جگہ پر خرچ کرنا جہاں کوئی منفعت نہ ہو اگرچہ مال تھوڑا سا ہی کیوں نہ خرچ کیا جائے، حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ کی نافرمانی میں ایک درہم بھی خرچ کرنے سے آپ مسرف (فضول خرچ) ہوں گے، ایک آدمی کے پاس جبل ابی قبیس (مکے کا پہاڑ) کی مانند مال ہو وہ اسے اللہ کی اطاعت میں خرچ کرے تو وہ مسرف (فضول خرچ) نہیں

ہو گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھانے پینے میں شکم سیری سے منع فرمایا کیونکہ شکم سیری جسم کو خراب کر دیتی ہے، بیماریاں پیدا کرتی ہے، نماز میں سستی لاتی ہے، کھانے اور پینے دونوں میں میانہ روی اختیار کرو، کھانے پینے میں میانہ روی جسم کو درست رکھتی ہے، فضول خرچی سے دور رہو، آدمی اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتا جب تک وہ اپنی شہوت کو اپنے دین پر ترجیح نہ دے، طبیب عرب ابن کلدہ کا کہنا ہے کہ معدہ بیماریوں کا گھر ہے، پرہیز ساری دواؤں کی جڑ ہے، ہر بدن کو وہ چیز دو جس کا وہ عادی ہے۔ (ابو نعیم) بِدَارًا مبادرت کرنا، ایک دوسرے سے آگے بڑھنا، باب مفاعلہ ہے، یتیم کے اولیاء اور اوصیاء اس جلدی میں ہیں کہ کہیں یتیم بڑا اور سمجھدار نہ ہو جائے، اس لیے اس مال کو خرچ کیے جائیں اور یتیم اس جلدی میں ہے کہ میں اولیاء اور اولیاء سے یہ مال وصول کروں۔ بدار اس طرح سمیٹنے کو کہتے ہیں کہ برتن بالکل بھر جائے اور اس میں ڈالی جانے والی چیز کناروں سے نیچے گرنے لگے۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ: جو اولیاء یتیموں کے مالوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں ان میں جو لوگ صاحب حیثیت ہیں، وہ ان یتیموں کے مالوں میں سے نہ کھائیں، جو کچھ رب تعالیٰ نے اسے عطا فرما رکھا ہے وہ اسی پر راضی رہے اور اسی پر قناعت کرتا رہے، ایسا وہ یتیم پر شفقت کرتے ہوئے اور اس کے مال کی حفاظت و بقاء کے لیے کرتا رہے۔

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ: جو اولیاء یتیموں کے مالوں کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتے ہیں ان کے لیے حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ محتاج و ضرورت مند ہوں وہ مناسب طریقے پر ان کے مال میں سے کھا سکتے ہیں، اس کے بارے میں علامہ آلوسی نے روح المعانی میں تین قول لکھے ہیں اول یہ کہ پہلے ضرورت مند ولی کو یتیم کے مال سے کھانے کی اجازت تھی بعد میں آیت کریمہ **إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ** نے اس کو منسوخ کر دیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یتیم کا ولی جو تنگدست ہو بطور قرض بقدر ضرورت اس کے مال سے کھا سکتا ہے جب مال ہاتھ میں آجائے تو ادائیگی کر دے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد اور حضرت ابو العالیہ اور حضرت عبیدہ سلمانی اور حضرت باقر رحمہم اللہ کا قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یتیم کا ولی جو ضرورت مند ہو اس کے مال کی نگرانی اور متعلقہ امور ضروریہ کی مشغولیت کے عوض بطور اجرت اس میں سے کھا سکتا ہے، مگر یہ کھانا بالمعروف یعنی مناسب طریقہ پر ہو مثلاً ایک یتیم ہے اس کے باپ نے جائیداد چھوڑی ہے بہت دکانیں ہیں، مکان ہیں، کھیتیاں ہیں، باغات ہیں ان کی دیکھ بھال کرنے، کرائے وصول کرنے اور محکموں میں جانے، مزدوروں کسانوں کو تلاش کرنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے اس دوڑ دھوپ محنت و کوشش کے عوض وہ شخص کھا سکتا ہے جو ان کاموں میں لگا ہوا ہے اور یہ کھانا بھی بالمعروف یعنی مناسب طریقے پر ہو، اس میں یتیم کی ہمدردی کا پورا پورا لحاظ رہے مال اڑانے کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

اس سے زیادہ نہ لے جتنا اور کسی شخص کو اس کی اجرت دینا گوارا ہوتا اور یہ بھی دیکھ لیں کہ ہم اپنے کام کے لیے کرتے تو کتنا خرچ ہوتا، ایسا نہ کریں کہ یتیم کے مال کی نگہداشت کرنے کے سلسلہ میں سفر میں جائیں تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہر کر بے تحاشا مال خرچ کر دیں اور اپنی ضرورت سے اسی شہر میں جائیں تو معمولی سے کرائے کی جگہ لیں اور معمولی سا کھانا کھا کر گزار لیں، اصولی بات یہ ہے جو اپنے لیے پسند کریں وہی یتیم کے لیے پسند کریں۔ (انوار البیان)

فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ: قرآن کریم میں بیان کی گئی شرائط کے پورا ہونے پر جب اولیاء اور اوصیاءِ یتیم اس کا مال اس کے سپرد کریں تو اس پر کچھ گواہی بھی کر لیں کہ یتیم نے اولیاء اور اوصیاء سے اپنا مال قبضے میں لے لیا ہے کیونکہ ایسا کرنا یہ تہمت سے بچنے کے لیے ضروری ہے اور بعد میں لڑائی جھگڑوں سے بچنے کے لیے لازمی ہے۔

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا: اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لیے کافی ہے، اس لفظ میں بہت جامعیت ہے جو بھی ولی یا وصی یتیم کے مال کی نگرانی کرے گا اور اس سلسلہ میں غلط طریقہ اختیار کرے گا مثلاً حساب غلط لکھے گا، کسی حاکم کو رشوت دے کر غلط فیصلہ کرائے گا، یا یتیم بالغ ہو کر مال لینے کے بعد وصول کرنے سے انکاری ہو جائے گا یا جتنا مال ملا ہے اس کی مقدار کم ظاہر کرے گا (غرض جس جانب سے بھی غبن یا خیانت ہو) تو وہ دنیا کی ظاہری کاغذی کارروائی کے ذریعہ مطمئن نہ ہو جائے اس کے پیش نظر رہے کہ یوم آخرت بھی سامنے ہے اللہ جل شانہٗ حساب لینے والا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے وہاں کے حساب میں

صحیح اترنا چاہیے۔ (انوار البیان) جب اللہ حساب لینے والا کافی ہے تو تم اوامر خداوندی کی مخالفت نہ کرو، جو حدود تمہارے لیے متعین کی گئی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ حسیب محاسب یا کافی کے معنیٰ میں ہے، ابن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر کوئی شاہد نہیں ہے۔

والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے مالوں میں حق میراث

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا {۷} وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا {۸} وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۪ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا {۹} اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا {۱۰} النساء

جواب ترجمہ: مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو تھوڑا ہو یا بہت یہ حصہ مقرر ہے۔ اور جب تقسیم کرنے کے موقع پر رشتہ دار اور یتیم اور مسکین حاضر ہو جائیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دے دو اور ان سے اچھے طریقہ پر بات کرو۔ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو (ایسی حالت میں ہوں کہ) اپنے بعد ننھے ننھے بچے چھوڑ جائیں گے اور ان کو ان کی نسبت خوف ہو (کہ ان کے مرنے کے بعد ان بیچاروں کا کیا حال ہو گا) پس چاہیے کہ یہ لوگ خدا سے ڈریں اور معقول بات کہیں۔ بیشک جو لوگ ظلم کے طریقے پر یتیموں کا مال کھاتے ہیں بات یہی ہے کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

شان نزول: مفسرین کا قول ہے کہ اوس بن ثابت انصاری وفات پا گئے اور اپنے پیچھے بیوی جس کا اُمّ حُجہ تھا اور تین بیٹیاں چھوڑ دیں، دو شخص کھڑے ہو گئے جو متوفی کے چچازاد بھائی اور اس کے وصی

تھے، ان دو کا نام سوید اور عرفجہ تھا، انہوں نے متوفّی کا سارا مال لے لیا، متوفّی کی بیوی اور اس کی بیٹیوں کو کچھ نہ دیا، دور جاہلیت میں عورتوں کو وارث نہیں بنایا جاتا تھا اور نہ چھوٹے بچے کو وارث بنایا جاتا تھا خواہ وہ مرد ہی کیوں نہ ہو، وارث صرف بالغ مردوں کو بنایا جاتا تھا، کہا جاتا تھا کہ اس کے سوا کسی کو کچھ نہیں دیا جاسکتا، جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر لڑے اور مال غنیمت حاصل کرے۔

اُمّ حُجہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اس نے آپ ﷺ سے کہا کہ یارسول اللہ! اوس بن ثابت فوت ہو گیا اور میرے سر پر تین بیٹیاں چھوڑ گیا، میں اس کی بیوہ ہوں، میرے پاس ان بچیوں پر خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، ان بچیوں کا باپ اچھا خاصا مال چھوڑ کر مرا ہے اور وہ مال سوید اور عرفجہ کے پاس ہے، انہوں نے مجھے اور ان کی بیٹیوں کو اس مال میں سے کچھ بھی نہیں دیا، یہ بچیاں میرے زیر کفالت ہیں، یہ دو شخص نہ تو مجھے کھانے پینے کو کچھ دیتے ہیں اور نہ بچیوں کو کچھ دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو بلوایا ان دونوں نے کہا کہ یارسول اللہ! اس عورت کا کوئی بچہ نہ گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بوجھ اٹھا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دشمن کو زک پہنچا سکتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اب چلے جاؤ، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ مجھے ان کے بارے میں کیسی ہدایت دیتا ہے چنانچہ وہ چلے گئے اس کے بعد اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ: مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، یہاں سے مواریث کے احکام شروع ہو رہے ہیں، مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں" اسلام سے پہلے عرب اور عجم کی قوموں میں انسان کی صنف ضعیف، یتیم بچے اور صنف نازک عورتیں ہمیشہ طرح طرح کے ظلم و ستم کا شکار رہے ہیں، اوّل تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا، اسلام نے سب سے پہلے ان کو حقوق دلائے پھر ان حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا، قانون وراثت میں بھی عام اقوام دنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔ عرب نے تو اصول ہی یہ بنالیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو

گھوڑے پر سوار ہو اور دشمنوں کا مقابلہ کر کے اس کا مال غنیمت جمع کرے (روح المعانی ص ۱۲ ج ۴) ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنف ضعیف بچے اور عورتیں اس اصول پر نہیں آسکتیں، اس لیے ان کے اُصول وراثت کی رو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہو سکتا تھا، لڑکی مطلقاً وارث نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی مستحق وراثت نہ تھا۔ (معارف القرآن)

والدین بھی اگرچہ اقربین میں داخل تھے، مگر مستقلاً والدین کے ذکر کی دو وجہیں ہیں ایک تو والدین کی اہمیت دکھانی مقصود ہے دوسری یہ کہ والد کے ترکہ کی تقسیم کے متعلق (اصل میں) آیت کا نزول ہوا تھا۔ (مظہری)

یہ آیت مبارکہ اس خاص واقعہ کے بعد نازل ہوئی جس کا تذکرہ شان نزول کے زیر عنوان کیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے یہ واقعہ سننے کے بعد توقف فرمایا تھا، پھر یہ آیت نازل ہوئی تھی، جس میں وارثوں کے لیے وراثت کا قانون نازل کیا گیا، اس کے بعد دوسری آیت وراثت نازل ہوئی، جس میں حصہ داروں کے حصوں کی تفصیل بیان کی گئی، آنے والی آیات میں وراثت کے احکامات تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔

حضور اقدس ﷺ نے احکام قرآنی کے مطابق کل ترکہ کا آٹھواں حصہ بیوی کو دے کر بایں طور پر سب مال مرحوم کے لڑکے اور لڑکیوں کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ اس کا آدھا لڑکے کو اور آدھے میں دونوں لڑکیاں برابر کی شریک رہیں اور چچازاد بھائی بمقابلہ اولاد کے چونکہ اقرب نہ تھے اس لیے ان کو محروم کیا گیا۔ (روح المعانی، معارف القرآن)

استحقاق میراث کا ضابطہ: مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ استحقاق میراث کا ضابطہ کے زیر عنوان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں "اس آیت نے وراثت کے چند احکام کے ضمن میں قانون وراثت کا ضابطہ بیان فرما دیا ہے۔ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ان دو لفظوں نے وراثت کے دو بنیادی اصول بتلا دیئے، ایک رشتہ ولادت، جو اولاد اور ماں باپ کے درمیان ہے اور جس کو لفظ وَالِدٰنِ سے بیان کیا گیا ہے دوسرے عام رشتہ داری جو لفظ اَقْرَبُوْن کا مفہوم ہے، اور صحیح یہ ہے کہ لفظ اَقْرَبُوْن ہر قسم کی قرابت اور رشتہ

داری کو حاوی ہے، خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو جیسے اولاد اور ماں باپ میں، یا دوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رشتوں میں یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوئے ہیں، لفظ اَقْرَبُوْن سب پر حاوی ہے، لیکن والدین کو ان کی اہمیت کی وجہ سے بطور خاص جدا کر دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہ بھی بتلا دیا کہ مطلق رشتہ داری وراثت کے لیے کافی نہیں، بلکہ رشتہ میں اقرب ہونا شرط ہے، کیونکہ اگر اقربیت کو معیاری شرط نہ بنایا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت پوری دنیا کی تمام انسانی آبادی پر تقسیم کرنا ضروری ہو جائے گا، کیونکہ سب ایک ماں باپ آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، دور قریب کا کچھ نہ کچھ رشتہ سب میں موجود ہے اور یہ اول تو امکان سے باہر ہے، دوسرے اگر کسی طرح کوشش کر کے اس کا انتظام کر بھی لیا جائے تو متروکہ مال جزء لایتجزی بن کر ہی تقسیم ہو سکے گا جو کسی کے کام نہ آئے گا، اس لیے ضروری ہوا کہ جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہو تو اصول یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک و دور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو حصہ نہ دیا جائے، ہاں اگر کچھ رشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اقرب قرار دیئے جائیں، اگرچہ وجوہ اقربیت ان میں مختلف ہوں تو پھر یہ سب مستحق وراثت ہوں گے جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ کہ یہ سب اقرب ہیں اگرچہ اقربیت کی وجوہ مختلف ہیں۔

نیز ایک اور بات اسی لفظ اَقْرَبُوْن نے یہ بتلائی کہ جس طرح مردوں کو مستحق وراثت سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ رشتہ اولاد کا یا ماں باپ کا ہو، یا دوسری قسم کے رشتے ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہے، جس طرح لڑکا ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح لڑکی بھی انہی سے پیدا ہوئی ہے جب حق وراثت کا مدار رشتہ پر ہوا تو چھوٹے بچے یا لڑکی کو محروم کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

پھر قرآن کریم کے اسلوب کو دیکھئے کہ للرجال والنساء کو جمع کر کے مختصر لفظوں میں ان کے حق کا بیان ہو سکتا تھا، اس کو اختیار نہیں کیا، بلکہ مردوں کے حق کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے اسی تفصیل و تشریح کے ساتھ عورتوں کا حق جداگانہ بیان فرمایا، تاکہ دونوں کے حقوق کا مستقل اور اہم ہونا واضح ہو جائے۔

نیز اسی لفظ اَقْرَبُوْن سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لیے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہو گا وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہو گا، اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنالیا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کر سکتا ہے، کیونکہ اقربیت کے علاوہ دوسرا معیار لامحالہ وقتی اجتہادی ہو گا، کیونکہ فقر و حاجت کوئی دائمی چیز نہیں، اس لیے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں درجات بھی ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعویدار نکل آیا کریں گے اور فیصلہ کرنے والوں کو ان کا فیصلہ مشکل ہو گا۔ (معارف القرآن)

مفسر قرآن صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "زمانہ جاہلیت میں دیگر معاشرتی قوانین کی طرح وراثت کے متعلق بھی کوئی مستقل قانون نہیں تھا، جو طریقہ رائج ہو گیا، اسی کے مطابق نسل در نسل عمل ہوتا رہتا تھا، وراثت کے متعلق مروجہ دستور یہ تھا کہ مرنے والے کے بیوی بچوں میں سے نہ تو بیوہ کو کچھ ملتا تھا اور نہ نابالغ بچوں کو دیا جاتا تھا اگر مرنے والے کا کوئی جوان بیٹا ہوتا تو ساری وراثت کا حق دار وہی سمجھا جاتا اور باقی بیوی بچے محروم رہ جاتے، وہ لوگ باپ کی وراثت کا حق دار اس بیٹے کو سمجھتے تھے جو لڑائی میں حصہ لینے کے قابل ہو، تیر، تلوار یا نیزہ چلا سکتا ہو دشمن پر حملہ آور ہو سکتا ہو اور اپنا دفاع بھی کر سکتا ہو، چھوٹے بچے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لہٰذا انہیں ترکے میں سے کچھ نہیں ملتا تھا، تقریباً اسی قسم کا قانون ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے وہ بھی بڑے بیٹے کو ہی وارث بناتے ہیں، انگریزوں میں بھی کم و بیش یہی قانون رائج ہے، مگر ایسے تمام قوانین غلط اور ظالمانہ ہیں جن میں ساری اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک نہ کیا گیا ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے وراثت کا وہ قانون نازل فرمایا جو حق و انصاف پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ (معالم العرفان)

قانون وراثت میں استثناء: کون سے لوگ وارث نہیں بن سکتے اور کن کی وراثت جاری نہیں ہوتی، اس سلسلہ میں چند استثنائی صورتیں بیان کی گئی ہیں، صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں"

البتہ بعض استثناء ہیں جن میں حقیقی اولاد بھی وراثت سے حصہ نہیں لے سکتی، سب سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کی ذات گرامی ہے، حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَآءِ لَانُوْرِثُ مَاتَرَکْنَا صَدَقَۃٌ یعنی ہم انبیاء کی جماعت مورث (جن کی وراثت تقسیم کی جائے) نہیں بنا کرتے، یعنی ہماری وراثت کسی کو نہیں ملتی، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ غربا اور مساکین کے لیے صدقہ ہوتا ہے، گویا ایک تو پیغمبر کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، ہاں پیغمبر اپنے باپ کی وراثت سے حصہ لے سکتا ہے بشرطیکہ باپ خود پیغمبر نہ ہو، وراثت میں دوسرا استثنا یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وراثت تقسیم نہیں ہوتی، لَایَرِثُ الْمُسْلِمُ لِلْکَافِرِ وَلَا الْکَافِرُ لِلْمُسْلِمِ یعنی نہ مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کی وراثت میں سے حصہ لے سکتا ہے، اگر باپ مسلمان ہے اور بیٹا عیسائی، مرزائی یا کسی طرح مرتد ہو گیا ہے تو وہ باپ کی وراثت سے محروم ہو گیا ہے اسی طرح بیٹا مسلمان ہے اور باپ کافر ہے تو پھر بیٹا کافر باپ کی وراثت نہیں لے سکتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمان تھے مگر ان کے دو دوسرے بھائی کافر تھے، باپ کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کافر باپ کی جائیداد سے حصہ لینے کے مجاز نہیں لہٰذا باپ کا مکان کافر بھائیوں طالب اور عقیل نے لے لیا، اگرچہ بعد میں فتح مکہ کے موقع پر عقیل بھی مسلمان ہو گئے تھے تاہم یہ طے شدہ قانون شریعت ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان وراثت نہیں چلتی، یہ دوسری استثنا ہے۔

تیسری استثناء یہ ہے کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں بن سکتا، بیٹا باپ کو قتل کر دے یا بھتیجا ایسے چچا کو قتل کر دے جس کی وراثت اس کو پہنچ سکتی تھی تو اس قتل کی وجہ سے وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہو جائے گا اسی طرح آزاد اور غلام کے درمیان بھی وراثت نہیں چلتی، باپ بیٹے میں سے کوئی بھی غلام ہے، تو اس کی وراثت آزاد بیٹے یا آزاد باپ کو نہیں ملے گی، آزاد آدمی کی وراثت کا حقدار اس کا آزاد وارث ہی ہو سکتا ہے۔ (معالم العرفان)

وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ: اور عورتوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو ان کے ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا، جو کچھ ان کے والدین نے، بھائیوں نے، چچاؤں

نے چھوڑا ہے، ان کی موت کے بعد عورتوں کو ان کا حصہ دیا جائے، یہ زمانہ جاہلیت کے اس ظالمانہ دستور کے بالکل برخلاف ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت کے لوگ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے، قرآن کریم میں یہاں رجال (مردوں) کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں چھوٹے بڑے سارے مرد شامل ہیں، اسی طرح یہاں نساء (عورتوں) سے مراد مطلقاً ہے خواہ چھوٹی عمر کی ہوں یا بڑی عمر کی ہوں، سب کو میراث میں سے مقرر شدہ حصہ دیا جائے گا، زمانہ جاہلیت میں عورتیں حقوق میراث سے محروم قرار دی جاتیں، عرب کہتے تھے، میراث کا وہ حق دار ہے جو میدان جنگ میں قومی عزت کے لیے لڑے اور مال غنیمت جمع کرے، عورتیں ہرگز اس کی مستحق نہیں، موجودہ کتب مذہبی بھی تقریباً تمام عورتوں کو حقوق میراث سے محروم رکھتی ہیں، قرآن مجید نے بیان کیا کہ عورتیں بھی اسی طرح حق دار ہیں جس طرح مرد، اس لیے کہ فطرت نے سوا جنسی عوارض ولوازم کے عورت اور مرد میں اور کوئی تقسیم جائز نہیں رکھی، تمام عورتیں نفس انسانیت میں مرد کے برابر ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ انہیں اس انسانی حق سے محروم رکھا جائے، وہ مذاہب جو عورت کے اس طبعی وفطری حق کے حامی نہیں وہ کس منہ سے اس کے احترام کا دعوی کرسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سوا اور کسی مذہب نے مرد اور عورت کے صحیح معنوں کو نہیں سمجھا۔ (سراج البیان)

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ: یہاں یہ بتایا گیا کہ میت کا متروکہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اسے وارثوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، یہ نہ سوچا جائے کہ مال تھوڑا ہے یہ کیسے اور کیونکر تقسیم کیا جائے اور کیسے تقسیم ہو سکتا ہے؟ **قَلَّ اَوْ كَثُرَ** (تھوڑا یا زیادہ) کی قید ایک وہم کو دور کرنے کے لیے لائی گئی ہے، جیسے آلات حرب (لڑائی کے ہتھیار) مردوں کے لیے خاص ہیں، یہاں یہ بتایا کہ سب مال سب میں حصہ کے مطابق تقسیم ہو گا۔

نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وراثت کے ذریعے جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا، تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہو چکا، یہ دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دوسرے کو ہبہ کر دے

یا بیچ ڈالے یا تقسیم کر دے۔ (روح القرآن)

شیخ ابو بکر رازی الجصاص الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا کا مطلب معلوم و مقرر حصہ ہے۔ (واللہ اعلم) کہا گیا ہے کہ فرض کے اصل معنی نشان اور علامت کے طور پر جوئے کے تیروں میں سوراخ کر دینے کے ہیں تاکہ اس کی وجہ سے وہ دوسرے تیروں سے الگ رہیں، الفرضۃ، اس علامت کو کہتے ہیں جو گھاٹ یا چشمے پر پانی کے حصے میں لگادی جاتی ہے، تاکہ اس کے ذریعے ہر حقدار پانی میں اپنا حصہ معلوم کرلے، فرض کے یہ لغوی معنی ہیں پھر شریعت میں معلوم اور مقرر مقداروں یا ثابت اور لازم امور پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا، ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے اصل معنی ثبوت کے ہیں، اس بنا پر کمان کے سرے پر جو شگاف ہوتا ہے، اسے فرض کہا جاتا ہے اس لیے کہ یہ شگاف باقی رہتا ہے۔

شریعت میں فرض ان ہی دو معنوں میں بٹا ہوا ہے، جب اس لفظ سے وجوب مراد لیا جائے گا، تو اس صورت میں مفروض یعنی فرض شدہ امر ایجاب کے سب سے اُونچے درجے پر ہوگا، شریعت میں فرض اور واجب کے معنوں میں بہت وجوہ کی بناء پر اہل علم کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ ہر مفروض اس لحاظ سے واجب ہوتا ہے کہ فرض اس کا مقتضی تھا کہ اس کا کوئی فرض کرنے والا نیز کوئی موجب موجود ہو، واجب کی یہ حیثیت نہیں ہے کیونکہ یہ بعض دفعہ خود بخود واجب ہو جاتا ہے اور اس کا موجب موجود نہیں ہوتا۔ (احکام القرآن للجصاص)

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ: اور جب ترکہ کی تقسیم کی موقع پر رشتہ دار، یتیم اور مساکین بھی آجائیں تو انہیں بھی اس میں سے کوئی حصہ دو، سعید بن المسیب، ابو مالک اور ابو صالح رحمہم اللہ کا قول ہے کہ یہ حکم آیت میراث کی وجہ سے منسوخ ہو چکا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطاء، حسن، شعبی، ابراہیم، مجاہد، اور زھری رحمہم اللہ کا قول ہے کہ یہ محکم ہے یعنی منسوخ نہیں ہوئی، عطیہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت، یہ بات آیت میراث کے نزول سے پہلے کی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے آیت میراث میں

فرائض نازل فرما کر ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا اور مرنے والا اگر کسی کو کچھ دینے کے لیے کہہ جائے تو اسے صدقہ قرار دیا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ میراث تقسیم کرتے وقت زیر بحث آیت میں مذکورہ حکم واجب تھا پھر آیت میراث کی بنا پر منسوخ ہو گیا، البتہ میت کی وصیت کی صورت میں آیت میں درج شدہ افراد کیلئے ترکہ میں حصہ بحال رکھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عکرمہ کی روایت کے مطابق آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ یہ میراث کی تقسیم کے متعلق ہے کہ تقسیم کے وقت مذکورہ بالا افراد کو بھی کچھ حصہ دے دیا جائے، اگر ترکہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو ان سے معذرت کر لی جائے۔ (احکام القرآن للجصاص) قرآن وحدیث کے دلائل سے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ تقسیم میراث کے وقت آیت میں مذکور موجود لوگوں کو کچھ دینا مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا: اور ان سے مناسب انداز میں بات کرو، تقسیم وراثت کے وقت دیگر رشتہ داروں کی موجودگی میں انہیں کچھ نہ کچھ دے دینا مستحب ہے، جب کہ زبان کی تیزی، دھتکارنا، کوئی اُلٹی سیدھی بات کرنا، کوئی دل شکستگی کی گفتگو کرنا جس سے رشتہ داروں میں صلہ رحمی کی بجائے ناچاقی، نااتفاقی، خفگی اور ناراضگی کی شکل پیدا ہو اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے، فرمایا کہ ان رشتہ داروں سے شیریں گفتگو کرو عمدہ طرز کلام اختیار کرو، دل جیتنے والی بات کرو، قول معروف (اچھی اور عمدہ وشیریں بات) اور معاف کر دینا یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد احسان جتلایا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے کہ جبکہ مال میں گنجائش نہ ہو تو اس صورت میں ان سے معذرت کر لی جائے۔ غیر وارث افراد سے کہا جائے گا کہ یہ ان لوگوں کا مال ہے جو یہاں موجود نہیں ہیں یا یہ یتیموں کا مال ہے جو ابھی نابالغ ہیں، اس مال میں اگرچہ آپ لوگوں کا

بھی حصہ بنتا ہے لیکن ہمیں اس میں سے آپ کو کچھ دینے کا اختیار نہیں ہے، غرض سعید بن جبیر کے نزدیک یہ بھی معذرت کی ایک صورت ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ: لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے، اس آیت کی تاویل میں سلف کے اندر اختلاف رائے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت کی بنا پر نیز سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، قتادہ، ضحاک، سدی کے قول کے مطابق اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی موت کا وقت قریب آجائے، اس کے پاس موجود لوگوں میں سے کوئی اس سے کہے، انہیں یعنی رشتہ داروں کو بھی کچھ دے جاؤ، ان کے ساتھ صلہ رحمی اور نیکی کرو، اگر یہ لوگ خود وصیت کرنے والے ہوتے تو اپنی اولاد کے لیے سب کچھ بچالینا زیادہ پسند کرتے۔

حبیب بن اَوس کہتے ہیں میں نے مقسم سے اس تفسیر کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تفسیر اس طرح نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی موت کا وقت آجائے، اس کے پاس موجود لوگوں میں سے کوئی اسے یہ مشورہ دے کہ، اللہ کا خوف کرو اور اپنا مال اپنے پاس رہنے دو کسی اور کو نہ دو، اگر مشورہ دینے والے خود اس کے رشتہ دار ہوتے تو انہیں یہ بات زیادہ پسند ہوتی کہ وہ ان کے متعلق وصیت کر جائے پہلے گروہ نے آیت کی یہ تاویل کی کہ اس قریب المرگ انسان کے پاس موجود لوگوں کو اسے وصیت پر اُبھارنے سے روک دیا گیا ہے جبکہ مقسم نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ آیت میں ترک وصیت کا مشورہ دینے والے کو اس قسم کے مشورے سے روک دیا گیا ہے، ایک اور روایت میں حسن کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو قریب الموت شخص اپنے مال کی تہائی سے زائد وصیت کا مشورہ دیتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور روایت کے مطابق یتیم کے مال کی سرپرستی اور حفاظت کے سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے مال میں وہی کچھ کریں اور اس

کے متعلق وہی کچھ کہیں جو وہ اپنی موت کے بعد پیچھے رہ جانے والے یتیموں اور بے بس اولاد کے مال میں کرنا اور کہنا پسند کرتے ہوں، یہاں یہ کہنا درست ہو گا کہ آیت کی سلف سے جتنی تاویلات مروی ہیں وہ سب مراد ہیں، البتہ ایک تاویل جس کی رو سے وصیت کا مشورہ اپنے سے روکا گیا ہے اس وقت درست ہو گی جب مشورہ دینے والے کا ارادہ ورثاء کو نقصان پہنچانے یا ان لوگوں کو محروم رکھنے کا ہو جن کے بارے میں مرنے والا وصیت کرنا چاہتا تھا یعنی مشورہ دینے والے کی یہ حرکت ایسی ہو کہ اگر وہ خود ان کی جگہ ہوتا تو اسے پسند نہ کرتا۔

وہ اس طرح کہ مرض موت میں مبتلا شخص کا مال بہت کم مقدار میں ہو اور اس کے ورثاء اس کے ورثاء اس کے بے بس اور کمزور اولاد ہو، اب یہ مشیر اسے مال کی پوری ایک تہائی کی وصیت کا مشورہ دے، حالانکہ اگر وہ خود اس کی جگہ ہوتا تو اپنے بے بس، ورثاء کے خیال سے کبھی ایسا کرنے پر رضامند نہ ہوتا، یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کسی شخص کے کمزور اور بے بس ورثاء ہوں اور اس کا مال بھی کوئی زیادہ نہ ہو تو اس کے لیے یہی مستحب ہے کہ کسی قسم کی وصیت نہ کرے اور سارا مال اپنے ورثاء کے لیے چھوڑ جائے اور اگر اسے وصیت کرنا ہی ہو تو تہائی سے کم کی وصیت کر جائے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے جب یہ عرض کیا تھا کہ میں اپنا مال وصیت میں دے دینا چاہتا ہوں تو آپ انہیں روکتے رہے، حتی کہ وہ تہائی مال پر آ گئے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ، اِنَّكَ اَنْ تَدَعَ وَرَثَتَكَ اَغنِيَآءَ خَيرٌ مِّن اَنْ تَدَعَهُمْ عَالَةً يَّتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ، تہائی ٹھیک ہے اور تہائی بھی بہت زیادہ ہے تم اگر اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں تنگدستی میں مبتلا کر جاؤ کہ پھر وہ اپنے گذارے کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھلاتے پھریں۔ (مشکوٰۃ، بخاری)

حضور ﷺ نے یہ واضح فرما دیا کہ ورثاء اگر غریب ہوں تو ایسی صورت میں ان کی خوشحالی کو مد نظر رکھتے ہوئے وصیت نہ کرنا وصیت کرنے سے افضل ہے، حسن بن زیاد نے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص مالدار ہو اس کے لیے افضل صورت یہی ہے کہ رضائے الٰہی کی خاطر اپنے تہائی

مال کی وصیت کر جائے اور جو شخص مال دار نہ ہو اس کے لیے افضل یہی ہے کہ کوئی وصیت نہ کرے بلکہ سارا مال اپنے ورثا کیلیے چھوڑ جائے۔ آیت کی تاویل میں حسن سے منقول روایت کے مطابق وصیت سے نہی کا حکم اس شخص کے لیے ہے جو مرنے والے کو تہائی سے زائد کی وصیت کر جانے کا مشورہ دے اس لیے کہ اسے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے (الثلث کثیر، تہائی بھی بہت زیادہ ہے) نیز آپ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تہائی سے زائد مال کی وصیت سے منع کر دیا تھا۔

فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا: وہ دوسروں کی سرپرستی کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں یعنی وہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کریں جو تقویٰ پر مبنی ہو جس میں ان لوگوں کی اہانت نہ ہو جو ان کی سرپرستی میں ہیں، ان کی دیکھ بھال کریں اور ان سے تقویٰ کا التزام کروائیں۔ (السعدی)

السدید کا معنی ہے عدل پر مبنی اور درست قول، یعنی مریض کو حکم دو کہ وہ اپنے مال سے واجبی حقوق ادا کرے پھر اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے اتنی مقدار وصیت کرے جس کی وجہ سے چھوٹے ورثاء کو نقصان نہ پہنچے، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے میت کو عدل پر مبنی قول کہو، وہ یہ ہے کہ اسے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی تلقین کرے اور اسے اس کے پڑھنے کا حکم نہ کرے، بلکہ آہستہ آہستہ خود پڑھے تاکہ وہ سن لے اور اسے تلقین کرے اس طرح نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اپنے قریب المرغ لوگوں کو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی تلقین کرو اور آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ انہیں کلمہ پڑھنے کا حکم دو، کیونکہ اگر اس کا اسے حکم دیا گیا تو ہو سکتا ہے وہ غصہ میں آجائے اور اس کا انکار کر دے، بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یتیم ہے یعنی اسے نہ جھڑکو اور نہ اسے حقیر سمجھو۔ (قرطبی)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا: شان نزول: یہ آیت غطفان قبیلے کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جسے مرثد بن زید کہتے تھے وہ اپنے کمسن بھتیجے کے مال کا ولی یعنی سرپرست تھا اس نے اس کا مال کھالیا تو اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

جمہور علماء نے کہا: اس سے مراد اوصیاء ہیں جو یتیم کے مال سے وہ کھاتے ہیں جو ان کے لیے مباح نہیں ہے، ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یہ ان کفار کے بارے میں نازل ہوئی جو عورتوں اور بچوں کو میراث

نہیں دیتے تھے، ہر اعتبار سے مال لینے کو کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ مقصود کھانا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر اشیاء کو تلف کیا جاتا ہے، ذکر میں پیٹ کو خاص کیا ہے ان کے نقص کو بیان کرنے کے لیے اور مکارم اخلاق کی ضد کے ساتھ اس پر طعن و تشنیع کی ہے، مآل اور انجام کے اعتبار سے کھائی گئی چیز کو آگ کہا گیا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی)

بعض علماء نے فرمایا: ناراً سے مراد حراماً ہے کیونکہ حرام کھانا آگ میں جانے کا سبب بنتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے حرام کو آگ کا نام دے دیا۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معراج کی رات کے متعلق بتایا کہ

رَأَيْتُ قَوْمًا لَهُمْ مَشَافِرُ كَمَشَافِرِ الْإِبِلِ وَقَدْ وُكِّلَ بِهِمْ مَنْ يَأْخُذُ بِمَشَافِرِهِمْ ثُمَّ يَجْعَلُ فِي أَفْوَاهِهِمْ صَخْرًا مِنْ نَارٍ يَخْرُجُ مِنْ أَسَافِلِهِمْ فَقُلْتُ يَا جِبْرِيلُ مَنْ هٰؤُلَاءِ قَالَ هُمُ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا (ابن ابی حاتم، ابن جریر، طبری، قرطبی)

میں نے ایک قوم دیکھی جن کے ہونٹ، اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے ان پر ایک فرشتہ معین تھا جو ان کو ہونٹوں سے پکڑتا تھا پھر ان کے مونہوں میں آگ کی چٹانیں ڈالتا تھا جو ان کے نیچے سے نکل جاتی تھیں، میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں۔

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَوْمٌ مِنْ قُبُورِهِمْ تَأَجَّجَ أَفْوَاهُهُمْ نَاراً قیامت کے دن ایسے لوگ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے جن کے مونہوں سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں۔ (امام طبرانی، ابن حبان)

حضرت سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ إِذَا قَامَ الرَّجُلُ يَأْكُلُ مَالَ الْيَتِيمِ ظُلْماً يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَهَبُ النَّارِ يَخْرُجُ مِن فِيهِ وَمِنْ مَسَامِعِهِ وَمِنْ أُذُنَيْهِ وَأَنْفِهِ

وَعَيْنَيْهِ يَعْرِفُهُ مَنْ رَآهُ بِآكِلِ مَالَ الْيَتِيْمِ جو شخص یتیم کا مال ظلماً کھاتا ہے جب وہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اس کے منہ، اس کے کانوں، اس کی ناک اور اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے اور اسے دیکھ کر ہر شخص پہچان لے گا کہ یہ یتیم کا مال کھانے والا ہے۔ (امام ابن جریر، امام ابن ابی حاتم)

تفسیر مدارک التنزیل میں روایت ہے کہ یتیم کا مال کھانے والا قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ دھواں اس کی قبر سے، اس کے منہ سے، اس کے کانوں سے نکل رہا ہو گا، لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں گے کہ یہ وہ شخص ہے جو دنیا میں یتیم کا مال کھایا کرتا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَرْبَعٌ حَقٌّ عَلَى اللهِ أَنْ لَّا يُدْخِلَهُمُ الْجَنَّةَ وَلَا يُذِيقُهُمْ نَعِيمَهَا: مُدْمِنُ الْخَمْرِ وَآكِلُ رِبًا وَآكِلُ مَالَ الْيَتِيْمِ بِغَيْرِ حَقٍّ وَالْعَاقُّ لِوَالِدَيْهِ اللہ پر حق ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل کرے نہ ان کو جنت کی نعمتیں چکھائے، عادی شرابی، سود کھانے والا، یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور ماں باپ کا نافرمان۔ (شعب الایمان للامام بیہقی، الدر المنثور ج ۲)

یہاں یتیم کا مال ظلماً کھانے پر وعید ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یتیم کا مال ظلماً نہیں کھایا جاتا بلکہ بوجہ استحقاق کے کھایا جاتا ہے، جیسے یتیم کے مال کی حفاظت و نگہبانی پر اٹھنے والے اخراجات، اُجرت، یا یتیم کا مال بطور قرض کے استعمال کیا، بعد میں ادا کیا گیا، یہ وہ صورتیں ہیں جن کو ظلماً کھانا نہیں کہا جا سکتا، اللہ تعالیٰ نے ان کی گنجائش دی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب و سنت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یتیم کا مال کھانا کبائر میں سے ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، ان سات چیزوں میں یتیم کا مال کھانے کا بھی ذکر فرمایا۔

وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا: اور انہیں جلد ہی ایک دہکتی آگ میں داخل ہونا ہو گا، وہ جلد ہی بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑیں گے، يَصْلَوْنَ یہ صَلِيَ سے ہے، الصلیٰ کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صَلِيَ بالنار اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی، یا وہ آگ میں جلا، صلی بکذا اسے فلاں چیز سے پالا پڑا، صلیت

الشاۃ میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مصلیۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: اصْلَوْهَا الْيَوْمَ،(یٰس ۶۴) آج اس میں داخل ہو جاؤ۔(مفردات القرآن) سعیر آگ کو کہتے ہیں،(مدارک التنزیل) السعیر کا معنی بھڑکنے والا انگارہ ہے۔(قرطبی) سعیر دہکتی آگ کو کہتے ہیں۔ (ابن ابی حاتم) سعیر جہنم کی ایک وادی ہے جس میں جہنم کی آگ جوش مارتی ہے۔(ابن ابی شیبہ)

حضرت عبید اللہ بن ابی جعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مَنْ أَكَلَ مَالَ الْيَتِيمِ فَإِنَّهُ يُؤْخَذُ بِمِشْفَرِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَمْلَأُ فَوْهُ جَمْراً فَيُقَالُ لَهُ كُلْ كَمَا أَكَلْتَهُ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ يُدْخَلُ السَّعِيرَ الْكُبْرَى (در منثور) جس شخص نے یتیم کا مال کھایا تو اس کو اس کے ہونٹوں سے پکڑا جائے گا اور اس کے منہ میں جلتے ہوئے انگارے بھر دیئے جائیں گے اور اس سے کہا جائے گا اسے بھی کھاؤ جیسے تو نے اس (یتیم کا مال) کو دنیا میں کھایا تھا پھر بڑی آگ میں اس کو داخل کر دیا جائے گا۔

اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عجیب کیفیت بن گئی تھی، اس آیت کا نزول ان پر بہت ہی شاق ہوا تھا، ان لوگوں نے یتیموں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان کے مالوں کو ہاتھ تک لگانا چھوڑ دیا تھا، اب یہ بات یتیموں پر بہت شاق گزری جس پر قرآن کریم میں یتیموں کی دلجوئی کے لیے یہ آیت اتاری گئی کہ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ اگر تم ان سے میل جول رکھو تو یہ تمہارے بھائی ہیں۔

قابل توجہ اہم اور ضروری مسائل: یہاں ایک بات قابل توجہ ہے ہمارے ہاں جب کوئی بندہ فوت ہو جاتا ہے تو اس کے مرنے کے بعد تیسرے دن، جمعرات، پھر چالیس دن بعد، پھر سال بعد گھر کے لوگ کھانے پینے کا اہتمام کرتے ہیں، اسے پنجابی میں تیجہ، ساتواں، چالیسواں اور برسی کا نام دیا جاتا ہے، اس موقع پر بلا مبالغہ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے اخراجات کیے جاتے ہیں، یہ مال اگر یتیم کا ہے تو اسے کھانے والے قرآن کریم کی یہ وعید اپنے ذہن میں رکھیں۔

اس مقام پر مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بہت اہم اور ضروری مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے جو ان کی تفسیر معارف القرآن میں ذکر کیے گئے ہیں، فرماتے ہیں سورۃ نساء کے اول رکوع میں شروع سے آخر تک عموماً یتامیٰ ہی کے احکام ہیں، یتامیٰ کے اموال کی نگہداشت رکھنے، ان کے مال کو اپنا مال نہ بنا لینے،

ان کے وراثت میں ملے ہوئے اموال سے ان کو حصہ دینے کا حکم فرمایا اور بڑا ہو جانے کے ڈر سے ان کا مال اڑا دینے میں جلدی کرنا، یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے مہر کم کر دینا، یا ان کے مال پر قبضہ کر لینا وغیرہ ان سب امور کی ممانعت فرمائی۔

آخر میں فرمایا کہ ناحق یتیم کا مال کھانا پیٹ میں آگ کے انگارے بھرنا ہے، کیونکہ اس کی پاداش میں موت کے بعد اس طرح کے لوگوں کے پیٹوں میں آگ بھری جائے گی، لفظ یاکلون استعمال فرمایا ہے اور یتیم کا مال کھانے پر وعید سنائی گئی ہے، لیکن یتیم کے مال کا ہر استعمال کھانے پینے میں ہو یا برتنے میں، سب حرام اور باعث عتاب و عذاب ہے، کیونکہ محاورے میں کسی کا مال ناحق کھالینا ہر استعمال کو شامل ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص وفات پا جاتا ہے تو اس کے مال کے ہر ہر حصہ اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے ساتھ ہر وارث کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اس کے نابالغ بچے یتیم ہوتے ہیں، ان بچوں کے ساتھ عموماً ہر گھر میں ظلم و زیادتی کا برتاؤ ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جو ان بچوں کے باپ کی وفات کے بعد مال پر قابض ہوتا ہے خواہ ان بچوں کا چچا ہو یا بڑا بھائی ہو یا والدہ ہو یا اور کوئی ولی یا وصی ہو، اکثر ان اُمور کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن کی ممانعت اس رکوع میں کی گئی ہے، اول تو سالہا سال مال کی تقسیم کرتے ہی نہیں، ان بچوں کی روٹی کپڑے پر تھوڑا بہت خرچ کرتے رہتے ہیں، پھر بدعات، رسومات اور فضولیات میں اسی مال مشترک سے خرچ کئے چلے جاتے ہیں، اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے ہیں اور سرکاری کاغذات میں نام بدلوا کر اپنے بچوں کا نام لکھواتے ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی ہی گھر خالی رہتا ہو گا۔

مدرسوں اور یتیم خانوں میں جو چندہ یتیموں کے لیے آتا ہے اس کو یتیموں پر خرچ نہ کرنا بھی ایک صورت یتیم کا مال ہضم کرنے کی ہے۔

مسئلہ: میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں، ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیتے ہیں، بعض علاقوں میں تانبے پیتل کے برتن مال کو تقسیم کئے بغیر فقیروں کو دیدیتے ہیں، حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے، پہلے مال بانٹ لیں، جس میں سے مرنے والے کی اولاد، بیوی، والدین، بہنیں، جس جس کو شرعاً حصہ پہنچتا ہو اس کو دیدیں، اس

کے بعد اپنی خوشی سے جو شخص چاہے مرنے والے کی طرف سے خیرات کریں، یا مل کر کریں تو صرف بالغین کریں، نابالغ کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تصرف درست نہیں۔

مسئلہ: میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازہ کے اوپر ڈالی جاتی ہے وہ کفن میں شامل نہیں ہے، اس کو میت کے مال سے خریدنا جائز نہیں، کیونکہ وہ مال مشترک ہے کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کر دے تو جائز ہے، بعض علاقوں میں نماز جنازہ پڑھانیوالے امام کے لیے کفن ہی کے کپڑے میں سے مصلی تیار کیا جاتا ہے اور پھر یہ مصلی امام کو دے دیا جاتا ہے یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے فاضل ہے، ورثہ کے مشترک مال میں سے اس کا خریدنا جائز نہیں۔

مسئلہ: بعض جگہ میت کے غسل کے لیے نئے برتن خریدے جاتے ہیں، پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے، اول تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ گھر کے موجودہ برتنوں سے غسل دیا جاسکتا ہے اور اگر خریدنے کی ضرورت پڑ جائے تو توڑنا جائز نہیں، اول تو اس میں مال ضائع کرنا ہے اور پھر ان سے یتیموں کا اور غائب وارثوں کا حق وابستہ ہے۔

مسئلہ: ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صدقہ و خیرات کچھ جائز نہیں، اس طرح کے صدقہ خیرات کرنے سے مردے کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی زیادہ سخت گناہ ہے، اس لیے کہ مورث کے مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں، اس مشترک مال میں سے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کا مال چرا کر میت کے حق میں صدقہ کر دیا جائے، پہلے مال تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد اگر وہ وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے حق میں صدقہ خیرات کریں تو ان کو اختیار ہے۔

تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر مشترک ترکہ میں سے صدقہ خیرات نہ کریں، اس لیے کہ جو ان میں یتیم ہیں ان کی اجازت تو معتبر ہی نہیں اور جو بالغین ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دلی سے اجازت دیں، ہو سکتا ہے وہ لحاظ کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں اور لوگوں کے طعنوں کے خوف سے کہ اپنے مردہ کے حق میں دو پیسے تک خرچ نہ کئے، اس عار سے بچنے کے لیے

بادل ناخواستہ ہامی بھر لے، حالانکہ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جب کہ دینے والا طیب خاطر سے دے رہا ہو۔

یہاں ہم ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائے گا یہ بزرگ ایک مسلمان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کی روح پرواز کر گئی، اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انہوں نے فوراً اسے بجھا دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا اور روشنی کی، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا جب تک یہ شخص زندہ تھا یہ چراغ اس کی ملکیت تھی اور اس کی روشنی استعمال کرنا درست تھا، اب یہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس کو ہر چیز میں وارثوں کا حق ہو گیا، لہٰذا سب وارثوں کی اجازت ہی سے ہم یہ چراغ استعمال کر سکتے ہیں اور وہ سب یہاں موجو نہیں ہیں، لہٰذا اپنے پیسوں سے تیل منگوا کر روشنی کی۔ (معارف القرآن)

میراث کے احکام

سوال ان آیات کی تفسیر کیجئے

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۱۱} وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ

كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ {۱۲} النساء

جواب ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے حق میں تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے پھر اگر دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کے لیے دو تہائی اس مال میں سے ہے جو میت نے چھوڑا اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے اور اگر میت کی اولاد ہے تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو کل مال کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے اور اگر اس کی کوئی اولاد نہیں اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہیں تو اس کی ماں کا ایک تہائی حصہ ہے پھر اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے (یہ حصہ اس) وصیت کے بعد ہو گا جو وہ کر گیا تھا اور بعد ادا کرنے قرض کے تم نہیں جانتے تمہارے باپوں اور تمہارے بیٹوں میں سے کون تمہیں زیادہ نفع پہنچانے والا ہے اللہ کی طرف سے یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے بیشک اللہ خبر دار حکمت والا ہے۔

جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں اس میں تمہارا آدھا حصہ ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو اس میں سے جو چھوڑ جائیں ایک چوتھائی تمہارا ہے اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائیں یا قرض کے بعد اور عورتوں کے لیے چوتھائی مال ہے جو تم چھوڑ کر مرو بشرطیکہ تمہاری اولاد نہ ہو پس اگر تمہاری اولاد ہو تو جو تم نے چھوڑا اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے اس وصیت کے بعد جو تم کر جاؤ یا قرض کے بعد اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی یہ میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا اور اس میت کا ایک بھائی یا بہن ہے تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے پس اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں وصیت کی بات جو ہو چکی ہو یا قرض کے بعد بشرطیکہ اوروں کا نقصان نہ ہو یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ جاننے والا تحمل کرنے والا ہے۔

شان نزول: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی سلمہ کے ہاں میری عیادت کی، وہ چلتے ہوئے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بے سدھ پایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا وضو کیا پھر اس پانی میں سے مجھ پر پانی چھڑکا، مجھے آرام آگیا یا مجھے اِفاقہ ہوا میں نے پوچھا

یارسول اللہ! میں اپنے مال کا کیا کروں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ، (اسباب النزول للواحدی)

یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ: یوصی، وہ حکم دیتا ہے، نصیحت کرتا ہے۔ یہاں سے وراثت کے ان تفصیلی احکام کو بیان کیا جارہا ہے جن کا اس سے پہلے اجمالی بیان کیا گیا تھا، کہ مردوں کے لیے اس میں حصہ ہے جو ان کے والدین چھوڑیں یا قریبی رشتہ دار چھوڑیں، عورتوں کے لیے اس میں حصہ ہے جو ان کے والدین چھوڑیں یا قریبی رشتہ دار چھوڑیں، یہاں پر ایصا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں تاکید پائی جاتی ہے، اس لحاظ سے وصیت تاکیدی حکم کو کہتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ نے قانون وراثت کے آغاز میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ احکام تاکیدی ہیں اور ان میں اپنی مرضی سے نہ کسی کو ردوبدل کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی ٹالے جاسکتے ہیں بلکہ ان پر عملدرآمد لازمی ہے۔ (معالم)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں "شریعت کا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے مال سے پہلے شریعت کے مطابق اس کے کفن دفن کے اخراجات پورے کئے جائیں، جن میں نہ فضول خرچی ہو نہ کنجوسی ہو، اس کے بعد اس کے قرضے ادا کئے جائیں، اگر قرضے اتنے ہی ہوں جتنا اس کا مال ہے یا اس سے بھی زیادہ تو نہ کسی کو میراث ملے گی نہ کوئی وصیت نافذ ہو گی اور اگر قرضوں کے بعد مال بچ جائے یا قرضے بالکل ہی نہ ہوں تو اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو اور وہ کسی گناہ کی وصیت نہ ہو، تو اب جو مال موجود ہے اس کے ایک تہائی میں سے اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی، اگر کوئی شخص پورے مال کی وصیت کر دے تب بھی تہائی مال ہی میں وصیت معتبر ہو گی، تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا مناسب بھی نہیں ہے اور وارثوں کو محروم کرنے کی نیت سے وصیت کرنا گناہ بھی ہے۔ اَداءِ دین کے بعد ایک تہائی میں وصیت نافذ کر کے شرعی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے جس کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں، اگر وصیت نہ کی ہو تو اداء دین کے بعد پورا مال میراث میں تقسیم ہو گا۔ (معارف القرآن)

اولاد کا حصہ: میراث کی تقسیم الاقرب فالاقرب کے اصول پر ہو گی، مرنے والے کی اولاد اور اس کے والدین چونکہ اقرب ترین ہیں، اس لئے ان کو ہر حال میں میراث ملتی ہے، یہ دونوں رشتے انسان کے قریب ترین اور بلاواسطہ رشتے ہیں، دوسرے رشتے بالواسطہ ہوتے ہیں، قرآن شریف میں پہلے انہی کے حصے بیان فرمائے اور اولاد کے حصہ سے شروع فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے۔ (معارف القرآن)

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ: یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے جس نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو میراث کا مستحق بھی بنادیا اور ہر ایک کا حصہ بھی مقرر کر دیا اور یہ اصول معلوم ہو گیا کہ جب مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصہ میں جو مال آئے گا اس طرح تقسیم ہو گا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا مل جائے، مثلاً کسی نے ایک لڑکا دو لڑکیاں چھوڑے تو مال کے چار حصے کر کے (۲/۴) لڑکے کو اور (۱/۴) ہر لڑکی کو دے دیا جائے گا۔ (معارف القرآن)

لڑکوں کو دوگنا دینے کی وجہ: تقسیم وراثت میں سب سے پہلے بیٹوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ سب لوگوں سے قریب ترین ہوتے ہیں، ولد کا لفظ اولاد کے لیے بولا جاتا ہے چاہے وہ مذکر ہو یا مؤنث، ایک اولاد پر بھی بولا جاتا ہے اور بہت سی اولاد پر بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں ایک ہی معنیٰ کے لیے یہ لفظ آیا ہے، اس کی جمع اولاد آتی ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے اپنے مورث کی ساری میراث پر لڑکے قابض ہو جاتے تھے، لڑکیاں محروم رہتی تھیں، قرآن کریم نے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں سے مردوں کو بھی حصہ دار قرار دیا اور عورتوں کو بھی حصہ دار قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے یہاں لڑکوں کے لیے دو حصے اور لڑکیوں کے لیے لڑکے کے مقابلے میں وراثت میں نصف حصہ مقرر فرمایا ہے، حظ کا معنیٰ حصہ ہے، لڑکوں کی لڑکیوں پر برتری کے لیے یہی کافی ہے کہ انہیں لڑکیوں کی موجودگی میں دگنا حصہ دیا جائے گا، اگر لڑکیاں نہ ہوں تو مکمل وراثت لڑکوں کی ہے، اگر دوسرے حقدار موجود نہ ہوں تب۔

ارباب تفسیر نے مرد وارثوں کو عورت وارثوں کے مقابلے میں دگنا حصہ دینے کی کئی وجوہات بیان فرمائی ہیں، ① مرد کی بہ نسبت عورت کے اخراجات کم ہوتے ہیں کیونکہ مرد پر اپنی بیوی اور

بچوں کی اور اپنے بوڑھے والدین کے مصارف کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کے برخلاف عورت پر کسی کی پرورش کی ذمہ داری نہیں ہے اور جب عورت کی بہ نسبت مرد کے اخراجات زیادہ ہیں تو مرد کا حصہ بھی عورت سے دگنا ہونا چاہیے۔

② سماجی کاموں کے لحاظ سے مرد کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ امام اور قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، ملک اور وطن کے نظم ونسق چلانے کی ذمہ داریاں رکھتا ہے اور ملک اور وطن کے دفاع کے لیے جہاد کی ذمہ داری بھی مرد پر ہے، حدود اور قصاص میں وہی گواہ ہو سکتا ہے اور کاروباری معاملات میں بھی مرد کی گواہی عورت سے دگنی ہے سو جس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اس کا وراثت میں حصہ بھی دگنا ہونا چاہیے۔

③ عورت چونکہ صنف کمزور ہوتی ہے اور اس کو دنیاوی معاملات کا زیادہ تجربہ نہیں ہوتا اس لیے اگر اس کو زیادہ پیسے مل جائیں تو اندیشہ ہے کہ اس کے وہ سب پیسے ضائع ہو جائیں گے۔ (تبیان القرآن)

④ اس میں حکمت یہ ہے کہ لڑکی کو شوہر کی طرف سے مہر بھی ملے گا، اور اس کی اولاد کی پرورش بھی اس کے شوہر یعنی بچوں کے باپ کے ذمہ ہوگی، برخلاف اس کے لڑکوں کو اپنی بیویوں کو مہر دینے ہوں گے اور اولاد کی پرورش بھی خود کرنی ہوگی۔ (انوار البیان)

⑤ لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا ہوتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے نزدیک لڑکیاں سرے سے احترام وعزت کی مستحق ہی نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ اسلام کے سامنے چونکہ ہر طرح کی مشکلات ہیں جن سے مرد دوچار ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں، اس لیے ان سے لڑکوں کو زیادہ حصہ دلایا ہے۔ (سراج البیان)

⑥ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ والدین سے بھی زیادہ رحیم اور شفیق ہے اور اس نے ان کے لیے جو حصص تجویز کئے ہیں تو یہی ان کے مفاد میں ہیں۔ (فی ظلال القرآن)

لڑکیوں کو حصہ دینے کی اہمیت: قرآن مجید نے لڑکیوں کو حصہ دلانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ لڑکیوں کے حصہ کو اصل قرار دے کر اس کے اعتبار سے لڑکوں کا حصہ بتلایا اور بجائے لا تثنیین مثل حظ الذکر (دو لڑکیوں کو ایک لڑکے کے حصہ کے بقدر) فرمانے کے للذکر مثل حظ الا تثنیین (لڑکے کو

دو لڑکیوں کے حصہ کے بقدر) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا، جو لوگ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھ کر بادل ناخواستہ شرماشرمی معاف کر دیتی ہیں کہ ملنے والا تو ہے ہی نہیں تو یوں بھائیوں سے برائی لیں، ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی، ان کا حق بھائیوں کے ذمہ واجب رہتا ہے، یہ میراث دبانے والے سخت گنہگار ہیں، ان میں بعض بچیاں نابالغ بھی ہوتی ہیں، ان کو حصہ نہ دینا دوہرا گناہ ہے ایک گناہ وارث شرعی کے حصہ کو دبانے کا اور دوسرا یتیم کے مال کو کھانے کا۔ (معارف القرآن)

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ: یعنی اگر نرینہ اولاد نہ ہو اور صرف لڑکیاں ہوں اور ایک سے زائد ہوں تو ان کو مال موروث سے دو تہائی ملے گا، جس میں سب لڑکیاں برابر کی شریک ہوں گی اور باقی ایک تہائی دوسرے ورثاء مثلاً میت کے والدین، بیوی یا شوہر وغیرہ میراث کے حق داروں کو ملے گا، دو لڑکیاں اور دو سے زائد سب دو تہائی میں شریک ہوں گی۔

دو لڑکیوں سے زائد کا حکم تو قرآن کی آیت میں صراحتاً مذکور ہے، جیسا کہ فوق اثنتین کے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں اور لڑکیاں دو ہوں تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو دو سے زیادہ کا حکم ہے، اس کا ثبوت حدیث شریف میں مذکور ہے، ترجمہ: جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے، اتنے میں ہمارا گذر اسواف میں ایک انصاری عورت پر ہوا، وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! یہ دونوں لڑکیاں ثابت بن قیس (میرے شوہر) کی ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ اُحد میں شہید ہوگئے ہیں، ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہو گیا ہے اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا، اس معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں، خدا کی قسم اگر ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو گا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہو گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرما دے گا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۃ نساء کی یہ آیت يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے سارے مال پر قبضہ کر لیا تھا) بلایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی حصہ دو، ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے وہ تم خود رکھ لو۔ اس حدیث

میں جس مسئلہ کا ذکر ہے اس میں آپ نے دو لڑکیوں کو بھی دو تہائی حصہ لے دیا، جس طرح دو سے زیادہ کا یہی حکم خود قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں منصوص ہے۔ (معارف القرآن)

وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ: یعنی اگر مرنے والے نے اپنی اولاد میں صرف ایک لڑکی چھوڑی اور اولاد نرینہ بالکل نہ ہو، تو اس کو اس کے والد یا والدہ کے چھوڑے ہوئے مال موروث کا آدھا حصہ ملے گا، باقی دوسرے ورثاء لے لیں گے۔ (معارف القرآن)

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ: اس کے بعد خداوند قدوس نے مرنے والے کے ماں باپ کا حصہ بتایا اور تین حالتیں ذکر فرمائیں۔ اول یہ کہ والدین دونوں زندہ چھوڑے ہوں اور اولاد بھی چھوڑی، خواہ ایک ہی لڑکا یا لڑکی ہو اس صورت میں ماں باپ کو چھٹا حصہ ملے گا، دیگر ورثہ اولاد اور بیوی یا شوہر لے لیں گے اور بعض حالات میں کچھ بچا ہوا پھر والد کو پہنچ جاتا ہے جو اس کے لئے مقرر چھٹے حصہ کے علاوہ ہوتا ہے علم فرائض کی اصطلاح میں اس طرح کے استحقاق کو استحقاق تعصیب کہتے ہیں۔

دوسری حالت یہ بتائی کہ مرنے والے کی اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں اور ماں باپ موجود ہوں اس صورت میں مال موروث کا تہائی (۱/۳) ماں کو اور باقی دو تہائی والد کو مل جائیں گے، یہ اس صورت کا حکم ہے جب کہ مرنے والے کے ورثہ میں اس کا شوہر یا اس کی بیوی بھی موجود نہ ہو، اگر شوہر یا بیوی موجود ہے تو سب سے پہلے ان کا حصہ الگ کیا جاوے گا اور باقی میں (۱/۳) والدہ کو اور (۲/۳) والد کو مل جائے گا۔

تیسری حالت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد تو نہ ہو لیکن بھائی بہن ہوں جن کی تعداد دو ہو، خواہ دو بھائی ہوں، خواہ دو بہنیں ہوں، یا دو سے زیادہ ہوں، اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر اور کوئی وارث نہیں تو بقیہ (۵/۶) حصہ باپ کو مل جائے گا، بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی سے ماں کا حصہ کم ہو گیا، لیکن بھائی بہن کو بھی کچھ نہ ملے گا کیونکہ باپ بہ نسبت بھائی بہن کے اقرب ہے، جو

بچے گا باپ کو مل جائے گا، اس صورت میں ماں کا حصہ (۱/۳) کے بجائے (۱/۶) ہو گیا، علم فرائض کی اصطلاح میں اس کو حجب نقصان کہتے ہیں اور یہ بہن بھائی جن کی وجہ سے والدین کا حصہ کٹ رہا ہے، خواہ حقیقی ہوں خواہ باپ شریک ہوں، خواہ ماں شریک ہوں، ہر صورت میں ان کے وجود سے ماں کا حصہ گھٹ جائے گا، بشرطیکہ ایک سے زیادہ ہوں۔ (معارف القرآن)

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ: تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون دینی اور دنیوی نفع کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے، یہ بات اللہ کو معلوم ہے، اس لیے اس کے بیان کردہ حکم کی روشنی میں ترکہ تقسیم کر دو کیونکہ مصالح کا علم صرف اللہ کو ہی ہے۔ ایک قول یہ کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد نفع رسانی میں تقریباً یکساں درجے پر ہیں کہ تمہیں پتہ نہیں چل سکتا کہ بلحاظ نفع رسانی تم سے کون زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ تم بچپن میں اپنے والدین سے فوائد حاصل کرتے رہے اور اب بڑھاپے میں اپنی اولاد سے فوائد حاصل کرو گے اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اموال میں والدین اور اولاد کے لیے حصے مقرر کر دیئے کیونکہ اسے تمام لوگوں کے مفادات اور مصالح کا علم ہے، ایک قول یہ ہے کہ تم میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس کی وفات پہلے ہو جائے گی اور اس کی اولاد اس کے مال سے فائدہ حاصل کرے گی یا اولاد کی وفات پہلے ہو جائے گی اور ماں باپ اس کے مال سے مستفید ہوں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور اپنی حکمت کی بنیاد پر تمہاری میراث میں یہ حصے مقرر کیے ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ جاننے والا، بہت زیادہ حکمت والا ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے بتلا دیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے، اس میں کسی کو رائے زنی یا کمی بیشی کا کوئی حق نہیں اور تمہیں پورے اطمینان قلب کے ساتھ

اسے قبول کرنا چاہیے تمہارے خالق ومالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، تمہارے نفع کا کوئی پہلو اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں ہے اور جو کچھ حکم وہ کرتا ہے کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، تمہیں خود اپنے نفع ونقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہو سکتی، اگر تقسیم میراث کا مسئلہ خود تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو تم ضرور اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کر پاتے اور میراث کی تقسیم میں بے اعتدالی ہو جاتی، اللہ جل شانہ نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا، تاکہ مال کی تقسیم میں عدل و انصاف کی پوری پوری رعایت ہو اور میت کا سرمایہ منصفانہ طریقہ سے مختلف مستحقین کے ہاتھوں میں گردش کرے۔ (معارف القرآن) اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے جو جس کا مستحق ہے اسے اتنا دلواتا ہے ہر چیز کی جگہ کو وہ بخوبی جانتا ہے تمہارے نفع نقصان کا اسے پورا علم ہے اس کا کوئی کام اور کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں تمہیں چاہیے کہ اس کے احکام اور اس کے فرمان مانتے چلے جاؤ۔

میراث میں شوہر اور بیوی کا حصہ: عقل انسانی حیران ہوتی ہے کہ دین اسلام نے کس باریکی کے ساتھ مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا خیال رکھا ہے، اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں اس قدر باریک بینی کے ساتھ ہر طبقہ کے حقوق کی پاسداری نہیں کی گئی، والدین اور اولاد کی وراثت کے مسائل سمجھانے کے بعد قرآن کریم نے شوہر اور بیوی کے ترکے کا ذکر کیا ہے، ارشاد فرمایا

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ: اور جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو تمہارا آدھا ہے، اگر بیوی فوت ہو جائے تو اس کے کل متروکہ اموال و املاک سے شوہر کو آدھا مال ملے گا، بشرطیکہ اس نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو نہ کوئی لڑکا ہو اور نہ کوئی لڑکی نہ ایک اور نہ ایک سے زیادہ، نہ اس شوہر سے اور نہ کسی پہلے شوہر سے۔ (انوار البیان) مندرجہ بالا سطور میں شوہر اور بیوی کے حصوں کی تعیین کی گئی ہے اور پہلے شوہر کا حصہ بتایا، شاید اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہو کہ اس کی اہمیت ظاہر کرنا مقصود ہے، کیونکہ عورت کی وفات کے بعد شوہر دوسرے گھر کا آدمی ہو جاتا ہے، اگر اپنے میکہ میں عورت کا انتقال ہوا ہو اور اس کا مال وہیں ہو تو شوہر کا حصہ دینے سے گریز کیا جاتا ہے، گویا اس زیادتی کا سدباب کرنے کے لیے شوہر کا حصہ پہلے بیان فرمایا۔ (معارف)

فَاِنۡ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ: اگر عورت فوت ہو جائے اور اس نے کوئی اولاد چھوڑی ہو خواہ ایک لڑکا یا لڑکی ہی ہو موجودہ شوہر سے ہو یا پہلے شوہر سے تو جس شوہر کی زوجیت میں ہوتے ہوئے فوت ہوئی ہے اس شوہر کو اس عورت کے متروکہ مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اور دونوں صورتوں میں یہ حصہ قرض کی ادائی اور وصیت کے نافذ کرنے کے بعد دیا جائے گا۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّكُمۡ وَلَدٌ: اگر شوہر فوت ہو جائے اور اس نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو نہ موجودہ بیویوں میں سے کسی سے اور نہ کسی پہلی بیوی سے تو مرتے وقت منکوحہ موجودہ بیوی کو کل متروکہ مال سے چوتھائی حصہ ملے گا۔

فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ: اور اگر شوہر نے کوئی اولاد بھی چھوڑی ہے، خواہ ایک لڑکا یا ایک لڑکی ہی ہو (پہلی بیوی یا موجودہ بیوی سے) تو موت کے وقت جو بیوی اس کے نکاح میں تھی اس کو شوہر کی میراث سے آٹھواں حصہ ملے گا۔ یہ حصہ دونوں صورتوں میں قرضوں کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ کے بعد دیا جائے گا۔ (انوار البیان) یہ دیکھنا چاہیے کہ بی بی کا مہر ادا ہو گیا ہے یا نہیں، اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو دوسرے قرضوں کی طرح اوّلاً کل مال سے دین مہر ادا ہو گا اس کے بعد ترکہ تقسیم ہو گا اور مہر لینے کے بعد عورت اپنی میراث کا حصہ بھی میراث میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے وصول کر لے گی اور اگر میت کا مال اتنا ہے کہ مہر ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو بھی دوسرے دیون کی طرح پورا مال دین مہر میں عورت کو دے دیا جائے گا اور کسی وارث کو کچھ حصہ نہ ملے گا۔ (معارف القرآن)

وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ: جس میت نے نہ باپ دادا کو چھوڑا ہو اور نہ اولاد کو اس کو "کلالہ" کہتے ہیں ایسے شخص کی میراث کا حکم یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ایک ماں شریک بھائی یا ایک ماں شریک بہن اس کی وارث ہوں تو دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ (آسان تفسیر رحمانی)

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ: اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی متروکہ ان سب کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، قرآن میں مطلق بہن کا ذکر ہے لیکن فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں بہن سے اخیافی بہن یعنی ماں شریک بہن مراد ہے، یہاں بھی تنبیہ فرمادی گئی کہ تقسیم میراث سے پہلے وصیت کی تکمیل اور دین کی ادائیگی ضروری ہے۔ (آسان تفسیر رحمانی)

وارثوں سے چونکہ اندیشہ تھا کہ ترکہ میت میں سے میت کا دین اور وصیت ادا نہ کریں بلکہ تمام مال آپ ہی رکھ لیں، اس لیے میراث کے ساتھ بار بار دین اور وصیت کا حکم تاکیداً بیان کیا گیا اور وصیت چونکہ تبرع اور احسان ہے اور بسا اوقات کوئی شخص معین اس کا مستحق نہیں ہوتا اور اس وجہ سے اس کے ضائع ہونے کا احتمال قوی تھا تو اس لیے بغرض اہتمام و احتیاط وصیت کو ہر جگہ دین سے پہلے ذکر فرمایا حالانکہ وصیت کا درجہ دین کے بعد ہے جیسا پہلے گزرا، نیز وصیت حق مورث ہے جیسے تجہیز و تکفین بخلاف وراثت اور دین کے کہ وہ دوسروں کا حق ہے تو اس حیثیت سے وصیت دین سے مقدم ہوگی گو دوسری وجہ سے دین وصیت پر مقدم ہے اور یہاں جو غیر مضار کی قید لگائی یہی قید مقامات سابقہ میں بھی معتبر ہوگی۔ (عثمانی) غَيْرَ مُضَآرٍّ: یعنی مرنے والے کے لئے جائز نہیں کہ وہ محض ورثاء کو نقصان پہنچانے کی نیت سے کسی کے لیے وصیت کر جائے یا کسی کا دین باقی ہونے کا جھوٹا اقرار کرے تاکہ ورثاء کو کم ملے اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا جاسکے ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ (آسان)

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ: میراث وصیت کے احکام ذکر کرنے کے بعد آخر میں خاص طور پر متنبہ فرمایا گیا کہ یہ احکام من جانب اللہ ہیں طبیعت قبول کرے یا نہ کرے اس پر عمل کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب واقف اور آگاہ ہیں کہ کس کا کیا حصہ ہونا چاہیے۔ (آسان تفسیر)

مسئلہ: وارث کے حق میں وصیت کرنا باطل ہے، اگر کسی نے اپنے وارث کے حق میں وصیت کی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں وارث کے لیے میراث ہی کافی ہے۔ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ، فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔ اللہ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے پس کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت معتبر نہیں۔ (جلالین)

حدود اللہ کی پابندی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۱۳} وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ {۱۴} النساء

جواب ترجمہ: یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کرے گا اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی زبردست کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی (مقرر کی ہوئی) حدود سے آگے بڑھے گا اللہ اس کو (جہنم) آگ میں داخل کرے گا اسی میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اس کے لیے بڑا ذلت آمیز عذاب ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: میراث کے جو احکام یہاں بیان کیے گئے ہیں ان سب کو اللہ کی حدود قرار دیا گیا ہے، وراثتی احکام کے بارے میں یہ فرما کر ان کی اہمیت واضح کی جارہی ہے، تِلْكَ (یہ) اس کا مشارٌ الیہ وہ احکام ہیں جن کا تذکرہ یتیموں اور میراث کے احکام میں کیا گیا ہے۔ حُدُوْدُ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں) ان کو حدود کہا، کیونکہ احکام شریعت حدود کی طرح ہیں، جو کہ مکلفین کے لیے لگائی گئیں، ان سے تجاوز ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ (مدارک التنزیل)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں" یہ سب احکام مذکورہ (متعلقہ میراث یا مع احکام یتامٰی کے) خداوندی ضابطے ہیں" (بیان القرآن) حدود اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ماننے اور اس کے نواہی سے بچنے کا نام ہے، حدود وہ ہیں جن کے ذریعے اس کے بندے اس کی بندگی بجالاتے ہیں، بندگی کی اصل حدود کی حفاظت ہے، عہد وپیمان کی نگہبانی ہے، جس نے اللہ کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کی اسے کسی مکروہ چیز کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور نہ ہی کسی آفت کا سامنا کرنا پڑے گا، ہر مصیبت، ہر امتحان وآزمائش کی جڑ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کو پھلانگنا اور عبور کرنا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے، رسول کریم ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے لوگ قابل تعریف و ستائش ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے اطاعت گزار بندوں کے لیے یہ ضابطے بیان کیے ہیں، جو شخص اِن ضابطوں اور حدود کی پابندی کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں بہشتوں میں داخل کریں گے۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: یہ ایسی جنتیں ہوں گی جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ یہ نہریں پانی، دودھ، شراب اور شہد کی ہوں گی۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: ان جنتوں میں جانے والے لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہاں سے کہیں اور نہیں جانا، ہمیشہ جنتوں کی بیش بہا نعمتوں میں رہیں گے۔ ایسی ہمیشگی ملے گی کہ کبھی انہیں موت نہیں آئے گی اور نہ یہاں سے باہر جائیں گے۔

وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بڑی کامیابی ہے، کس قدر اعزاز و افتخار کی بات ہے کہ انسان کامیابی حاصل کرلے، حصولِ کامیابی کی خاطر انسان جتن کرتا ہے، کوششیں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ مہربان ذات ہے جس نے احکامات و ضابطے مقرر فرمائے، پھر ان ضابطوں کے مطابق عمل کرنے والے لوگوں کو کامیابی کی خوشخبری بھی سنائی، یہ ایسی بڑی کامیابی ہے کہ اس جیسی کوئی اور کامیابی نہیں ہے، دنیا میں ملنے والی ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کامیابیاں ایک جنت والی کامیابی کے مقابلے میں ہیچ اور بے معنیٰ ہیں

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا: جو شخص اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرے گا، اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں داخل کرے گا، دوزخ وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کا ٹھکانہ ہے۔

خَالِدًا فِيْهَا: اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے نافرمان، اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کو پائمال کرنے والے ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، وہاں سے بھاگنے اور کسی محفوظ جگہ میں جانے کی کوئی سبیل نہیں ہوگی۔ ارباب تفسیر فرماتے ہیں کہ انہیں ایسی ہمیشگی ملے گی کہ نہ انہیں موت آئے گی اور نہ ہی راحت ملے گی، حدود اللہ کی پائمالی یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی وجہ ہے۔

سوال کسی گناہ گار کے لیے قطعی طور پر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا؟

جواب ایسے گناہ گار کے لیے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا حکم سنایا گیا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو ٹھکرائے، اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے، اللہ تعالیٰ کے حکم کو ٹھکرانے اور انکار کرنے والا شخص کافر ہو گیا، اس صورت میں یہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: اللہ تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی کرنے والوں، اس کے احکامات کو معطل کرنے والوں، اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل ترک کرنے والوں، اللہ تعالیٰ کے احکامات میں شک کرنے والوں، اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کو پائمال کرنے والوں کے لیے دوزخ ہے، ہمیشہ وہاں رہنا ہو گا، اس کے ساتھ انہیں جو عذاب دیا جائے گا وہ ذلت والا ہو گا۔

شیخ ابوزہرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذلت آمیز عذاب یہ ان لوگوں کی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، خصوصاً میراث کے معاملے میں، یہ شخص اللہ کا نافرمان ہے، اس شخص نے ان حدود کے نقوش کو مٹایا اور عبور کیا ہے جو اللہ نے کھینچے ہیں، اس کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں ڈالے گا، یہ وہاں ہمیشہ رہے گا، اس کے لیے توہین آمیز عذاب ہو گا، آخرت میں اس طرح کا عذاب ملنا انتہائی درجہ کی اہانت اور ذلت ہے، کیونکہ اس شخص نے دوسروں کی دنیا کے بدلے میں اپنی آخرت کو فروخت کر ڈالا ہے، جب اس نے اس مال کے ذریعے دوسروں کی دنیوی سعادت چاہی تو اس نے اپنے عمل کے ذریعے آخرت کی بدبختی حاصل کی، اس نے جب کچھ ایسی چیز کو عزت دینا چاہی جو اس پر واجب تھی تو اس نے اپنے آپ کو ذلت میں ڈالا، حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جو حق کو واضح کرتا ہے اور رشد کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (زہرۃ التفاسیر لابی زہرہ)

فائدہ: قرآنی اسلوب بیان کو سامنے رکھتے ہوئے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ وراثت کا مسئلہ کس قدر اہمیت رکھتا ہے، اس میں کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے، اس بارے میں ظلم نہیں کیا جانا چاہیے، حدیث شریف میں ارشادِ نبوی ہے **مَنْ فَرَّ مِنْ مِيْرَاثِ وَارِثِهٖ، قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ** (ابن ماجہ) جس نے وارث کی میراث سے راہِ فرار اختیار کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن

اس کی میراث کو کاٹ دیں گے۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اگرچہ اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن قرآنی ارشادات کو سامنے رکھا جائے تو کیا ان میں کم وعیدیں ہیں۔

بدکار عورت کی سزا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۶﴾ النساء

جواب ترجمہ: اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کریں تو ان پر اپنے لوگوں میں سے چار گواہ کرلو، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان (عورتوں) کو گھروں میں روک رکھو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے دو اگر یہ عمل کر جاتے ہوں تو تم ان کو اذیت دو پھر اگر توبہ کرلیں اور اپنے کو سدھار لیں تو ان سے چشم پوشی کرو بلاشبہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ: یہاں سے کچھ ایسے احکامات کو بیان کیا جارہا ہے جن کا تعلق مردوں اور عورتوں سے ہے، الّٰتِیۡ یہ خلاف قیاس اَلَّتِیۡ کی جمع ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ صیغہ جمع ہی کے لیے بنایا گیا ہے، فَاحِشَہ فعل قبیح، زنا اور بدکاری کو کہا جاتا ہے، زنا میں زیادہ برائی اور قباحت ہے اس لیے اسے فاحشہ کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو عورتیں زنا کا ارتکاب کریں ان پر اپنے لوگوں میں سے چار گواہ پیش کیے جائیں۔

جب کسی عورت کے بارے میں یہ بات سنی جائے کہ اس نے ایسا کام کیا ہے تو خبر چونکہ کانوں کان محلہ اور بستی میں پھیل جاتی ہے (اگرچہ جھوٹی ہی ہو) اور یہ عورت کے لیے اور اس کے خاندان

کے لیے باعث ننگ و عار بن جاتی ہے اس لیے شریعت اسلامیہ نے گواہ طلب فرمانے کا حکم دیا۔ اس قسم کے امور گواہوں کے بغیر ثابت نہیں ہوتے، جب حاکم کے پاس معاملہ چلا جائے تو وہ گواہ طلب کرے یہ گواہ صرف مرد ہوں گے، عورتوں کی گواہی اس سلسلہ میں معتبر نہیں۔ گواہ بھی چار ہوں گے اور مسلمان ہوں گے دیگر امور میں دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ یہ ننگ و ناموس اور عزت و آبرو کا معاملہ ہے اس لیے اس میں سختی کی گئی جب تک چار مرد گواہی نہ دیں اس وقت تک کوئی سزا نہیں دی جاسکتی، اگر چار گواہ نہ ملیں تو جن لوگوں نے یہ بات اُڑائی ہے وہ سب اور خود گواہ جو چار سے کم رہ گئے ان سب پر حد قذف یعنی تہمت لگانے کی سزا نافذ کی جائے گی جو ۸۰ کوڑے ہیں، سورۃ نور کے پہلے رکوع میں حد قذف بیان فرمادی ہے۔ (انوار)

اگر کسی عورت پر زنا کی تہمت لگائی گئی اور چار مرد مسلمان گواہ قائم نہ ہو سکے تو عورت پر سزا نافذ نہ کی جائے گی۔ البتہ اگر واقعی میں اس نے ایسا کام کیا ہو جسے وہ جانتی ہے تو اللہ کے حضور میں توبہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ چونکہ قاضی کے پاس ثبوت نہ ہو سکا اور مجھ پر سزا نافذ کرنے کا فیصلہ نہیں دیا گیا تو میں یہ کام کرتی ہی رہوں، اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، بندوں کو علم ہو یا نہ ہو وہ گناہوں پر سزا دے گا، لہٰذا ہر گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔

اگر چار مسلمان مرد گواہی دے دیں کہ فلاں عورت نے زنا کیا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ شادی شدہ عورت نے اگر ایسا کیا ہو تو اسے رجم کر دیا جائے یعنی پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے اور اگر شادی شدہ نہ ہو تو سو (۱۰۰) کوڑے مارے جائیں یہ شریعت کا حکم ہے جو سورۃ نور میں مذکور ہے۔ (انوار البیان) گواہوں کا عادل اور مرد ہونا ضروری ہے، مدعی پر سختی اور بندوں کی پردہ پوشی کے لیے عورت پر زنا کے الزام میں چار گواہوں کا پیش کرنا لازمی ہے۔

فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ: اس سے پہلے یہ حکم تھا کہ ان عورتوں کو گھروں میں روکے رکھیں کیونکہ باہر نکلنے ہی سے عموماً زناکاری کے واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ حکم سورۃ نساء میں مذکور ہے ارشاد ہے، یعنی ان کو گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ اللہ

تعالیٰ ان کو موت دے دے یا ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے، یہ حکم سورۃ نور کی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ (انوار البیان)

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سلف میں اس بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں زناکار عورت کی جو سزا بیان کی گئی ہے یعنی تا حکم ثانی اسے قید میں رکھا جائے یہ ابتدائی حکم تھا جو آغاز اسلام کے وقت دیا گیا تھا اور اب یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آغاز اسلام میں زناکار عورت کا حکم یہی تھا جو اس مذکورہ بالا قول باری نے واجب کر دیا تھا یعنی اسے قید کی سزا دی جاتی یہاں تک کہ وہ مر جاتی یا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی اور راستہ نکال دیتا، اس وقت عورت کو اس کے سوا اور کوئی سزا نہ دی جاتی۔ آیت میں باکرہ اور ثیبہ کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا گیا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم باکرہ اور ثیبہ دونوں قسموں کی عورتوں کے لیے عام تھا۔

اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا **اَلرَّجْمُ لِلثَّیِّبِ وَالْجَلْدُ لِلْبِكْرِ** یعنی شادی شدہ زناکار کو سنگسار کرنا اور غیر شادی شدہ کے لیے کوڑے لگانا یہ سزا مرد عورت دونوں کے لیے ہے۔ (انوار البیان)

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا: میں یہ حکم دیا کہ جو دو آدمی (مرد و عورت) بدکاری کریں تو ان کو ایذا دو، ایذا دینے میں زبان سے عار دلانا اور زجر و توبیخ کی باتیں کرنا بھی شامل ہے اور اس آیت میں مار پیٹ کی صورت میں کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی، اس کو حکام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا لیکن سورۃ نور کی آیت میں سزا مقرر کر دی گئی تو اب اس پر عمل کرنا لازم ہو گیا۔

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا: اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے اعراض کرو اور انہیں تکلیف نہ دو، اللہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور وسیع رحمت والا ہے، یہ حکام کو خطاب کیا جا رہا ہے۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

توبہ کی اہمیت اور فضلیت

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۱۷} وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى إِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ أُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا {۱۸} النساء

جواب ترجمہ: اللہ پر توبہ قبول کرنے کا حق انہیں لوگوں کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے برا کام کرتے ہیں اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں ان لوگوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا دانا ہے۔ توبہ ان کے لیے نہیں ہے جو برائیاں کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ پہنچتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی (توبہ قبول ہوتی ہے) جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں ایسوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ: توبہ کا لغوی معنی رجوع کرنا اور لوٹ آنا ہے یعنی جس سمت میں آپ چلے جا رہے ہیں ادھر سے منہ پھیر کر دوسری سمت میں چل پڑیں، توبہ شرعی میں بھی یہی معنی ملحوظ ہے کہ انسان گناہ و معصیت کی جس راہ پر اپنی کم عقلی اور کج فہمی کے باعث بھاگا چلا جا رہا ہے اس سے رخ موڑ کر نیکی اور تقویٰ کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے، اسی لیے محققین نے توبہ کی قبولیت کے لیے متعدد شرائط بیان فرمائی ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔ ① ندامت ② اس گناہ سے اسی وقت باز آجانا ③ دوبارہ یہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ ④ وَاَن يَّكُوْنَ ذَالِكَ حَيَآءً مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا مِن غَيْرِهٖ۔ یعنی یہ سب کچھ اللہ جل مجدہ سے شرمسار ہو کر کرے، ایسی توبہ کو قبول فرمانے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ (ضیاء القرآن)

عربی زبان میں علی وجوب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی علی اللہ فرمایا گیا جس کا مطلب یہ سمجھ آتا ہے کہ توبہ کی قبولیت اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی، یہاں اللہ تعالیٰ پر توبہ کی قبولیت کے واجب ہونے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے وعدہ کی تاکید کی جارہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کی توبہ یقیناً قبول فرمائیں گے، علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں علی اللہ عند اللہ کے معنیٰ میں ہے کہ توبہ اللہ کے پاس ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے ان بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو ناواقفیت کی وجہ سے کوئی برا کام کر بیٹھیں پھر توبہ کرلیں گو یہ توبہ فرشتہ موت کو دیکھ لینے کے بعد عالم نزع سے پہلے ہو۔ (تفسیر ابن کثیر) اللہ تعالیٰ نے یہاں آگاہ فرمایا ہے کہ توبہ اللہ تعالیٰ پر استحقاق ہے، قبولیت توبہ ایک ایسا حق ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے جود و کرم کی بنا پر اپنے آپ پر اس بندے کے لیے لازم فرمایا ہے جو برا کام کر بیٹھتا ہے۔ (السعدی)

جو لوگ جہالت و حماقت کی وجہ سے گناہ کر بیٹھتے ہیں یہ طریقہ توبہ انہیں بتایا گیا ہے، یہ لوگ اگر مذکورہ شرائط کے ساتھ توبہ کریں تو مہربان رب ان پر مہربانی کرتے ہوئے انہیں توبہ کی توفیق دے دیتا ہے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں كُلُّ مَنْ عَصَى اللهَ خَطَأً أَوْ عَمَدًا فَهُوَ جَاهِلٌ حَتَّى يَنْزَعَ عَنِ الذَّنْبِ، جو بھی قصداً یا غلطی سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے وہ جاہل ہے جب تک کہ اس سے باز جائے۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں أَنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوا يَقُولُونَ: كُلُّ ذَنْبٍ أَصَابَهُ عَبْدٌ فَهُوَ بِجَهَالَةٍ (ابن جریر)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے کہ بندہ جس گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ جہالت ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اِجْتَمَعَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَوْا أَنَّ كُلَّ شَيْءٍ عُصِيَ بِهِ فَهُوَ جَهَالَةٌ، عَمَدًا كَانَ أَوْ غَيْرَهُ (تفسیر عبد الرزاق) اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر وہ چیز جس کے ذریعے نافرمانی کی گئی ہے وہ جہالت ہے، جان بوجھ کر ہو یا غلطی سے ہو۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں كُلُّ عَامِلٍ بِمَعْصِيَةِ اللهِ فَهُوَ جَاهِلٌ حِينَ عَمِلَهَا، اللہ کی نافرمانی کرنے والا ہر شخص جاہل ہے جب وہ اس نافرمانی کا ارتکاب کرے۔

{ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللهُ عَلَيْهِمْ }: ابن عباس رضی اللہ عنہما یتوبون من قریب کا معنیٰ یوں بیان کرتے ہیں مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى مَلَكِ الْمَوْتِ، قریب سے مراد یہ ہے کہ

اس گناہ اور موت کے فرشتہ کو دیکھنے تک کا وقت ہے۔ حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں مَا كَانَ دُوْنَ الْمَوْتِ فَهُوَ قَرِيْبٌ، موت سے پہلے پہلے توبہ کی جائے تو یہ توبہ قریب ہے۔ حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مَا دَامَ فِي صِحَّتِهِ، توبہ قریب کی وہ ہے جو صحت کے زمانہ میں کی جائے۔ حضرت حسن بصري رحمہ اللہ فرماتے ہیں ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ ثم يتوبون من قريب کا مطلب یہ ہے کہ جب تک غرغرہ نہیں ہوا تب تک جس نے توبہ کی یہ قریب کی توبہ ہے۔ غرغرہ کا وقت نزاع کا وقت ہوتا ہے، جب مرنے والے کو ملک الموت آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا ہے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ترمذی شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ اللهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ (ترمذی) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک سانسوں کا ٹوٹنا شروع نہ ہو۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اَلدُّنْيَا كُلُّهَا قَرِيْبٌ، ساری دنیا قریب ہی ہے۔

عبد اللہ بن عُمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَتُوْبُ قَبْلَ الْمَوْتِ بِشَهْرٍ إِلَّا قَبِلَ اللهُ مِنْهُ، وَأَدْنَى مِنْ ذَالِكَ، وَقَبْلَ مَوْتِهِ بِيَوْمٍ وَسَاعَةٍ، يَعْلَمُ اللهُ مِنْهُ التَّوْبَةَ وَالْإِخْلَاصَ إِلَيْهِ إِلَّا قَبِلَ مِنْهُ (حلیۃ الاولیاء) جو بھی مومن بندہ اپنی موت سے مہینہ بھر پہلے توبہ کرلے اس کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیتا ہے یہاں تک کہ اس کے بعد بھی بلکہ موت سے ایک دن پہلے تک بھی بلکہ ایک سانس پہلے بھی جو بھی اخلاص اور سچائی کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھکے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِعَامٍ تِيْبَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِشَهْرٍ تِيْبَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِجُمُعَةٍ تِيْبَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِيَوْمٍ تِيْبَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِسَاعَةٍ تِيْبَ عَلَيْهِ (مسند الطیالسی) جو اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور جو مہینہ بھر پہلے توبہ

کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے اور جو ہفتہ بھر پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے اور جو ایک دن پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے، جس نے اپنی موت سے پہلے ایک گھڑی توبہ کی تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے، یہ سن کر حضرت ایوب رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا وہی کہتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ چار صحابی رضی اللہ عنہم جمع ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتَ بِيَوْمٍ، جو شخص اپنی موت سے ایک دن پہلے بھی توبہ کرلے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ دوسرے نے پوچھا، کیا سچ مچ تم نے حضور ﷺ سے ایسے ہی سنا ہے؟ قَالَ: نَعَمْ، اس نے کہا ہاں۔ تو دوسرے نے کہا: وَأَنَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتَ بِنِصْفِ يَوْمٍ، میں نے تو نبی کریم ﷺ سے یہاں تک سنا ہے کہ وہ موت سے آدھا دن پہلے توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، تیسرے نے کہا: أَنْتَ سَمِعْتَ هٰذَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے سنا ہے؟ انہوں نے کہا، نَعَمْ، ہاں۔ تیسرے نے کہا کہ وَأَنَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتَ بِضَحْوٍ، میں نے آپ ﷺ سے سنا کہ موت سے پہلے چاشت کے وقت بھی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ چوتھے نے پوچھا: أَنْتَ سَمِعْتَ هٰذَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ آپ نے نبی اکرم ﷺ سے یہ سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نَعَمْ۔ ہاں۔

چوتھے نے کہا: وَأَنَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ [تَعَالٰى] يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ بِنَفْسِهٖ اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اُس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان گلے تک نہ آ جائے (یعنی موت کی سختی اور روح نکلنے کا وقت نہ آ پہنچے)۔

حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں إِنَّ اللہ تَعَالیٰ لَمَّا لَعَنَ إِبْلِیْسَ سَأَلَہُ النَّظرۃ فَقَالَ: وعِزَّتِكَ وَجَلَالِكَ لَا أَخْرُجُ مِنْ قَلْبِ ابن آدَمَ مَا دَامَ فِیْہِ الرُّوْحُ فَقَالَ اللہ: وَعِزَّتِی لَا أَمْنَعُہُ التَّوْبَۃَ مَا دَامَ فِیْہِ الرُّوْحُ، کہ اللہ تعالیٰ نے جب ابلیس پر لعنت نازل فرمائی، تو اس نے مہلت طلب کی اور کہا تیری عزت اور تیرے جلال کی قسم کہ ابن آدم کے جسم میں جب تک روح رہے گی میں اس کے دل سے نہ نکلوں گا، اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا مجھے اپنی عزت اور اپنے جلال کی قسم کہ میں بھی جب تک اس میں روح رہے گی اس کی توبہ قبول کروں گا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَالَ إِبْلِیْسُ: وَعِزَّتِكَ لَا أَزَالُ أُغْوِیْہِم مَا دَامَتْ أَرْوَاحُھُمْ فِیْ أَجْسَادِھِمْ فَقَالَ اللہ عَزَّ وَجَلَّ: وَعِزَّتِی وَجَلَالِی، لَا أَزَالُ أَغْفِرُ لَھُمْ مَّا اسْتَغْفَرُوْنِی (مسند احمد) شیطان نے کہا: تیری عزت کی قسم، جب تک ان کے جسموں میں روحیں رہیں گی میں ان کو گمراہ کرتا رہوں گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت اور اپنی بزرگی کی قسم میں ان کو اس وقت تک معاف کرتا رہوں گا جب تک یہ مجھ سے معافی مانگتے رہیں گے۔

ان تمام احادیث اور ارشادات اکابر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک بندہ زندہ ہے اور اسے اپنی حیاتی کی امید ہے تب تک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اس پر رجوع کرتا ہے، یہی اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی اس آیت میں وعدہ بھی فرمایا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ بہت علم والا اور حکمت والا ہے، یہ علم و حکمت میں مبالغہ ہے، اس کے احکامات اور افعال کی اَساس اور بنیاد حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے، وہ جانتا ہے کہ کس نے جان بوجھ کر نافرمانی کی، کس نے عمداً گناہ کیا، کس نے سچے دل سے توبہ کی، کون جان بوجھ کر بغاوت و سرکشی کرتا ہے اور کون توبہ تائب ہوتا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ: مقبولان توبہ کی شرائط ذکر کرنے کے بعد اِن لوگوں کا ذکر کیا جارہا ہے جن کی توبہ کسی صورت قبول نہیں کی جائے گی، فرمایا اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہے جو برے کام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب

ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے، انسان جب زندگی سے مایوس ہو جائے اور فرشتوں کو دیکھ لے اور روح بدن سے نکل کر حلق تک پہنچ جائے، سینے میں گھٹن لگے، حلق میں اٹکے، سانسوں سے غرغرہ شروع ہو تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ سَيِّئَاتٌ یہ سَيِّئَةٌ کی جمع ہے، معنی ہے برائی۔ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْٰنَ: یہ احمق وبے وقوف لوگ ہوش وحواس میں اپنے پروردگار کے ساتھ بندگی کا تعلق قائم نہیں کرتے، اپنے جرائم وگناہوں پر نادم وشرمسار نہیں ہوتے، توبہ تائب نہیں ہوتے، جب موت کا فرشتہ دیکھتے ہیں تو یہ لوگ پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم توبہ کرتے ہیں، ہم اللہ سے معافی مانگتے ہیں، فرعون جیسا شخص جو خدائی کے دعوے کرتا تھا جب دریا کی موجوں میں ہچکولے کھانے لگا تو پکار اٹھا تھا کہ میں اس پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے،، جو اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوا، ارشاد ربانی ہے حَتّٰٓى إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُوا إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ {يُونُس: ۹۰، ۹۱} یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو بولا کہ میں نے مان لیا کہ اس معبود کے سوا کوئی معبود نہیں جس کو بنی اسرائیل نے مانا ہے اور میں مسلمان ہوں، (جواب دیا گیا کہ) اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مسلسل فساد ہی مچاتا رہا۔ فرعون کا یہ کلمہ پڑھنا، یہ ایمان لانا قبول نہیں ہوا کیونکہ عذاب کے مشاہدہ کے بعد اس نے یہ اعلان کیا تھا، اگر فرعون اس سخت گھڑی سے پہلے ایمان لے آتا تو اس کی توبہ قبول ہونے کے واضح امکانات تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ بدکردار اور ظالم لوگوں کے ان لمحات کا حال بیان فرماتا ہے جب موت ان کے سامنے آتی ہے۔ جب وہ اپنے انجام کو دیکھتے ہیں اور اپنے اعمال بد کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس حال میں وہ سخت نادم ہوتے ہیں تو وہ دنیا میں واپس لوٹنے کی خواہش کرتے ہیں حَتّٰٓى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحاً فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا {الْمُؤْمِنُون: ۹۹، ۱۰۰} یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آکھڑی ہو گی تو وہ کہے گا کہ: میرے پروردگار!

مجھے واپس بھیج دیجیے۔ تاکہ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں، اس میں جاکر نیک عمل کروں۔ ہرگز نہیں! یہ تو ایک بات ہی بات ہے جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے۔

یہ صرف قبولیت توبہ کی بات ہی نہیں کہ موت سے پہلے پہلے قبول ہوتی ہے، بلکہ کوئی بھی نیکی کا کام موت سے پہلے پہلے ہی کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا {الْمُنَافِقُونَ: ۱۰، ۱۱} اور ہم نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے (اللہ کے حکم کے مطابق) خرچ کرلو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آجائے تو وہ یہ کہے کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے اور مہلت کیوں نہ دے دی کہ میں خوب صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا۔

یہاں فرمایا کہ یہ گناہگار اور نافرمان مرتے دم تک جو گناہوں پر اڑے رہے اور موت دیکھ کر کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں تو ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی، جیسے دوسری جگہ ہے فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ (غافر:۸۴) مطلب یہ ہے کہ ہمارے عذابوں کا معائنہ کرلینے کے بعد ایمان کا اقرار کرنا کوئی نفع نہیں دیتا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بتلا رہے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے وہ موت سے پہلے پہلے کرلو، نیکیاں موت سے پہلے پہلے کرلو، صدقے اور خیراتیں کرلو موت سے پہلے پہلے، نمازیں پڑھ لو موت سے پہلے پہلے، توبہ تائب ہو جاؤ موت سے پہلے پہلے۔

وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ: اور اسی طرح ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہے جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں، جس طرح موت کے ان گناہگاروں اور نافرمانوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی اسی طرح ان لوگوں کی بھی توبہ قبول نہیں ہوتی جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا: ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔ یہ لوگ جو موت سے پہلے پہلے توبہ نہیں کرتے، یہ لوگ جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں، ان کی اُخروی سزا یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عذاب الیم (دردناک) تیار رکھا ہے، یہ عذاب انہیں دہکتی جہنم میں دیا جائے گا، بھڑکتی آگ کے شعلے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں گے، انگارے اور گرم ترین پتھر ان پر برسائے جائیں گے، ہر وہ سزا دی جائے گی جس سے ان کی تکلیف میں اضافہ ہو۔ أَعْتَدْنَا عتید سے ماخوذ ہے اور عتید کا معنی ہے حاضر۔ یہ جملہ توبہ قبول نہ ہونے کی مزید تاکید کر رہا ہے۔ (مظہری) اہل سنت والجماعت کے عقیدے میں جنت اور جہنم دونوں تیار ہو چکی ہیں، عذاب الیم جہنم کی آگ اور جہنم کی شدید ٹھنڈک کے ساتھ دیا جائے گا۔ (تفسیر کبیر للرازی)

فائدہ: جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالم آخرت کے دیکھنے سے پہلے کی توبہ البتہ قبول ہوتی ہے، اتنا فرق ہے کہ حسب تقریر اوّل صورت اوّل میں تو قبول توبہ قاعدہ عدل وانصاف کے موافق ہے اور دوسری صورتوں میں قبول توبہ اس کا محض فضل ہے۔ (عثمانی)

زبردستی عورتوں کی جان ومال کا وارث بننے کی ممانعت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا {۱۹} وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا {۲۰} وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا {۲۱} النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی اپنی میراث بنالو اور نہ (یہ جائز ہے) کہ تم ان کو قید کرلو تاکہ تم ان کو جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ وصول کرلو،

سوائے اس کے کہ وہ کھلی برائی کریں، اور ان کے ساتھ اچھی گذر بسر رکھو، اور اگر تم ان کو پسند نہیں بھی کرتے تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اس میں اللہ نے بہت کچھ بہتری رکھی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدل کر لانا چاہو اور تم ایک کو ڈھیر سارا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو کیا تم اس کو بہتان کے راستہ سے اور کھلا گناہ کر کے لوگے۔ اور تم اس کو کیسے لیتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے ہو اور انہوں نے تم سے خوب پختہ عہد کر لیا ہے۔

شان نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہوتا تو اس کے ورثاء اس کی بیوی کے زیادہ حق دار ہوتے تھے ان میں سے اگر کوئی چاہتا تو اس کی بیوی سے شادی کر لیتا یا اگر وہ چاہتے تو اس کی شادی کسی اور سے کرا دیتے تھے اور اگر چاہتے تو شادی نہ بھی کراتے یہ لوگ عورت کے اپنے میکے والوں سے زیادہ حق دار ہوتے تھے لہٰذا اس معاملے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری)

② مفسرین کا قول ہے کہ دورِ جاہلیت اور آغاز اسلام میں اہل مدینہ کے ہاں رواج تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا اور اس کی بیوی ہوتی تو اس کا سوتیلا بیٹا آتا یا اس عورت کے اہل عصبہ میں سے قریبی آدمی آتا تو وہ اپنا کپڑا اس عورت پر ڈال دیتا تو یہ اس عورت کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حق دار قرار پاتا اگر یہ چاہتا تو بغیر حق مہر دیے اس عورت سے شادی کر لیتا، اس عورت کا حق مہر وہی ہوتا جو میت نے دیا ہوتا اور اگر چاہتا تو اس کی شادی کسی اور کے ساتھ کر دیتا اور اس کا حق مہر خود لے لیتا اس عورت کو کچھ نہ دیتا تھا اور اگر چاہتا تو اسے دوسری شادی سے روک دیتا اور اسے تکلیف پہنچاتا تاکہ اس عورت نے اپنے متوفی خاوند کے ورثے میں جو کچھ پایا ہوتا وہ فدیے میں لے لے یا جب یہ عورت مر جاتی تو یہ اس عورت کا وارث بن جاتا چنانچہ ابو قیس بن الاسلت انصاری فوت ہوا اور اپنی بیوی کبیشہ بنت معن الانصاریہ کو اپنے پیچھے چھوڑا تو اس کا سوتیلا بیٹا اٹھ کھڑا ہوا جس کا نام حصن تھا۔

مقاتل کا کہنا ہے کہ اس کا نام قیس بن ابی قیس تھا اس نے متوفیہ پر اپنا کپڑا ڈال دیا اور اس کے نکاح کا وارث بن گیا اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا اور اس کے قریب نہیں گیا اور اس کو کوئی خرچ وغیرہ نہیں دیا تاکہ اس سے اس کا مال فدیہ میں لے لے اس مقصد کے لیے اس کو تکلیف دیتا رہا کبیشہ

رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور آپ ﷺ سے فریاد کی، اس نے کہا کہ یارسول اللہ! ابو قیس فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا میرے نکاح کا وراث بن گیا اس نے مجھے تکلیف دی اور مجھ پر طوالت کھینچی یعنی عرصے سے یہ صورت حال ہے کہ نہ تو وہ مجھے خرچ دیتا ہے اور نہ میرے پاس آتا ہے اور نہ ہی وہ مجھے آزاد کرتا ہے یعنی مجھے اپنا کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں کرنے دیتا اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم اپنے گھر بیٹھی رہو تا آنکہ تمہارے بارے میں اللہ کا حکم نازل ہو۔

راوی کا کہنا ہے کہ وہ عورت چلی گئی مدینہ میں جب عورتوں نے یہ قصہ سن لیا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور انہوں نے کہا کہ ہماری حالت بھی کبیشہ جیسی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ہمارے سوتیلے بیٹوں نے شادی نہیں کی بلکہ ہم سے چچازادوں نے شادیاں کیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول للواحدی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا: اے اہل ایماں! جبر واکراہ اور زور زبردستی تمہارے لیے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے وارث بن جاؤ، یہ زمانہ جاہلیت میں کیے جانے والے کاموں کی نہی ہے، شان نزول کے مطابق قریبی رشتہ دار بیوہ عورت پر چادر ڈال دیتا تھا، اس سے لوگوں کو روکتا تھا، اگر وہ حسینہ جمیلہ ہوتی تو خود ہی اس سے شادی رچالیتا تھا، اگر دمیمہ (واجبی شکل وصورت، یا بدصورت) ہوتی تو اسے روک کر رکھتا تھا، نہ خود شادی کرتا اور نہ کسی دوسری جگہ شادی کراتا تھا، یہاں تک کہ وہ فوت ہو جاتی اور وہ اس کے مال ودولت کا وراث بن جاتا تھا، یا وہ چاہتا تو اسے دوسروں سے بیاہ دیتا تھا اور مہر خود ہی وصول کر لیتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اہل ایماں کو اس طرح کے شریر کام سے روک دیا ہے۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ: اور تم ان عورتوں کو اس غرض سے قید میں مت رکھو کہ جو مال تم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لے لو، عضل کا معنیٰ تنگی کرنا، قید میں رکھنا، یعنی تم انہیں قید میں نہ رکھو، ان پر عرصہ حیات تنگ نہ کرو تا کہ تم نے جو مہر انہیں دیا ہے اسے قبضہ میں کر لو، یا پھر وہ مجبور ہو کر مال ودولت تمہارے سپرد کر دیں۔

اِلَّآ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ: یہ ایک استثنائی صورت ہے کہ خاوند بیوی سے مہر کب واپس لے سکتا ہے؟ اس بارے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ جب بیوی اِعلانیہ فحاشی کا اِرتکاب کرے تو اس وقت تم ان سے دیا گیا مہر واپس لے سکتے ہو، حضرات مفسرین کرام کی آراء اس بارے میں مختلف ہیں، کہ اس آیت میں علی الاعلان بے حیائی سے کیا مراد ہے؟ عطا خراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد زنا ہے یعنی اگر کوئی عورت زنا کرے تو اس کا شوہر اس کو مہر میں دی ہوئی رقم واپس لے لے پہلے یہی حکم تھا بعد میں جب حدود کے احکام نازل ہوئے کہ کنواری کو سو کوڑے مارے جائیں اور شادی شدہ کو رجم کر دیا جائے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ علی الاعلان بے حیائی سے مراد شوہر سے بغض رکھنا اور اس کی نافرمانی کرنا ہے اگر عورت ایسا کرے تو شوہر اس کو مہر میں دی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ضحاک رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ زنا کا ارتکاب کرنے کی صورت میں اس سے دیا گیا مہر واپس لے سکتا ہے۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو تم نے ان عورتوں کو اپنے نکاح میں اللہ کی امانت سے لیا ہے اور اللہ کی اجازت سے تم نے ان کے جسموں کو اپنے اوپر حلال کیا ہے اور تمہارے ان پر حقوق ہیں اور تم پر ان کے حقوق ہیں، تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی اور کو نہ آنے دیں اور کسی نیک بات میں تمہاری نافرمانی نہ کریں جب وہ یہ کر لیں تو دستور کے مطابق ان کا کھانا پینا اور لباس وغیرہ تم پر لازم ہے۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندی فرماتے ہیں کہ اگر عورت اپنے شوہر کی نافرمانی کرے تو وہ اس سے دی ہوئی چیزیں واپس لے سکتا ہے۔ (تفسیر سمرقندی) شیخ عبد الحق حقانی فرماتے ہیں "ایسا فعل جب مضائقہ نہیں کہ جب عورت کا قصور ہو نہ عام خانہ داری کا قصور بلکہ فاحشہ بینہ یعنی جب اس سے زنا چار گواہوں سے ثابت ہو جاوے

تب اس کو مجبور کر کے مہر واپس لینا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ ایسے وقت بعض علماء کے نزدیک مہر دینا ہی واجب نہیں رہتا۔ (تفسیر حقانی)

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: اور تم ان کے ساتھ نیکی کا سلوک کرو، یہ عورتوں کے شوہروں سے خطاب ہے، یعنی جب عورتیں بے حیائی کا کام نہ کریں اور جائز اور نیکی کے کاموں میں تمہاری اطاعت اور مدد کریں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، ان کو اپنی حیثیت کے مطابق اچھا کھلاؤ اور اچھا پہناؤ۔ (تفسیر تبیان القرآن)

یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت نہیں کرتے ہیں، برا سلوک کرنے والوں سے اللہ مخاطب ہیں، معروف سے مراد مروّت سے پیش آنا، اچھا بول بولنا، اچھا کھانا دینا، رہن سہن کے لیے اچھا مکان دینا، قول و فعل سے تکلیف دینے سے گریز کرنا، غرضیکہ معروف سے مراد ہر وہ اچھائی ہے جو ایک خاوند اپنے بیوی کے ساتھ کر سکتا ہے، اسے اَذیت اور دکھ و تکلیف سے بچائے۔

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا: اگر تم ان عورتوں کو ناپسند کرو، تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھ دے، یعنی جس عورت کی شکل و صورت تم کو ناپسند ہے ہو سکتا ہے کہ اس سے بہت حسین و جمیل اولاد پیدا ہو اور نیک سیرت بچے ہوں، جو بڑھاپے میں تمہارا سہارا بنیں اور ان کی نیکیاں تمہاری بخشش اور نجات کا ذریعہ بن جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خیر کثیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عورت پر مہربانی فرمائیں گے اور آدمی کو اس عورت سے بچہ عطا فرما دے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس بچے میں بہت خیر رکھ دیں گے۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، در منثور)

مجاہد رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ اس کراہت میں خیر کثیر رکھ دیں گے۔ (عبد بن حمید، در منثور) سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ **وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا** سے مراد بچہ ہے۔ (ابن جریر، در منثور) ضحاک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب مرد اور عورت

کے درمیان کوئی بات واقع ہو جائے تو اس کو طلاق دینے میں جلدی نہ کرے اور آہستگی اختیار کرے اور صبر کرے شاید کہ اللہ تعالیٰ اس میں ایسی چیز دکھا دیں جو وہ پسند کرے۔ (ابن المنذر، در منثور) قتادہ رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ یہ بھی ممکن ہے اس (عورت) کو روک لو اگرچہ اس کا روکنا تمہیں ناگوار ہو، تو اللہ تعالیٰ اس میں خیر کثیر کر دیں گے اور حسن رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے قریب ہے کہ وہ اس کو طلاق دے پھر وہ کسی اور عورت سے شادی کرے تو اللہ تعالیٰ اس عورت میں بہت خیر رکھ دے۔ (عبد بن حمید، در منثور)

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا: اگر کسی شخص کے نکاح میں کوئی عورت ہو اور وہ اسے طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہے اس کے متعلق آیت بالا میں ہدایت فرمائی ہے کہ اگر کسی بیوی کو چھوڑ رہے ہو جسے تم مہر میں یا مہر کے علاوہ بھی بطور ہبہ و عطیہ کے بہت سا مال دے چکے ہو تو اس مال میں سے کچھ نہ لو، اول تو طلاق دینا ہی مبغوض چیز ہے پھر ایسی عورت کو جو ایک عرصہ ساتھ رہی ہے خصوصاً جبکہ اس کا کوئی قصور نہ ہو اس کو طلاق دینا اور جو مال اس کو دے دیا ہو وہ اس سے واپس لے لینا اخلاق اسلامیہ کے خلاف ہے، اس قسم کے مواقع میں عورتیں مال واپس کرنے سے گریز کرتی ہیں، لہٰذا مال لینے کے لیے طرح طرح سے انہیں تنگ کیا جاتا ہے یا ان پر کسی طرح کی تہمت رکھ دی جاتی ہے یا زبردستی چھین لیا جاتا ہے، یہ سراپا ظلم ہے اس سے منع فرمایا۔

قنطار: سے مراد مال کثیر ہے، شَيْـًٔا سے مراد تھوڑا سا مال ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا قنطار بارہ ہزار ہیں، ابو نضرہ العبدی رحمہ اللہ نے کہا بیل کی کھال میں جتنا سونا بھرا جا سکے وہ قنطار ہے، حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا اس سے مراد بارہ ہزار ہیں، مجاہد رحمہ اللہ نے کہا اس سے مراد ستر ہزار دینار ہیں، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا اس سے مراد بارہ سو اوقیہ ہیں (ایک اوقیہ، چالیس درہم کے برابر ہے) مجاہد رحمہ اللہ سے ایک اور روایت ہے کہ اس سے مراد ستر ہزار مثقال ہیں۔ (سنن دارمی، تبیان القرآن)

اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا: کیا تم اس مال کو باطل طور پر اور کھلے ہوئے گناہ کا ارتکاب کر کے لو گے؟ بھتانا اور اثماً حال ہیں بمعنی اسم فاعل یا مفعول لہٗ ہیں، بھتان کا معنی ہے باطل قول (تہمت) باطل فعل میں بھی اس کا استعمال آیا ہے، یہاں باطل فعل ہی مراد ہے، اسی لیے بھتانا کا تفسیری معنی ظلماً کیا گیا ہے، بعض روایات میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص سابق عورت کی جگہ جدید عورت سے نکاح کرنا چاہتا تھا تو پہلی عورت پر زنا کی تہمت لگاتا تھا تاکہ وہ مجبور ہو کر کچھ مال دے کر اپنی گلو خلاصی کرالے (اس صورت میں بھتانًا سے مراد ہو گا باطل قول) اَتَاْخُذُوْنَهٗ میں استفہام انکاری زجر آگیں ہے۔ (یعنی ایسا نہ کرنا چاہیے یا ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں) (مظہری)

وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ: جو مال تم نے اپنی بیوی کو دے دیا ہے حالانکہ تم ایک دوسرے سے بے حجاب ہو کر مل بھی چکے ہو، وہ اپنی ذات تمہارے حوالے کر چکی ہے (اور مہر اسی کا عوض ہے) تو اب اس عوض کو جو تم دے چکے ہو کس طرح واپس لو گے؟ یہ تو عقلاً بھی برا ہے اور مزید یہ ہے کہ وہ عورتیں تم سے مضبوط اقرار لے چکی ہیں کہ تم نے جو مہر مقرر کیے وہ مہر ادا کرو گے، لہٰذا اس عہد کی خلاف ورزی کرنا عقلاً و شرعاً مذموم ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ بوقت نکاح ادائے مہر کا عہد و پیمان ہوا، پھر آپس میں مل کر بے حجابانہ میل جول بھی رکھتے رہے اب ان کو مجبور کرنا کہ مال واپس کرو یا معاف کرو یہ سراپا ظلم و جور ہے۔ (انوار البیان) اِفضاء کا معنی ہے فضاء یعنی صحراء میں داخل ہو جانا، یہاں فضاء میں داخل ہونے سے مراد ہے خالی مکان میں (جہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو) داخل ہو جانا۔ (مظہری) لیکن اللہ تعالیٰ نے اس لفظ میں کنایہ کے طور پر بات کی ہے، جو کہ ایک باریک نکتہ ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: خلوت صحیحہ سے (پورا) مہر پختہ ہو جاتا ہے خواہ جماع نہ کیا ہو۔ (مظہری)

وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا: اور تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں، پختہ عہد و پیماں سے مراد وہ عہد ہے جو نکاح کے وقت مرد سے لیا جاتا ہے کہ تم اسے اچھے طریقے سے آباد کرنا یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا۔ حسن، ابن سیرین، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک پختہ عہد سے مراد عورت کے ولی کا یہ قول ہے کہ میں نے اس عورت کو تیرے نکاح میں ان شرائط و حقوق کے بموجب دیا جو اللہ نے

عورتوں کے لیے مردوں پر رکھے ہیں یعنی ضابطہ اور دستور کے مطابق نکاح میں رکھنا یا خوبی کے ساتھ آزاد کر دینا۔ (مظہری) شعبی اور عکرمہ نے کہا پختہ عہد سے وہ مضمون مراد ہے جو حدیث مسلم میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَآءِ، فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ، وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو تم نے ان کو بامان خدا لیا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو بحکم خدا اپنے لیے حلال بنایا ہے۔ (رواہ جابر)

وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے

سوال ان آیات میں ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے نکاح حرام ہے، تفسیر کیجیے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا {۲۲} حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۲۳} النساء

جواب ترجمہ: اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرنا مگر (جاہلیت میں جو ہو چکا سو ہو چکا) یہ نہایت بے حیائی اور (خدا کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔ تم پر حرام کر دی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، اور بھتیجیاں اور بھانجیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، اور تمہاری دودھ شریک بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں (ساسیں)، اور تمہارے زیر پرورش تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری ان بیویوں (کے پیٹ) سے ہوں جن کے ساتھ تم نے خلوت کی ہو۔ ہاں اگر تم نے ان کے ساتھ خلوت نہ کی ہو (اور انہیں طلاق دے دی ہو یا ان کا انتقال ہو گیا ہو) تو تم پر (ان کی لڑکیوں سے نکاح

کرنے میں) کوئی گناہ نہیں ہے، نیز تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں، اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرو، البتہ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ ہو چکا۔ بیشک اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

شان نزول: ① یہ آیت حصن بن ابی قیس کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنے باپ کی بیوی یعنی اپنی سوتیلی ماں سے شادی کی تھی جس کا نام کبیشہ تھا، دوسرا شخص جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی الاسود بن خیف جس نے اپنے باپ کی بیوی یعنی اپنی سوتیلی ماں سے شادی کی تھی، تیسرا شخص صفوان بن امیہ بن خلف تھا جس نے اپنی سوتیلی ماں فاختہ بنت الاسود بن المطلب سے شادی کی تھی اور چوتھا شخص منظور بن زبان تھا جس نے اپنے والد کی بیوی یعنی اپنی سوتیلی ماں ملیکہ بنت خارجہ سے شادی کی تھی۔ (اسباب النزول)

② اشعث بن سوار کا قول ہے کہ ابو قیس فوت ہو گیا یہ شخص انصار کے نیکوکار لوگوں میں سے تھا اس کے بیٹے قیس نے اپنے باپ کی بیوی کے ساتھ منگنی کی تو اس نے اس سے کہا کہ میں تم سے ایک بچے کا وعدہ کرتی ہوں لیکن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر ان کی اجازت لوں گی چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اس نے آپ ﷺ کو اس صورت حال کی اطلاع دی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (۲۲) نازل کی۔ (اسباب النزول للواحدی)

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ: جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہے ان سے نکاح نہ کرنا۔ کلام عرب میں نکاح کا اصل معنی وطی ہے اور تزوج کو بھی نکاح کہتے ہیں کیونکہ تزوج وطی مباح کا سبب ہے۔ (لسان العرب) نکاح کا اصل معنی وطی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ وطی کے لیے عقد کرنے کو بھی نکاح کہا جاتا ہے کیونکہ یہ وطی مباح کا سبب ہے، قرآن مجید میں نکاح عقد کے معنیٰ میں مستعمل ہوا ہے کیونکہ وطی جماع کے لیے صریح ہے اور عقد جماع سے کنایہ ہے اور بلاغت اور ادب کے بھی موافق ہے۔ (تاج العروس)

زمانہ جاہلیت میں لوگ مرنے والے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا کرتے تھے، ابتداء اسلام میں بعض ایسے واقعات پیش آئے، پھر ہمیشہ کے لیے باپ کی بیوی سے نکاح کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا، واضح رہے کہ جس کسی بھی عورت سے کسی شخص نے نکاح کر لیا صرف نکاح کر لینے سے ہی وہ عورت اس شخص کے بیٹوں پر حرام ہو گئی باپ کے ساتھ اس عورت کی خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میرے ماموں ابو بردہ رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے ان کے پاس ایک جھنڈا تھا میں نے کہا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی طرف بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کا سر کاٹ کر لاؤں۔ (مشکوٰۃ بحوالہ انوار البیان) باپ کی منکوحہ بیٹے کی ماں ہے اور جو شخص اپنی ماں یا کسی اور محرم کے ساتھ نکاح کرے اس کی سزا اسلام میں یہ ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے اور اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ (تبیان القرآن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا زمانہ جاہلیت میں لوگ محرمات کو حرام قرار دیتے تھے لیکن اپنے باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) سے نکاح کو جائز سمجھتے تھے، اسی طرح دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا بھی جائز سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کاموں کو حرام قرار دیدیا۔ (تبیان)

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: آیت نے اس بے شرمی کو ممنوع قرار دیا، البتہ جن لوگوں نے اسلام سے پہلے ایسا نکاح کیا تھا ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ پچھلا گناہ معاف ہے کیونکہ اسلام لانے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اس آیت کے نزول کے بعد نکاح کا یہ تعلق ختم کر لیا جائے۔ (ترجمان القرآن)

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا: ایسا کرنا بے حیائی ہے، مبغوض چیز ہے، اور بہت برا راستہ ہے، مقت اور ممقوت، مبغوض اور نفرت انگیز شے یا فعل کو کہتے ہیں، باپ کی منکوحہ سے نکاح کے لیے زواج المقت کی تعبیر مشہور رہی ہے، اسی طرح اس شخص کو مقتی کہتے تھے جو اس فعل شنیع کا مرتکب ہوا ہو۔ (تدبر قرآن، تفسیر عثمانی) ایسا کرنا اس قدر مبغوض، شنیع اور ناپسندیدہ عمل ہے کہ حضرت براء کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی طرف بھیجا تھا جس نے اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا کہ اس کا سر قلم کر لائیں۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ: اُمہات اُم کی جمع ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ تم پر تمہاری مائیں حرام کردی گئی ہیں، یعنی ماں کے ساتھ نکاح حرام ہے، امہات کے عموم میں دادیاں اور نانیاں بھی داخل ہیں۔

وَبَنٰتُكُمْ: بنات بنت کی جمع ہے، اس کا معنیٰ ہے بیٹی، مراد یہ کہ اپنی صلبی بیٹی سے نکاح حرام ہے، نواسی سے بھی نکاح حرام ہے، پوتی سے بھی نکاح حرام ہے، اسی طرح پڑپوتی، پڑنواسی سے بھی نکاح حرام ہے۔ جس لڑکی کو محض گود لے کر پال رکھا ہو اس سے اور اس کی اولاد سے نکاح جائز ہے، اس میں صرف اتنی شرط ضرور ہے کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی دوسری حرمت نہ آئی ہو، اسی طرح اگر کسی نامراد نے کسی عورت سے زنا کیا، اس زنا کی وجہ سے جو لڑکی پیدا ہوئی ہے اس سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے۔

وَاَخَوٰتُكُمْ: اخوات اختٌ کی جمع ہے، اس کا معنیٰ ہے بہن، مراد یہ کہ حقیقی بہن سے بھی نکاح حرام ہے، علّاتی بہن (باپ شریک) سے بھی نکاح حرام ہے، اَخیافی بہن (ماں شریک) سے بھی نکاح حرام ہے۔

وَعَمّٰتُكُمْ: عمات عمّۃٌ کی جمع ہے، عمّۃٌ کا معنیٰ ہے پھوپھی، پھوپھی والد کی حقیقی بہن کو کہا جاتا ہے، والد کی علاتی اور اَخیافی بہن سے بھی نکاح حرام ہے، ان تینوں طرح کی پھوپھیوں سے نکاح نہیں ہو سکتا۔

وَخٰلٰتُكُمْ: خالات خالہ کی جمع ہے، خالہ والدہ کی حقیقی بہن کو کہا جاتا ہے، والدہ کی حقیقی، علاتی، اَخیافی تینوں طرح کی بہنوں کے ساتھ نکاح حرام ہے۔

وَبَنٰتُ الْاَخِ: اسی طرح بھائی کی لڑکیوں یعنی بھتیجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، حقیقی ہو علاتی ہو یا اخیافی ہو، تینوں طرح کے بھائیوں کی لڑکیوں سے نکاح حلال نہیں ہے۔

وَبَنٰتُ الْاُخْتِ: بہن کی لڑکیوں یعنی بھانجیوں سے بھی نکاح حرام ہے اور یہاں بھی وہی تعمیم ہے کہ بہنیں خواہ حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی ان کی لڑکیاں شرعاً نکاح میں نہیں آسکتیں۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ: جن عورتوں کا دودھ پیا ہے اگرچہ وہ حقیقی مائیں نہ ہوں وہ بھی حرمت نکاح کے بارے میں والدہ کے حکم میں ہیں اور ان سے بھی نکاح حرام ہے، تھوڑا سا دودھ پیا ہو یا زیادہ،

ایک مرتبہ پیا ہو یا متعدد دفعہ پیا ہو، ہر صورت میں یہ حرمت ثابت ہو جاتی ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو حرمت رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ (معارف القرآن)

البتہ اتنی بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حرمت رضاعت اسی زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے فَإِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ (بخاری و مسلم) یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہو گی، وہ اسی زمانہ کے دودھ پینے سے ہو گی جس زمانہ میں دودھ پینے ہی سے بچے کا نشو و نما ہوتا ہے۔

اور یہ مدت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بچے کی پیدائش سے لے کر ڈھائی سال تک ہے اور دیگر فقہاء کے نزدیک جن میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ بھی ہیں، صرف دو سال کی مدت تک رضاعت ثابت ہو سکتی ہے اور اسی پر امام محمد رحمہ اللہ کا فتویٰ بھی ہے اگر کسی لڑکے لڑکی نے اس عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہو گی۔

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ: رضاعت کے رشتہ سے جو بہنیں ہیں ان سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، تفصیل اس کی یوں ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے ایام رضاع میں کسی عورت کا دودھ پی لیا، وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا اور اس عورت کی نسبی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے اور اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں اور اس عورت کا جیٹھ دیور ان بچوں کے رضاعی چچا بن گئے اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں اور باہم ان سب میں حرمت رضاعت ثابت ہو گئی، نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہے رضاعت کے رشتہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الوِلَادَةِ (بخاری) رضاعت کی وجہ سے وہ رشتہ حرام ہے جو ولادت کی وجہ سے حرام ہے۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ: تمہاری بیویوں کی مائیں تم پر حرام کی گئیں ان سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا، کسی عورت سے نکاح ہو جانا ہی اس کی ماں سے نکاح ہونے کی حرمت کے لیے کافی ہے، بیوی سے خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ (انوار البیان)

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ ۪: جن عورتوں سے تم نے نکاح کیا ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جنہیں تم گودوں میں لیتے ہو اور کھلاتے ہو ان لڑکیوں سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، بشرطیکہ تم نے ان لڑکیوں کی ماؤں سے جماع کیا ہو، اگر کسی عورت سے نکاح تو کر لیا لیکن جماع نہیں کیا پھر اسے طلاق دے دی تو اس عورت کی پہلے شوہر والی لڑکی سے نکاح جائز ہے۔ فِیْ حُجُوْرِكُمْ قید احترازی نہیں ہے جس بیوی سے نکاح کر کے جماع کر لیا اس کی لڑکی سے نکاح درست نہیں اگرچہ کسی دوسرے رشتہ دار کے پاس پرورش پاتی ہو اور اس کی گود میں پلتی ہو۔ (انوار البیان)

ربائب ربیبہ کی جمع ہے، ربائب وہ اولاد جو اس عورت کے پچھلے خاوند کی ہے۔ کسی شخص کی بیوی کے پچھلے خاوند سے بیٹی کے ساتھ نکاح بھی جائز نہیں ہے۔ حجور حجر کی جمع ہے اس کا معنٰی پرورش میں لینا، گود میں لینا۔

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ: تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشتوں سے ہیں وہ بھی تم پر حرام ہیں، اس میں بھی عموم ہے حرمت کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ بیٹے نے کسی عورت سے نکاح کر لیا ہو، نکاح کے بعد جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو بہر حال اب نکاح کرنے والے کے باپ سے اس عورت کا نکاح حرام ہو گا۔ (انوار البیان) منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح حلال ہے اور رضاعی بیٹا بھی نسبی بیٹے کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔ حلائل حلیلہ کی جمع ہے اس کا معنٰی بیوی۔ خاوند کو حلیل کہتے ہیں، کیونکہ بیوی خاوند کے لیے اور خاوند بیوی کے لیے حلال ہوتا ہے۔

مسئلہ: پوتوں کی بیویوں سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔ مسئلہ: رضاعی بیٹے کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ: دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔ حقیقی بہنیں ہوں یا علّاتی ہوں یا اَخیافی، نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں، یہ حکم سب کو شامل ہے، البتہ طلاق

ہو جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے لیکن یہ جواز عدت گزرنے کے بعد ہے عدت کے دوران نکاح جائز نہیں ہے۔

فائدہ: جس طرح دو بہنوں کو بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح سے پھوپھی اور بھتیجی خالہ اور بھانجی ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی عورت کا اس کی پھوپھی پر یا پھوپھی کا اس کے بھائی کی بیٹی پر اور کسی عورت کا اس کی خالہ پر یا خالہ کا اپنی بہن کی بیٹی پر نکاح کیا جائے نہ بڑی کا نکاح چھوٹی پر کیا جائے اور نہ چھوٹی کا بڑی پر کیا جائے۔ (ترمذی و ابوداؤد، انوار البیان)

فائدہ: حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ جن دو عورتوں میں ایسا رشتہ ہو کہ ان میں سے کسی ایک کو مرد فرض کر لیا جائے تو دونوں کا آپس میں نکاح نہ ہو سکے ایسی دو عورتیں بھی بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ (انوار البیان)

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: یہاں جن جن عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے ان کی فہرست بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ جو کچھ اس سے پہلے دورِ جاہلیت میں ہو چکا ہے وہ معاف ہے، کیونکہ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے جن لوگوں کے جو جرائم و گناہ ہوتے ہیں انہیں معافی دے دی جاتی ہے، وہ جو پہلے گزر چکا، وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا، اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ (ذخیرۃ الجنان) دو بہنوں کو ایک شخص کے نکاح میں ممنوع قرار دیتے ہوئے ماضی میں کیے گئے اس طرح کے نکاح کے بارے میں فرمایا کہ جو گزر چکا گزر چکا، اب ایسا نہیں کرنا۔ (قرطبی)

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت ان تمام محرمات کو جانتے تھے مگر باپ کی بیوہ اور نکاح اُختین مروّج تھا اسی لیے ان کے متعلق الا ماقد سلف فرمایا۔ (مدارک التنزیل) مطلب یہ ہے کہ اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے اگر کسی شخص نے محرمات سے نکاح کیا ہو تو چونکہ اس وقت تک حکم شرعی نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ معاف ہے، مگر جو عورتیں حرام ہیں، ان سے نکاح باقی نہیں رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے، ان رشتوں کے حرام ہونے سے پہلے ان لوگوں سے جو گناہ ہو چکا ہے وہ انہیں معاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحیم ہے اسی لیے تو انہیں سابقہ کیے پر سزا نہیں دے گا۔

شوہر والی عورتوں سے نکاح حرام

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۲۴} النساء

جواب ترجمہ: اور حرام ہیں وہ عورتیں جو کسی مرد کے نکاح میں ہوں سوائے ان عورتوں کے جن کے تم مالک ہو جاؤ۔ اللہ نے ان احکام کو تم پر فرض فرما دیا ہے، اور تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں وہ عورتیں جو ان کے علاوہ ہیں کہ تم اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو اس حال میں کہ تم پاک دامنی اختیار کرنے والے ہو، پانی بہانے والے نہ ہو، سو ان میں سے جن عورتوں سے نفع حاصل کر لو ان کے مہر دے دو جو مقرر ہو چکے ہیں اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ مقرر مہر کے بعد آپس کی رضا مندی سے کسی بات پر راضی ہو جاؤ بلاشبہ اللہ علیم ہے حکیم ہے۔

شان نزول: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگ اَوطاس میں ہمارے ہاتھ قیدی عورتیں لگ گئیں جن کے خاوند تھے ہم نے ان کی مقاربت کرنا مکروہ جانا ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اس پر یہ آیت وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ نازل ہوئی تو ہم نے ان قیدی عورتوں سے جنسی تعلق کو حلال اور جائز کر لیا۔ (اسباب النزول)

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ: شادی شدہ عورتوں کے ساتھ نکاح بھی تمہارے اوپر حرام کر دیا گیا ہے، جب کسی عورت کا کسی مرد سے نکاح ہو گیا ہو اگرچہ رخصتی ابھی نہ ہوئی ہو تو اس کا نکاح کسی

دوسرے مرد سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ عورت اپنے شوہر کے نکاح سے نہ نکلے اس کا شوہر مر جائے یا طلاق دیدے اور پھر اس کی عدت گزر جائے تب کسی دوسرے مرد سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔

محصنات اِحصان سے ہے، احصان عربی لغت میں روکنے اور منع کرنے کو کہتے ہیں، اسی سے لفظ حصانت بھی ہے جس کا معنیٰ محفوظ ہے، اس کا معنیٰ حفاظت بھی ہے، اسی سے قلعے کو حصن، حصین کہتے ہیں کیونکہ وہ اس شخص کو اندر داخل ہونے سے روکتا ہے جو برائی کا ارادہ رکھتا ہے، حِصان (بالکسر) گھوڑے کو کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی اپنے مالک کو ہلاکت سے بچاتا ہے، حَصان (بالفتح) پاکدامن عورت کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی شرمگاہ کو خرابی سے بچاتی ہے، محصنات اسم مفعول ہے، جمع مؤنث ہے، اس کا واحد مُحْصَنَةٌ ہے شوہر والی عورت، جب کہ مُحْصِنَةٌ اسم فاعل ہے ہر پاکدامن عورت۔

لفظ اِحصان قرآن کریم میں چار معانی کے لیے آیا ہے، ① آزادی: ارشاد ہے وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ اور تم میں جو آزاد ایمان والی عورتوں سے نکاح پر قدرت نہ رکھتا ہو، یہاں محصنات کا معنیٰ ہے آزاد عورتیں۔ ② عفت: ارشاد ہے وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (الْأَنْبِيَاءِ: ۹۱) یعنی اس نے اپنی عفت محفوظ رکھی۔ ③ اسلام: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَإِذَا أُحْصِنَّ اس کی تفسیر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ اسلام لائیں۔ ④ عورت کا خاوند والی ہونا، ارشاد قرآنی وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ میں یہی مراد ہے یعنی شادی شدہ عورت۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: یعنی جو عورتیں میدان جنگ میں پکڑی جائیں اور ان کے خاوند دارالحرب میں رہ جائیں تو ان کا سابقہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور حکومت اسلامیہ اس عورت کو جس سپاہی کے حصہ میں دے وہ اس سے ہم بستری کر سکتا ہے، جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہمیشہ سے حکومتوں کے لیے دردسر کا سبب بنا رہا ہے، اسلام نے اپنی فطری سادگی سے اس کا حل پیش کیا ہے کہ اگر جنگ میں دشمن قوم کے مرد اور عورتیں اسیر بن کر آئیں تو حکومت اسلامیہ کو اختیار ہے چاہے تو انہیں آزاد کر دے، چاہے تو ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دے، چاہے تو مسلمان قیدیوں کے ساتھ ان کا تبادلہ کر لے اور اگر مصلحت

عامہ کا تقاضا یہ ہو کہ انہیں اسیر ہی رکھا جائے تو پھر اس کی اجازت ہے لیکن کیسے ؟ جاپان، جرمنی اور روس کے قیدی کیمپوں کا یہاں کوئی وجود نہیں جہاں انہیں بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہو، انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتی ہوں اور ان سے رات دن جبری مزدوری لی جاتی ہو، بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے، ہر سپاہی اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھے، جو اسیر عورت کسی کے حصہ میں آئے وہ ایک ماہواری گزرنے کے بعد اس سے صحبت کر سکتا ہے، اگر اس کے شکم سے اولاد پیدا ہوئی تو اس کے حقوق بالکل ویسے ہوں گے جیسے دوسری اولاد کے، اب وہ اس لونڈی کو فروخت بھی نہیں کر سکتا اور اس کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد بھی ہو جائے گی۔ (ضیاء القرآن)

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ : اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی حرمت تم پر فرض کر دی ہے، تمہارے اوپر یہ بات کتاب میں لازم کر دی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کو لازم پکڑو، یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر لکھت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر ان کا حرام ہونا لکھ دیا ہے جو تم پر کتاب میں حرام کی گئی ہیں، وہ حلال ہیں جو کتاب میں تم پر حلال کی گئی ہیں، یعنی چار عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ : یعنی جو محرمات اب تک مذکور ہوئیں ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں، مثلاً چچا کی لڑکی، خالہ کی لڑکی، ماموں زاد بہن، ماموں چچا کی بیوی ان کی وفات یا طلاق دینے کے بعد بشرطیکہ یہ مذکورہ اقسام اور کسی رشتہ سے محرم نہ ہوں اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی، جب وہ طلاق دیدے یا وفات پا جائے، بیوی مر جائے تو اس کی بہن کے ساتھ، وغیرہ، بے شمار صورتیں بنتی ہیں، ان سب کو مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے عموم میں داخل فرما دیا۔ (معارف القرآن)

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ : یعنی محرمات کا یہ بیان تمہارے لیے اس لیے کیا گیا ہے کہ اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو اور ان کو اپنے نکاح میں لاؤ۔ ابو بکر جصاص رحمہ اللہ احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نکاح مہر سے خالی نہیں ہو سکتا (حتی کہ اگر زوجین آپس میں یہ طے کر لیں کہ نکاح بغیر مہر کے ہو گا تب بھی مہر لازم ہو گا) دوسری یہ بات معلوم

ہوئی کہ مہر وہ چیز ہونی چاہیے جس کو مال کہا جاسکے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہونا چاہیے، ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے۔

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: یعنی اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں طلب کرو اور یہ سمجھ لو کہ عورتوں کی تلاش عفت و عصمت کے لیے ہے جو نکاح کا اہم مقصد ہے اور نکاح کے ذریعہ اس چیز کو حاصل کرو، مال خرچ کر کے زنا کے لیے عورتیں تلاش نہ کرو، اس سے معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زنا کار بھی مال خرچ کرتے ہیں لیکن وہ مال خرچ کرنا بھی حرام ہے اور اس مال کے ذریعہ جو عورت حاصل کی جائے اس سے استمتاع حلال نہیں ہوتا۔ لفظ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ بڑھا کر زنا کی ممانعت فرماتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ زنا میں صرف شہوت رانی، سفح ماء (پانی بہانا) مقصود ہوتا ہے، کیونکہ اس سے طلب اولاد اور ابقاء النسل (نسل باقی رکھنے) کا ارادہ نہیں ہوتا، مسلمانوں کو پاک دامن رہنے اور تکثیر نسل انسانی کے لیے اپنی قوت کو بر محل خرچ کرنا چاہیے، جس کا طریقہ ملک نکاح اور ملک یمین ہے۔ (تفسیر معارف القرآن)

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً: یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے استمتاع کر لو تو ان کے مہر دیدو، یہ دینا تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔ اس آیت میں استمتاع سے بیویوں سے ہمبستر ہونا اور وطی کرنا مراد ہے، اگر محض نکاح ہو جائے اور رخصتی نہ ہو اور شوہر کو استمتاع کا موقع نہ ملے، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی طلاق دیدے تو آدھا مہر واجب ہوتا ہے اور اگر استمتاع کا موقع مل جائے تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے، اس آیت میں خصوصی توجہ دلائی ہے کہ جب کسی عورت سے استمتاع کر لیا تو اس کا مہر دینا ہر طرح سے واجب ہو گیا، اس میں کوتاہی کرنا شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے اور انسانی غیرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جب نکاح کا مقصد حاصل ہو گیا تو بیوی کے حق میں کوتاہی اور ٹال مٹول نہ ہو، البتہ شریعت عورت کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ مہر اگر معجل ہے تو مہر کی وصولی تک وہ شوہر کے پاس جانے سے انکار کر سکتی ہے۔ (معارف القرآن)

علماء اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ آیت، فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً میں نکاح صحیح کے ذریعہ نفع اٹھانا مراد ہے اور اُجُوْرَهُنَّ سے منکوحہ عورتوں کے مہر مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تم جن عورتوں سے نکاح کر کے خلوت یا صحبت کا نفع اٹھا چکے ہو تو ایسی عورتوں کا پورا مہر دینا تمہارے ذمہ واجب ہے جیسا کہ دوسری جگہ، وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً، آیا ہے چنانچہ اُجُوْرَهُنَّ کے بعد فریضہ کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا ہے کہ نکاح صحیح کے بعد اگر خلوت صحیحہ کی نوبت آجائے تو جتنا مہر مقرر ہوا ہے وہ سارا دینا آئے گا اور اس آیت میں فریضہ کا لفظ ایسا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ اور اگر خلوت اور صحبت سے پہلے ہی ان کو طلاق دے دی تو پھر تم پر پورا مہر واجب نہ ہو گا بلکہ نصف مہر واجب ہو گا۔ (معارف القرآن ادریسی)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ: اس میں یہ بتایا ہے کہ مہر مقرر کرنے کے بعد آپس میں میاں بیوی جس بات پر مہر کے سلسلے میں خوشی کے ساتھ راضی ہو جائیں اس میں کچھ حرج نہیں۔ مثلاً یہ کہ عورت بخوشی پورا مہر معاف کر دے یا کچھ چھوڑ دے یا شوہر مہر میں اپنی طرف سے اضافہ کر دے تو یہ سب درست ہے اس میں کوئی گناہ نہیں، اگر عورت مہر معجل کو مؤجل کر دے یعنی یہ مان لے کہ میرا مہر بعد میں دے دینا تو یہ بات بھی درست ہے۔ (انوار البیان)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ علم والا ہے، وہ حکمت والا ہے اس نے اپنے بندوں کے حالات اور طبیعتیں جانتے ہوئے احکامات شرعیہ نازل فرمائے، اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ تمام احکامات حکمت پر مبنی ہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات اور طے کردہ اوامر کے مطابق عمل کریں گے تو اس کا انہیں فائدہ ملے گا، اس کا کوئی حکم بندوں کے نقصان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے، جو لوگ احکام خداوندی کی تعمیل کی بجائے نافرمانی کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے گا، عافیت و نجات کا راستہ یہی ہے کہ انسان اوامر خداوندی کی تعمیل کرتا جائے، نواہی سے بچتا جائے، اس کی حکمتوں کو پیش نظر رکھے۔

متعہ اور اسلام

بعض لوگوں نے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ سے متعہ کا جواز نکالا ہے حالانکہ متعہ ہماری شریعت میں ہر گز جائز نہیں، ابتدائے اسلام کے زمانہ میں بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے اس کو روا رکھا گیا تھا، پھر جب مسلمانوں کو غلبہ حاصلہ ہو گیا اور وہ مجبوریاں رفع ہو گئیں تو متعہ یعنی وقتی نکاح کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیدیا گیا، ظاہر ہے کہ کسی خاص مدت کے لیے نکاح کرنے سے نہ تو حقوق کما حقہ ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی اولاد صحیح ثابت ہوتی ہے، زوجین کے دیگر حقوق کا بھی تعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دو چار ماہ یا جو بھی مدت مقرر ہوئی، اس کے ختم ہونے پر نکاح خود بخود ختم ہو گیا۔

لہٰذا اس قسم کا نکاح جائز نہیں ہے مسلم شریف اور احادیث کی دیگر کتب میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث منقول ہے جس کی رو سے متعہ کو ابدی طور پر حرام قرار دیا گیا ہے، لہٰذا عورتوں سے استفادہ کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو باقاعدہ عقد نکاح ہو یا پھر لونڈی ہو، اس کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں، اگر کوئی ایسی صورت پیدا کرے گا تو وہ باطل ہو گی، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی ترمذی شریف میں منقول ہے کہ پہلے وہ متعہ کے قائل تھے مگر بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے کہ نکاح اور لونڈی کے علاوہ كُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا حَرَامٌ ہر ذریعہ شہوت رانی حرام ہے۔ (معالم العرفان)

اہل تشیع یہاں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ سے متعہ مراد لیتے ہیں، یعنی وہ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ جن عورتوں سے تم متعہ کروا نہیں ان کا کرایہ یعنی پے منٹ ادا کر دو، حالانکہ اس آیت کا متعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ گزشتہ آیات میں نکاح ہی کی بات آ رہی ہے تو یہاں بھی نکاح ہی مراد ہے۔ (برہان القرآن)

اسْتَمْتَعْتُمْ میں سین طلب کے لیے نہیں ہے بلکہ تاکید کے لیے ہے۔ (المقتطف) اسی سے متعہ کا لفظ بھی مشہور عام ہے، روافض کی تفسیر قمی میں امام صادق رحمہ اللہ کی طرف منسوب یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت متعہ پر دلیل ہے۔ (تفسیر قمی جلد اول) محسن کاشانی نے تفسیر صافی میں اس مقام

پر استمتاع سے متعہ ثابت کرنے کے لیے ابی نضرہ کی ایک روایت پیش کی ہے کہ جب انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متعہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے سورۃ النساء کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متعہ کے ثبوت کا ذکر کیا۔ (تفسیر صافی) نکاح متعہ کو ثابت کرنے کے لیے ایک خانہ ساز روایت صافی میں یہ بھی نقل کی گئی کہ استمتاع کے بعد مدت کا ذکر کیا گیا، جس کے لیے اجل مسمّٰی کے الفاظ آیت میں شامل کیے گئے۔

متعہ کا لغوی معنٰی فائدہ اٹھانے کے ہیں، روافض کے ہاں متعہ کا مفہوم یہ ہے کہ تنہائی میں مرد اور عورت ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں، مرد عورت سے یوں کہے کہ میں تمہیں اتنی رقم دوں گا تم میری نفسانی خواہش پوری کرو، وہ قبول کرلے، پھر اس کی نفسانی خواہش پوری کرنے کے بعد نہ وہ اس کی بیوی ہے اور نہ ہی یہ مرد اس کا شوہر ہے، رافضیوں کے نزدیک متعہ کا یہ مفہوم ہے، اپنے مسلک و مشرب کو عام کرنے کے لیے انہوں نے متعہ کے خانہ ساز بے شمار فضائل بیان کیے ہیں۔

رافضی کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص متعہ کرنے کے بعد غسل کرتا ہے تو غسل کے پانی کے ایک ایک قطرہ سے ستر ستر فرشتے جنم لیتے ہیں، جو اس کے لیے ساری عمر دعاؤں میں مشغول رہتے ہیں، یہ روافض کے خانہ ساز فضائل ہیں، شریعت اسلام اس بارے میں کچھ نہیں بولتی، قرآنی تعلیمات اور نبوی فرمودات میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے، اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں بھی اس بارے میں کوئی روایت نہیں ہے، جس میں متعہ کے یہ فضائل بیان کیے گئے ہوں، البتہ متعہ کے حرام اور ناجائز ہونے پر کتاب و سنت کے بہت سے دلائل ہیں، جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

قرآنی تعلیمات اور متعہ

کس ڈھٹائی اور جرأت کے ساتھ خانہ ساز روایات سے لوگوں کے اذہان کو ایک ایسے کام کی طرف متوجہ کر دیا گیا کہ لوگ اسی کو حقیقت جاننے اور سمجھنے لگے، پھر لوگوں کا ذہن یہ بنایا گیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اگر متعہ پر پابندی نہ لگاتے تو شاید ہی کوئی بدبخت بدکاری کرتا، یا وہ اس پر پابندی نہ لگاتے تو بہت کم لوگ بدکاری کا ارتکاب کرتے، جس کے پاس چار پیسے ہوتے وہ نکاح متعہ کر

لیتا اور گناہوں سے بچ جاتا، اس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں اور قرآنی تعلیمات کی طرف توجہات مرکوز نہیں کرنے دی جاتیں، حالانکہ نظر انصاف سے ملاحظہ فرمایئے کہ قرآنی تعلیمات کیا کہتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذَالِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ (المعارج:۲۹ تا ۳۱) اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہاں ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں جن کے وہ مالک ہیں انہیں کوئی ملامت نہیں۔ اب جو کوئی اس کے علاوہ اور (راستہ) ڈھونڈھے گا تو ایسے لوگ حد سے گزر جانے والے ہوں گے۔

یہاں جائز خواہش نفس پورا کرنے کے دو ہی محل بتائے گئے ہیں، ایک اپنی منکوحہ بیویاں اور دوسری میدان کارزار سے سپہ سالار کے حکم سے ملنے والی باندیاں، ان کے علاوہ کسی مسلمان کو کھلی آزادی نہیں دی گئی کہ وہ جہاں چاہے، جس سے چاہے، جب چاہے، مال و دولت کی فراوانی کے زور پر نکاح کے نام پر متعہ کرتا پھرے، جسے بزرگوں نے نکاح نہیں زنا کا نام دیا ہے۔

جو بندہ اللہ تعالیٰ کے طے کردہ نشانات، کھینچے ہوئے نقشے، بتائے ہوئے طریقے اور جاری کیے ہوئے احکامات سے انحراف و روگردانی کرے گا وہ حدود سے تجاوز کرے گا، حدود سے تجاوز کرنے والے کی تعریف و ستائش نہیں کی گئی بلکہ اسے باغی کہا گیا ہے۔

قرآن کریم کی سورۃ النساء میں اس مقام پر ان عورتوں کی ایک لمبی فہرست بیان کی گئی جن سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے، ان کے علاوہ عورتوں کے ساتھ اس لیے نکاح کو حلال و جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ گناہوں سے بچا جا سکے، شہوت رانی اور مستی نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی، ارشاد ربانی ہے وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذَالِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (النساء:۲۴) اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئیں ہیں کہ اپنے مال کے مہر سے تم ان سے نکاح کر سکتے ہو، برے کام سے بچنے کے لئے، پانی بہانے والے نہ ہو۔

جو لوگ خانہ ساز روایات کا سہارا لیتے ہوئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دشمنی میں متعہ کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کے بے سروپا فضائل بیان کرتے ہیں وہ انصاف کے پیمانے سے دیکھیں کہ متعہ میں

تو شہوت رانی ہوتی ہے، متعہ کرنے والے کو کسی لغت کی رو سے ہم محصن اور پاکدامن نہیں کہہ سکتے، متعہ نکاح وشادی کے قائم مقام نہیں ہے، اس لیے کہ یہ شرعی نکاح نہیں ہے، اس لیے نکاح متعہ کی آڑ میں عورت سے استمتاع اور استلذاذ ناجائز ہے، متعہ اس قرآنی آیت کی روشنی میں جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

متعہ کے جواز پر دلائل دینے والے اور نوجوانوں کے اذہان خراب کرنے والے اس آیت مبارکہ کی گہرائی میں جاکر سوچیں کہ ان کے مؤقف کی تو یہ آیت کسی صورت تائید نہیں کرتی، ارشاد ہے وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ (النساء: ۲۵) اور تم میں سے جس کسی کو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری وسعت وطاقت نہ ہو تو وہ مسلمان لونڈیوں سے جن کے تم مالک ہو اپنا نکاح کرلے۔

یہاں بھی یہی واضح کیا جارہا ہے کہ نکاح کے لیے یا تو آزاد مسلمان عورتیں ہیں، یا پھر لونڈیاں ہیں، تیسری کوئی صورت اس آیت میں نہیں دکھائی دیتی کہ مال ودولت کی چمک دمک سے اپنی جنسی خواہشات کو تسکین بخشنے کے لیے کسی عورت کے ساتھ وقتی اور کچھ ایام کے لیے مراسم قائم کیے جائیں، پھر جذبات کی تسکین کے بعد اپنی اپنی راہ لے کر تو کون اور میں کون کا ورد کیا جائے، یہاں آزاد مسلمان عورتوں کے مقابلے میں لونڈیوں کے ساتھ مراسم قائم کرنے کی اجازت تو دے دی گئی مگر متعہ کی کوئی شکل بھی واضح نہیں کی گئی، جس سے یہ سمجھا جائے کہ متعہ کی فلاں مقام پر گنجائش ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے، وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور: ۳۳) اور ان لوگوں کو پاک دامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار بنادے۔

یہاں تو پاکدامنی کی تعلیم دی گئی ہے، ناداری کی وجہ سے کسی غلط کاری کی ترغیب نہیں دی گئی، بلکہ دامن عفت بچانے کی ترغیب دی گئی ہے، انہیں مالدار ہونے کی آس اور امید دلائی گئی ہے، تب تک تم دامن بچائے رکھنا، یہاں کسی متعہ کی اجازت نہیں دی گئی۔

یہاں لفظ استمتاع وجہ نزاع ہے، اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس نفع اٹھانے سے مراد نکاح ہے، جب کہ روافض کے نزدیک اس استمتاع سے مراد نکاح متعہ ہے، اہل سنت اور روافض کے اس موقف میں واضح فرق ہے، اہل سنت کے ہاں منعقد ہونے والے نکاح میں دائمی طور پر عورت کو اپنے پاس رکھنا ہوتا ہے، اسے طلاق دینا، اسے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرنا نہیں ہوتا، جب کہ روافض کے ہاں یہ عارضی عقد ہوتا ہے، وقتی لذت براری مقصود ہوتی ہے، اس کے بعد بغیر طلاق کے معاملہ ختم ہو جاتا ہے، جب کہ اہل سنت کے ہاں اگر خاوند فوت ہو جاتا ہے تو عورت کو اس کی میراث میں سے حصہ دیا جاتا ہے، اگر مرد عورت کو کسی وجہ سے طلاق دیتا ہے تو اسے عدت گزارنا پڑتی ہے، جب کہ متعہ میں جدائی کے بعد دونوں کا رخ مختلف سمت ہوتا ہے، کوئی عدت وغیرہ نہیں گزارنا پڑتی۔

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ کے معنٰی میں اختلاف ہے، حضرت حسن بصری اور مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم عورتوں سے نفع اٹھاؤ اور نکاح صحیح کر کے جماع کے ذریعے ان سے لذت حاصل کرو، انہیں مہر ادا کرو، یہاں اجور مہور (مہر) کے معنٰی میں ہے۔ دوسرے لوگ (روافض) کہتے ہیں اس سے مراد نکاح متعہ ہے، نکاح متعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی عورت کے ساتھ ایک مدت تک نکاح کرنا، جب وہ مدت پوری ہو جائے بغیر طلاق کے دونوں کے درمیان جدائی ہو جائے گی، استبراء رحم ہو جائے گا، ان دونوں کے درمیان میراث بھی نہیں ہو گی، ایسا کرنا ابتدائے زمانہ اسلام میں مباح تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔ (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن)

تمام علماء، فقہاء، صلحاء، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے متعۃ النساء حرام ہے۔ (الکشف والبیان عن تفسیر القرآن علامہ ثعلبی)

حدیث نبوی اور متعہ

ربیع بن بسرہ جہنی رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک عمرے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے کنوارے پن کی شکایت کی، اس پر نبی کریم

ﷺ نے ہمیں فرمایا کہ لوگو! تم ان عورتوں سے متعہ کرلو، اگلی ہی صبح میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي كُنْتُ أَمَرْتُكُمْ بِالْاِسْتِمْتَاعِ مِنْ هٰذِهِ النِّسَآءِ إِلَّا أَنَّ اللهَ حَرَّمَ ذَالِكَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، اے لوگو! میں تمہیں ان عورتوں سے استمتاع کے بارے میں کہا کرتا تھا مگر بے شک اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن تک اسے حرام قرار دیا ہے۔ (الکشف والبیان عن تفسیر القرآن، مسند احمد بن حنبل) یہ روایت روافض کے کلینی کی کتاب صافی میں بھی موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے متعہ کی ممانعت کا اعلان فرمادیا تھا۔

حضرت حصیف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن رحمہ اللہ سے نکاح متعہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ إِنَّمَا كَانَ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ نَهَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ عَنْهُ وَرَسُولُه صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، یہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تین دن تک رہا پھر اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کردیا۔ (تفسیر الثعلبی)

حضرت کلبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں متعہ کو رسول اللہ ﷺ نے تین دن کے لیے حلال کیا تھا، پھر اسے حرام قرار دے دیا تھا، اس کا طریقہ یہ تھا کہ جو مدت دونوں کے درمیان طے ہوجاتی تھی اس کے خاتمے پر وہ اسے اس کی اجرت دے دیتا تھا، پھر وہ کہتا کہ میرے لیے مدت میں اضافہ کردے تو میں تجھے اجرت زیادہ دوں گا، اگر عورت چاہتی کہ ایسا کروں تو وہ کرلیتی تھی، جب ان کے درمیان طے شدہ مدت مکمل ہوجاتی تو وہ شخص اسے اُجرت دے دیتا تھا اور اسے جدا کر دیتا تھا، پھر یہ ترتیب آیت طلاق، عدت اور ممات کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ (الثعلبی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ أَنَّ عَلِيًّا قَالَ لِابْنِ عَبَّاس: نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مُتعَةِ النِّسَآءِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَعَنْ أَكْلِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَةِ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کے دن متعۃ النساء اور پالتو گدھے کھانے سے منع فرمایا۔ (الثعلبی)

حضرت ابو نضرہ رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جس متعہ کا ذکر سورۃ النساء میں کیا گیا ہے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرماتے ہوئے کہا تھا کہ إِنَّمَا أَحَلَّ اللّٰهُ ذَالِكَ عَلَى عَهدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَالنِّسَآءُ يَومَئِذٍ قَلِيلٌ، ثُمَّ حُرِّمَ عَلَيهِم بَعدَ أَن نُهِيَ عَنهَا بے شک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متعہ اس وقت حلال کیا تھا جب عورتیں تھوڑی ہوتی تھیں، پھر جب اس سے منع کیا گیا تو یہ ان پر حرام کر دیا گیا۔ (الثعلبی)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی، پھر فرمایا کہ مَا بَالُ رِجَالٍ يَنكِحُونَ هٰذِهِ المُتعَةَ وَقَد نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ عَنهَا لَا أَجِدُ رَجُلاً يَنكِحُهَا إِلَّا رَجَمتُهُ بِالحِجَارَةِ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ نکاح متعہ کرتے ہیں جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے، اگر میں نے کسی آدمی کو نکاح متعہ کرتے ہوئے پالیا تو اسے پتھر مار مار کر ختم کر دوں گا۔ (رجم کر دوں گا کا معنیٰ سنگسار کرنا) (الثعلبی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: نوجوانو! تم میں سے جو شادی کی طاقت رکھتا ہے اسے شادی کر لینی چاہئے اور جو شادی کی استطاعت نہیں رکھتا اسے چاہئے کہ وہ کثرت سے روزے رکھے کیونکہ روزے قوت شہوانی کو قابو میں رکھنے کا مجرب نسخہ ہیں۔ (بخاری، مسلم) جو نوجوان شادی کی استطاعت نہیں رکھتا اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ کا حکم نہیں دیا حالانکہ نکاح متعہ آسان ہے جس پر زیادہ خرچہ بھی درکار نہیں ہے۔ حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ان سے متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ رحمہ اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا متعہ بعینہ زنا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ متعہ سفاح ہے (پانی نکالنا) حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متعہ مردار، لہو جاری اور خنزیر کے گوشت کی طرح حرام ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں اسلام میں کسی ایسی چیز کو نہیں دیکھتا جو پہلے حلال کی گئی ہو، پھر حرام کی گئی، پھر حلال کی گئی ہو، پھر حرام کی گئی سوائے متعہ کے۔ (الثعلبی)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں سے متعہ کی ممانعت کا اعلان کیا تھا۔ (کلینی ج ۵ ص ۴۵۷) مسلم شریف میں خیبر کی جگہ فتح مکہ کے موقع پر متعہ کی ممانعت کا ذکر ہے، فتح خیبر اور فتح مکہ میں کم و بیش ایک سال کا فرق ہے، فتح خیبر سنہ ۷ ہجری میں ہوئی جب کہ فتح مکہ سنہ ۸ ہجری میں ہوئی۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ غزوہ اوطاس کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کے لیے متعہ کی اجازت دی پھر ممانعت فرمادی۔ (مسلم)

بخاری اور مسلم میں روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں جو شخص نکاح کر سکتا ہے وہ نکاح کرلے اور جو اس کی طاقت نہیں رکھتا وہ روزے رکھے، کیونکہ روزہ قوت شہوانی کو قابو میں رکھنے کا مجرب نسخہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استطاعت نہ رکھنے والوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا نکاح متعہ کرنے کا حکم نہیں دیا، حالانکہ نکاح متعہ پر کوئی زیادہ خرچ نہیں آتا صرف ایک مٹھی بھر جو کے عوض لڑکی کو راضی کرلیا جائے تو نکاح متعہ ان (روافض) کے نزدیک ہو جاتا ہے۔ (کلینی فی الکافی ۵/۴۵۷)

حرمت متعہ از روئے اجماع

نکاح متعہ کی حرمت پر بہت سے علماء کرام نے اجماع نقل کیا ہے چنانچہ امام نووی، امام المازری، امام قرطبی، امام خطابی، امام ابن منذر اور امام شوکانی رحمہم اللہ وغیرہ اس کی حرمت کے قائلین میں صف اول کا مقام رکھتے ہیں۔ مذکورہ تمام ائمہ رحمہم اللہ نے متعہ کے حرام ہونے پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے، جب کہ روافض مسلمانوں کے اجماعی نظریے سے ہٹ کر اپنا الگ نظریہ رکھتے ہیں کہ متعہ اب بھی جائز ہے، اپنے مفسرین کی خانہ ساز تفسیروں سے مختلف حوالہ جات پیش کرتے ہیں، اپنے طور پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اہلسنت کا موقف غلط ہے، جب کہ اہل سنت دلائل کی بنیاد پر سمجھتے ہیں کہ روافض اب بھی غلط راہ اختیار کیے ہوئے ہیں، کیونکہ کسی بھی دور میں متعہ مستقل مباح نہیں رہا، اگر کسی دور میں متعہ ہوتا رہا تو اس کی مدت بہت ہی محدود بتائی گئی ہے۔

روافض کے پاس جواز متعہ کے دلائل

روافض اپنے شہوت پرستانہ جذبات کی تسکین کے لیے نکاح متعہ کو جائز قرار دینے کے لیے کچھ خانہ ساز روایات اور کچھ دماغی اختراعات پیش کر کے امت میں بے راہ روی کو جنم دے رہے ہیں، انہوں نے اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے سورۃ النساء کی آیت ۲۴ سے استدلال کیا ہے، جس میں ارشاد ہے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء:۲۴) تم جن عورتوں سے فائدہ اٹھانا چاہو انہیں ان کا مقرر کیا ہوا مہر دے دو یہ مقرر کیا ہوا فرض ہے۔

یہاں سے وہ لوگ لفظ استمتاع اور کلمہ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ سے متعہ کی اباحت پر استدلال کرتے ہیں، اس کے ساتھ وہ صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی قرأت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى بھی پیش کرتے ہیں کہ یہ کلمات متعہ کے جواز کی غمازی کرتے ہیں۔ امام صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت متعہ پر دلیل ہے۔ (بحار، الوسائل بحوالہ تفسیر قمی ج ۱ ص ۱۹۹) وَفِيْ ذَالِكَ تَصْرِيْحٌ بِاَنَّ الْمُرَادَ بِهٖ عَقْدُ الْمُتْعَةِ (الصافی فی تفسیر القرآن للکاشانی ج ۲ ص ۲۱۸) اس آیت میں صراحت ہے کہ اس سے مراد عقد متعہ ہے۔

اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت یوں ہی نازل کی ہے یعنی جس میں ایک مدت مقررہ تک کا ذکر ہے۔ (الصافی فی تفسیر القرآن للکاشانی ج ۲ ص ۲۱۸) امام صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متعہ کے بارے میں قرآن نازل ہوا اور سنت جاری ہوئی۔ (الصافی فی تفسیر القرآن للکاشانی ج ۲ س ۲۱۹) امام باقر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اس بارے میں خطاب کے بیٹے آگے نہ بڑھتے تو بدبخت کے علاوہ کوئی بھی زنا نہ کرتا۔ (الصافی فی تفسیر القرآن للکاشانی ج ۲ ص ۲۱۹)

ان کی دوسری دلیل اہل بیت رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب احادیث ہیں، ان حضرات کا کہنا ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم سے بعض ایسی روایات کا ثبوت موجود ہے جن سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، جناب علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے اگر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ متعہ میں ہم سے سبقت نہ کرتے تو ہم میں سے بے وقوف

لوگ ہی زنا کا ارتکاب کرتے۔ رافضیوں کی تفسیر میں ایک لفظ شقی اور دوسرا لفظ شفی منقول ہے، شقی کا معنیٰ بدبخت اور شفی کا معنیٰ تھوڑا، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر متعہ سے منع نہ کرتے تو شقی (بدبخت) زنا کرتا، یا شفی (بہت تھوڑے لوگ) زنا کرتے، باقی لوگوں میں سے کوئی بھی زنا کی ہمت وجرأت نہ کرتا وہ متعہ کرتا۔ امام صادق رحمہ اللہ سے مروی ہے، جو ہمارے اسلاف کی اتباع نہیں کرتا اور متعہ کو حلال نہیں سمجھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (صاحب الوسائل ج ۲۱ ص ۸)

امام محمد بن مسلم سے مروی ہے: مجھے ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ تم دنیا سے اس وقت تک نہ جانا جب تک کہ سنت (متعہ) کو زندہ نہ کرو۔ (صاحب الوسائل ج ۲۱ ص ۱۵) روافض یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی کتاب نے متعہ حلال کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قیامت تک متعہ کا حلال ہونا ثابت ہے اس کو تو عمر رضی اللہ عنہ نے حرام کیا ہے اور اس سے منع کیا ہے تو وہ کرتا رہے۔ (الصافی ج ۲ ص ۲۱۹)

ہمارے علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ روافض کا اپنا خیال ہے جو انہوں نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیا ہے، اہل سنت کے نزدیک پہلی بات تو یہ ہے کہ جس آیت سے روافض متعہ پر استدلال کرتے ہیں یہ منسوخ ہو چکی ہے، اس کی ناسخ سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ (مومنون: ۵ تا ۷) اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، ہاں ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں جن کے وہ مالک ہیں انہیں کوئی ملامت نہیں، اب جو کوئی اس کے علاوہ (راہ) ڈھونڈھے گا تو ایسے لوگ حد سے گذر جانے والے ہوں گے۔ یہاں بیویوں اور لونڈیوں کے ساتھ مباشرت اور جماع کی اجازت دکھائی دیتی ہے، شرمگاہوں کی حفاظت دکھائی دیتی ہے، ان دو مقامات کے علاوہ متعہ سمیت کوئی بھی شکل اختیار کی جائے گی وہ زیادتی اور سرکشی ہو گی، انہیں عادون کہا گیا کہ یہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

روافض کی جانب سے ایک الجھن یہاں پیدا کی جاتی ہے کہ سورۃ المعارج اور سورۃ المومنون تو دونوں مکی سورتیں ہیں، جب کہ متعہ کے احکام جس سورت میں آئے ہیں وہ سورۃ النساء ہے جو مدنی

ہے، تو مکی آیت مدنی آیت کو کیونکر اور کیسے منسوخ کر سکتی ہے؟

روافض کی طرف سے ایک الجھن مزید پیدا کی جاتی ہے کہ جن جن روایات میں متعہ کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اضطراب پایا جاتا ہے، یعنی وہ قابل عمل نہیں ہیں، کسی روایت میں کہا گیا ہے کہ متعہ یوم خیبر کے موقع پر حرام کیا گیا، کسی روایت میں آتا ہے کہ نکاح متعہ اوطاس میں منع کیا گیا، کسی روایت میں ہے کہ متعہ فتح مکہ کے موقع پر حرام کیا گیا، کسی روایت میں ہے کہ متعہ حجۃ الوداع کے موقع پر حرام قرار دیا گیا، کسی روایت میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اس کے عدم جواز کا حکم دیا گیا، کبھی کہا جاتا ہے کہ متعہ کے حرام ہونے کا حکم دوبار نازل ہوا، کبھی کہا جاتا ہے متعہ کے حرام ہونے کا حکم ایک بار نازل ہوا، کبھی کہا جاتا ہے کہ متعہ کے حرام ہونے کا حکم تین بار آیا ہے، یہ سارے اشکالات پیش کرتے ہوئے روافض کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے کسی مستند اور مضبوط حدیث کا ثبوت موجود نہیں ہے کہ متعہ حرام کر دیا گیا۔

ایک اشکال روافض یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے متعہ کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کی تردید نہیں فرمائی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگ متعہ کرتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت میں بھی لوگ متعہ کرتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں نکاح متعہ کی ممانعت کا حکم دیا۔

روافض کے اشکالات کا جواب

جہاں تک آیت مبارکہ سورۃ النساء ۲۴ کے الفاظ استمتاع سے نکاح متعہ کا استدلال ہے یہ بالکل درست نہیں ہے، علماء تفسیر اس آیت کے ذیل میں جو ارشادات تفسیری حواشی میں نقل کرتے ہیں ان کا اعتبار کیا جائے اور انہیں تسلیم کیا جائے گا، الکافی، الصافی اور القمی کی عبارتیں مشکوک ہیں، ارباب تفسیر کی آراء کی روشنی میں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ میں نکاح متعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس حکم سے پہلے قرآن کریم میں وہ طویل فہرست بیان کی گئی ہے جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا

ہے، یہاں تو نکاح شرعی کے جواز کو بیان کیا گیا ہے، نہ کہ نکاح متعہ کو، قرآن کریم نے اس سے پہلے جو فہرست پیش کی ہے اس کی روشنی میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ حرام کاری کا ہر دروازہ شریعت نے بند کر دیا ہے، شریعت نے جن کے ساتھ نکاح کو حرام کر دیا ان کو واضح کر دیا، جن سے نکاح حلال کر دیا ان کو واضح کر دیا، اس لیے یہاں روافض کی دال کسی صورت نہیں گل سکتی۔

جب اللہ تعالیٰ نے حرام کی گئی عورتوں کی فہرست بیان کی تو ایک انسان کے ذہن میں یہ سوال اجاگر ہو سکتا تھا کہ جب اس طویل ترین فہرست میں بیان کی گئیں عورتوں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے تو پھر کس سے نکاح کیا جائے، اس پیدا ہونے والے سوال کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا گیا، واضح کر دیا گیا کہ وَ أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذَالِكُمْ ان کے علاوہ جس سے چاہو شادی کر سکتے ہو اور لونڈیوں سے استمتاع کر سکتے ہو، اس سے آگے فرمایا گیا کہ یہ نکاح شرعی اس لیے کرنا تاکہ تم برے کاموں سے بچ سکو، شہوت رانی کے لیے یہ کام مقصود نہیں ہونا چاہیے، تو متعہ کے اندر وہ ساری باتیں ہوتی ہیں جو اس آیت کی منشاء کے خلاف ہیں۔

اس آیت کریمہ سے نکاح شرعی مراد ہے، جس کی طرف محصنین کا لفظ اشارہ کرتا ہے، جس سے مراد پاکدامنی ہے، نسل کی حفاظت ہے، جب کہ متعہ کے اندر نہ تو نسل بڑھانا مقصود ہوتا ہے اور نہ ہی دامن عفت بچانا مقصود ہوتا ہے، وہ ایک وقتی کارروائی ہوتی ہے، قرآن کریم کہتا ہے غَيْرَ مُسَافِحِينَ صرف پانی نکالنا مقصود نہیں ہونا چاہیے، وقتی لذت کے حصول کے بعد رقم کی ادائیگی کے بعد اپنے اپنے رخ پر متعہ کرنے والے زانی چل پڑتے ہیں، دل میں اطمینان ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے حالانکہ یہ کارنامہ نہیں بلکہ ان ظالموں نے منہ کالا کیا ہے۔

روافض کی تفاسیر کے حوالے سے ہم نقل کر چکے ہیں کہ انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۲۴ میں چند الفاظ اور جملوں کا اضافہ کیا ہے، جیسے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى، الی اجل مسمی کا اضافہ انہوں نے اپنی طرف سے کرتے ہوئے اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کیا ہے کہ ان کی قرأت میں یہ ہے، یہ جملہ زیادہ کر کے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اس سے نکاح متعہ مراد ہے۔

اس کا ① جواب تو یہ ہے کہ یہ جملہ قرآن کریم میں بالکل ثابت نہیں ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے کہ یہ مصحف عثمانی میں موجود نہیں ہے، اصولی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو صحابی رضی اللہ عنہ اگر کوئی ایسا جملہ تلاوت کرے یا بتائے کہ یہ قرآن ہے لیکن اس کا قرآن ہونا ثابت نہ ہو تو اس سے کسی بات کی دلیل نہیں پکڑی جا سکتی، کیونکہ یہ جملہ بنیادی طور پر ہی باطل ہے جو قرآن میں نہیں ہے اور قرآن کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے، اس کا اسے قرآن سمجھ کر نقل کرنا ہی باطل ہے جب کہ وہ قرآن ہے ہی نہیں تو اس کا باطل ہونا واضح ہے، جو چیز قرآن کریم میں نہ ہو صحابی اسے نقل ہی نہیں کر سکتا، جب قرآن کریم جمع کیا گیا تھا اس وقت جمع کرنے والے دو دو گواہوں کی موجودگی میں قرآنی آیات جمع کر رہے تھے، جب وہاں اس قدر احتیاط تھی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی صحابی اس عبارت کو قرآن بنا دے جو قرآن میں ہے ہی نہیں۔

② اگر ہم نکاح متعہ کے جواز کے لیے خبر واحد سے استدلال کو درست تسلیم کر لیں جیسا کہ کچھ لوگوں نے استدلال کیا یا جیسا کہ ان لوگوں کی تفاسیر میں سورۃ النساء کی آیت ۲۴ سے استدلال کیا گیا ہے، یہ ان دلائل کے معارض ہے جو اس سے بہت زیادہ مضبوط ہیں، کیونکہ جمہور علماء اس کے خلاف ہیں، کیونکہ صریح قطعی احادیث بہت زیادہ ہیں، جو نکاح متعہ کے حرام ہونے کے بارے میں بتاتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان گرامی میں واضح کیا گیا ہے کہ نکاح متعہ قیامت تک دائمی طور پر حرام ہے جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے، حضرت سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فتح مکہ کے دن جہاد میں شرکت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي كُنْتُ أَذِنْتُ لَكُمْ فِي الِاسْتِمْتَاعِ فِي النِّسَاءِ، وَإِنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ ذَالِكَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهُنَّ شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيلَهُ، وَلَا تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور بے شک اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اسے حرام قرار دیا ہے، پس جس شخص کے پاس ان میں سے کوئی چیز ہو تو اسے چاہیے کہ اس کا راستہ چھوڑ دے، جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے وہ واپس نہ لو۔ (مسلم)

رہا روافض کی طرف سے یہ اشکال کہ ان روایات میں تعارض اور اضطراب ہے یہ درست نہیں ہے، ان روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے، آپ ﷺ نے لوگوں کے اذہان میں بٹھانے کے لیے، نکاح متعہ کی طرف توجہات مرکوز کرنے سے بچانے کے لیے حجۃ الوداع کے موقع پر بھی اس کی حرمت بیان کی، فتح مکہ کے دن بھی فرمایا، جب ان دونوں مقامات میں فرمائے گئے ارشادات کو جمع کرنا ممکن ہے تو ان میں تطبیق کی شکل پیدا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ علم اصول اور علوم حدیث سے سمجھا جاسکتا ہے، لہٰذا روافض کا یہ کہنا بے جا ہے۔

③ چلو بالفرض ہم اصول مناظرہ کے طور پر روافض کی یہ بات تسلیم کرلیں کہ یہ آیت ۲۴ نکاح متعہ کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے تو یہ بات سن لی جائے کہ اس کی اباحت تو منسوخ ہو چکی ہے، جیسا کہ صحیح روایات جو متفق علیہا ہیں ان سے اس کا منسوخ ہونا ثابت ہو چکا ہے، نکاح متعہ دوبار منسوخ کیا گیا ہے ایک بار یوم خیبر میں جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اور دوسری بار فتح مکہ کے دن جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، ہاں بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ ایک ہی بار فتح مکہ کے موقع پر نکاح متعہ کو منسوخ کیا گیا ہے، جہاں تک یوم خیبر میں منسوخ ہونے کی بات ہے وہ گھریلو پالتو گدھے کھانا حرام قرار دیا گیا تھا صرف، یہاں کچھ راویوں نے یہ سمجھا کہ خیبر میں ہی نکاح متعہ اور گھریلو گدھوں کو حرام قرار دیا گیا۔ (اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن)

علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، لیکن بعض صحیح، صریح روایات میں یہ بات آئی ہے کہ نکاح متعہ یوم خیبر میں بھی حرام قرار دیا گیا، تو اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ نکاح متعہ دوبار حرام قرار دیا گیا ہے، یہ بات یقینی ہے کہ ایک بار سے زیادہ حرام قرار دیا گیا، اس پر جو روایت ہے وہ صحیح ہے۔ سبرہ جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے تیسرے دن نبی کریم ﷺ کو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کعبہ کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں متعہ کی اجازت دی تھی اب قیامت تک یہ حرام ہے۔ (التحریر والتنویر)

④ اللہ تعالیٰ نے صراحت ووضاحت کے ساتھ شرم گاہ کی حفاظت کو ضروری قرار دیا ہے، اپنی بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی جگہ بھی شرم گاہ استعمال نہیں کرنا، دو ہی مقامات ہیں ایک بیوی اور دوسری لونڈی، ان کے علاوہ فرمایا کہ جو ان کے علاوہ کوئی چیز تلاش کرے گا وہ عادین (حد سے بڑھنے والوں) سے ہو گا، پتہ چلا کہ نکاح متعہ کرنے والا جس سے لطف اندوزی اور استمتاع کر رہا ہے وہ نہ ہی اس کی بیوی ہے اور نہ ہی اس کی لونڈی ہے تو اس سے لطف اندوزی کرنے والا عادین (حد سے بڑھنے والوں) میں سے ہے، یہ قرآن کریم کی نص ہے، رہا اس عورت کا اس کی لونڈی نہ ہونا یہ واضح ہے، کیونکہ لونڈی تو میدان کارزار میں معرکہ میں شرکت کرنے اور فتح کی صورت میں امیر المجاہدین مجاہد کے حوالے کرتا ہے۔

جس عورت کے ساتھ نکاح متعہ کیا ہے یہ بیوی نہ ہونے کی وجہ سے ان حقوق شرعیہ سے محروم ہے جو شریعت نے بیوی کے لیے مقرر کیے ہیں، ان میں خاوند کی موت کی صورت میں میراث ہے، خاوند کی فوتگی کی صورت میں عدت گزارنا ہے، طلاق ہے، نان ونفقہ ہے، اگر یہ عورت نکاح شرعی کی صورت میں اس کی بیوی ہے تو یہ بیوی ہے جو وراثت پائے گی، جو عدت گزارے گی، اس پر طلاق واقع ہو گی، اس کے لیے نفقہ واجب ہو گا، جب کہ نکاح متعہ کرنے والی ان تمام باتوں اور حقوق سے محروم ہو گی۔

⑤ جہاں تک ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں الی اجل مسمیٰ کا ذکر ہے، پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ابو نضرہ کے لیے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ایسی ہی اتاری ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ متعہ سے منع نہ کرتے تو کوئی بدبخت ہی زنا کرتا، پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نکاح متعہ کے مطلقاً جواز کی روایت، پھر ان کی طرف سے ضرورت کے وقت نکاح متعہ کے جائز ہونے کی روایت اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، سب سے درست اور صحیح ترین بات یہ ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان تمام باتوں سے رجوع کر لیا تھا، وہ نکاح متعہ کو حرام سمجھتے تھے۔ (البحر المحیط فی التفسیر) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب انتہائی ضرورت کے لیے نکاح متعہ کی اباحت کا فتویٰ دیا تو ان سے سوال کیا گیا، جس کا انہوں نے جواب دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مردار، لہو جاری، لحم خنزیر (خنزیر کا گوشت) کو حرام قرار دیا ہے، مگر

اضطراری (شدید مجبوری) حالت میں اجازت دی ہے۔ (التحریر والتنویر)

جب متعہ کی اباحت کے بارے میں لوگوں کی زبانوں پر الفاظ مچلنے لگے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں مطلقاً اسے حلال نہیں کہتا میں تو حالت مجبوری میں اس کو اس طرح حلال کہتا ہوں جس طرح اللہ نے مردار کے لیے فرمایا۔ (التفسیر الحدیث) حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نکاح متعہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا یہ متعہ ہے، نہ یہ نکاح ہے، نہ سفاح ہے، نہ طلاق ہے نہ اس میں میراث ہے۔ (تفسیر الحدیث)

⑥ روافض اہل بیت سے کچھ روایات لے کر پیش کرتے ہیں جن سے نکاح متعہ کی اباحت اور اجازت ثابت ہوتی ہے، اس میں ایک روایت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کا حکم دیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا، ہمیں متعہ کرنے سے کسی نے منع نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک شخص نے اپنی رائے سے وہ کہا جو چاہا (بحر المحیط فی التفسیر) اہل بیت رضی اللہ عنہم میں سے ایک جماعت یہی کہتی ہے، تابعین کی ایک جماعت یہی کہتی ہے، لیکن درست بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح متعہ کے حرام ہونے کا ثبوت موجود ہے، اس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں، اہل بیت رضی اللہ عنہم میں روافض کے ہاں سب سے اعلیٰ شخصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں، اگرچہ اہل سنت کے ایمان کا بھی وہ حصہ ہیں، ان سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ کو حرام قرار دیا ہے۔

⑦ جہاں تک عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متعہ کی اجازت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا، بعد میں ایک شخص نے اپنی رائے سے متعہ حرام قرار دیا، اس شخص سے مراد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت جس میں کہا گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ متعہ کو منع نہ کرتے تو کوئی بدبخت ہی زنا کرتا، یہ شیعی مفسر طبرسی نے نقل کیا ہے، یہ بات انتہائی غلط اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے ہی ارشادات ہم نقل کر چکے ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ میں نے اجازت دی تھی اب اللہ نے قیامت تک اسے حرام قرار دیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو متعہ کے حرام ہونے کو اپنی

زبان پر لائے وہ نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں، کیونکہ نبی کریم ﷺ پہلے اسے حرام قرار دے چکے تھے۔ (التفسیر الحدیث)

⑧ نکاح متعہ کے بارے میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے تین روایات منقول ہیں (۱) عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے جس میں انہوں نے فرمایا کہ متعہ کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی جس نے نکاح متعہ والی آیت کو منسوخ کیا ہو، نبی کریم ﷺ نے ہمیں اجازت دی تو ہم نے متعہ کیا، آپ ﷺ نے ہمیں متعہ کرنے سے منع نہیں کیا، ایک آدمی نے اپنی رائے سے منع کیا، یہ روایت شیعی مفسر طبرسی نے نقل کی ہے۔ (۲) ایک روایت جس میں آیا ہے کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے متعہ کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم نبی کریم ﷺ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں متعہ کرتے تھے۔ یہ روایت بھی شیعہ مفسر طبرسی نے نقل کی ہے۔

(۳) تیسری روایت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ہے جس کا راوی کوئی نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں دو متعہ ہوا کرتے تھے، میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں، ان دونوں متعوں پر سزا دوں گا، یہ دو متعے متعہ نکاح اور متعہ حج تھے۔ یہ روایت بھی شیعی مفسر طبرسی نے نقل کی ہے۔ (التفسیر الحدیث، ذیل آیت النساء ۲۴)

شیعی مفسر طبرسی نے یہ چار روایات جو نقل کی ہیں یہ صحاح ستہ کی روایات نہیں ہیں، شیعی مفسر نے یہ روایات کہاں سے لائی ہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن جو مستند مفسرین اور اہل سنت کے اعلیٰ پائے کے مفسر ہیں جیسے علامہ طبری رحمہ اللہ، علامہ بغوی رحمہ اللہ، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اور خازن رحمہ اللہ انہوں نے ان روایات کو اپنی اپنی تفاسیر میں جگہ نہیں دی، حالانکہ ان لوگوں نے روایات کے ساتھ اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے، انہوں نے ماثور احادیث اپنی تفاسیر میں بیان کی ہیں۔

ان میں پہلی روایت وہ ہے جو طبری نے ذکر کی ہے، اس روایت سے بھی وہ نکاح متعہ کی اباحت یا جواز کو ثابت نہیں کرتے، کیونکہ جو ارشاد نبی کریم ﷺ نے نکاح متعہ کی ممنوعیت کے بارے میں فرمایا وہ پانچ محدثین کرام رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے جو بہت ہی مضبوط ہے، باقی چار روایات وہ ہیں جنہیں

شیعی مفسر علامہ ابو علی فضل بن حسن الطبرسی نے اپنی تفسیر مجمع البیان میں جمع کیا ہے، راجح بات یہی ہے یہ روایات شیعی تفاسیر میں پائی جاتی ہیں، پہلے شیعی مفسرین انہیں نقل کر چکے ہیں اور بعد والوں نے بھی مکھی پر مکھی ماری ہے، یوں قائلین نکاح متعہ کے دلائل میں دھیرے دھیرے اضافہ ہوتا رہا، پھر یہ بڑی جرأت سے کہتے اور لکھتے رہے کہ نبی کریم ﷺ نے نکاح متعہ کو حرام نہیں قرار دیا، اسے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرام قرار دیا ہے۔

ازیں بعد ان لوگوں نے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جس میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام بگاڑا نہ ہو، یہ لوگ شر انگیزی اور شیطنت میں اس قدر آگے بڑھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دائرہ اسلام سے ہی باہر نکال دیا، یہ زہر اگلتے رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس چیز کو حرام قرار دیا جسے اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے حلال کیا تھا، معاذ اللہ یہ تو کسی صورت قابل تسلیم نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے حلال کردہ کو حرام کر دیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم جماعت سامنے موجود ہو اور کسی رد عمل کا اظہار نہ کرے، یہ بات عقل کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوئی غیر شرعی کام کریں اور نبی کریم ﷺ کے تربیت یافتہ لوگ جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق ادا کر دیتے تھے وہ خاموش رہیں۔

چلو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تو روافض تسلیم نہیں کرتے کم از کم حضرت علی شیر خدا، خیبر شکن رضی اللہ عنہ کیسے اس غیر شرعی فعل پر راضی ہوتے، معلوم ہوا کہ روافض کی طرف سے یہ روایات گھڑی گئیں، جن کا کوئی سر پیر نہیں ہے، اس لیے سب سے بہترین راستہ اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت پر اعتماد کیا جائے۔

بے حیائی کی مرتکب لونڈی کی شرعی سزا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا

مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۲۵} النساء

جواب ترجمہ: اور جو کوئی تم میں سے اس بات کی طاقت نہ رکھے کہ خاندانی مسلمان عورتیں نکاح میں لائے تو تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی سے نکاح کرلے جو تمہارے قبضے میں ہوں اور ایماندار بھی ہوں اور اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے تم آپس میں ایک ہو لہٰذا ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرلو اور دستور کے موافق ان کے مہر دے دو در آنحالیکہ نکاح میں آنے والیاں ہوں آزاد شہوت رانیاں کرنے والیاں نہ ہوں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں پھر جب وہ قید نکاح میں آجائیں پھر اگر بے حیائی کا کام کریں تو ان پر آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں پر مقرر کی گئی ہے یہ سہولت اس کیلئے ہے جو کوئی تم سے تکلیف میں پڑنے سے ڈرے اور صبر کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ: مطلب یہ ہے کہ آزاد عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی طاقت و وسعتِ مال نہ ہو کہ ان کے نان و نفقہ اور مہر وغیرہ کو تم آسانی سے نہ ادا کرسکتے ہو کیونکہ معاشرہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں، کمزور بھی اور طاقتور بھی اور ظاہر ہے ایک کمزور اور مزدور قسم کا آدمی وسعتِ مال نہیں رکھتا، اگر وہ کسی عورت سے نکاح رچالے جس کے ایک دن کے اخراجات اس کی ایک ماہ کی مزدوری بھی پورے نہ کرسکتی ہو تو وہ ایسی بیوی سے سکون و محبت اور شفقت ورأفت کی امید کیونکہ کرسکتا ہے تو پھر پہلے ہی قدم وہ سوچ سمجھ کر اٹھائے۔

ایک غریب آدمی اگر کسی متمول عورت سے نکاح کرے گا درانحالیکہ وہ یہ بات نہ جانتی ہو کہ میرے ہونے والے شوہر کی کیا حالت ہے اور یہ سبز باغ دکھا کر اس کو یا اس کے گھر والوں کو آمادہ کر بھی لے گا اور اس طرح نکاح قرار پا جائے گا تو اس کا نبھانا اتنا آسان نہیں ہو گا، اس لیے ایک تو نکاح

سے پہلے فریقین کو اچھی طرح اس حالت پر غور و فکر کر لینا چاہیے اور دوسری یہ بات ہے کہ زندگی کے ایسے معاملات میں پردہ و اخفاء سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ اس سے بہتر ہے کہ آدمی جوڑ ہی ایسی جگہ جوڑے جس میں اس طرح کی خلل اندازی کا خطرہ نہ ہو۔

اس لیے چونکہ نکاح کے مسائل جاری تھے ان میں اس طرح ہدایت فرمادی گئی کہ ایک آدمی اگر صاحب وسعت نہیں ہے کہ ایک آزاد عورت کی ذمہ داریاں باحسن و خوبی ادا کر سکے تو چاہیے کہ ان باندیوں میں سے جو اس کی اپنی ملکیت میں آچکی ہوں یا کسی دوسرے کی باندی سے اس کی اجازت کے ساتھ نکاح کر لے، ایسا کرے گا تو اس میں ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں بھلائیوں کی امید کی جاسکتی ہے اگر وہ باندی اپنی ہے تو بہتر ہے کہ آزاد کر کے اپنے نکاح میں لے آئے وہ اس کی شکر گزار رہے گی اور خدمت گزار بھی اور اگر کسی دوسرے کی باندی ہے تو اس کی اجازت سے جب وہ نکاح کرے گا اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے گا تو عین ممکن ہے کہ اس طرح مل بیٹھنے سے اس مملوکہ کے آزاد ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے ممکن ہے کہ نکاح میں دینے والا مزید احساس کرتے ہوئے اس کو آزاد کر دے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مکاتب کر دے اور اس طرح اس کی مکاتبت کو ادا کر کے وہ آزاد ہو جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس جوڑ سے وہ دونوں مل کر مزدوری کر لیں اور اس مزدوری روی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کے حالات میں آسانی پیدا فرمادے۔

اس لیے فرمایا کہ اگر آزاد عورت میسر نہ آئے تو یہ کنیز و مملوکہ بھی تو آخر انسان ہے اور اس میں وہ ساری خواہشیں موجود ہیں جو ایک آزاد عورت میں ہیں پھر ایک پنتھ دو کاج والی بات سے کیوں گریز کیا جائے بلکہ اس کو ایک نیک کام سمجھتے ہوئے سرانجام دے اور نیت میں یہ بات رکھے کہ میں نے اس سے نیکیاں کمانی ہیں، یقیناً اس کو اس میں سے سب کچھ میسر آجائے گا، یہ مشورہ گویا اس لیے دیا گیا کہ ایک کنیز کا مہر اور نان و نفقہ اتنا بڑا نہیں ہو گا جتنا کہ ایک آزاد عورت کا اور پھر یہ بھی کہ ان کے مالک ان کو غریب شوہروں کے نکاح میں دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کریں گے۔

فَتَيٰتِكُمْ سے اس جگہ مراد نوجوان ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی کنیزیں مراد ہیں، خواہ وہ جوان ہوں یا سن رسیدہ ہوں، ہاں! شرط یہ ہے کہ مملوکہ مومنہ ہو اس لیے کہ اگر وہ غیر مومنہ ہوئی تو اولاد

کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہر حال میں رہے گا۔ (العروۃ الوثقیٰ)

قرآن میں مُحْصَنٰتٌ کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے، منکوحہ عورتیں، آزاد عورتیں اور پاک دامن عورتیں، یہاں یہ تیسرا معنی مناسب حال ہے، بعض حضرات نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور گنجائش اس کی بھی ہے۔ (آسان تفسیر رحمانی)

طول: کا معنیٰ غنیٰ، مالداری اور گنجائش ہے، اس کا اصل معنیٰ فضل اور زیادتی ہے، محصنات کا معنیٰ ہے آزاد مسلمان عورتیں، فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ کا معنیٰ ہے مسلمان باندیاں، فتیٰ، غلام اور فتیات باندی، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک استطاعت رکھنے والے شخص کے لیے باندی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: ایک طرف تو حکم یہ دیا گیا ہے کہ باندیوں سے نکاح اسی وقت کیا جائے جب آزاد عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ ہو، دوسری طرف یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب کسی باندی سے نکاح کی نوبت آجائے تو پھر محض اس کے باندی ہونے کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھنا درست نہیں، کیونکہ فضیلت کا اصل دارومدار تقویٰ پر ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس کی ایمانی حالت زیادہ مضبوط ہے ورنہ اولاد آدم ہونے کے لحاظ سے سب ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ (توضیح القرآن للشیخ تقی عثمانی)

تمہارے بعض بعض میں سے ہیں، مقصد یہ ہے کہ لونڈیاں بھی تمہاری ہی جنس سے ہیں، وہ بھی آخر انسان ہیں مگر جنگی قیدی بن کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہیں، لہٰذا انہیں حقیر نہ سمجھو اور ان کی تذلیل نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ نازل فرما کر آزاد اور غلام کے درمیان نفرت کو کم کرنے کا حکم دیا ہے۔ (معالم العرفان) بہت دفعہ باندیاں ایمان میں آزاد عورتوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں، اس لیے باندی ہونے کی وجہ سے حقیر نہ سمجھیے۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: تم ان ایمان والی کنیزوں سے نکاح کرلو اور ان کے مالکوں کی اجازت سے، باندی کا نکاح بغیر اس کے مالک کی اجازت کے درست نہیں آزاد اور بالغ عورت تو اپنا نکاح خود کر سکتی ہے لیکن کنیز اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی جب تک اس کے

مالک کی اجازت نہ ہو اور دیدو ان کا مہر موافق دستور کے یعنی ان کا مہر مثل دیدو۔ (معارف ادریسی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا أَيُّمَا عَبْدٍ تَزَوَّجَ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهِ، فَهُوَ عَاهِرٌ جو غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے وہ زنا ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی) أُجُوْر اجر کی جمع ہے، مہر، معروف کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کوئی تکلیف و نقصان پہنچائے بغیر مہر ادا کرو، مہر کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام نہ لو۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ: اور ان سے نکاح کی یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ درانحالیکہ وہ عفیفہ اور پاکدامن ہوں زنا کرنے والی اور بدکار نہ ہوں اور نہ درپردہ یارانہ کرنے والی اور چھپے طور آشنا بنانے والی ہوں یعنی نکاح اِنہیں لونڈیوں سے کرو جو پاکدامن ہوں ان سے نہ کرو جو بدکار اور زناکار ہوں اور چھپے طور پر کسی سے یارانہ رکھتی ہوں۔ (معارف ادریسی)

زناکار وہ عورت کہلاتی ہے جو ہر ایک سے زنا کرائے اور چھپے طور پر یارانہ رکھنے والی وہ عورت ہے جو ہر ایک سے تو زنا نہ کرائے البتہ کسی ایک شخص کو اپنا یار اور آشنا بنالے جہلائے عرب پہلی قسم کے زنا کو حرام جانتے تھے اور دوسری قسم کے زنا کو حلال جیسا کہ آج کل کے متمدن قوموں اور ان کے مقلدوں کا مذہب ہے، اس لیے اللہ نے ان دونوں قسموں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرما کر یہ ظاہر فرمادیا کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں دونوں ہی حرام ہیں۔ (معارف القرآن ادریسی)

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور یہاں مُحْصَنٰتٍ (پاک دامن عورتیں) سے مراد وہ عورتیں ہیں جو عفت و عصمت والی ہوں اور فحاشی اور شبہات سے دور رہتی ہوں، اور مُسٰفِحٰتٍ (بدکار عورت) وہ ہے جو اپنے آپ کو ہر اس مرد کے لیے پیش کر دے جو اسے چاہے۔ اور مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (جو معشوق بنائے) سے مراد وہ عورت ہے جو اپنے لیے ایک خاص خفیہ ساتھی (عاشق) بنا لے، اہلِ جاہلیت ان دونوں قسموں میں فرق کرتے تھے، یعنی وہ کھلے عام زنا کو برا سمجھتے تھے لیکن خفیہ تعلقات کو جائز جانتے تھے، پس اسلام نے آکر دونوں قسموں کو حرام قرار دے دیا۔ (تفسیر الوسیط)

عصر حاضر میں گرلز فرینڈ اور بوائے فرینڈ کا جو کلچر متعارف ہے یہ سمجھ لیجیے کہ دور جاہلیت کو پھر سے عام کرنے کی ناپاک کوشش ہے، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے آنگن اور کلاس روموں سے شروع ہونے والی یہ زناکاری پورے اسلامی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، اخبارات، رسائل

اور میڈیا پر خوفناک واقعات پڑھنے، سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں، ان واقعات کو اگر زمانہ جاہلیت کے واقعات کے ساتھ ملایا جائے تو انسانیت شرما جاتی ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ: غلط کار باندیوں کی شرعی سزا کا بیان موجود ہے کہ جب باندیاں نکاح میں آگئیں، اور ان کے پاک دامن رہنے کا انتظام ہو گیا تو اب اگر زنا کر بیٹھیں تو ان کو اس سزا سے آدھی سزا ملے گی جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے، اس سے غیر شادی شدہ آزاد عورتیں مراد ہیں، غیر شادی شدہ آزاد مرد و عورت سے اگر زنا کا صدور ہو جائے تو اس کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور جو کوئی شادی شدہ مرد و عورت زنا کر لے تو اس کی سزا رجم ہے یعنی پتھروں سے مار مار کر قتل کر دیا جائے گا چونکہ اس میں تنصیف نہیں ہو سکتی، اس لئے چاروں اماموں کا مذہب یہی ہے کہ غلام یا باندی خواہ شادی شدہ ہوں خواہ کنوارے ہوں اگر ان سے زنا سرزد ہو جائے تو ان کی سزا پچاس کوڑے ہیں۔ (معارف القرآن للمفتی)

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ: یعنی باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت اس شخص کے لیے ہے جس کو زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ **اَلْعَنَتَ:** ایسا گناہ جو غلبہ شہوت تک پہنچانے والا ہو، **اَلْعَنَتَ** کا اصل معنی جڑنے کے بعد ہڈی کا ٹوٹنا، پھر استعارۃً ہر نقصان و مشقت کے لیے استعمال کیا گیا اور گناہوں میں اِبتلاء سے بڑھ کر کوئی نقصان دہ چیز نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ **اَلْعَنَتَ** کا معنی زنا ہے کیونکہ وہ ہلاکت کا سبب ہے۔ (مدارک التنزیل)

وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: یعنی باوجود اندیشہ زنا کے بھی اگر صبر کر لو اور اپنے نفسوں کو پاک دامن رکھ سکو تو یہ تمہارے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ باندیوں سے نکاح کرو، کیونکہ اس سے اولاد غلام ہو گی اور وہ لونڈی ہر وقت باہر نکلنے والی، داخل ہونے والی، محنت و مشقت کرنے والی ہے، یہ تمام چیزیں نکاح کرنے والے کے لیے نقصان اور توہین کا باعث ہیں اور عزت ایمان والوں کی صفات سے ہے حدیث میں ہے **اَلْحَرَائِرُ صَلَاحُ الْبَيْتِ وَالْاِمَاءُ هَلَاكُ الْبَيْتِ** آزاد عورتیں گھر کی درستی ہیں اور لونڈیاں گھر کی ہلاکت ہیں۔ (قرطبی) اس لیے فرمایا صبر کرو تو یہ بہتر ہے تمہارے لیے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **مَنْ أَرَادَ أَنْ يَلْقَى اللهَ طَاهِرًا**

مُطَهَّرًا فَلْيَتَزَوَّجِ الْحَرَائِرَ (ابن ماجہ) جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پاک صاف ہو کر ملاقات کرے تو وہ آزاد عورتوں سے شادی کرے۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی باندیوں سے نکاح کرنا مکروہ ہے، اگر اس کراہت پر عمل کرلو گے تب بھی اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے اور وہ رحم والا بھی ہے کیونکہ اس نے باندیوں سے نکاح کی اجازت دیدی، اور اس کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ (معارف القرآن للمفتی)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بلاضرورت مطلق باندی سے خواہ مسلمان ہو یا کتابیہ نکاح فی حد ذاتہ درست ہے مگر مکروہ ہے اس لیے کہ وہ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اور فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ کے عموم اور اطلاق میں داخل ہے فی حد ذاتہ وہ حرام نہیں البتہ عوارض مذکورہ اور مفاسد بالا کی وجہ سے باندی سے نکاح مکروہ ہوگا اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک بدون مجبوری اور لاچاری کے باندی سے نکاح درست نہیں۔ (معارف القرآن ادریسی)

شریعت کے احکامات پر عمل کی ترغیب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {٢٦} وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا {٢٧} يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا {٢٨} النساء

جواب ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ بیان فرمائے تمہارے لیے اور تم کو بتلا دے طریقے ان لوگوں کے جو تم سے پہلے تھے اور یہ کہ وہ تمہاری توبہ قبول فرمائے اور اللہ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول فرمائے اور جو لوگ خواہشات نفسانیہ کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ کو ہلکا کر دے جبکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ: اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ حلال و حرام تم پر کھول کھول کر بیان کرے، جیسا کہ سورۃ النساء میں بیان کیا جارہا ہے اسی طرح طرح قرآن

کریم کے مختلف مقامات پر بیان کیا گیا، تفسیر مظہری میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ وہ تمہارے لیے تمہارے دین کے احکامات اور تمہارے کاموں کی مصلحتیں بیان کرے، یہاں لام زائدہ ہے، استقبال کے معنیٰ کے لیے تاکید کے لیے لایا گیا ہے، یا کہا جاتا ہے کہ لام تعلیل کے لیے ہے۔ (مظہری) ان کاموں کی حکمتیں اور مصلحتیں اور تمہارے اعمال کا حسن و جمال تم سے پوشیدہ اور مخفی ہے۔

وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ: اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ سابقہ انبیاء اور صالحین کی قابل تعریف راہیں تمہیں سُجھا دے، ان کا منہج اور طریقہ تمہیں بتا دے تاکہ تم بھی ان طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے پیغمبر کی اس شریعت پر عمل کرنے لگ جاؤ جو اس کی محبوب اور اس کی پسندیدہ ہے۔ سنن سنت کی جمع ہے، لغوی معنیٰ ہے طریقہ، اصطلاح مفہوم میں سنت اس عظیم الشان طریقے کو کہا جاتا ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (التفسیر الوسیط)

اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہلے انبیاء علیہم السلام و صالحین رحمہم اللہ کے طریقے تمہیں دکھائے ہیں، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلامیہ میں جو چیزیں حلال و حرام کی ہیں وہ ہو بہو پہلی شریعتوں میں بھی حلال و حرام تھیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کے لیے احکامات جاری فرمائے تھے، جن کی انہیں ضرورت تھی، اور ان کی مصلحتیں اس کا تقاضا کر رہی تھیں، اسی طرح جن چیزوں کی ہمیں ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مشروع قرار دیں، جن کا ہماری مصلحتیں تقاضا کر رہی تھیں، اگرچہ ہماری اور ان کی شریعتیں اپنی ذات میں تو مختلف ہیں مگر مصالح کے باب میں وہ متفق ہیں۔

وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ: اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہیں توبہ کرنے کی توفیق دے، جو کچھ تم سے کمی کوتاہی ہوئی ہے اس سے درگزر کر دے، تمہاری توبہ قبول فرمالے، جس گناہ سے، جس حرام کاری سے تم توبہ کرو وہ فوراً قبول فرمالیتا ہے۔ توبہ کا معنیٰ ہے ندامت اختیار کرتے ہوئے گناہ کو چھوڑنا اور یہ عزم کرنا کہ آئندہ میں گناہ نہیں کروں گا، عبارت کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ اللہ تم پر توبہ کرے جو کہ اس کی ذات سے محال ہے، اس کا مطلب یہ ہے جو ہم نے لکھ دیا ہے، قبول توبہ مراد ہے، یعنی جب بھی تم صدق و اخلاص کے ساتھ اس ذات حق کی طرف رجوع کرو گے وہ تمہاری توبہ قبول کرلے گی، اس طرح کی

جانے والی توبہ کو سچی توبہ اور توبہ نصوح کہا جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ : اللہ تعالیٰ بہت علم والا ہے، وہ اشیاء کی حقیقت اور تہہ تک جانتا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے کون سے احکامات کی پیروی تم پر لازم کی ہے اور بڑی حکمت والا ہے ، اپنی شریعت، اپنے اندازے اپنے کام اور اپنے فرمان میں وہ صحیح علم اور کامل حکمت رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ : اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہیں توبہ کی توفیق دے، ایسی توبہ جس میں تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی ہو، اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم وہ کام کرو جو تمہیں اللہ کی بخشش اور رضا کا اہل بنادے، وہ کام کرو جو تمہیں توبہ کی قبولیت تک پہنچادے، اللہ کے ہاں تمہارے درجات کی بلندی تک تمہیں رسائی دلادے۔

وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا: جب کہ خواہشات کے پرستار، کافروں، فاسقوں اور نافرمانوں میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ تم حق سے دور رہو، خیر کے کاموں سے دور رہو، خیر کے کاموں سے دور رہنا یہ بہت بڑی دوری ہے۔ میل کا اصل معنیٰ ہے ایک طرف جھکاؤ، اعتدال و میانہ روی سے دوسری طرف جھک جانا، کیونکہ اعتدال کا معنیٰ عدل و میانہ روی ہے، تو میل کا لفظ ظلم اور حق سے دور رہنے پر بولا جاتا ہے، یہاں میل کو عظیم کے ساتھ موصوف کرنے کی وجہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو لوگ شہوات کی پیروی کرتے ہیں وہ راہِ حق سے تھوڑا سا ہٹانے اور پھیرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ تو مطلقاً راہِ حق، راہِ راست سے بندے کو بھٹکاتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے چلنے کا حکم دیا ہے۔

یہ شہوت کے بندے، شہوت کے پرستار وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ وصف بیان کیا ہے ایسے لوگ ہر دور میں موجود ہوتے ہیں، یہ لوگ رذائل، فجور کے علمبردار ہوتے ہیں، کبھی یہ آزادانہ ماحول کا نعرہ لگاتے ہیں، کبھی تہذیب و تمدن کا ترنگا لہراتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہی تہذیب کے بندوں سے اپنے بندوں کو بچایا ہے، ان سے خبردار کیا ہے، تاکہ یہ لوگ ان نئی تہذیب کے گندے انڈوں سے متأثر نہ ہوں، بلکہ بندگان خدا کو چاہیے کہ وہ ان کا مقابلہ کریں، ان کا تعاقب کریں، ان کی گمراہ کن سرگرمیوں کو طشت از بام کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان شہوت پرستوں کی کسی

تحریک کو پروان نہیں چڑھنے دے گا، اللہ کا دین نور حق ہے اسے پھونکوں سے بجھایا نہیں جاسکتا۔

شہوات کی اتباع کرنے والوں کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ زناکار لوگ ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے یہود مراد ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مجوس مراد ہیں، لیکن میرے خیال میں شہوت پرستوں سے مطلق شہوت پرست مراد لینا زیادہ بہتر ہے، تاکہ جو جو اِن کے نقشِ قدم پر چلے وہ اسی چھتری کے نیچے آتا جائے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنی رحمت وشفقت کے رنگوں میں سے ایک اور رنگ کو بیان فرمارہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ تم سے تخفیف چاہتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو احکامات دیے ہیں، جن جن چیزوں کا تمہیں مکلف بنایا ہے یہ تمہاری قدرت ودسترس میں ہیں، تم ان اعمال کو بجالاسکتے ہو، ان احکام کی پیروی کرسکتے ہو، وہ تمہارے لیے تخفیف کرنا چاہتا ہے تاکہ تم لوگ اس کے احکامات کی تعمیل کرسکو، اس کے اَوامر کی اتباع کرسکو، اس کے نواہی سے بچ سکو، تاکہ تم اس کی اطاعت واستجابت اور شکر میں آگے بڑھو، یہ تخفیف جو اُمت محمدیہ کے لیے کی گئی ہے یہ سابقہ اُمم کے لیے نہیں تھی۔

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا: اللہ تعالیٰ انسان کے خالق ہیں، اللہ نے اپنی اس مخلوق کو کمزور وضعیف قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اِطاعت کی مشقتوں اور تکالیف پر صبر نہیں کرسکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس پر رحمت ومہربانی ہوئی ہے کہ اسے ہلکے اور خفیف احکامات دیے ہیں جنہیں یہ بآسانی بجالاسکے، یہ آسانی اور تخفیف شریعت اسلامیہ کا امتیازی اور نمایاں وصف ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اسے بیان فرمایا ہے، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا **يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ** اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے، وہ تمہیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا **مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ** اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی حرج نہیں بنائی، ایک مقام پر ارشاد فرمایا **وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ، اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ**

النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے، میں اپنی رحمت ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جو زکوٰۃ دیتے ہیں، وہ جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، وہ جو پیغمبر نبی اُمّی کی اتباع کرتے ہیں، وہ نبی اُمّی جسے وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں پاتے ہیں، وہ نبی جو انہیں نیکی کا حکم کرتا ہے اور انہیں برائی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام کرتا ہے، ان سے ان کے بوجھ دُور کرتا ہے، ان سے ان کی وہ بیڑیاں ہٹاتا ہے جو ان پر ہیں۔

قرآنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جب ہم اپنے پیارآقا نبی کریم ﷺ کے ارشادات دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں بھی تخفیف وآسانی کے فرامین ملتے ہیں، ارشاد نبوی ہے إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ یہ دین آسان ہے جو شخص اپنی طاقت سے زیادہ دین میں مشقت کرے گا دین اس پر غالب آجائے گا، آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو سرزمین یمن کی طرف روانہ کرتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا تم دونوں آسانی کرنا، مشکلات پیدا نہ کرنا، تم دونوں خوشخبری سنانا اور نفرت نہ دلانا۔ اسی طرح جب ہم قرآن وحدیث کے بحر عمیق میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان نورانی تعلیمات میں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، رحمت ومہربانی کے کیا کیا رنگ دکھائی دیتے ہیں تاکہ بندگان خدا شکر خداوندی میں آگے بڑھیں، تاکہ یہ پیکر خاکی اللہ کی اطاعت میں نمایاں دکھائی دے، تاکہ بندگانِ خدا عجز وانکساری کا پیکر بن جائیں۔

باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے سے ممانعت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ

مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا {۲۹} وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا {۳۰} النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی تجارت آپس کی رضا مندی سے ہو، اور مت قتل کرو اپنی جانوں کو، بیشک اللہ تم پر بہت بڑا مہربان ہے۔ اور جو شخص زیادتی اور ظلم اختیار کرے گا سو عنقریب ہم اسے دوزخ میں داخل کر دیں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ: اے اہل ایمان! ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ باطل سے مراد یہ ہے کہ حرام طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ مثلاً سود لے کے، جوئے بازی کے طریقے سے اور چھین کر، چوری کر کے، خیانت کر کے اور اسی طرح کے دوسرے غیر شرعی طریقوں سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ۔ (معالم التنزیل)

کھانے سے مراد ایک دوسرے کے مالوں میں ناجائز تصرف کرنا ہے، باطل سے مراد خلاف شرع طریقے سے کھانا ہے، کھانے سے مراد مطلق لینا ہے، جو ان تمام تصرفات کو شامل ہے جن سے شریعت میں منع کیا گیا ہے، کھانے کو یہاں خاص اس لیے کیا گیا چونکہ تمام تصرفات سے غرض اس مال کو کھانا ہی ہوتا ہے، باطل کا لفظ ہر اس تصرف پر ہو گا جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اللہ تعالیٰ نے یہاں اہل ایمان کو مخاطب کیا ہے، تاکہ ان کے دلوں میں موجود عقیدہ کی حرارت کو حرکت دے، انہیں اس بات پر خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے اوامر کو قبول کریں اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے رک جائیں۔

اموالکم میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ اموال ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ساری امت پر لازم ہے کہ وہ ان مالوں کی باطل تصرفات سے حفاظت کرے، وہ تصرفات باطلہ جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ یہاں بَيْنَكُمْ کے لفظ سے یہ اشارہ دیا گیا کہ افراد اور جماعتوں کے درمیان مالوں کا تبادلہ حق وعدل کی بنیاد پر ہونا چاہیے، باطل اور ظلم کے طریقے سے نہیں ہونا چاہیے۔

اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ: آیت کے پہلے حصے میں ایک دوسرے کے مال کو باطل اور ناجائز طریقے سے کھانے سے منع فرمایا گیا اور یہاں ایک دوسرے کے مال کو کھانے کی ایک جائز صورت بیان کی جارہی ہے وہ یہ کہ تم باہمی تجارت کرکے، باہمی رضامندی کے ساتھ ایک دوسرے کا مال استعمال کرسکتے ہو، اسے استثنائی صورت کہا جاسکتا ہے، یہ مستثنیٰ منقطع ہے، کیونکہ تجارت ان مالوں کی جنس سے نہیں ہے جو باطل طریقے سے کھائے جاتے ہیں۔ تجارت ایک اصطلاح ہے جس سے مراد تبادلے کے معاہدے ہیں، جن کا مقصد منافع حاصل کرنا ہے، ملکیت کے دیگر تمام اسباب میں اس کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا کیونکہ یہ سب سے عام ہے اور اسباب معاش کا زیادہ تر تعلق اسی سے ہے، نبی کریم ﷺ نے تجارت کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ أَطْيَبَ الْكَسْبِ كَسْبُ التُّجَّارِ الَّذِينَ إِذَا حَدَّثُوا لَمْ يَكْذِبُوا، وَإِذَا ائْتُمِنُوا لَمْ يَخُونُوا، وَإِذَا وَعَدُوا لَمْ يُخْلِفُوا، وَإِذَا اشْتَرَوْا لَمْ يَذُمُّوا، وَإِذَا بَاعُوا لَمْ يُطْرُوا، وَإِذَا كَانَ عَلَيْهِمْ لَمْ يَمْطُلُوا، وَإِذَا كَانَ لَهُمْ لَمْ يُعَسِّرُوا (شعب الایمان، الآداب للبیہقی) سب سے پاکیزہ کمائی تاجروں کی کمائی ہے، وہ تاجر جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، جب وعدہ کریں تو اس کی مخالفت نہ کریں، جب ان کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، جب خریداری کریں تو اس کی برائی نہ کریں، جب بیچیں تو اس کی تعریف نہ کریں، جب انہیں کچھ دینا ہو تو اس میں ٹال مٹول نہ کریں، جب انہیں کچھ لینا ہو تو مشکل پیدا نہ کریں۔

یہاں تجارت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مال کو باہمی رضامندی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، ایک بائع اور مشتری دونوں کسی سودے پر ایجاب وقبول کے وقت ایک دوسرے کے ساتھ راضی ہیں تو اس میں جواز کی صورت بنتی ہے، اگر بائع کسی مشتری کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک چیز کے دام اس قدر زیادہ لگاتا ہے کہ بائع تو بیچنے پر خوش ہے اور مشتری ناراض دل کے ساتھ مجبوراً لے رہا ہے تو پھر یہ بھی باہمی مال ناجائز طریقے سے کھانے میں شامل ہوگا۔

تجارت کے ذریعہ بھی وہ مال حاصل کرنا حلال ہے جو آپس کی رضا مندی سے ہو، خریدار یا صاحب مال دونوں کسی معاملہ پر راضی ہو جائیں اور یہ رضامندی خوش دلی سے ہو تو لین دین جائز ہے

کسی فریق کو خریدنے یا بیچنے پر مجبور نہ کیا جائے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی کی چیز اٹھا کر چل دیتے ہیں یہ غصب یا لوٹ مار ہے اور بعض لوگ صاحب مال کو کچھ پیسے دے دیتے ہیں، اول تو وہ بیچنے پر راضی نہیں ہوتا اور اگر راضی ہو جائے تو اتنی قیمت نہیں دیتے جس پر وہ خوش دلی سے راضی ہو زبردستی کسی کی چیز لے لینا یا اپنے پاس سے خود قیمت تجویز کر کے دے دینا جس سے صاحب مال راضی اور خوش نہ ہو تو یہ سب حرام ہے۔ (انوار البیان)

تراضی سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ مال کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا باہمی رضامندی کے ساتھ شرعی طریقہ کے مطابق، خواہ وہ بذریعہ تجارت ہو، وراثتاً ہو یا کسی کی طرف سے ہبہ کیا گیا ہو، یا اس کے ساتھ کوئی بھی ملتا جلتا طریقہ ہو۔

یہ آیت بیع تعاطی اور بیع موقوف کے جواز پر دلالت کرتی ہے، بیع تعاطی سے مراد وہ خرید وفروخت ہے جس میں فریقین (خریدار اور فروخت کنندہ) بغیر زبانی ایجاب و قبول کے، محض کسی عمل (جیسے قیمت دینا اور مال لینا) سے خرید وفروخت کر لیں، مثال کے طور پر، کوئی شخص دکان سے چیز اٹھا کر قیمت رکھ دے اور دکاندار خاموشی سے لے لے، تو یہ بیع تعاطی کہلاتی ہے۔

فقہ حنفی: بیع تعاطی جائز ہے اور نافذ بھی، خصوصاً جب عرف و تعامل میں یہ طریقہ رائج ہو، فقہ شافعی: اصل میں ایجاب و قبول کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ضرورت یا عرف کی وجہ سے بیع تعاطی کو کافی مانتے ہیں، فقہ مالکی و حنبلی: عام طور پر بیع تعاطی کو جائز سمجھتے ہیں کیونکہ اصل مقصود فریقین کی رضامندی ہے، چاہے وہ قول سے ظاہر ہو یا فعل سے، خلاصہ کلام یہ کہ باہمی رضامندی شرط ہے۔

آج کے دور میں مثالیں: دکان یا مارکیٹ سے خریداری جہاں گاہک پیسے رکھتا ہے اور مال لے لیتا ہے، ٹکٹ مشین سے ٹکٹ خریدنا، بس یا میٹرو کارڈ میں پیسے ڈال کر سفر کرنا، گاڑیوں کے شیشوں پر ایک سٹکر چسپاں کر دیا جاتا ہے، جس میں ادا کی گئی رقم کا ریکارڈ ہوتا ہے، گاڑیاں جس ٹول پلازے سے گزرتی ہیں وہاں خودکار طریقے سے ٹیکس وصول کر لیا جاتا ہے، یہ سب طریقے جائز ہیں، یہ باہمی رضامندی سے ہوتے ہیں، اگرچہ گاڑیوں کے شیشوں پر لگایا جانے والا سٹکر یکطرفہ حکومتی رضامندی

سے ہوتا ہے، جو حکومت کی طرف سے وضع کیے گئے قانون وضابطے کے مطابق ہوتا ہے، یہ بھی جائز ہے۔

بیع موقوف فقہاء کے نزدیک ایسی بیع ہے جس کا وقوع تو ہو جائے لیکن اس کا حکم (یعنی لازم یا نافذ ہونا) کسی غیر کی اجازت یا رد پر موقوف ہو، اسے بیعِ موقوف کہتے ہیں۔ بیع موقوف نہ فی الفور نافذ ہوتی ہے نہ مطلقاً کالعدم، یہ مالک یا ولی کی اجازت یا رد پر موقوف رہتی ہے، اجازت سے صحیح ولازم ہو جاتی ہے، رد سے باطل ہو جاتی ہے۔

چند غیر شرعی معاملات کا تذکرہ

جتنے بھی غیر شرعی معاملات ہیں ان کے ذریعہ جو مال حاصل ہو گا وہ باطل طریقے پر کھانے میں شمار ہو گا، شراب، خنزیر اور مردار کی بیع حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے جو پیسہ اس ذریعہ سے ملے وہ بھی حرام ہے جو چیز اپنی ملکیت میں نہیں اس کی بیع باطل ہے، پرندہ کی بیع جبکہ وہ اُڑ رہا ہے اور مچھلی کی بیع جبکہ وہ سمندر میں ہو یہ بھی بیع باطل ہے، اگر مال مثلاً سو روپے کا لیا ہو اور خریدار سے یوں کہے کہ میں نے ایک سو دس میں لیا ہے اور تمہیں اصل دام پر دیتا ہوں، یہ بھی حرام ہے اس میں جھوٹ بھی ہے اور فریب بھی۔

کرایہ پر مکان، دکان کا دینا لینا بھی ایک قسم کی تجارت ہے اس میں بھی باہمی رضامندی شرط ہے بہت سے لوگ کسی کے خالی مکان کو دیکھ کر قبضہ کر لیتے ہیں پھر صاحب مکان کو مجبور کرتے ہیں کہ کرایہ لے لو اگر وہ کرایہ لینا منظور کرے تو اپنا منہ بولا کرایہ دینے پر مجبور کرتے ہیں وہ مجبور ہو کر بد دلی کے ساتھ تھوڑا کرایہ منظور کر لیتا ہے، یہ بھی حرام ہے.

اور بعض لوگ حکومتوں کے غیر شرعی قانون کی آڑ لیتے ہیں، حکومتوں کا قانون ہے کہ کرایہ دار سے خالی نہیں کرا سکتے، کرایہ بھی نہیں بڑھا سکتے، ایسے قانون بنانا اور ایسے قانون کو استعمال کر کے مالک مکان کو نقصان پہنچانا یہ بھی حرام ہے۔ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ مال ایک ہزار کا خریدا اور دکاندار سے کیش میمو بارہ سو کا بنوا لیا پھر جب کوئی شخص خریدنے آیا تو اس کو وہ کیش میمو دکھا کر یہ باور کرا دیا

کہ یہ مال ہم نے بارہ سو میں خریدا ہے لہٰذا تم دام کے دام خرید لو یا سو روپیہ نفع دے کر لے لو، یہ سب دھوکہ دہی ہے اور حرام ہے۔ (انوار البیان)

جس زمانے میں راقم الحروف یہ الفاظ تحریر کر رہا ہے اس وقت وطن عزیز پاکستان میں حکمرانوں کی طرف سے بزور قوت اپنی رعایا سے بجلی، گیس اور دیگر کچھ مدات میں ناجائز وصولیاں کی جا رہی ہیں، ملک بھر میں یہ ظلم جاری ہے، صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہیں مگر ان حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، اس کا نتیجہ ایک بری شکل میں نکل رہا ہے کہ عوام میں بھی بہت سے لوگ داؤ لگا کر حکومت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ حکومتی مظالم کے جواب میں بلاواسطہ میٹر بجلی کی تاریں جوڑ کر بجلی استعمال کرتے ہیں، حکمرانوں کی زبانوں پر اس کا گلہ ہے کہ لوگ بجلی چوری کرتے ہیں مگر حکمرانوں کو ذرا خیال نہیں آتا کہ وہ بزور قوت و طاقت ناجائز مال بٹورتے ہیں اور اپنی رعایا پر مظالم ڈھاتے ہیں، یہ سب ناجائز مال اسی آیت کے ذیل میں آتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اس کا عطف ماقبل پر ہے، اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ ① بعض مفسرین (جیسے ابن عباس رضی اللہ عنہما قتادہ رحمہ اللہ) نے کہا کہ یہاں مطلب ہے: خودکشی مت کرو، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اس سے خودکشی، نشہ آور چیزوں کے ذریعے اپنی جان کو نقصان پہنچانا اور کسی بھی طرح سے اپنے آپ کو ہلاک کرنا حرام قرار پایا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ، فَهُوَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدَّى فِيهِ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَحَسَّى سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ، فَسُمُّهُ فِي يَدِهِ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ، فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَجَأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا (بخاری)

جو شخص کسی پہاڑ سے گر کر اپنی جان ہلاک کرے، تو وہ دوزخ کی آگ میں (بار بار) اسی طرح گرتا رہے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنے والا ہو گا اور جو شخص زہر پی کر اپنی جان ہلاک کرے، تو اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہو گا اور وہ جہنم کی آگ میں اسے پیتا رہے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنے والا ہو گا اور جو شخص لوہے (یعنی کسی ہتھیار) سے اپنی جان لے، تو وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہو گا اور وہ جہنم کی

آگ میں اسے اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنے والا ہو گا، یہ حدیث خودکشی کی سخت ترین ممانعت اور اس کے انجام کی سخت وعید کو بیان کرتی ہے۔

امام مسلم نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ (مسلم) نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے خود کو مشاقص (یعنی چوڑے نوک والے تیر، مشاقص کی واحد مشقص) کے ذریعے قتل کر لیا تھا، تو آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی۔

② ایک دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَنفُسَكُمْ سے مراد ایک دوسرے کی جانیں ہیں، یعنی مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں، کیونکہ سب ایک ہی امت اور ایک ہی جسم کی مانند ہیں، امام طبری رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے کہا: جب تم کسی مسلمان بھائی کو قتل کرتے ہو تو گویا اپنی ہی جان کو قتل کرتے ہو۔

③ گناہ و معصیت میں پڑ کر اپنی روحانی ہلاکت نہ کرو، بعض نے اس کا مطلب یہ لیا کہ گناہوں، حرام کھانے اور نافرمانیوں میں پڑ کر اپنی آخرت کو تباہ نہ کرو، یعنی دنیاوی طور پر زندہ رہ کر بھی آخرت کی موت اور عذاب نہ مول لو۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ نہی ایک دوسرے کے قتل سے متعلق ہے، یہاں أَنْفُسَكُمْ ذکر فرمایا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْمُؤْمِنُونَ كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ مؤمنین ایک ہی جان کی مانند ہیں اور اس لیے بھی کہ عرب یہ کہا کرتے تھے قُتِلنَا وَرَبِّ الكَعبَةِ رب کعبہ کی قسم! ہم قتل کر دیے گئے، جب کہ ان میں سے کچھ لوگ قتل ہو جاتے تھے، کیونکہ ان میں سے بعض کا قتل ہونا ایسا ہی سمجھا جاتا تھا جیسے سب ہی قتل ہو گئے ہوں۔

④ اور بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو اس طرح کہ تم ایک دوسرے کا مال کھاؤ یا ان گناہوں کے ارتکاب سے جو اللہ نے حرام کیے ہیں، کیونکہ یہ طرزِ عمل تمہارے معاملات کو بگاڑ دے گا، تمہاری قوت و شوکت کو زائل کر دے گا اور تمہاری وحدت کو پارہ پارہ کر دے گا اور کسی قوم یا جماعت کے لیے سب سے بڑی ہلاکت یہی ہے کہ اس کے معاملات بگڑ

جائیں، اس کی طاقت ختم ہو جائے اور اس کی وحدت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے۔ اور امام ابنِ کثیر بھی اسی معنی کی طرف گئے ہیں، انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس قول وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو قتل نہ کرو، کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کرنا، اس کی نافرمانیوں میں مشغول ہونا اور آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے کھانا۔

ارباب تفسیر کے فرامین کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ بات درست لگتی ہے کہ یہ بابرکت آیت ان سب پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، یہ مسلمان کو اس بات سے روکتی ہے کہ وہ اپنی جان خود لے اور یہ بھی روکتی ہے کہ وہ کسی اور کو قتل کرے اور یہ بھی منع کرتی ہے کہ وہ گناہوں کا ارتکاب کرے جو اس کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔

نکتہ: یہاں اللہ تعالیٰ نے باطل طریقے سے مال کھانے کی ممانعت کو انسانی قتل سے پہلے ذکر کیا ہے، جب کہ قتل انسان یہ مال حرام کھانے سے زیادہ سخت ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے کھانے پھر ایک دوسرے کو قتل کرنے سے منع فرمایا تاکہ نہی تدریجی طور پر شدید سے اشد (سخت سے زیادہ سخت) کی طرف ہو اور اس لیے بھی کہ جن لوگوں کے دور میں یہ وحی اتاری گئی تھی اس وقت لوگوں میں باطل طریقے سے مال کھانا زیادہ رائج تھا، لوگوں کا مال کھانا ان کے لیے بہت آسان تھا، جب کہ دوسروں کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا: بیشک اللہ تم پر نہایت رحم فرمانے والا ہے، اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے (یعنی حرام قرار دیا ہے) اور جن چیزوں کو حلال کیا ہے، وہ سب دراصل انسانوں پر رحمت ہی کے پہلو سے ہے اور ان پر کسی قسم کی مشقت ڈالنے کے لیے نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے اور اسی کی جھلک یہ ہے کہ اس نے انہیں صرف انہی چیزوں کا مکلف بنایا ہے جو ان کی قدرت اور استطاعت کے اندر ہیں۔

یہ آیتِ کریمہ جان و مال کی حرمت کے بارے میں ایک عظیم اصول ہے اور یقیناً نبی اکرم ﷺ نے اس معنی کو خطبۂ حجۃ الوداع میں مؤکد فرمایا جب آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ

هَذَا أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ وَإِنَّ أَوَّلَ دَمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ (مشکوٰۃ المصابیح)

بیشک تمہارا خون اور تمہارے مال تم پر ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں، جیسے تمہارے اس دن کی حرمت ہے، تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں، خبردار! جاہلیت کے تمام امور میرے قدموں کے نیچے پامال ہیں اور جاہلیت کے تمام خون (کے انتقام) کو میں ختم کرتا ہوں، اور سب سے پہلا خون جسے میں اپنے خاندان میں سے ختم کرتا ہوں وہ ربیعہ کے بیٹے کا خون ہے

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا: جو شخص ظلم اور زیادتی کی بنا پر ایسا کرے گا اسے ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے) اس وعید میں روئے سخن کس طرف ہے اس کے متعلق کئی اقوال بیان کیے گئے ہیں ایک یہ کہ اس کا مرجع باطل طریقے سے مال کھانے نیز ناحق کسی کی جان لینے کے گھناؤنے افعال کی طرف ہے، اس لیے جو شخص بھی ان میں سے کسی ایک فعل کا مرتکب ہو گا وہ اس وعید کا سزاوار قرار پائے گا۔ (احکام القرآن للجصاص)

عطاء کا قول ہے کہ اس وعید کا تعلق صرف ناحق کسی کی جان لینے کے فعل سے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا مرجع ہر وہ فعل ہے جس کی سورت کی ابتدا سے یہاں تک ممانعت کر دی گئی ہے۔ ایک اور قول ہے کہ اس وعید کا تعلق قول باری يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا سے شروع ہوتا ہے اس لیے کہ اس کا ماقبل بھی مقرون بالوعید ہے، لیکن زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اس وعید کا تعلق اس سے متصل دو افعال یعنی باطل طریقے سے مال کھانے اور کسی کو ناحق قتل کرنے کے ساتھ ہے وعید کو اپنے قول (عُدْوَانًا وَّظُلْمًا) کے ساتھ مقید کیا ہے تاکہ سہو اور غلطی کی بنا پر سرزد ہونے والے افعال اس سے خارج ہو جائیں، نیز وہ افعال بھی اس سے نکل جائیں جو احکام میں اجتہاد کی راہ سے عصیان کی حد کو چھو جانے والے ہوں۔ (احکام القرآن)

اللہ تعالیٰ نے ظلم و عدوان دونوں کا ذکر کیا حالانکہ ان دونوں کے معانی متقارب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دو لفظوں کے معانی متقارب ہوں لیکن ان میں لفظی اختلاف ہو تو ایسی صورت میں

دونوں کا اکٹھا ذکر عبارت کے حسن کا سبب بنتا ہے۔(احکام القرآن)ناراً کی تنوین تعظیم کے لیے ہے اس کا مطلب ہے کہ بہت سخت آگ ہو گی۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے، ایک مخفی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کی صفات عدل و رحم کا صحیح تصور نہیں رکھتے وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں، وہ بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں لیکن یہ یہود کی طرح توقع یہی رکھتے ہیں کہ خدا ان پر بڑا مہربان ہے اس لیے سب بخش دے گا، قرآن نے یہود کا قول **سَيُغْفَرُ لَنَا** جو نقل کیا ہے وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے، درحقیقت اس قماش کے لوگ شہ تو حاصل کرتے ہیں اس ڈھیل اور مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق عطا فرماتا لیکن ان کی حیلہ جُو طبیعت آڑ ڈھونڈتی ہے خدا کی رحمت کی، حالانکہ خدا رحیم ہے تو آخر وہ ظالموں پر کیوں رحم فرمائے گا، اس کی رحمت کے اصلی مستحق تو وہ مظلوم ہیں جو ان کے ہاتھوں زندگی بھر ستائے گئے اور آہ بھی نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ جو لوگ ظلم و عدوان کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان کو جہنم میں جھونک دینا خدائے رحیم پر ذرا بھی شاق نہیں گزرے گا، اس لیے کہ وہ جس طرح رحیم ہے اسی طرح عادل بھی ہے اور یہ عدل بھی اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔(تدبر)

بڑے گناہوں سے اجتناب، چھوٹے گناہ بے باق

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا {۳۱} النساء

جواب ترجمہ: اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا تو ہم تم سے تمہارے چھوٹے گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ: کسی چیز سے اجتناب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے دُوری اختیار کی جائے اور اسے ایک طرف چھوڑ دیا جائے، یہاں تک کہ تم

ایک طرف ہو اور وہ دوسری طرف اور تم دونوں کے درمیان کوئی ملاپ نہ ہو، اور کبائرِ گناہ سے مراد وہ بڑے بڑے گناہ ہیں جن کی سنگینی زیادہ ہے اور جن پر سخت عذاب مقرر کیا گیا ہے، جیسے شرک، ناحق کسی جان کو قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا اور اسی طرح کی دوسری حرام چیزیں، اور سَیِّئٰات، سیئہ کی جمع ہے اور سیئہ اس برے عمل کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا کرنے والا دنیا یا آخرت میں برائی و نقصان سے دوچار ہو اور یہاں سَیِّئٰات سے مراد چھوٹے گناہ ہیں، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ان کا ذکر کبائر کے مقابلے میں کیا گیا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو جن سے شریعت نے تمہیں روک رکھا ہے، "ہم تمہارے گناہوں کو تم سے دور کر دیں گے" یعنی ہم انہیں تم پر سے مٹا ڈالیں گے یہاں تک کہ وہ ایسے ہو جائیں گے جیسے تم نے کبھی وہ کام کیے ہی نہ تھے، یہ سب اللہ کی طرف سے تم پر فضل اور تم پر رحمت ہے۔

حضرات علماء کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے صغیرہ گناہوں کو اپنی رحمت اور کرم کے ساتھ معاف فرما دیتا ہے، جب وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کریں اور اس کی طرف سچی توبہ کے ساتھ رجوع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاؤُا بِمَا عَمِلُوا، وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى. الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَآئِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (النجم ۳۲،۳۱) اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تاکہ وہ بدی کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے، اور نیکی کرنے والوں کو بہتر بدلہ عطا فرمائے، وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے ہیں سوائے چھوٹے گناہوں (کے)، بے شک آپ کا رب بڑی مغفرت والا ہے۔

کبیرہ گناہ: وہ گناہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے دنیا یا آخرت میں سخت وعید سنائی ہو، یا ان پر حد مقرر کی گئی ہو، یا ان پر اللہ کے غضب، لعنت یا جہنم کی وعید آئی ہو، جیسے شرک، قتلِ ناحق، جادو، والدین کی نافرمانی، چوری، زنا، جھوٹی گواہی، سود کھانا وغیرہ۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے اس کا خلاصہ یہ بیان کیا ہے، علماء میں کبیرہ گناہ کی حد کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ کبیرہ وہ ہر معصیت ہے جس

پر حد واجب ہو اور بعض نے کہا کہ کبیرہ وہ جرم ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ اس کے مرتکب کو دین کی کوئی پروا نہیں اور اس کی دیانت میں کمزوری ہے۔ علامہ واحدی رحمہ اللہ نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ کبیرہ گناہ کی کوئی ایسی حد مقرر نہیں ہے جس سے بندے اسے پہچان سکیں، ورنہ لوگ صغیرہ گناہوں میں جری ہو جاتے اور ان کو حلال سمجھنے لگتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے بندوں سے چھپا دیا تاکہ وہ ہر اس چیز سے بچنے کی کوشش کریں جس سے منع کیا گیا ہے، اس اُمید پر کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچ سکیں اور اس کی مثال نمازِ وسطیٰ، لیلۃ القدر اور قبولیتِ دعا کے وقت کو چھپا دینا ہے۔

صغیرہ گناہ: وہ گناہ جن پر شریعت میں کوئی حد یا شدید وعید نہیں آئی، بلکہ انہیں محض نافرمانی اور معصیت قرار دیا گیا ہو، جیسے بے فائدہ باتیں کرنا، غصہ میں جھوٹ بول جانا، کسی کو حقیر سمجھنا، نظروں کا غلط استعمال وغیرہ۔

وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا: اور ہم تمہیں عزت کی جگہ داخل کریں گے یعنی آخرت میں ہم تمہیں ایک بہترین جگہ داخل کریں گے اور وہ جنت ہے جس کا اللہ نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ فرمایا ہے، یہ ایک پاکیزہ اور بابرکت مقام ہے، جہاں داخل ہونے والا اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم اور رضا مندی سے بہرہ مند ہو گا۔

عورتوں کی خواہش کہ کاش ہم مرد ہوتیں؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا {۳۲} النساء

جواب ترجمہ: اور اس کی آرزو نہ کرو جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے تم سے بعض کو بعض پر بزرگی دی ہے، مردوں کا اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

شانِ نزول: ① حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ یارسول اللہ! تَغزُو الرِّجَالُ وَلَا نَغْزُو، وَإِنَّمَا لَنَا نِصْفُ الْمِيْرَاثِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم عورتیں اس ثواب سے محروم ہیں، اسی طرح میراث میں بھی ہمیں بہ نسبت مردوں کے آدھا ملتا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ترمذی)

② اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ یارسول اللہ! ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر میراث میں حصہ ملتا ہے، ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کی گواہی کے برابر ہے، کیا ہم عمل میں اسی طرح ہیں، اگر عورت نیکی کرے گی تو اس کو اس کی نیکی کا اجر مرد کی نیکی سے آدھا ملے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

③ یہ آیت اُس زمانے کی عورتوں کی اس آرزو پر نازل ہوئی، جنہوں نے آرزو کی تھی کہ لَيْتَنَا الرِّجَالُ فَنُجَاهِدَ كَمَا يُجَاهِدُوْنَ وَنَغْزُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ (عبدالرزاق) اے کاش ہم مرد ہوتیں تو ہم بھی اسی طرح جہاد کرتیں جیسے یہ مرد جہاد کرتے ہیں، اور ہم اللہ کی راہ میں جہاد کرتیں؟ (تفسیر ابن کثیر)

④ عِکْرِمَہ سے روایت ہے کہ عورتوں نے جہاد کے بارے میں سوال کیا اور کہا: کاش اللہ تعالیٰ ہمارے لیے بھی جہاد مقرر فرما دیتا تاکہ ہم بھی وہ اجر و ثواب حاصل کرتیں جو مردوں کو ملتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے (اس پر) آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول)

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ: اس مقام پر جس تمنا سے روکا گیا ہے اس سے مراد وہ خواہش ہے جس میں دوسروں کے مال و دولت، مرتبے یا کسی اور نعمت پر لالچ اور حسد پایا جائے، یعنی یہ چاہنا کہ کاش جو کچھ فلاں کے پاس ہے وہ میرے پاس آجائے، ایسی تمنا انسان کی زندگی کو بدبختی میں ڈال دیتی ہے، اخلاق و دین کو خراب کر دیتی ہے اور یہ دراصل خالق کی تقسیم پر اعتراض کے مشابہ ہے، حالانکہ اللہ ہی اپنے بندوں کے حالات اور اُن کے معاملات کو خوب جاننے والا ہے، البتہ اس ممانعت میں وہ تمنا شامل نہیں جسے علما نے غِبطہ اور رشک سے تعبیر کیا ہے، یعنی یہ خواہش کہ

جو بھلائی یا نعمت دوسرے کے پاس ہے ویسی ہی میرے پاس بھی ہو جائے، مگر اس طرح کہ اُس کے پاس موجود نعمت میں کوئی کمی نہ آئے۔

صاحبِ کشاف نے فرمایا: اللہ کا یہ فرمان وَلَا تَتَمَنَّوْا حسد کرنے اور اس بات کی آرزو کرنے سے روکتا ہے کہ کاش ہمیں بھی وہ ملتا جو اللہ نے بعض لوگوں کو عزت، مرتبہ یا مال کی صورت میں عطا فرمایا ہے، کیونکہ یہ فضیلت اور تقسیم اللہ کی طرف سے ہے، جو اس کی حکمت، تدبیر اور بندوں کے حالات کے علم پر مبنی ہے اور اس پر کہ کس کے لیے رزق کو کشادہ کرنا بہتر ہے اور کس کے لیے تنگی رکھنا زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کشادہ کر دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرتے، لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ اللہ کی تقسیم پر راضی رہے اور یہ جان لے کہ جو اللہ نے اس کے حصے میں رکھا ہے وہی اس کی بھلائی اور مصلحت ہے اور اگر اس کے خلاف ہوتا تو اس کے لیے نقصان اور فساد کا باعث بنتا اور اپنے بھائی کے حصے پر حسد نہ کرے۔ (تفسیر کشاف، تفسیر الوسیط)

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ: مردوں کا اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا، یہ اس پچھلی ممانعت (یعنی حسد اور بے جا تمنا) کی علت ہے، مطلب یہ کہ مرد و عورت کے ہر فریق کے لیے ان کی کمائی میں سے ایک مقدر حصہ ہے اور ان کے وراثت یا مال سے جو کچھ ملے اس میں ایک مقرر حصہ ہے، جب صورت حال یہ ہے تو کسی سمجھدار شخص کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس رزق کے خلاف تمنا کرے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، بلکہ اسے چاہیے کہ وہ اسی پر راضی رہے جو اللہ نے اس کے لیے تقسیم کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مردوں اور عورتوں کے رزق کو اپنی حکمت اور علم کے مطابق مقرر فرمایا ہے اور اسی نے ہر فریق کو اس کی استعداد اور ساخت کے مطابق ذمہ داریاں اور کام سونپے ہیں۔

بعض حضرات سے یوں نقل کیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصے بیان فرماتے ہوئے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فرمایا تو عورتوں نے کہا کہ ہم زیادہ حصہ کی مستحق ہیں کیونکہ ہم ضعیف

ہیں اور مرد قوی ہیں اور انہیں روزی حاصل کرنے پر قدرت زیادہ ہے، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ جب لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ نازل ہوئی تو بعض مردوں نے کہا کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ نیکیوں کے اعتبار سے عورتوں سے بڑھ جائیں گے اور ہمارا ثواب عورتوں کے ثواب سے دوگنا ہوگا، جیسا کہ دنیا میں میراث کے حصہ میں زیادہ دیا گیا ہے، اس پر آیت لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا نازل ہوئی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے تشریعاً اور تکویناً اس کے سب کام اور سب فیصلے اور احکام حکمت کے مطابق ہیں، اس نے جس کو جس حال میں رکھا ہے اور جتنی قوت دی ہے اور جس کام کا اہل بنایا ہے اور جس کام پر لگایا ہے یہ سب حکمت کے موافق ہے اگر سبھی کی ایک جنس ہو جاتی یا سب قوت میں برابر ہوتے تو دنیاوی معیشت و معاشرت میں بہت سارخنہ پڑ جاتا، رہا آخرت کا معاملہ اس کا تعلق اعمال اور اخلاص سے ہے، جو شخص مرد ہو یا عورت اپنی فطرت قوت و توانائی کے اعتبار سے اخلاص کے ساتھ عمل کرے گا، اس کا وہ اجر و ثواب پائے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے، صرف مرد ہونے کی وجہ سے یا عورت ہونے کی وجہ سے کسی کے ثواب میں اضافہ یا نقصان نہ ہوگا، یہ بات کہ اللہ نے جس کو جو فضیلت دی ہے دوسرا اس کی آرزو نہ کرے اس کا تعلق اُمور غیر اختیاریہ سے ہے اور جو اُمور اختیاریہ ہیں اس میں محنت کوشش کر کے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں، البتہ حسد نہ ہو، ریاکاری نہ ہو، اعجاب نفس نہ ہو، اپنی تعریف کرانا مقصود نہ ہو، آپس میں نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اور سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فرمایا ہے۔ (انوار البیان)

نیز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اسے شاکر صابر لکھ دیں گے۔ ① جس نے اپنے دین میں اپنے سے اوپر کو دیکھا اور اس نے اس کی اقتداء کی ② جس نے اپنی دنیا میں اپنے سے نیچے والے کو دیکھا اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے اس سے زیادہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو شاکر صابر لکھ دیں گے اور جس نے اپنے دین میں اپنے سے نیچے والے کو دیکھا اور دنیا میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھا اور اس پر رنج کیا (کہ مجھے تو اس قدر مال نہ ملا) تو اللہ تعالیٰ اسے شاکر و صابر نہ لکھیں گے، (مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ انوار البیان)

آنحضرت سرور عالم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک شخص کو اللہ نے مال و علم دیا، وہ مال کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور صلہ رحمی کرتا ہے اور مال میں جو حقوق ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ادا کرتا ہے تو (مالی اعتبار سے) یہ شخص سب سے افضل ہے اور ایک وہ بندہ ہے جسے اللہ نے علم دیا اور مال نہیں دیا لیکن اس کی نیت سچی ہے وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں شخص کی طرح خرچ کرتا، تو ان دونوں شخصوں کا اجر برابر ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح از ترمذی بحوالہ انوار البیان) جن کمالات کے حاصل کرنے میں عملی کوشش کو دخل نہیں ان کی تمنا نہ کرے اور جو کام کر سکتا ہے ان میں محنت کوشش کر کے آگے بڑھے۔ (انوار البیان)

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ: مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ **وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ** سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو دنیا کا سامان نہ مانگو۔ (ابن ابی شیبہ، در منثور) سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ **وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ** سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عبادت کی تمنا کرو دنیا کے مال کی تمنا نہ کرو۔ (ابن ابی حاتم) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ اس سے سوال کیا جائے۔ (ترمذی) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں کہ اس کا سوال کیا جائے اور بلاشبہ افضل عبادت خوشحالی کا انتظار کرنا ہے۔ (در منثور)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے لوگوں کے لیے ہے اس کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ وہ تمہیں اپنے خزانوں سے دے، کیونکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہو جانے والا ہے جب کہ اللہ کے خزانے کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں، یہ فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حسد سے منع کیا جا رہا ہے، حدیث شریف میں بھی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کے پاس موجود مال کی تمنا نہ کرے، لیکن ہاں یہ دعا ضرور کرے کہ اے اللہ! تو مجھے اس کی طرح عطا فرما دے اور مجھے وہ عطا فرما دے جو میری دنیا اور آخرت کے لیے بہتر ہو۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا: بیشک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک کائنات کے تمام امور کو جاننے والا ہے، اسی علم و حکمت کے مطابق اس نے اپنی مخلوق میں رزق اور

صلاحیتیں تقسیم کیں، چنانچہ ان میں سے کسی کو غنی بنایا اور کسی کو فقیر، تاکہ وہ ایک دوسرے کے محتاج رہیں اور باہم ان نفع بخش چیزوں کا تبادلہ کریں جن سے کوئی بے نیاز نہیں اور اللہ نے ہر گروہ کو اسی کے مزاج اور صلاحیت کے مطابق ذمہ داریاں دی ہیں، یہ سب اللہ کی صنّاعی ہے جس نے ہر چیز کو خوب سے خوب تر بنایا، بے شک وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

وہ علیم ہے اسی لیے تو اس نے لوگوں کے طبقات بنائے ہیں، ان میں سے بعض کو بعض پر ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق بلندی عطا کی ہے، اس لیے کہ اس کی مشیّت حکمت پر مبنی ہے، ابن عیینہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جو سوال کرتا ہے اللہ اسے عطا کرتے ہیں۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

مولیٰ الموالات کی میراث

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا {۳۳} النساء

جواب ترجمہ: اور ہر ایک کے لیے ہم نے اس مال میں وارث مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا، ان کو ان کا حصہ دے دو، بیشک اللہ کو ہر چیز کی اطلاع ہے۔

شان نزول: سعید بن المسیّب رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے بیٹے نہ ہونے کی وجہ سے کسی غیر مرد کو بیٹا بنا لیتے اور پھر اُسے اپنا وارث ٹھہراتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ حکم نازل فرمایا کہ اُن کے لئے وصیت میں سے ایک حصہ رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اصل وراثت کو رشتہ داروں اور عصبات (حقیقی وارثوں) کی طرف لوٹا دیا اور یہ پسند نہ فرمایا کہ دعویٰ کرنے والے اپنے دعوے اور منہ بولے بیٹے کو وارث بنائیں، ہاں البتہ ان کے لئے وصیت کے ذریعے سے ایک حصہ مقرر کر دیا۔ (اسباب النزول)

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ: اور ہر ایک کے لیے ہم نے اس مال میں وارث مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں، کُل کا مضاف یہاں محذوف ہے، جس کی جگہ تنوین نے لے لی ہے، اس کی تقدیر یوں ہے، لِکُلِّ إنسَان ہر انسان کے لیے، یا لِکُلِّ قَومٍ ہر قوم کے لیے، یا لِکُلِّ مَن مَّاتَ ہر مرنے والے کے لیے، یا لِکُلِّ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ ہر مرد و عورت کے لیے اور مَوَالِيَ لفظ مَولیٰ کی جمع ہے۔ مَولیٰ ایک مشترک لفظ ہے جس کے کئی معنیٰ ہیں، چنانچہ آقا کو، جو اپنے غلام کو آزاد کرے مَولیٰ کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اس پر احسان کرنے میں اس کا ولی ہے اور آزاد شدہ غلام کو بھی مَولیٰ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ اس پر اپنے آقا کے احسان اور ولایت کا تعلق باقی رہتا ہے، اسی طرح حلیف، مددگار اور قریبی رشتہ دار کو بھی مَولیٰ کہا جاتا ہے، نیز انسان کے عصبات (یعنی عصبہ رشتہ دار) کو بھی مَوَالِي کہا جاتا ہے۔ سدی کہتے ہیں کہ موالی ورثاء کو کہا جاتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ موالی سے یہاں مراد عصبہ ہیں، اس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی دلالت کرتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا أَنَا أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مَنْ مَاتَ وَتَرَكَ مَالًا فَمَالُهُ لِلْمَوَالِي الْعَصَبَةِ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَأَنَا وَلِيُّهُ (تفسیر کبیر، الوسیط) میں مؤمنوں کا سب سے زیادہ حق دار ہوں، جو شخص وفات پا جائے اور مال چھوڑ جائے تو اس کا مال اس کے موالی یعنی عصبات (قریبی رشتہ دار مرد) کے لیے ہے اور جو کوئی بوجھ (قرض یا عیال) چھوڑ جائے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اقْسِمُوا هَذَا الْمَالَ فَمَا أَبْقَتِ السِّهَامُ فَلأَوْلَى عَصَبَةٌ ذَكَر (کبیر، الوسیط) اس مال کو حصوں کے مطابق تقسیم کرو اور جو حصہ مقررہ حصوں (یعنی فرض حصوں) سے بچ جائے تو وہ سب سے قریبی مرد عصبہ کو دیا جائے۔

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ: اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہو ان کو ان کا حصہ دے دو، اس میں عقد موالات کا تذکرہ ہے، زمانہ جاہلیت میں یہ تھا کہ دو شخص آپس میں یوں اقرار کر لیتے تھے کہ ہماری تمہاری آپس میں دوستی ہے جب ہم میں سے کوئی جنایت کرے تو

دوسرا اس کی دیت کا متحمل ہو اور جب دونوں میں سے کوئی مر جائے تو اس کے مال کا وارث ہو ان میں سے ہر شخص کو مولی الموالاۃ کہا جاتا تھا، کیا اس کا حکم اسلام میں باقی ہے؟ اس کے بارے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر ایسا معاقدہ اور معاہدہ دو آدمی آپس میں کر لیں پھر ان میں سے کوئی شخص مر جائے اور مرنے والے کا کوئی بھی وارث اصحاب فرائض میں سے اور عصبات کے رشتہ داروں میں سے اور ذوی الارحام میں سے موجود نہ ہو تو مولی الموالاۃ کو میراث مل جائے گی اگر دو شخصوں نے آپس میں کوئی ایسا معاہدہ کیا ہو تو اسے آپس میں منسوخ بھی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کی طرف سے دیت ادا نہ کی ہو اگر ان میں سے کوئی شخص دوسرے کی دیت ادا کر چکا ہے تو اب یہ موالاۃ فسخ نہیں ہو سکتی۔ (انوار البیان)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عقد موالات کی وجہ سے اب ایک کی دوسرے کو میراث نہیں ملے گی، بلکہ جس کسی شخص نے کسی سے موالاۃ کی ہو اگر وہ مر جائے اور اس کا کوئی وارث رشتہ داروں میں سے نہ ہو تو اس کی میراث عامۃ المسلمین کو ملے گی۔ (یعنی اس کا ترکہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا)۔ (انوار البیان)

علامہ ابو بکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت بالا سے مولی الموالاۃ کی میراث ثابت ہو رہی ہے اور کوئی ایسی چیز کتاب و سنت میں نہیں ہے جس سے اس کو منسوخ کیا جا سکے اور آیت کریمہ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس میں ذوی الارحام کو مولی الموالاۃ سے اَولیٰ بتایا ہے (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے) پس اگر ذوی الارحام میں سے کوئی موجود نہ ہو تو بتقاضائے آیت کریمہ مولی الموالاۃ کو میراث ملنی چاہیے۔ (احکام القرآن صفحہ ۱۸۶: ج ۲، انوار البیان)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا: بیشک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لئے تمام چیزوں کو جاننے والا ہے، ظاہر و پوشیدہ سب پر مطلع ہے، پس وہ ان لوگوں کو جو اس کی شریعت کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے ان کے لائق ثواب دے گا اور جو اس سے روگردانی کریں

گے انہیں ان کے لائق سزا دے گا، یہ جملہ مبارکہ وعدہ ہے ان کے لئے جو اللہ کی اطاعت کریں اور وعید ہے ان کے لئے جو نافرمانی کریں۔

مردوں کی عورتوں پر حاکمیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا {۳۴} وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا {۳۵} النساء

جواب ترجمہ: مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس واسطے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے اور اس واسطے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں پھر جو عورتیں نیک ہیں وہ تابعدار ہیں مردوں کے پیٹھ پیچھے اللہ کی نگرانی میں (ان کے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا خطرہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور سونے میں جدا کر دو اور مارو پھر اگر تمہارا کہا مان جائیں تو ان پر الزام لگانے کے لیے بہانے مت تلاش کرو بیشک اللہ سب سے اوپر بڑا ہے۔ اور اگر تم کو شوہر اور بیوی کے آپس کے اختلاف کا ڈر ہو تو بھیج دو ایک آدمی فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی فیصلہ کرنے والا عورت کے خاندان میں سے، اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا، بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔

شان نزول: مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت سعد بن الربیع جس کا شمار نقبا یعنی اشراف میں ہوتا تھا اور اس کی بیوی حبیبہ بنت زید بن ابی زہیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ دونوں انصار میں سے تھے، اس کا شان نزول یہ ہے کہ اس کی بیوی نے اس کی نافرمانی کی تو اس نے اسے تھپڑ مار دیا، بیوی

کا باپ اسے لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس گیا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیٹی سعد سے بیاہ دی اس نے اسے تھپڑ مارا نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ اپنے خاوند سے قصاص لے لے چنانچہ عورت اپنے باپ کے ساتھ خاوند سے قصاص لینے چلی گئی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ واپس لوٹو یہ جبریل امین میرے پاس آئے ہیں اور اللہ نے یہ آیت نازل کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے ایک بات کا ارادہ کیا تھا اللہ نے دوسری بات کا ارادہ کیا اور جس بات کا ارادہ اللہ نے کیا وہ بہتر ہے نبی ﷺ نے قصاص کا حکم واپس لے لیا۔ (اسباب النزول)

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مرد عورت کا حاکم رئیس اور سردار ہے، ہر طرح سے اس کا محافظ و معاون ہے، اسی لئے مرد عورتوں سے افضل ہیں یہی وجہ ہے کہ نبوت ہمیشہ مردوں میں رہی بعینہ شرعی طور پر خلیفہ بھی مرد ہی بن سکتا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں **لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً** (بخاری) وہ لوگ کبھی نجات نہیں پاسکتے جو اپنا والی کسی عورت کو بنائیں، اسی طرح ہر طرح کا منصب قضا وغیرہ بھی مردوں کے لائق ہی ہیں۔

وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ: دوسری وجہ افضیلت کی یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں جو کتاب و سنت سے ان کے ذمہ ہے مثلاً مہر، نان نفقہ اور دیگر ضروریات کا پورا کرنا، پس مرد فی نفسہ بھی افضل ہے اور بہ اعتبار نفع کے اور حاجت براری کے بھی اس کا درجہ بڑا ہے، اسی بنا پر مرد کو عورت پر سردار مقرر کیا گیا جیسے اور جگہ فرمان ہے **وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** (البقرۃ:۲۲۸) اور مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت دی ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ: کہ نیک عورتیں فرمان برداری کرنے والی ہوتی ہیں، اللہ کی فرمان برداری کرتی ہیں اور شوہروں کی فرمان برداری بھی کرتی ہیں اور مرد گھر پر موجود نہ ہو تب بھی اپنی آبرو اور شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس حفاظت اور نگہداشت کی توفیق دی ہے اور انہیں برائیوں سے بچایا ہے۔ (روح المعانی) ابن عباس

رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی اس کے بال بچوں کی نگہداشت اس کے مال کی حفاظت وغیرہ اس کا کام ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں خَيْرُ النِّسَآءِ امْرَأَةٌ إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَإِذَا أَمَرْتَهَا أَطَاعَتْكَ وَإِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِي نَفْسِهَا وَمَالِكَ (ابن ابی حاتم) بہتر عورت وہ ہے کہ جب اس کا خاوند اس کی طرف دیکھے وہ اسے خوش کر دے اور جب حکم دے بجالائے اور جب کہیں باہر جائے تو اپنے نفس کو برائی سے محفوظ رکھے اور اپنے خاوند کے مال کی محافظت کرے پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

آپ ﷺ نے فرمایا إِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ خَمْسَهَا، وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَفِظَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ زَوْجَهَا قِيلَ لَهَا: اُدْخُلِي الْجَنَّةَ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتِ (مسند احمد) جب کوئی عورت پانچوں وقت نماز ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرے، اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے تو چاہے جنت میں چلی جا۔

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ: پھر فرمایا جن عورتوں کی سرکشی سے ڈرو یعنی جو تم سے بلند ہونا چاہتی ہو، نافرمانی کرتی ہو، بے پرواہی برتتی ہو، دشمنی رکھتی ہو، تو پہلے تو اسے زبانی نصیحت کرو ہر طرح سمجھاؤ، اتار چڑھاؤ بتاؤ اللہ کا خوف دلاؤ حقوق زوجیت یاد دلاؤ، اس سے کہو کہ دیکھو خاوند کے اتنے حقوق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا، مِنْ عِظَمِ حَقِّهِ عَلَيْهَا (ترمذی) اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے کیونکہ سب سے بڑا حق اس پر اسی کا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ فَأَبَتْ عَلَيْهِ، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ (بخاری) جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

صحیح مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ إِذَا بَاتَتِ الْمَرْأَةُ هَاجِرَةَ فِرَاشِ زَوْجِهَا، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ (مسلم) جس رات کوئی عورت روٹھ کر اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں نازل کرتے رہتے ہیں۔

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ: تو یہاں ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی نافرمان عورتوں کو پہلے تو سمجھاؤ بجھاؤ، پھر بستروں سے الگ کرو، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یعنی سلائے تو بستر ہی پر مگر خود اس سے کروٹ موڑ لے اور مجامعت نہ کرے، بات چیت اور کلام بھی ترک کر سکتا ہے اور یہ عورت کی بڑی بھاری سزا ہے، بعض مفسرین فرماتے ہیں ساتھ سلانا ہی چھوڑ دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوتا ہے کہ يَا رَسُولَ اللهِ، مَا حَقُّ امْرَأَةِ أَحَدِنَا؟ قَالَ : أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ، وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ (ابی داؤد والمسند) عورت کا حق اس کے میاں پر کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ جب تو کھائے تو اسے بھی کھلا، جب تو پہنے تو اسے بھی پہنا، اس کے منہ پر نہ مار، گالیاں نہ دے اور گھر سے الگ نہ کر غصہ میں اگر تو اس سے بطور سزا بات چیت ترک کرے تو بھی اسے گھر سے نہ نکال، پھر فرمایا اس سے بھی اگر ٹھیک ٹھاک نہ ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ یونہی اسے ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے بھی راہ راست پر لاؤ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں فرمایا وَاتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ ، فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٌ، وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَداً تَكْرَهُونَهُ ، فَإِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ، وَلَهُنَّ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (صحیح مسلم) عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو وہ تمہاری خدمت گزار اور ماتحت ہیں تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ جس کے آنے جانے سے تم خفا ہو اسے نہ آنے دیں اگر وہ ایسا نہ کریں تو انہیں یونہی سے تنبیہ بھی تم کر سکتے ہو لیکن سخت مار جو ظاہر ہو، نہیں مار سکتے تم پر ان کا حق یہ ہے کہ انہیں کھلاتے پلاتے پہناتے اڑھاتے رہو، پس ایسی مار نہ مارنی چاہیے جس کا نشان باقی رہے جس سے کوئی عضو ٹوٹ جائے یا کوئی زخم آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس پر بھی اگر وہ باز نہ آئے تو فدیہ لو اور طلاق دے دو۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی لونڈیوں کو مارو نہیں اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کرنے لگے یارسول اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر ذَئِرَتِ النِّسَآءُ عَلٰی أَزْوَاجِهِنَّ، بہت سی عورتیں اپنے خاوندوں کی نافرمان ہوگئی ہیں، اس پر آپ ﷺ نے انہیں مارنے کی اجازت دی، پھر بہت سی عورتیں اپنے خاوندوں کی شکایتیں لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی یاد رکھو تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زدوکوب کرتے ہیں لَيْسَ أُولٰئِكَ بِخِيَارِكُمْ وہ اچھے آدمی نہیں (ابوداؤد)

حضرت اشعث فرماتے ہیں ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا پھر مجھ سے فرمانے لگے اشعث تین باتیں یاد رکھ جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر یاد رکھی ہیں ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا؟ دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی (نسائی)

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا: اگر اب بھی عورتیں تمہاری فرمانبردار بن جائیں تو تم ان پر کسی قسم کی سختی نہ کرو، نہ مارو پیٹو، نہ بیزاری کا اظہار کرو۔

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا: اللہ بلندیوں اور بڑائیوں والا ہے، یعنی اگر عورتوں کی طرف سے قصور سرزد ہوئے بغیر یا قصور کے بعد ٹھیک ہو جانے کے باوجود بھی تم نے انہیں ستایا تو یاد رکھو ان کی مدد پر ان کا اِنتقام لینے کے لئے اللہ تعالیٰ ہے اور یقیناً وہ بہت زبردست ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا: اس دوسری آیت میں قرآن کریم نے اس فساد عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لیے حکّام وقت، فریقین کے اولیاء اور حامیوں کو اور مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کر کے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے فریقین کا اشتعال بھی ختم ہو جائے اور الزام تراشی کے راستے بھی بند ہو جائیں اور ان کے آپس میں مصالحت کی راہ نکل آئے اور گھر کا جھگڑا اگر گھر میں ختم نہیں ہوا تو کم از کم خاندان ہی میں ختم ہو جائے، عدالت میں مقدمہ کی صورت میں، کوچہ و بازار میں یہ جھگڑا نہ چلے۔

وہ یہ کہ ارباب حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمان کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لے دو حکم مقرر کریں، ایک مرد کے خاندان سے دوسرا عورت کے خاندان سے اور ان دونوں جگہ لفظ حکم سے تعبیر کر کے قرآن کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہو سکتی ہے جو ذی علم بھی ہو اور دیانتدار بھی، خلاصہ یہ ہے کہ ایک حکم مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا مقرر کر کے دونوں میاں بیوی کے پاس بھیجے جائیں، اب وہاں جا کر یہ دونوں کیا کام کریں اور ان کے اختیارات کیا ہیں، قرآن کریم نے اس کو متعین نہیں فرمایا۔ (معارف القرآن للمفتی)

اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا: یعنی اگر یہ دونوں حکم اصلاح حال اور باہمی مصالحت کا ارادہ کرینگے تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں امداد فرمادیں گے اور میاں بیوی میں اتفاق پیدا کر دیں گے۔ اس جملہ سے دو باتیں مفہوم ہوئیں، اول تو یہ کہ مصالحت کرانے والے دونوں حکم اگر نیک نیت ہوں اور دل سے چاہیں کہ باہم صلح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی غیبی امداد ہو گی، کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور ان کے ذریعہ دونوں میاں بیوی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اتفاق و محبت پیدا فرمادیں گے، اس کے نتیجہ سے یہ بھی سمجھا سکتا ہے کہ جہاں باہمی مصالحت نہیں ہو پاتی تو دونوں حکمین میں سے کسی جانب اخلاص کے ساتھ صلح جوئی میں کمی ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا: پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ کو ان الفاظ پر ختم فرمایا بیشک اللہ خوب جاننے والا، باخبر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن سب کو جاننے والا ہے، وہ دلوں کے احوال اور ان کے علاج کے طریقوں سے بھی پوری طرح باخبر ہے، لوگوں کے اعمال و تصرفات میں سے کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی اور وہ سب کا حساب لے گا، پس یہ جملہ بطورِ نتیجہ ذکر کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اگر حکم (فیصلہ کرنے والے) حق اور انصاف کے خلاف کوئی راستہ اختیار کریں تو ان کے لیے سخت وعید ہے، کسی درجہ میں بھی گڑبڑ کی تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہو گا۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی درست ادائیگی کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا {۳۶} الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا {۳۷} وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا {۳۸} النساء

جواب ترجمہ: اور اللہ کی بندگی کرتے رہو اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی، ساتھ بیٹھنے والے، مسافر اور غلاموں کے ساتھ (بھی حسن سلوک کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ اِترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل سکھاتے ہیں اور ان کو اللہ نے جو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں اور ہم نے انکار کرنے والوں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر اور شیطان جس کا دوست ہو تو وہ بہت برا دوست ہوا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا: امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت "اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ" محکم ہے، اس میں سے کوئی چیز منسوخ نہیں، اسی طرح یہ تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے، اگر یہ (تعلیم) کتاب میں نہ بھی آتی تو بھی عقل اس کی طرف رہنمائی کرتی، عبودیت کا مطلب ہے اس ذات کے لیے عاجزی اور فقر و احتیاج ظاہر کرنا جس کے ہاتھ میں حکم و اختیار ہے، یہ آیت اس بات کی اصل ہے کہ اعمال خالص اللہ کے لیے ہوں اور انہیں ریاکاری اور دوسری آلائشوں سے پاک رکھا جائے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي، تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ ، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں سب شریکوں سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی عمل کرے اور اس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے، تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ (مسلم)

اور مطلب یہ ہے: اے لوگو! تم پر لازم ہے کہ تم خالص طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت اور اس کے سامنے عاجزی وانکساری کرو اور اپنے تمام امور میں صرف اسی کی طرف متوجہ رہو، بغیر اس کے کہ اپنے عقیدے، عبادت، اقوال اور اعمال میں اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ، اور انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا مگر یہ کہ اللہ ہی کی عبادت کریں، دین کو اسی کے لیے خالص رکھتے ہوئے، یکسو ہو کر، یہ خالص عبادت اللہ تعالیٰ ہی کا ہم پر حق ہے، کیونکہ وہی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہے جس نے ہمیں رزق دیا اور وہی ہر حال میں ہم پر احسان فرمانے والا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے ایک گدھے پر سوار تھا جس کا نام "عُفَیر" تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: يَا مُعَاذُ، هَلْ تَدْرِي حَقَّ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ، وَمَا حَقُّ العِبَادِ عَلَى اللهِ؟ "اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: فَإِنَّ حَقَّ اللهِ عَلَى العِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلاَ يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَحَقَّ العِبَادِ عَلَى اللهِ أَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! کیا میں یہ خوشخبری لوگوں کو نہ سنا دوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: لاَ تُبَشِّرْهُمْ، فَيَتَّكِلُوا "نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں۔" (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے ان حکیمانہ نصیحتوں کو، جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہوئیں، اپنی عبادت کے حکم اور شرک سے ممانعت کے ساتھ شروع کیا ہے، کیونکہ خالص عبادت ہی دین کی بنیاد ہے اور اس کا سب سے بڑا ستون ہے، اس کے بغیر اللہ کسی کا عمل قبول نہیں فرماتا اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو ہدایات آگے بیان ہوئیں ان کی اہمیت بہت بلند ہے، کیوں کہ انہیں عبادت اور توحید کے ساتھ جوڑنے سے وہ مزید عظمت اور جلالت حاصل کر لیتی ہیں۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا: اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص عبادت کا تعلق رکھو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص عبادت کا معاملہ ہے اسی طرح ماں باپ کے ساتھ خالص حسن سلوک روا رکھو، اچھے تعلقات رکھو، ان دونوں کی اطاعت کرو، ان دونوں کی عزت واکرام کرو، ان کے احکامات کی بجاآوری کرو جن کی بجاآوری سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، جن کی بجاآوری کی تم استطاعت وطاقت رکھتے ہو، اہم ترین بات یہاں یہ ہے کہ اپنی توحید، اپنی بندگی کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ لوگوں میں احترام اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بعد سب سے زیادہ حقدار ماں باپ ہیں کہ ان کا احترام کیا جائے، اس لیے کہ اسباب کی دنیا میں وہ بلاواسطہ اس کے دنیا میں آنے کا ذریعہ ہیں۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے، سورۃ الاسراء میں ارشاد فرمایا **وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً**، تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم اسی کی بندگی بجالاؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے، **قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً**، فرمادیجیے! آجاؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں وہ چیز جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے، وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً، وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد و پیمان لیا تھا کہ تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرو گے اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھو گے۔

نبی کریم ﷺ کے نورانی ارشادات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا، انہیں کسی قسم کی تکلیف دینے والی بات سے منع کیا گیا، حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا رِضَا اللهِ فِي رِضَا الوَالِدَيْنِ وَسَخَطُ اللهِ فِي سَخَطِ الوَالِدَيْنِ، اللہ تعالیٰ کی رضا والدین کی رضا میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔ (ترمذی)

بنی سلمہ کا ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آکر عرض کیا کہ يَا رَسُولَ اللهِ، هَلْ بَقِيَ مِنْ بِرِّ أَبَوَيَّ شَيْءٌ أَبَرُّهُمَا بِهِ بَعْدَ مَوْتِهِمَا؟ قَالَ: نَعَمْ اَلصَّلَاةُ عَلَيْهِمَا، وَالِاسْتِغْفَارُ لَهُمَا، وَإِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا، وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِي لَا تُوصَلُ إِلَّا بِهِمَا، وَإِكْرَامُ صَدِيقِهِمَا یارسول اللہ! کیا میرے ذمہ کوئی نیکی باقی ہے جو میں والدین کی موت کے بعد ان کے ساتھ کروں؟ فرمایا کہ ہاں! ان کی نماز جنازہ پڑھو، ان دونوں کے لیے استغفار کرو، انہوں نے کسی سے جو وعدہ کیا اسے پورا کرو، ان کے دوستوں کی عزت واحترام کرو، ان کی وجہ سے جو رشتہ داری ہے اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ (ابو داؤد، شعب الایمان) شعب الایمان کی روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں فَهَذَا الَّذِي بَقِيَ عَلَيْكَ یہ ہے وہ چیز جو تجھ پر باقی ہے۔

ایک صحابی جب نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں اس غرض سے تشریف لائے کہ میں میدان جہاد میں جہاد کے لیے جانے سے متعلق آپ ﷺ سے مشورہ کروں، تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا تیری والدہ ہے، انہوں نے عرض کیا تھا کہ جی ہاں! والدہ ہے، اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں جہاد پر جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ اذْهَبْ فَأَكْرِمْهَا، فَإِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلَيْهَا تو چلا جا اور جا کر اپنے والدین کا اکرام کر، جنت ان دونوں کے قدموں کے پاس ہے، ایک روایت میں ہے کہ جنت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق جب ایک شخص جہاد میں جانے کے لیے مشورہ کرنے آیا تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تیرے والدین ہیں، اس نے جواب دیا کہ صرف ماں ہے، آپ ﷺ نے اس کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ فَاتَّقِ اللّٰهَ فِيهَا، فَإِذَا فَعَلْتَ ذَالِكَ فَأَنْتَ حَاجٌّ وَّمُعْتَمِرٌ، وَمُجَاهِدٌ، فَإِذَا دَعَتْكَ أُمُّكَ فَاتَّقِ اللّٰهَ وَبِرَّهَا ماں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، جب تو نے ایسا کر دیا تو تو حاجی بھی ہے، معتمر بھی ہے اور مجاہد بھی ہے، جب تجھے تیری ماں بلائے تو اللہ سے ڈر اور ماں کے ساتھ نیکی کر۔ (شعب الایمان) نبی کریم ﷺ کا اپنا عمل بھی قابل رشک تھا، آپ ﷺ جعرانہ میں گوشت تقسیم کر رہے تھے کہ آپ ﷺ کی رضاعی ماں وہاں تشریف لائیں تو نبی کریم ﷺ نے فَبَسَطَ لَهَا رِدَاءَهُ، فَجَلَسَتْ عَلَيْهِ ان کے لیے اپنی چادر بچھائی، پھر وہ اس چادر پر بیٹھ گئیں۔ (ابو داؤ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ صِلَةُ الْمَرْءِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيهِ، بَعْدَ أَنْ يُوَلِّيَ والدین کے چلے جانے کے بعد سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ بندہ اپنے والد کے دوستوں سے صلہ رحمی کرے۔ (سنن ابی داؤد)

وَّبِذِي الْقُرْبٰى: دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم فرمایا ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنے اور انہیں لینے دینے کو صلہ رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے، صلہ رحمی کی دین اسلام میں بہت بڑی فضیلت ہے اور اس کے برخلاف قطع رحمی کی بہت زیادہ مذمت آئی ہے، بنی اسرائیل کو دی گئی آسمانی تعلیمات میں یہ حکم دیا گیا کہ وہ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک رکھیں، اللہ کے ہاں ان باتوں کی بڑی اہمیت ہے، اسی لیے تو اپنی بندگی کے بعد ان باتوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ: ذُو سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ، وَمُتَصَدِّقٌ مُوَفَّقٌ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ بِكُلِّ ذِي قُرْبٰى وَمُسْلِمٍ، وَفَقِيرٌ عَفِيفٌ مُتَصَدِّقٌ، جنت کے لوگ تین قسم کے ہیں: ایک عادل بادشاہ، دوسرا وہ شخص جسے صدقہ دینے کی توفیق دی گئی، اور تیسرا وہ شخص جو رحم دل اور نرم دل ہو اپنے ہر قریبی رشتہ دار اور ہر مسلمان کے ساتھ، اور وہ غریب جو عفت و پاکدامنی اختیار کرنے والا اور (اپنی حاجت کے باوجود) صدقہ کرنے والا ہو۔

(شعب الایمان للبیہقی) نبی کریم ﷺ نے صلہ رحمی کے بارے میں ارشاد فرمایا وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَه جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

وَالْيَتٰمٰى: یتامیٰ یتیم کی جمع ہے، یتیم اسے کہتے ہیں جس کی چھوٹی عمر میں اس کا والد فوت ہو گیا ہو یتیموں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ تم ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، ان پر رحم کرو، ان کی اچھی تربیت کرو، بنی اسرائیل کو دیے گئے احکامات میں بھی اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا حکم دیا ہے، جو شخص یتیم کی کفالت کرے گا وہ قیامت کے دن نبی کریم ﷺ سے بہت ہی قریب ہو گا، خود نبی مہربان ﷺ نے فرمایا کہ أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا ایسے ہوں گے۔ (بخاری) جس وقت آپ ﷺ یہ جملہ ارشاد فرما رہے تھے اس وقت آپ ﷺ نے اپنی اُنگشت شہادت اور درمیان والی بڑی انگلی کو ملا کر اشارہ کیا، جب کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ دکھائی دے رہا تھا۔

نبی کریم ﷺ نے یتیم کے بارے میں فرمایا وَمَنْ ضَمَّ يَتِيْمًا بَيْنَ أَبَوَيْنِ مُسْلِمَيْنِ إِلَى طَعَامِهِ وَشَرَابِهِ حَتّٰى يُغْنِيَهُ اللّٰهُ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ (شعب الایمان) جو شخص کسی یتیم کو (ایسے حال میں کہ وہ) مسلمان ماں باپ سے ہو، اپنے کھانے اور پینے (یعنی اپنی کفالت و پرورش) میں شریک کر لے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے (یتیم کو) غنی کر دے، اس کے لیے جنت واجب ہو گئی، یعنی جو مسلمان کسی یتیم کو اپنے گھر میں رکھ کر اس کی پرورش کرے، اسے کھلائے پلائے، یہاں تک کہ وہ یتیم اللہ کے فضل سے خود کفیل ہو جائے، تو ایسے مسلمان کفیل کے لیے جنت کی بشارت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے خَثْعَم قبیلے کی ایک عورت کی عیادت کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہیں اپنی حالت کیسی لگ رہی ہے؟ اس نے عرض کیا: مجھے نہیں لگتا کہ میں اس بیماری سے بچ سکوں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وَدِدْتُ أَنَّكِ لَمْ تُفَارِقِي الدُّنْيَا حَتّٰى تَعُولِي يَتِيمًا أَوْ تُجَهِّزِي غَازِيًا، میری خواہش ہے کہ تم دنیا سے جدا نہ ہوتیں یہاں تک کہ کوئی یتیم کی پرورش کر لیتیں یا کسی مجاہد کو سامانِ جہاد مہیا کر دیتیں۔ (شعب الایمان للبیہقی)

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی سنگ دلی کی شکایت کی تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنْ أَرَدْتَ أَنْ يَلِينَ قَلْبُكَ، فَامْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيمِ وَأَطْعِمْهُ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا دل نرم ہو جائے، تو یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور اسے کھانا کھلایا کرو۔ (شعب الایمان للبیہقی)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ مَسَحَ بِرَأْسِ يَتِيمٍ فَإِنَّ لَهُ بِكُلِّ شَعَرَةٍ مَرَّتْ يَدَاهُ عَلَيْهِ حَسَنَةٌ، وَمَنْ أَحْسَنَ إِلَى يَتِيمَةٍ أَوْ يَتِيمٍ غَيْرِهِ كُنْتُ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ، وَفَرَّقَ بَيْنَ أُصْبُعَيْهِ جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو اس کے ہاتھ جہاں جہاں بالوں پر گزریں گے، ہر بال کے بدلے اسے نیکی ملے گی اور جو کسی یتیم لڑکی یا یتیم لڑکے کے ساتھ بھلائی کرے، تو میں اور وہ (جنت میں) اس طرح ہوں گے (یعنی قریب قریب) جیسے یہ دو انگلیاں اور آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کے درمیان فاصلہ کیا۔ (شعب الایمان)

آپ ﷺ نے اس گھر کو عزت وبزرگی والا گھر قرار دیا ہے جس میں کوئی یتیم عزت سے رہتا ہے، ارشاد فرمایا أَحَبُّ بُيُوتِكُمْ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ مُكْرَمٌ تمہارے گھروں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ گھر ہے جس میں کوئی یتیم عزت واکرام کے ساتھ رہتا ہو۔ (شعب الایمان)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے مہاجرین کے ایک یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا، تو نبی کریم ﷺ نے فرط مسرت میں ارشاد فرمایا وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَلِي أَحَدٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَتِيمًا فَيُحْسِنُ وِلَايَتَهُ ثُمَّ يَضَعُ يَدَهُ عَلَى رَأْسِهِ إِلَّا جَعَلَ اللهُ لَهُ بِكُلِّ شَعَرَةٍ حَسَنَةً، وَكَفَّ عَنْهُ بِكُلِّ شَعَرَةٍ سَيِّئَةً، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے! کوئی مسلمان یتیم کی کفالت کرے اور اس کی ولایت وپرورش میں حسنِ سلوک سے کام لے، پھر اپنے ہاتھ کو اس کے سر پر پھیرے، تو اللہ تعالیٰ ہر بال کے بدلے اس کے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور ہر بال کے بدلے اس سے ایک برائی کو دور فرما دیتا ہے۔ (شعب) ایک روایت میں یتیم کے سر پر ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملنے، ایک خطاء معاف ہونے اور ایک درجہ بلند ہونے کا بتایا گیا۔

نبی کریم ﷺ نے یتیم بچے کو روتے دیکھا تو اسے چپ کراتے ہوئے فرمایا کہ أَسَكَتَ أَمَا تَرْضَى أَنْ أَكُونَ أَنَا أَبُوكَ وَعَائِشَةُ أُمُّكَ؟ چپ کر جا کیا تو اس پر خوش نہیں کہ میں تیرا باپ ہوں اور عائشہ تیری ماں ہو۔ (شعب الایمان)

سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی روشن تعلیمات میں بھی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کا درس ملتا ہے، حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: كُنْ لِلْيَتِيمِ كَالْأَبِ الرَّحِيمِ، یتیم کے لیے مہربان باپ کی طرح بنو۔ (شعب الایمان للبیہقی)

وَالْمَسٰكِيْنِ: مساکین یہ مسکین کی جمع ہے، مسکین وہ ضرورت مند شخص ہے جسے فقر وفاقہ اور کفایت کرنے والی چیزوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے مدد ونصرت کی ضرورت ہے، اس کی مدد کی جائے، اگر وہ صحت مند ہے تو اسے کسی کام پر کھڑا کیا جائے تاکہ وہ اپنی گزر بسر کا خود انتظام کرنے کے قابل ہو جائے، اگر ضعیف و بیمار ہے تو اس کی دیکھ بھال میں اس کا ہاتھ بٹایا جائے، غرضیکہ جو کچھ ہو سکتا ہے کرنا چاہیے، بنی اسرائیل کو دی گئی تعلیمات میں بھی مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے بیوہ، مسکین کے لیے کوشاں شخص کو مجاہد فی سبیل اللہ قرار دیا، مسلم کی روایت السَّاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِينِ، كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللهِ کے ان الفاظ میں یہی فرمایا گیا ہے۔

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ نزدیک والے پڑوسی سے اچھا سلوک رکھو اور دوسرا مطلب وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ پڑوسی بھی ہو اور رشتہ دار بھی اس طرح سے اس کے دو حق ہو جائیں گے، ایک پڑوسی ہونے کا اور دوسرا قرابت دار ہونے کا۔

وَالْجَارِ الْجُنُبِ: اس سے صرف وہ پڑوسی مراد ہو گا، جو رشتہ دار نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ بھی حسن سلوک روا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پڑوسی کی اہمیت اس طرح بیان فرمائی کہ مجھے جبریل پڑوسی کے بارے میں اس طرح وصیت کرتے رہے کہ میں نے سمجھا شاید پڑوسی کو وراثت میں بھی شامل کرنے کا فرمادیں گے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر) نبی کریم ﷺ نے تین بار قسم

کھا کر فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں، وہ شخص مومن نہیں، وہ شخص مومن نہیں، صحابہ نے پوچھا کون یارسول اللہ! تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کے پڑوسی اس کی تکلیفوں سے محفوظ نہیں ہیں، نبی کریم ﷺ نے پڑوسی کے بارے میں فرمایا کہ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

پڑوسی تین قسم پر ہیں، ایک وہ پڑوسی ہے جس کے تین حقوق ہیں، حق الجوار (پڑوسی ہونے کا حق)، حق القرابۃ (قریبی رشتہ دار ہونے کا حق)، حق الاسلام (مسلمان ہونے کا حق) دوسرا وہ پڑوسی ہے جس کے دو حق ہیں، ایک حق جوار، دوسرا حق الاسلام، تیسرا وہ پڑوسی ہے جس کا ایک ہی حق ہے اور وہ حق پڑوس کا ہے، یہ غیر مسلم پڑوسی ہے، لیکن بہر حال پڑوسی ہے، اسے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے، ان میں جو جس قدر قریبی ہے اس کے ساتھ اسی قدر حسن سلوک روا رکھنا چاہیے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ: کا ترجمہ یہ ہے کہ پہلو کا ساتھی اور مفسرین رحمہم اللہ نے اس سے ہمنشین یعنی مجلس میں ساتھ بیٹھنے والا مراد لیا ہے، پاس بیٹھنے والوں کے بھی حقوق ہیں، ان کو تکلیف نہ پہنچائے، اپنی ایسی حالت نہ رکھے جس سے انہیں تکلیف ہو اور مجلس کی بات کو امانت سمجھے دوسری جگہ نہ پہنچائے، چغل خوری نہ کرے، اِدھر کی اُدھر نہ لگائے اور عموم لفظ کی وجہ سے بعض مفسرین نے سفر کے ساتھی کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ (انوار البیان) یہ سفر کا ساتھی بھی ہو سکتا ہے، یہ بھی کہا گیا کہ کسی بھی کام کا ساتھی اس شق میں داخل ہے، تعلیم و تعلم کا میدان ہو، صنعت و حرفت کا شعبہ ہو، کسی مجلس و اجلاس میں ایک ساتھ بیٹھنے والے لوگ ہوں، اس میں جس قدر عموم پیدا کرتے جائیں گے عموم پیدا ہوتا جائے گا، یہ بہت ہی وسیع اور عریض معاملہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صاحب بالجنب سے مراد عورت ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہیں جو اپنے ساتھی کے حق میں بہتر ہوں اور بہترین پڑوسی وہ ہیں جو اپنے پڑوسی کے حق میں بہتر ہوں۔ (ترمذی، باب البر والصلہ)

وَابْنِ السَّبِيْلِ: اس سے مراد مسافر یا مہمان ہے، مسافر وہ شخص ہے جو اپنے شہر سے دُور ہے، اس کے ہاتھ میں جو مال و دولت تھی وہ ختم ہو چکی ہے، اس کے بغیر وہ اپنی منزل مراد کو نہیں پہنچ سکتا، اس لیے ایسے شخص کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کریم میں مسافر کو زکوٰۃ دینے کا بھی حکم دیا گیا ہے، یہ بھی مصارف زکوٰۃ میں سے ایک ہے، مسافر کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ اسے ٹھکانہ مہیا کیا جائے، جتنے دن وہ آپ کے علاقے یا شہر میں رہے اسے چھت مہیا کی جائے، اس کی رہائش کا بندوبست کیا جائے، ویسے تین دن مہمانی کرنا واجب ہے، اسے کھانا کھلایا جائے، اس کی اس قدر مدد کی جائے جو اسے اس کے وطن تک بآسانی پہنچا دے۔

نبی کریم ﷺ نے مہمان کے اکرام کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، مہمان کا اکرام یہ ہے کہ اس کی آمد پر خندہ پیشانی سے اس سے ملاقات کرے، گرم جوشی سے اس کا استقبال کرے، اس کی مہمان نوازی کرے، اس کی خدمت نوکروں چاکروں سے کروانے کی بجائے خود کرے، بامر مجبوری نوکروں چاکروں سے بھی خدمت کروا سکتا ہے، جب مہمان اور مسافر کے ساتھ ہم کلامی ہو تو انتہائی محتاط انداز میں، کوئی دل آزاری، کوئی تکلیف دہ بات مہمان اور مسافر سے نہ کرے، اچھی اچھی دل خوش کن باتیں کرے، ورنہ خاموشی اختیار کر لے یہ بہتر ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ جو شخص اللہ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ بھلائی و خیر کی بات کرے ورنہ چپ رہے، یہ بھی مہمان نوازی کے خلاف ہے کہ مہمان چپ کر کے بیٹھا رہے اور میزبان بھی چپ کر کے بیٹھا رہے، ایسا کرنے سے مہمان پریشان ہو گا۔

وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: جو تمہارے باندی اور غلام ہیں اور وہ تمہارے تصرف میں ہیں ان کے ساتھ بھی خوبی کا برتاؤ کرو اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آؤ، ان کی خوراک پوشاک کا خیال کرو، ان پر ظلم و زیادتی نہ کرو، طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ یہ باندی غلام تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے خادم ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے تصرف میں دے دیا ہے، سو جس کے تصرف میں کوئی غلام ہو وہ اسے اسی میں سے کھلائے جس میں سے خود کھاتا ہے اور اسی میں سے پہنائے جس میں سے خود پہنتا ہے اور ان سے وہ کام نہ لو جس کی ان کو طاقت نہ ہو، اگر طاقت سے زیادہ کام لو تو ان کی مدد کر دو۔ (بخاری، انوار البیان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے غلام کو ایسے عمل پر سزا دی جو عمل اس نے نہیں کیا تھا، یا اس کو طمانچہ مار دیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔ (مسلم، انوار البیان) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے مملوک کے ساتھ بری طرح پیش آتا ہو۔ (ترمذی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے مرض الوفاۃ میں یہ وصیت فرماتے رہے کہ نمازوں کا اہتمام کرنا اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا، (شعب الایمان، مشکوٰۃ، انوار البیان) مسلمانوں میں شرعی جہاد نہیں رہا تو غلاموں اور باندیوں کی نعمت سے بھی محروم ہو گئے اللہ وہ دن لائے کہ شرعی جہاد ہو اور کافر قیدی آئیں اور غلام اور باندیاں بنیں۔ لونڈی اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بار ذمہ داری نہ ڈالی جائے، انہیں اذیت نہ دی جائے، انہیں وہ کھانا کھلایا جائے جو خود کھاتے ہو، انہیں کپڑا پہنایا جائے، جس چیز کی انہیں ضرورت ہو وہ مہیا کی جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا: اللہ تعالیٰ مختال اور فخور کو پسند نہیں کرتے ہیں، مختال: وہ متکبر ہے جو اپنی ذات پر مغرور اور خود پسند ہو، اسے اس لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے ایسے اخلاق و اوصاف کا تصور کرتا ہے جو دراصل اس میں نہیں ہوتے۔ قرآنِ مجید میں **مُخْتَالًا فَخُوْرًا** کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے جیسے سورہ نساء ۳۶، سورہ لقمان ۱۸، سورہ حدید ۲۳ وغیرہ۔ مختال: یہ لفظ اختیال سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے تکبر کرنا، اترانا، اپنی بڑائی جتانا، چلنے یا برتاؤ میں غرور کا اظہار کرنا۔ مختال وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے دوسروں کو حقیر جانے اور اپنی حرکات و سکنات

میں غرور دکھائے۔ فخُور: کا مطلب ہے بڑائی جتانے والا، اپنی نعمتوں یا کارناموں پر فخر کرنے والا اور ان کا اظہار دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے کرنے والا۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنی دولت، حسب نسب، علم یا طاقت پر اتراتا ہے اور ہر وقت فخریہ انداز میں بات کرتا ہے۔

مختال اور فخور کے بارے میں حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کی آراء گرامی بھی دیکھیے، امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختال کا مطلب ہے وہ شخص جو دل میں تکبر اور غرور رکھتا ہے، اور "فخور" وہ ہے جو اپنی بڑائی ظاہر کرے اور دوسروں پر جتائے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختال وہ ہے جو تکبر اور غرور سے چلتا اور برتاؤ کرتا ہے، جبکہ فخور وہ ہے جو لوگوں کے سامنے اپنی نعمتوں پر فخر کرتا اور ان پر اظہارِ بڑائی کرتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختال کا تعلق باطنی کیفیت (دل کے تکبر) سے ہے اور فخور کا تعلق ظاہری اظہار سے ہے، یعنی دل میں غرور ہو اور زبان یا عمل سے دوسروں پر جتائے۔ سید طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختال وہ ہے جو متکبر اور اپنی ذات پر فخر کرنے والا ہو، اسے مختال اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے ایسے اوصاف، عادات اور اعمال کا تصور کرتا ہے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہوتے، پھر وہ ان کے گھمنڈ میں لوگوں پر برتری جتاتا ہے اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتا، "فخور" وہ ہے جو اپنی باتوں یا کاموں پر حد سے زیادہ فخر کرنے والا ہو، اپنی خوبیاں اور کارنامے بار بار بیان کرنے والا اور اس بات کا خواہش مند کہ لوگ اس کی تعریف ان چیزوں پر بھی کریں جو اس نے کی ہی نہیں۔

اہم ترین احکامات جاری کرنے کے بعد آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا، خود پسندی میں مبتلا ہو اور جو اپنی باتوں اور کاموں پر حد سے زیادہ فخر جتانے والا ہو، کیونکہ جس میں یہ صفات ہوں وہ لوگوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتا، بلکہ اس کا غرور اسے دوسروں سے میل جول کرنے سے روک دیتا ہے اور اس کا فخر اسے ان پر چڑھ دوڑنے اور برتری جتانے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ

شخص نہایت خوبصورت تھا، اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے حسن و جمال محبوب ہے اور اللہ نے مجھے (خوبصورتی) بھی عطا کی ہے جیسا کہ آپ ﷺ دیکھ رہے ہیں حتیٰ کہ میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص مجھ سے بڑھ جائے، خواہ جوتے کے تسمے میں ہی کیوں نہ ہو، تو کیا یہ تکبر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لَا، وَلٰكِنَّ الْكِبْرَ مَنْ بَطِرَ الْحَقَّ، وَغَمَطَ النَّاسَ، نہیں، بلکہ تکبر یہ ہے کہ حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر جاننا۔ (سنن ابی داؤد، جامع الاصول)

یہ شخص کون تھا؟ اس کے بارے میں جامع الاصول کے حواشی میں چار اشخاص کے نام لکھے گئے ہیں مالک بن مرارہ رہاوی، سواد بن عمرو، ابوریحانہ قرشی اور عقبہ بن عامر۔ جامع الاصول کے پانچویں باب میں ان لوگوں کے نام ہیں جن کا تذکرہ حدیث میں موجود ہے لیکن ان کے نام حدیث میں نہیں ہیں۔

حضرت ثابت بن قیس بن شماس انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا، آپ ﷺ نے یہ آیت إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ تلاوت فرمائی، پھر آپ ﷺ نے تکبر کا ذکر کیا اور اس کو بہت بڑا (گناہ) بیان فرمایا، یہ سن کر ثابت بن قیس رو پڑے، تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا، مَا يُبْكِيْكَ تمہیں کس چیز نے رُلایا؟ عرض کیا، یا نبی اللہ! میں تو خوبصورتی پسند کرتا ہوں، یہاں تک کہ مجھے یہ بھی اچھا لگتا ہے کہ میرے جوتے کا تسمہ بھی عمدہ ہو، آپ ﷺ نے فرمایا، فَأَنْتَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، إِنَّهُ لَيْسَ الْكِبْرُ بِأَنْ تُحْسِنَ رَاحِلَتَكَ، وَرَحْلَكَ، وَلٰكِنَّ الْكِبْرَ مَنْ سَفِهَ الْحَقَّ، وَغَمَصَ النَّاسَ، تو تم جنتی ہو! (یاد رکھو) تکبر یہ نہیں ہے کہ تم اپنی سواری یا اپنے سامان کو اچھا بنالو، بلکہ تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کو حقیر جانے اور لوگوں کو کمتر سمجھے۔ (معجم کبیر طبرانی)

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ: اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان متکبروں اور فخریہ انداز اپنانے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور نہ ہی ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اپنی دولت کو راہِ خیر میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں، حالانکہ ان کا یہ بخل ایک بڑی خرابی ہے، بلکہ وہ دوسروں کو بھی بخل پر اکساتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ بھی انہی کے برے راستے پر چلیں۔

صاحبِ کشاف نے فرمایا: یعنی یہ لوگ نہ صرف اپنے ہاتھ کے مال پر بخل کرتے ہیں بلکہ دوسروں کے ہاتھ کے مال پر بھی بخل کرتے ہیں اور ان کو بھی بخل پر آمادہ کرتے ہیں، یہ ان کے سخاوت سے بغض رکھنے کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لیے عرب کے محاورے میں کہا جاتا ہے: أَبْخَلُ مِنَ الضَّنِينِ بِنَائِلِ غَيْرِهِ دوسروں کے انعام پر بخل کرنے والے سے زیادہ بخیل کوئی نہیں۔ پھر کہا: ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو بخل کی بیماری میں مبتلا ہیں، کہ جب ان کے کان میں یہ خبر پڑتی ہے کہ کسی نے کسی پر سخاوت کی، تو ان کا دل گھبرا جاتا ہے، بے چینی اور کڑھن ان پر طاری ہو جاتی ہے، اپنی بیٹھک کی پوزیشن بدل لیتے ہیں، گھبراہٹ سے ان کی آنکھیں گردش کرنے لگتی ہیں، گویا ان کا سامان لُوٹ لیا گیا ہو یا ان کے خزانے توڑ دیے گئے ہوں، یہ سب ان کے بخل اور دوسروں کی سخاوت پر حسرت و جلن کی علامت ہے۔ (تفسیر کشاف، تفسیر الوسیط)

بُخلٌ کے معنی ہیں روک لینا، دینے سے انکار کرنا، یا وہ چیز اپنے پاس ہی روک کر رکھنا جو دوسروں کو دینی چاہیے۔ اصطلاحی معنی: بخل اس اخلاقی کمزوری کا نام ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اُن کے حق داروں پر خرچ نہ کرے بلکہ روک لے۔ یہ صرف مال تک محدود نہیں بلکہ مال و دولت کو نہ خرچ کرنا، علم کو چھپانا، قوت یا صلاحیت کو نفع کے لئے استعمال نہ کرنا، سلام یا دعاء جیسی چھوٹی نیکی میں بھی بخل کرنا شامل ہے۔ شرعی حیثیت: قرآن و حدیث میں بخل کو شدید ناپسندیدہ اور مذموم صفت کہا گیا ہے۔ اس مقام پر بخیلوں اور بخل کو ناپسندیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت کی روشن تعلیمات میں بخیل و بخل کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، (آل عمران، ۱۸۰) جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے، بلکہ یہ ان کے لیے بُرا ہے، قیامت کے دن وہی مال ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا۔

سورۃ النساء کی پیش نظر آیت کو دیکھ لیا جائے، جس میں فرمایا گیا کہ جو لوگ بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے

ہیں، ان کے لیے ہم نے ذلت دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا، وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ، جو بخل کرتا ہے تو وہ دراصل اپنی ہی جان پر بخل کرتا ہے، اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔ (سورۃ محمد ۳۸)

بخل کی مذمت نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے بھی معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ سَفَكُوا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ (صحیح مسلم) بخل سے بچو! کیونکہ بخل نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا، اس نے انہیں خون بہانے اور حرام چیزوں کو حلال سمجھنے پر آمادہ کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا يَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْإِيمَانُ بخل اور ایمان دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے یعنی بخل ہو گا تو ایمان نہیں ہو گا اور ایمان ہو گا تو بخل نہیں ہو گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ شُحٌّ مُطَاعٌ وَهَوًى مُتَّبَعٌ وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ (شعب الایمان للبیہقی، المعجم الاوسط للطبرانی) تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں: ایسا بخل جس کی اطاعت کی جائے، خواہشاتِ نفس کی پیروی، اور انسان کا اپنی ذات پر غرور۔

ایک اور حدیث میں ہے: يَدُ اللهِ مَلْأَى لَا يَغِيضُهَا نَفَقَةٌ، سَحَّاءُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، وَقَالَ: أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضَ، فَإِنَّهُ لَمْ يَغِضْ مَا فِي يَدِهِ، وَقَالَ: عَرْشُهُ عَلَى المَاءِ، وَبِيَدِهِ الأُخْرَى المِيزَانُ، يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ (صحیح بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا، وہ دن اور رات (یعنی ہر وقت) عطا فرماتا رہتا ہے، پھر فرمایا: کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اُس وقت سے آج تک وہ (کتنا) خرچ کرتا چلا آرہا ہے، پھر بھی اُس کے ہاتھ میں کوئی کمی نہیں آئی اور فرمایا: اُس کا عرش پانی پر ہے اور اُس کے دوسرے ہاتھ میں ترازو ہے، جسے وہ نیچا اور اونچا کرتا رہتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ بخیلوں کے بخل کو ختم کرنے کے لیے حکم دے رہے ہیں کہ يَا ابْنَ آدَمَ أَنْفِقْ أُنْفِقْ عَلَيْكَ (مسلم) اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا۔

وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: اور وہ چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا، یہاں ان کی ایک اور برائی کی وضاحت ہے، یعنی وہ نہ صرف اپنے ہاتھوں میں موجود چیزوں میں بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل پر آمادہ کرتے ہیں، بلکہ اللہ کی نعمتوں کو بھی چھپاتے اور پوشیدہ رکھتے ہیں جو اس نے انہیں عطا کی ہیں، پس وہ ان نعمتوں کو ظاہر نہیں کرتے، خواہ وہ نعمتیں مالی ہوں، علمی ہوں یا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کوئی اور نعمت۔

شانِ نزول: ① اکثر مفسرین رحمہم اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے محمد ﷺ کی صفت کو چھپایا اور اسے لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کیا حالانکہ ان کی کتابوں میں آپ کی صفت لکھی موجود تھی۔ (اسباب النزول) ② کلبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ بخل کرنے والے یہود ہیں، انہوں نے اس شخص کی تصدیق کرنے میں بخل کیا جو ان کے پاس محمد ﷺ کی صفات لے کر آیا تھا حالانکہ ان کی کتابوں میں آپ کی صفات لکھی موجود تھیں۔ (اسباب النزول)

③ مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ تین آیات وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا، کے لفظ تک یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ (اسباب النزول) ④ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت یہود کی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ لوگ انصار کے لوگوں کے پاس آتے تھے ان کے ساتھ میل جول کرتے تھے انہیں نصیحت کرتے تھے ان سے کہتے تھے کہ تم اپنے اموال خرچ نہ کرو اس طرح ہمیں تمہارے نادار ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ نازل کی۔ (اسباب النزول، تفسیر الوسیط)

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا: اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے، لفظ اَعْتَدْنَا کے معنی ہیں ہم نے پوری تیاری کر رکھی ہے، یعنی وہ عذاب کوئی عارضی یا وقتی سزا نہیں بلکہ ازل سے اللہ نے اس کے لیے سامان مہیا کر رکھا ہے، اس میں تاکید ہے کہ کافروں کو یہ عذاب ضرور ملے گا۔ یہاں وہ کافر لوگ مراد ہیں جو ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں، اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور ضد و تکبر کی بنا پر حق کو قبول نہیں کرتے۔ عَذَابًا مُّهِيْنًا، ذلت دینے والا عذاب،

صرف دردناک ہی نہیں بلکہ رسوا کرنے والا بھی ہو گا، دنیا میں یہ لوگ تکبر کرتے ہیں، خود کو بڑا سمجھتے ہیں، دوسروں کو حقیر جانتے ہیں، قیامت کے دن انہیں ذلیل وخوار کر کے عذاب دیا جائے گا تا کہ ان کا غرور خاک میں مل جائے، جہنم کا عذاب جسمانی اذیت کے ساتھ ساتھ روحانی رسوائی اور تحقیر کا مجموعہ ہو گا، امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ عذاب ان کے کفر کی سزا ہے اور ان کے تکبر کے بدلے میں ذلت ورسوائی کا سامان ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے آخرت میں وہ عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں ان کی تحقیر ہو گی، جیسے دنیا میں وہ اہل ایمان کو حقیر سمجھتے تھے، قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عذاب مہین کا مطلب یہ ہے کہ جہنم کا عذاب نہ صرف دردناک ہو گا بلکہ ان کی عزت و آبرو کو بھی پامال کر دے گا، شیخ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان "اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے" ان کے اس برے انجام کو بیان کرتا ہے جس کی طرف وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے جائیں گے، یعنی ہم نے ان لوگوں کے لیے، جو اللہ کی نعمتوں کے ناشکرے اور اس کی وحی کے منکر ہیں، ایسا عذاب تیار کر رکھا ہے جو انہیں ذلیل وخوار کرے گا، ان کے غرور و تکبر اور فخر وناز کو بھلا دے گا۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ: اور جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لیے، یہ بھی مختالاً فخوراً کی صفت ہے، درمیان میں بطور جملہ معترضہ کافروں کے لیے عذاب مہین کا تذکرہ فرما دیا اس میں یہ بتایا کہ یہ تکبر اور فخر کے متوالے اللہ کی رضا کے کاموں میں تو خرچ نہیں کرتے البتہ لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں، دنیا دار کو جاہ و شہرت مطلوب ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ میری تعریف ہو اور لوگوں پر میری مالداری ظاہر ہو، اسی لیے اہل دنیا اللہ کی رضا کے کاموں میں مال خرچ کرنے سے جان چراتے ہیں۔ (انوار البیان) شہرت وریاکاری کے لیے مال کو اڑانا شریعت اسلامیہ میں قابل مذمت فعل ہے، یہاں بھی ان لوگوں کے اس طریقہ کار کی مدح نہیں کی جارہی بلکہ ان کی مذمت کی جارہی ہے۔

وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ : ان لوگوں کی مذمت فرماتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اللہ پر ایمان لاتے تو اس سے ثواب لینے کی امید رکھتے اور عذاب سے ڈرتے اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے (جہاں اعمال کی جزا ملتی ہے) تو اپنی زندگی کو درست کرتے۔ (انوار البیان) ان لوگوں سے مراد یہود ہیں۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا : اور شیطان جس کا ساتھی ہو سو وہ برا ساتھی ہے، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں الشیطان سے ابلیس اور اس کے مددگار جو اس کے قبیلہ سے ہیں اور وہ لوگ جو اس کی باتوں پر چلتے ہیں یہ سب مراد ہیں پھر لکھتے ہیں کہ نفسانی قوتیں اور خواہشیں اور شیاطین الانس والجن بھی مراد ہوسکتے ہیں، شیطان کو برا ساتھی اس لیے بتایا کہ ہمیشہ گناہوں کی طرف بلاتا ہے اور گناہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور گناہ دوزخ میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ (انوار البیان) یہاں شیطان سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو برائی پر اکسائے اور اس کی طرف دھکیلے، خواہ وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے اور قرین سے مراد وہ ساتھی ہے جو انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے، یہ لفظ فعیل کے وزن پر ہے جس کا مطلب ہے مفاعل جیسے خلیط بمعنی مخالط اور ساء کا مطلب یہاں "بئس" (یعنی بہت بُرا) ہے۔ "قریناً" اس ضمیر کی وضاحت کے لیے آیا ہے جو "ساء" میں پوشیدہ ہے۔ اور مذموم چیز (مخصوص بالذم) محذوف ہے، اور اس سے مراد وہی شیطان ہے جو انسان کو گناہوں اور برائیوں کی طرف دھکیلتا ہے۔ (تفسیر الوسیط)

اس آیتِ کریمہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بُرے ساتھی اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں، کیونکہ اخلاق کی برائی اور بگاڑ ساتھ رہنے سے دوسرے تک منتقل ہو جاتی ہے، صحبت صالح انسان کو صالح بنادیتی ہے جب کہ صحبت طالح انسان کو طالح بنادیتی ہے، اور اس جملے کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو انسانوں اور جنات کے شیاطین کی اطاعت سے روکا جائے، جو فحش کاموں اور برے اعمال پر اُبھارتے ہیں اور اپنے پیروکاروں کے سامنے برائیوں اور گناہوں کو خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ایمان نہ لانے والوں پر وبال، ذرہ برابر ظلم نہیں ہو گا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا {۳۹} اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا {۴۰} فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا {۴۱} يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا {۴۲} النساء

جواب ترجمہ: اور کیا نقصان ہے ان کا اگر وہ ایمان لائیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور خرچ کریں اس میں سے جو اللہ نے انہیں دیا ہے، اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ بیشک اللہ ظلم نہیں فرمائے گا ذرہ برابر بھی، اور اگر نیکی ہو گی تو اس کو چند در چند کر دے گا، اور اپنے پاس سے بڑا ثواب عطا فرمائے گا۔ پس کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان پر گواہ بنائیں گے۔ جس دن وہ لوگ آرزو کریں گے جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی کہ کاش! ان پر زمین برابر کر دی جاتی اور یہ لوگ اللہ سے کوئی بات بھی نہ چھپائیں گے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سختی سے ملامت فرمائی جو لوگوں کی رضا کو اللہ کی رضا پر ترجیح دیتے ہیں اور جو حق آنے کے بعد بھی اس کا انکار کرتے ہیں، اور فرمایا، اور ان پر کیا آفت آتی اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے؟

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ: اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے انہیں دیا؟ یعنی ان کافروں، بخیلوں اور ریاکاروں کو کیا نقصان پہنچتا اگر وہ اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لاتے، آخرت پر یقین رکھتے جس میں ثواب و عذاب ہے، اور اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے؟ یقیناً ایمان، انفاق اور حق کو ماننے میں کوئی نقصان نہیں بلکہ سراسر بھلائی ہی بھلائی ہے، اور جس کفر، بخل اور ریاکاری پر وہ قائم ہیں، وہی سراسر نقصان اور بربادی ہے۔ یہ جملہ ان کے کج روی اور

راہِ حق کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چلنے پر سخت ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ اسی مفہوم کی طرف صاحبِ کشاف نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کے قول وَمَاذَا عَلَيْهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے ان پر کیا بوجھ یا ضرر پڑتا؟ اصل مقصود ان پر ملامت اور توبیخ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور انفاق میں تو سراسر فائدہ اور کامیابی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی بدلہ لینے والے سے کہا جائے مَا ضَرَّكَ لَوْ عَفَوْتَ، تمہیں کیا نقصان ہوتا اگر تم معاف کر دیتے؟ یا کسی نافرمان بیٹے سے کہا جائے مَا كَانَ يَرْزَؤُكَ لَوْ كُنْتَ بَارًّا تمہیں کیا نقصان پہنچتا اگر تم والدین کے فرماں بردار ہوتے؟ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ معاف کرنے یا والدین کے ساتھ بھلائی کرنے میں کوئی نقصان نہیں بلکہ سراسر نفع ہے، لیکن یہ اندازِ بیان اس بات پر سخت ملامت اور جہالت پر توبیخ کے لیے ہے کہ انہوں نے نفع بخش راستہ چھوڑ کر نقصان والے راستے کو اختیار کیا۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا: اور اللہ ان پر علم رکھنے والا ہے، آیت کے آخر میں یوں فرمانے کا مقصد انہیں ڈرانا ہے، اس بات پر کہ انہوں نے ہدایت کے راستے کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے کو اختیار کیا، یعنی اللہ ان کے ظاہر اور باطن سب پر علم رکھنے والا ہے اور وہ ان کو ان باتوں پر سزا دے گا جو انہوں نے چھپائی ہوں گی اور جو ظاہر کی ہوں گی، اس سزا کے ساتھ جو ان کے عمل کے لائق ہو گی، ان سیاہ کاروں کے دُرون خانہ کو اللہ اچھی طرح جانتا ہے، یہ جو کچھ اپنے اندر چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے، جو کچھ بھی ان کا ظاہر و باطن ہے اللہ جانتا ہے، برا ہے تو وہ انہیں سزا دے گا، یہ بچ کے نہیں جا پائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح فرمایا کہ وہ ظلم سے پاک ہے، اس نے ظالموں پر اتمامِ حجت کر دی اور انہیں بھلائی کے راستے کی طرف بلایا۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کسی پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ مِثْقَالَ کا مطلب ہے وزن، اور ذَرَّہ کبھی سرخ رنگ کی چھوٹی چیونٹی کے لیے آتا ہے اور کبھی اس باریک ذرّے کے لیے جو مٹی میں پھونکنے سے اڑتا ہے، یہ اتنی چھوٹی اور حقیر چیز ہے کہ جب اس کے برابر بھی ظلم ثابت نہ ہو تو بڑی چیزیں تو بدرجہ اَولیٰ محفوظ ہیں۔ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما نے اپنا ہاتھ غبار میں ڈالا، پھر اس میں پھونک ماری، ان کی پھونک سے غبار کے جو ٹکڑے اُڑے تو انہوں نے فرمایا یہ سب ذرّہ ہیں، اللہ نے یہاں ذرہ اس لیے ذکر فرمایا کہ انسانی نظر جس سب سے کمترین، حقیر ترین، قلیل ترین چیز پر جاتی ہے وہ ذرّہ ہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے نیک عمل کا اجر کم نہیں کرتا، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا اور معمولی کیوں نہ ہو، اسی لیے مثال سب سے چھوٹی چیز ذَرَّہ سے دی گئی، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال: ۷-۸) پس جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بھی برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔

اور فرمایا، وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ (الانبیاء: ۴۷) اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو رکھ دیں گے، پس کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، اور اگر (عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔ یعنی قیامت کے دن انصاف کے ترازو قائم کیے جائیں گے اور کسی جان پر ذرّہ بھی ظلم نہ ہو گا، اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو اللہ تعالیٰ اسے حاضر کر دے گا۔ آیت کے الفاظ لا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ میں مفعول محذوف ہے، تقدیر یہ ہے کہ لَا يَظْلِمُ أَحَدًا ظُلْمًا وَزْنَ ذَرَّةٍ، اللہ کسی پر ذرّہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا: یعنی اگر وہ نیک عمل ذرّہ جتنا ہو تو اللہ اسے کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور اپنے فضل سے مزید بڑا اجر عطا کرتا ہے، یہ اللہ کی وسیع سخاوت، بے پایاں رحمت اور عظیم مغفرت کی دلیل ہے اللہ جسے عظیم قرار دیں اس کی عظمت کا کیا حساب و شمار ہو گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَا يَتَصَدَّقُ أَحَدٌ بِتَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، إِلَّا أَخَذَهَا اللهُ بِيَمِينِهِ، فَيُرَبِّيهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ، أَوْ قَلُوصَهُ، حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ، أَوْ أَعْظَمَ (مسلم) کوئی شخص بھی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور کے برابر

صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے، پھر اسے ایسے بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے یا اُونٹنی کے بچے کو بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ (صدقہ) ایک بڑے پہاڑ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

رحمت دوعالم ﷺ کے فرامین میں اس معنیٰ کو خوب واضح کیا گیا ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ کی طویل حدیثِ شفاعت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائے گا، اِرْجِعُوا، فَمَنْ وَجَدْتُمْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ، فَأَخْرِجُوهُ مِنَ النَّارِ، لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان پاؤ، اُسے جہنم سے نکال لو، چنانچہ وہ بہت سے لوگوں کو نکال لیں گے، پھر حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے اگر چاہو تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لو، إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ بیشک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ الْمُؤْمِنَ حَسَنَةً، يُثَابُ عَلَيْهَا الرِّزْقُ فِي الدُّنْيَا وَيُجْزَى بِهَا فِي الْآخِرَةِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِهَا فِي الدُّنْيَا، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَةٌ (مسند الطیالسی) اللہ تعالیٰ مومن کی کسی نیکی پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ اس کے بدلے دنیا میں بھی روزی عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی اس کا اجر دیتا ہے، لیکن کافر کو نیکی کا بدلہ صرف دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، پس جب قیامت کا دن آئے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہ ہو گی۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا: یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ہر اُمت پر اس کے رسول کو بطور گواہ لایا جائے گا، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر حجت بنایا تھا، تاکہ مجرم پر الزام اور حجت زیادہ مضبوط ہو جائے، اس کے لیے رُسوائی اور شرمندگی زیادہ سخت ہو، اور اس کی حسرت و پشیمانی شدید تر ہو اور جو لوگ رسول کی اطاعت کرتے رہے اور اس کی بات کو مانتے رہے، ان کی خوشی اور مسرت زیادہ ظاہر ہو، یہ آیت کافروں کے لیے سخت وعید ہے

جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ، بیشک اللہ ایک ذرّے کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور یہ نیکوکاروں کے لیے خوشخبری اور وعدہ ہے جن کے بارے میں فرمایا: وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا اور اگر کوئی نیکی کرے تو اللہ اسے کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

یہاں فَكَيْفَ میں جو فاء آئی ہے وہ اس شرط کے اظہار کے لیے ہے جو پہلے کے کلام سے پیدا ہوئی ہے اور كَيْفَ محذوف مبتدا کی خبر کے مقام پر ہے، تقدیر عبارت یوں ہو گی، إِذَا أَيْقَنْتَ بِمَا أَخْبَرْنَاكَ بِهِ أَيُّهَا الرَّسُولُ الْكَرِيمُ أَوْ أَيُّهَا السَّامِعُ مِنْ أَنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا فَكَيْفَ يَكُونُ حَالُ هٰؤُلَاءِ الْكُفَّارَةِ إِذَا مَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ مِنَ الْأُمَمِ السَّابِقَةِ بِشَهِيدٍ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ بِمَا ارْتَكَبُوْهُ مِنْ سُوْءِ الصَّنِيعِ وَقُبْحِ الْأَعْمَالِ اے رسول کریم! یا اے سننے والے! جب تو اس بات پر یقین کر لے جو ہم نے تجھ سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے بڑھا دیتا ہے اور اپنے پاس سے عظیم اجر عطا فرماتا ہے، تو پھر سوچ کہ ان کافروں کا حال کیسا ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے جو ان کے برے اعمال اور قبیح افعال پر گواہی دے گا اور وہ گواہ ان کا اپنا نبی ہو گا جسے اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا اور جب ہم آپ کو، اے محمد ﷺ، ان لوگوں پر گواہ کے طور پر لائیں گے جنہیں اللہ نے آپ کے ذریعے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کا حکم دیا تھا مگر انہوں نے آپ کو جھٹلایا اور ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو ترجیح دی، یقیناً ان کا حال سب سے بدترین ہو گا اور ان کا انجام سب سے برا ہو گا، ان کے کفر، بخل، ریاکاری اور خواہشِ نفس و شیطان کی پیروی کی وجہ سے۔

اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس آیت کے الفاظ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کو ان انبیاء پر بھی گواہ کے طور پر لائیں گے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام اپنی امتوں تک پہنچا دیا تھا اور اپنی قوموں کی خیر خواہی میں کوتاہی نہیں کی تھی، لیکن راجح اور قوی بات یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت میں سب پہلو شامل ہیں، آپ ﷺ اپنی امت پر بھی گواہ ہوں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام

پہنچا دیا اور پچھلے انبیاء پر بھی گواہ ہوں گے کہ انہوں نے اپنی قوموں تک اللہ کا پیغام پہنچایا اور ان کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وہ بلند مقام عطا فرمایا ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ (التفسیر الوسیط للطنطاوی)

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ: اس روز جن لوگوں نے کفر کیا ہو گا اور پیغمبر کا کہنا نہ مانا ہو گا آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین کا پیوند ہو جائیں یعنی جن لوگوں نے رسول کی رسالت کا انکار کیا ہو گا اور رسول کا حکم نہ مانا ہو گا یا صرف ایک جرم کیا ہو گا یعنی انکار کیا ہو گا یا رسول کا کہنا نہ مانا ہو گا وہ آرزو کریں گے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ سما جائیں اور پھر زمین برابر کر دی جائے یا خاک کے ساتھ خاک ہو گئے ہوتے اور جانوروں کی طرح معدوم کر دیا جاتا۔

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: اور اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے، عطاء نے کہا کہ لَا يَكْتُمُوْنَ کا عطف تسوی پر ہے اور مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہے یعنی وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں سما جاتے، مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتے اور رسول ﷺ کے اوصاف و حالات (جو توراۃ میں مذکور ہیں) انہوں نے نہ چھپائے ہوتے، جمہور کے نزدیک لَا يَكْتُمُوْنَ کا عطف یود الذین پر ہے یعنی وہ اپنی کوئی بات اللہ تعالیٰ سے چھپا نہ سکیں گے، اللہ سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ان کے ہاتھ پاؤں خود شہادت دیں گے۔ (مظہری)

حالت نشہ میں نماز کی ممانعت، غسل، تیمم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا {۴۳} النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ تم

جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو، اور نہ اس حالت میں نماز کے پاس جاؤ جبکہ تم پر غسل فرض ہو مگر یہ کہ راستہ گزرنے والے ہو یہاں تک کہ تم غسل کرلو، اگر تم مریض ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کی جگہ سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر پانی نہ پاؤ تو ارادہ کرو پاک مٹی کا، سو مسح کرلو اپنے چہروں کا اور ہاتھوں کا بیشک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا مغفرت فرمانے والا ہے۔

شان نزول: ① حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے لیے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کھانا تیار کیا، ہمیں دعوت دی اور شراب بھی پلائی، ہم کو نشہ ہو گیا نماز کا وقت ہو گیا تو مجھے آگے کھڑا کر دیا، میں نے قرأت میں یوں تلاوت کی قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ نازل فرمائی۔ (در منثور)

② حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے، عبد الرحمٰن بن عوف نے اور ایک تیسرے آدمی نے شراب نوشی کی، انہیں عبد الرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی، انہوں نے نماز میں سورۃ الکافرون کی اس طرح تلاوت کی کہ آیات خلط ملط کر دیں، جس پر سورۃ النساء کی یہ آیت نازل کی گئی۔

③ عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں روایت ہے کہ یہ آیت ابو بکر، عمر، علی، عبد الرحمن بن عوف سعد کے بارے میں نازل ہوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے کھانا اور شراب تیار کی تو ان لوگوں نے کھایا اور شراب بھی پی، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو نماز پڑھائی اور اس میں سورۃ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھی یہاں تک کہ اس کو ختم فرمایا اور یوں کہا لَيْسَ لِيْ دِيْنٌ وَّلَيْسَ لَكُمْ دِيْنٌ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ: اے اہل ایماں! تم نماز کے قریب نہ جاؤ درانحالیکہ تم نشے کی حالت میں ہو، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب شراب ابھی کلی طور پر حرام نہیں ہوئی تھی، اس میں حکم دیا گیا کہ اگر کسی کو شراب پی کر نشہ ہے تو وہ نماز کے قریب نہ جائے، یہاں تک کہ نشہ اُتر جائے اور اسے اپنے کلام کا شعور ہو، اس سے مراد یہ ہے کہ عبادت کے وقت ہوش و شعور اور ذہنی سکون ضروری ہے۔

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کے ارشادات کی روشنی میں یہ نماز مغرب تھی، جس میں یہ واقعہ پیش آیا، نماز کے قریب نہ جاؤ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی کی طرف نہ جاؤ، قریب جانے سے ممانعت مبالغہ کے لیے ہے، مطلب واضح ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، نماز سے مراد وہ ہئیت مخصوصہ ہے جو دکھائی دیتی ہے، جس میں قیام ہے، قرأت ہے، رکوع ہے اور سجدے ہیں۔

سُکاری، سکران (نشے میں ہونے والے) کی جمع ہے، لغت میں سُکر کا اصل معنیٰ ہے بند کرنا، اسی سے عربوں کا قول ہے: "سَکَّرتُ الطَّرِیق" یعنی میں نے راستہ بند کر دیا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے جو کافروں کے بارے میں ہے، اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ اس میں چڑھتے رہتے تو وہ کہتے: ہماری آنکھیں تو بند کر دی گئی ہیں سُکِّرَتْ أَبْصَارُنَا یعنی ان کی آنکھیں بند کر دی گئیں کہ ان تک روشنی نہ پہنچے اور وہ چیزوں کو اپنی حقیقت پر نہ دیکھ سکیں اور یہاں سُکر سے مراد وہ کیفیت ہے جو شراب پینے والے کو لاحق ہوتی ہے، جس میں انسان کا ہوش جاتا رہتا ہے اور اس کے اور اس کی عقل کے درمیان ایک پردہ یا رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ: اس وقت تک نشے کی حالت میں نماز کی ادائیگی پر پابندی لگادی گئی تھی جب تک قاری قرآن کو یہ پتہ نہ چل رہا ہو کہ وہ نماز کے اندر پڑھی جانے والی تلاوت میں کیا پڑھ رہا ہے۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "روایت میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ نماز کے اوقات میں شراب نہیں پیتے تھے اور جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو شراب پیتے، اس طرح صبح تک ان کا نشہ اُتر جاتا اور وہ جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ (روح المعانی، الوسیط)

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا: جنبی کو نماز کے لیے غسل کرنا ضروری ہے، اسی طرح حدثِ اصغر (وضو توڑنے والی چیزوں) کی صورت میں وضو کرنا فرض ہے۔ اور (لفظ) جنب اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس پر جماع، احتلام یا کسی اور سبب سے جنابت لازم ہو جائے، یہ لفظ صحیح قول کے مطابق واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے، کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے، اس کا مادہ مُجَانَبَۃٌ سے ہے، جس کا مطلب ہے دوری اختیار کرنا۔

اور عَابِرِیْ سَبِیْلٍ اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو راستہ طے کر رہا ہو، یعنی مسافر یا پھر وہ جو راستے کو

ایک جانب سے دوسری جانب پار کر رہا ہو، عربی میں کہا جاتا ہے: 'میں نے یہ راستہ طے کیا، یعنی عَبَرْتُ هٰذَا الطَّرِيْقَ اور میں اس راستے کو پار کرتا ہوں، جسے عَبراً وَّعُبُوراً کہا جاتا ہے، اسی سے کہا جاتا ہے عَبَرَ فُلَانٌ النَّهرَ فلاں نے دریا عبور کیا یعنی اسے پار کر کے دوسری جانب نکل گیا۔

انصار کے کچھ ایسے لوگ تھے جن کے گھروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، انہیں حالتِ جنابت لاحق ہو جاتی اور ان کے پاس پانی موجود نہ ہوتا، جب وہ پانی لینا چاہتے تو مسجد کے علاوہ کوئی اور راستہ انہیں نہیں ملتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ اور نہ (داخل ہو) حالتِ جنابت میں، مگر بطور گزرنے والے (راہ گیر کے طور پر)۔

حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا کا مطلب ہے جنابت کی حالت میں نماز سے رکاوٹ کی حد وانتہا غسل کرنے تک ہے، غسل یہ ہے کہ پورے جسم پر پانی بہایا جائے، جنابت کے بعد یہ ایک ظاہری پاکیزگی بھی ہے اور بدن کے لیے نشاط اور تازگی بھی، کیونکہ وہ عمل جس کے سبب جنابت واقع ہوئی اس سے جسم پر کچھ تھکن طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ غسل ایک روحانی طہارت بھی ہے، کیونکہ یہ انسان کے اندر اللہ کے ذکر اور نماز کی ادائیگی کے لیے اچھا اور پاکیزہ جذبہ پیدا کرتا ہے، بعد اس کے کہ شہوت نے کچھ وقت کے لیے اس پر غلبہ پایا ہوتا ہے، پس غسل کے بعد جسم کو نئی تازگی حاصل ہوتی ہے اور روح کو صفائی و پاکیزگی میسر آتی ہے اور بندہ اطاعتِ الٰہی کے لیے خوش دلی سے تیار ہو جاتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى أَوْ عَلٰى سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا: اگر کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا پانی نہ ملے، یا پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو، تو اللہ تعالیٰ نے سہولت دی ہے کہ پاک مٹی سے تیمم کر لیا جائے۔ وہ بیماری جس کی وجہ سے پانی کا استعمال بالکل ممکن نہ ہو، مثلاً پانی استعمال کرنے سے مرض کی شدت بڑھ جائے یا شفایابی میں تاخیر ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ نے ایسے مریض کو ان حالات اور اسی طرح کے دیگر مواقع پر وضو یا غسل کے بجائے تیمم کی اجازت دی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پانی نہ ملنے یا اس کے حکم میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

حالت جنابت میں نماز کا نہ پڑھنا تاوقتیکہ غسل نہ کر لے یہ حکم جب ہے کہ کوئی عذر نہ ہو اور اگر

کوئی ایسا عذر پیش آئے کہ پانی کے استعمال سے معذوری ہو اور طہارت کا حاصل کرنا ضروری ہو تو ایسے وقت میں زمین سے تیمم کر لینا کافی ہے۔ اب پانی کے استعمال سے معذوری کی تین صورتیں بتلائیں ایک بیماری کہ اس میں پانی ضرر کرتا ہے دوسری یہ کہ سفر درپیش ہے اور پانی اتنا موجود ہے کہ وضو کرلے تو پیاس سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے دور تک پانی نہ ملے گا۔ تیسری یہ کہ پانی بالکل موجود ہی نہیں اس پانی موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ دو صورتیں طہارت کی ضروری ہونے کی بیان فرمائیں ایک یہ کہ کوئی جائے ضرور سے فارغ ہو کر آیا اس کو وضو کی حاجت ہے دوسری یہ کہ عورت سے صحبت کی ہو تو اس کو غسل کی ضرورت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَلْغَآئِطِ، غَيْطٌ، سے ماخوذ ہے، جس کے معنی زمین کی نشیبی جگہ کے ہیں، یہاں اس سے مراد قضائے حاجت ہے، کیونکہ لوگوں کی عادت یہ رہی ہے کہ جب کوئی قضائے حاجت کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسی نشیبی جگہ کی طرف جاتا ہے تاکہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ سکے۔

أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ میں ملامست (چھونا) سے مراد بعض فقہاء کے نزدیک جماع ہے، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے عورتوں سے جماع کیا، لیکن اس کو ملامست (چھونے) کے لفظ سے کنایہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے، کیونکہ اس طرح کے امر کو صریح الفاظ میں ذکر کرنا معیوب اور باعثِ شرم سمجھا جاتا ہے، اسی رائے کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے اختیار کیا ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک ملامست سے مراد جماع نہیں بلکہ صرف چھونا ہے، یعنی تمہاری جلد کا ان کی جلد سے لگنا، امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی قول سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ عورت کو چھونا وضو کو توڑ دیتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر عورت کو چھونا شہوت کے ساتھ ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا، بصورتِ دیگر نہیں۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، خواہ وہ شہوت کے ساتھ ہو یا بغیر شہوت کے۔

تیمم لغوی معنی میں "قصد کرنے" کو کہتے ہیں, کہا جاتا ہے: تَيَمَّمْتُ الشَّيْءَ یعنی میں نے اس چیز کا قصد کیا، شرعی اصطلاح میں تیمم کا مطلب ہے: چہرے اور ہاتھوں پر مٹی لگانے کا قصد کرنا۔ جہاں

تک "صعید" (وزن فعیل) کا تعلق ہے تو یہ زمین کی اوپر والی سطح پر بولا جاتا ہے، خواہ وہ مٹی ہو یا کچھ اور، بعض حضرات کے نزدیک یہ صرف مٹی کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور "طیب" سے مراد پاکیزہ ہے، جو نہ کسی ناپاکی سے آلودہ ہو اور نہ ہی کسی گندگی سے، یعنی: اگر تمہیں پانی نہ ملے جس سے تم طہارت حاصل کر سکو، یا پانی تو مل جائے لیکن تم اس کے استعمال پر قادر نہ ہو، تو زمین کی اوپر والی سطح پر موجود پاکیزہ مٹی کا قصد کرو تاکہ اسے پانی کے بدلے اپنی طہارت کے لیے استعمال کرو۔

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ: تیمم میں چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کیا جاتا ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات مشکل نہیں بلکہ آسانی پر مبنی ہیں، پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کا حکم عجز اور مجبوری کے وقت دین کی آسانی کی بہترین مثال ہے۔ علامہ عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "تیمم کی صورت یہ ہے کہ پاک زمین پر دونوں ہاتھ مارے پھر سارے منہ پر اچھی طرح مل لیوے پھر دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک مل لے مٹی طاہر ہے اور بعض چیزوں کے لیے مثل پانی کے مطہر بھی ہے مثلاً خف، تلوار، آئینہ وغیرہ اور جو نجاست زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے اور نیز ہاتھ اور چہرہ پر مٹی ملنے میں تذلل اور عجز بھی پورا ہے جو گناہوں سے معافی مانگنے کی اعلیٰ صورت ہے، سو جب مٹی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاست کو زائل کرتی ہے تو اس لیے بوقت معذوری پانی کی قائم مقام کی گئی، اس کے سوا مقتضائے آسانی و سہولت جس پر حکم تیمم مبنی ہے یہ ہے کہ پانی کی قائم مقام ایسی چیز کی جائے جو پانی سے زیادہ سہل الوصول ہو، سو زمین کا ایسا ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب جگہ موجود ہے، معہٰذا خاک انسان کی اصل ہے اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے میں گناہوں اور خرابیوں سے بچاؤ ہے، کافر بھی آرزو کریں گے کہ کسی طرح خاک میں مل جائیں۔ (عثمانی)

شانِ نزول: اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کا کجاوہ باندھا کرتا تھا ایک رات مجھ پر غسل فرض ہو گیا، ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے موت یا مرض کا اندیشہ ہو گیا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت **لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى** (آخر تک) نازل فرمائی (جس میں تیمم کرنے کی اجازت دی گئی) (لباب النقول)

تیمم کی مشروعیت کا سبب: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں گئے، جب مقام بیداء یا ذات الجیش پر پہنچے تو میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ہار کو تلاش کرنے کے لیے رک گئے اور آپ کے ساتھ تمام قافلہ رک گیا، اس جگہ پانی تھا اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ پانی تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی اور کہنے لگے کہ تم نہیں دیکھ رہے کہ (حضرت) عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا کیا ہے؟ تمام لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ٹھہرا لیا، اس مقام پر پانی ہے اور نہ لوگوں کے ساتھ پانی ہے۔ (یہ شکایت سن کر) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے زانو پر سر رکھے ہوئے محو نیند تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا اور کہنے لگے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو پریشان کیا ہے اور ایسی جگہ روک لیا ہے جہاں بالکل پانی نہیں ہے، نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پانی ہے، پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر جو کچھ ان کے آیا کہتے رہے اور اپنے ہاتھ سے میری کوکھ میں اپنی انگلی چبھوتے رہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آرام میں خلل آنے کے خیال سے اپنی جگہ سے مطلقاً نہیں ہلی، یہاں تک کہ اسی حال میں یعنی جب کہ لوگوں کے پاس پانی نہ تھا، صبح ہو گئی، اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت تیمم نازل فرمائی، پھر نقباء میں سے حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہا اے آل ابو بکر! یہ کوئی آپ کی پہلی برکت نہیں ہے! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے اس اُونٹ کو کھڑا کیا جس پر میں سوار تھی تو ہار اس کے نیچے سے نکل آیا۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، تبیان)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا: یعنی اللہ بندوں کی کوتاہیوں کو معاف کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے، وہ عفو و درگزر کرنے والا ہے اسی لیے تو اس نے یہ کام تم پر آسان کیے ہیں، وہ عفو و درگزر والا ہے اسی لیے تو اس نے تمہیں تیمم میں رخصت دی ہے۔

علامہ عثمانی رحمہ اللہ آیت کے اس حصہ کے ذیل میں لکھتے ہیں" اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت دے دی اور مٹی کو پانی کے قائم مقام کر دیا اس لیے کہ وہ سہولت اور معافی دینے والا ہے اور بندوں کی خطائیں بخشنے والا ہے اپنے بندوں کے نفع اور آسائش کو پسند فرماتا ہے جس سے یہ بھی

معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں نشہ کی حالت میں جو کچھ کا کچھ پڑھا گیا تھا وہ بھی معاف کر دیا گیا جس سے یہ خلجان نہ رہا کہ آئندہ کو تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھیں گے مگر جو پہلے غلطی ہو گئی شاید اس کی نسبت مواخذہ ہو۔ (تفسیر عثمانی)

احکام و آداب: علماء کرام نے عرق ریزی کرتے ہوئے اس آیت کے ذیل میں چند احکامات کا استنباط کیا ہے، ① مسلمان پر لازم ہے کہ جب وہ نماز کے لیے تیار ہو تو ہر اس چیز سے اجتناب کرے جو خشوع کے منافی ہو، کیونکہ نماز دراصل اللہ تعالیٰ سے مناجات اور اس کے حضور کھڑا ہونا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنے والا ہو اسے اسی کے لیے فارغ ہونا چاہیے اور ایسے درجے کے علم و فہم کا حامل ہونا چاہیے کہ وہ اللہ رب العالمین کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔

② نماز، نشہ کی حالت میں شخص پر اس وقت تک حرام ہے جب تک وہ ہوش میں نہ آ جائے، پس اگر وہ نشہ کی حالت میں نماز ادا کرے تو وہ باطل ہو گی اور یہی حکم حدث یا جنابت والے کے لیے بھی ہے جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائے۔

③ اس آیت سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ یہاں "نماز" سے مراد اس کی جگہ ہے، کہ نشہ کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا حرام ہے، کیونکہ اس سے گندگی پھیلنے یا برے کلمات نکلنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اسی پر قیاس کیا گیا ہے ہر اس شخص کو جو کسی ایسی نجاست کا حامل ہو کہ اس سے گندگی یا گالی گلوچ وغیرہ کا خوف ہو۔

④ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے استدلال کیا کہ مسلمان کو نیند یا اس جیسی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے، کیونکہ اس وقت وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتے ہوئے نیند میں جھک جائے تو سو جائے یہاں تک کہ اس کی نیند جاتی رہے، کیونکہ تم میں سے اگر کوئی نیند کی حالت میں نماز پڑھے تو ممکن ہے کہ وہ اِستغفار کرنا چاہے اور الٹا اپنے آپ کو گالی دے بیٹھے۔

یہود کی قبیح و شنیع حرکات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِيۡلَ {۴۴} وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيۡرًا {۴۵} مِنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا وَاسۡمَعۡ غَيۡرَ مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلۡسِنَتِهِمۡ وَطَعۡنًا فِى الدِّيۡنِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانۡظُرۡنَا لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَاَقۡوَمَ ۙ وَلٰكِنۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا {۴۶} النساء

جواب ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ گمراہی کو خریدتے ہیں اور یہ ارادہ کرتے ہیں کہ تم راہ سے بھٹک جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو جاننے والا ہے اور اللہ کافی ہے، ولی ہونے کے اعتبار سے اور اللہ کافی ہے مددگار ہونے کے اعتبار سے۔ جو لوگ یہودی ہیں ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات کی تحریف کرتے ہیں ان کی جگہوں سے اور کہتے ہیں ہم نے سن لیا اور نہیں مانیں گے اور کہتے ہیں کہ سن لے اس حال میں کہ تو سننے والا نہ ہو، اور اپنی زبانوں کو موڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے لفظ راعنا کہتے ہیں اور اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور آپ سن لیجیے اور ہم پر نظر فرمایئے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑے سے آدمی۔

شان نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رفاعہ بن زید بن تابوت یہود کے بڑے لوگوں میں سے تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتا تو اپنی زبان کو مروڑ کر کہتا اے محمد! ہماری بات توجہ سے سنیے تاکہ ہم آپ کو بات سمجھائیں پھر وہ اسلام میں طعن کرتا اور عیب جوئی کرتا تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ سے لے کر فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا تک۔ (ابن اسحاق، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، بیہقی، در منثور)

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ: علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد أَلَمۡ تَرَ بعض اوقات ایسے شخص کے لئے آتا ہے جو پہلے سے جانتا ہو، تو یہ تعجب اور یاد دہانی کے لئے ہوتا ہے، جیسے علمائے یہود اور تاریخ دان اور کبھی یہ ایسے شخص کے لئے بھی آتا ہے جو پہلے سے نہ جانتا ہو، تو اس صورت میں یہ اطلاع دینے اور تعجب دلانے کے لئے ہوتا ہے، یہ تعبیر اتنی مشہور ہو گئی کہ محاورے کی طرح استعمال ہونے لگی، اس بنا پر کہ جس نے کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو، اس کی حالت کو ایسے سمجھا گیا جیسے اس نے دیکھا ہو، یعنی اس پر بھی وہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیے بلکہ اس کو بھی تعجب ہونا چاہیے، پھر اس کے ساتھ بھی وہی کلام کیا گیا جو دیکھنے والے سے کیا جاتا ہے تاکہ اس کی شہرت اور اس پر تعجب کو زیادہ نمایاں کیا جائے۔ یہاں "رؤیت" یا تو بصری نظر کے معنی میں ہے (یعنی کیا آپ نے انہیں دیکھا نہیں؟) یا دل کے ادراک کے معنی میں ہے جس میں علم تک پہنچنے اور آگاہی حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے (یعنی کیا تمہارا علم ان تک نہیں پہنچا؟) اَلَّذِيۡنَ سے مراد یہود کے احبار (علماء) ہیں۔ اَلَّذِىۡۤ اُوۡتُوۡهُ سے مراد وہ علم اور احکام ہیں جو انہیں کتاب (توراۃ) میں دیے گئے تھے، جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور دینِ اسلام کی حقانیت بھی شامل تھی۔ اَلۡكِتٰبَ سے مراد وہی توراۃ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تاکہ بنی اسرائیل کے لئے ہدایت ہو، لیکن انہوں نے اس میں تحریف کر دی اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ پس مفہوم یہ ہے: کیا تمہیں ان یہودی علما کا حال معلوم نہیں ہوا جنہیں تورات میں سے ایک حصہ اور کچھ علم عطا کیا گیا تھا؟ اگر تم نے ان کے احوال نہ دیکھے ہوں یا براہِ راست مشاہدہ نہ کیا ہو، تو بھی ضرور جان لو۔

يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِيۡلَ: تو لیجیے! یہ ہے ان کا حال اور یہی ہے ان کی حقیقت، وہ گمراہی خریدتے ہیں، یعنی یہ کہ واضح دلائل اور آیات کے ظاہر ہونے کے باوجود یہودیت پر قائم رہتے ہیں جو دینِ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرتی ہیں اور وہ صرف اپنی گمراہی پر قناعت نہیں کرتے جس میں ان کی طبیعتیں رچ بس چکی ہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ تم، اے مسلمانوں کی جماعت! اسلام جیسے دینِ حق کو چھوڑ دو اور ان کے کفر و ضلالت کی پیروی اختیار کر لو۔

چنانچہ آیتِ کریمہ کا مقصد مومنین کو ان احبار (یہودی علما) کے بُرے حال پر تعجب دلانا اور انہیں ان کی دوستی یا ان کے جھوٹ اور شبہات سننے سے روکنا ہے اور یہ خطاب ہر اس شخص کے لیے ہے جو ایمان والوں میں سے اس کے لائق ہے، یہاں نبی اکرم ﷺ کو براہِ راست خطاب کرنا اور پھر بعد میں سب کو شامل کرنا، جیسا کہ فرمایا گیا أَنْ تَضِلُّوا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان یہود کے حالات اتنے قبیح اور مشہور ہو چکے ہیں کہ ان پر ہر دیکھنے یا جاننے والے کو تعجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ان کو کتاب کا صرف کچھ حصہ دیا گیا تھا، ساری کتاب نہیں دی گئی، کیونکہ وہ اس کا بڑا حصہ بھول گئے تھے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی اور جو تھوڑا بہت علم ان کے پاس باقی رہا، اس پر بھی عمل نہ کیا بلکہ اس کو بھی بدل ڈالا، تحریف کی اور اس کی تفسیر اپنی خواہشات اور نفسانی میلانات کے تابع کر دی۔

یہ آیت کریمہ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ ان کے حال پر تعجب کا مقام ہے، کیونکہ وہ گمراہی کو نہ سستی اور کمزوری سے ڈھونڈتے ہیں اور نہ ہی سوچ بچار کے بعد، بلکہ اسے بڑی حرص و لالچ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے سب سے قیمتی سرمایہ یعنی ہدایت کو قربان کر دیتے ہیں اور وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان بھی انہی کی طرح گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

اس آیت کے قریب المعنی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً، وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر اختیار کرو جیسے انہوں نے کیا تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کے خریدی ہوئی چیز یعنی گمراہی کا ذکر فرمایا، لیکن جو چیز انہوں نے چھوڑ دی یعنی ہدایت، اس کا ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے واضح اور ظاہر ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہیں، نیز اس سے یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ وہ لوگ خود گمراہی کو مقصود بالذّات سمجھ کر خریدتے ہیں، ان کے نزدیک حق اور ہدایت سے دور رہنا ایک ایسی خواہش ہے جس پر وہ دل سے آمادہ ہوتے ہیں اور اس کے لیے قیمت دینے پر تیار ہیں، کیونکہ وہ لوگ گمراہی پر اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب انہیں اس کے سوا کچھ بھاتا ہی نہیں اور نہ ہی وہ کسی اور چیز پر مطمئن ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ جو گمراہی میں خود بھی ڈوبے ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والے ہوں، ان سے دور رہنا اور ان کو حقیر سمجھنا ہی مناسب ہے۔ جیسا کہ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: لَا تَرَى حَالَةً أَسوَأُ وَلَا أَقبَحُ مِمَّن جَمَعَ بَينَ هَذَين الأَمرَين أَعنِي الضَّلَال وَالإِضلَال تم کسی حالت کو اس سے زیادہ بدتر اور قبیح نہ پاؤ گے کہ ایک شخص خود بھی گمراہی میں ڈوبا ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہو۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ دراصل اس ملامت اور تعجب کی بنیاد کو واضح کرنے کے لیے بطور استئناف آئی ہے، جو کلام کے آغاز سے ہی ظاہر تھی، اس کی بنا ایسے سوال پر ہے جیسے کوئی پوچھے، یہ لوگ آخر کرتے کیا ہیں کہ ان پر نظر ڈالی جائے؟ تو جواب دیا گیا: یہ ہدایت کے باوجود گمراہی کو اختیار کرتے ہیں یا ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی کو لے لیتے ہیں۔

اور ابو البقاء رحمہ اللہ کے نزدیک يَشْتَرُونَ کا جملہ یا تو أُوتُوا کی ضمیر کی حالت مقدرہ ہے یا پھر الَّذِينَ سے حال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تم سے بہتر جانتا ہے، اے ایمان والو! اور اس نے تمہیں ان کے حالات اور ان کی سازشوں سے آگاہ کر دیا ہے، لہٰذا تم ان سے ہوشیار رہو، ان کی باتوں پر کان نہ دھرو اور اپنے دین وعقیدے کے دفاع کے لیے پوری تیاری رکھو۔

وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ یہ جملہ مسلمانوں کے ساتھ یہود کے باطنی حسد، دشمنی اور ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کی دعوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جیسے کوئی شخص خود اندھیری گلی میں غلط راستہ اختیار کر کے بھٹک گیا ہو، اب وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جو لوگ روشنی والے سیدھے راستے پر چل رہے ہیں وہ بھی اپنی راہ چھوڑ کر اسی اندھیرے اور خطرناک گلی میں آجائیں، اسی طرح یہود خود ہدایت چھوڑ کر گمراہی میں پڑ گئے تھے اور پھر چاہتے تھے کہ مسلمان بھی ہدایت (اسلام) چھوڑ کر ان کے ساتھ گمراہی میں شریک ہو جائیں۔ السبیل سے مراد سیدھا راستہ ہے، یعنی دینِ اسلام، یہاں "الف" عہد کے لئے ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ: یہ جملہ معترضہ کے طور پر لایا گیا ہے، تحذیر اور تاکید کے لیے، یعنی: اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تم سے بہتر جانتا ہے، اے ایمان والو! اور اس نے تمہیں ان کے حالات اور

ان سازشوں کے بارے میں خبر دے دی ہے جو وہ تمہارے خلاف خفیہ طور پر تیار کرتے ہیں، پس ان سے ہوشیار رہو اور ان کی باتوں پر دھیان نہ دو، بلکہ اپنے دین اور عقیدے کے دفاع کے لیے ان کی تادیب کی تیاری کرو۔

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا : اس کا مقصد مؤمنوں کے دلوں میں یہ اطمینان پیدا کرنا ہے کہ انجامِ کار ان ہی کے حق میں بہتر ہو گا، یعنی اللہ ہی کافی ہے تمہارا ولی بن کر، جو تمہارے اُمور کی تدبیر فرماتا ہے اور تمہارے حال کو سنوارتا ہے اور اللہ ہی کافی ہے مددگار بن کر، جو دشمنوں کے مکر و شر سے تمہاری حفاظت فرماتا ہے، جب صورتِ حال یہ ہے تو تم صرف اسی کی ولایت اور نصرت پر بھروسہ کرو، اس کی مضبوط رسی کو تھامے رکھو، اس کے احکام کی اطاعت کرو اور دشمنوں کے مکر و فریب سے تنگ دل نہ ہو، کیونکہ اللہ اپنے فضل و کرم سے تمہیں ان پر غالب کرے گا۔

لفظ **كَفٰى** فعل ماضی ہے اور اللہ کا نام اس کا فاعل ہے، جبکہ باء یہاں تاکید کے لیے زائد ہے۔ **وَلِيًّا** اور **نَصِيْرًا** یا تو تمیز ہیں یا حال کے طور پر منصوب ہیں، اللہ تعالیٰ نے لفظ **كَفٰى** کو دہرا کر ذکر فرمایا تاکہ مؤمنوں کے دلوں میں اور زیادہ اطمینان اور سکون بیٹھ جائے، کیونکہ ایسے مواقع پر تکرار دل پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور مقصدِ کلام کو زیادہ مؤکد بنا دیتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: تم صرف اللہ کی ولایت اور نصرت پر قناعت کرو، اللہ ہی تمہارے لیے سرپرستی، مدد اور اِعانت کے لیے کافی ہے اور جسے اللہ کافی ہو اور وہی اس کا مددگار ہو، تو اسے اپنے دشمنوں پر نصرت کی فکر کرنے کی کوئی حاجت نہیں، اس آیت میں وعدہ و وعید بھی ہے اور ترغیب و ترہیب بھی ہے، اس آیت میں کچھ سوالات ہیں۔

سوال: اللہ کی ولیت (مدد اور حمایت) کا مطلب صرف اس کی مدد کرنا ہے، تو پھر ولی اور نصیر کا ذکر ایک ساتھ کیوں کیا گیا؟ کیا یہ تکرار نہیں ہے؟

جواب: ولی وہ ہوتا ہے جو کسی چیز میں تصرف کرتا ہے اور تصرف کرنے والا ضروری نہیں کہ وہ کسی کی مدد بھی کرے، اس لیے یہاں تکرار نہیں ہے۔

سوال: اللہ کا ذکر **وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا** کی جگہ **وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَ نَصِيْرًا**

کیوں نہیں کیا گیا؟ اور اس تکرار میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: تکرار اس مقام پر دل پر زیادہ اثر ڈالتا ہے اور یہ زیادہ شدت سے اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے، تکرار میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، اس لیے جملہ مکرر ذکر فرمایا ہے۔

سوال: وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا میں "بِ" کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: مختلف مفسرین نے اس کی مختلف تفاسیر پیش کی ہیں، ① اگر کہا جاتا كَفَى اللّٰهُ تو فعل فاعل سے جڑتا، لیکن یہاں "بِ" کا اضافہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی کفایت کسی دوسرے کی کفایت سے مختلف ہے، یہ زیادہ بلند مرتبہ اور عظمت والی ہے۔ ② ابن سراج نے کہا کہ کلام کی تقدیر اس طرح ہو سکتی ہے، كَفَى اِكْتِفَاؤُكَ بِاللّٰهِ وَلِيًّا اور جب لفظ "كَفَى" ذکر کیا گیا، تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان کو اللہ ہی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

③ حرف "ب" الصاق کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ اُس صورت میں بہتر ہوتا ہے جب اثر ڈالنے والا کوئی ایسا ہو جس کے درمیان اور اثر کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو۔ اگر کہا جاتا كَفَى اللّٰهُ تو یہ ظاہر کرتا کہ اللہ ہی اس کفایت کا فاعل ہے، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ یہ کفایت کسی واسطے سے کرتا ہے یا بلاواسطہ، جب آپ "بِ" کا حرف ذکر کرتے ہیں، تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ عمل بلا کسی واسطے کے، براہِ راست خود کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنی مدد و کفایت کو بغیر کسی واسطے کے فراہم کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (سورۃ ق:۱۶)۔ اور ہم اس سے زیادہ قریب ہیں، اس کی گردن کی رگ سے بھی۔ (مفاتیح الغیب للرازی)

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: پھر اللہ تعالیٰ نے ان اقوال و افعال کا ذکر فرمایا جو یہود نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو ایذا دینے کے لیے کہے اور کیا کرتے تھے، ارشاد ہے "یہودیوں میں سے کچھ لوگ کلمات کو ان کے اصل مقامات سے بدل دیتے ہیں، "تحریف" کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مقام سے موڑ دینا اور بدل دینا۔

یہ جملہ اس موصول کی وضاحت ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ

الْكِتَابِ، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا محذوف مبتدا کی خبر ہو اور يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ اس کی صفت ہو، یعنی یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی صفت یہ ہے کہ وہ کلمات کو ان کے اصل مقامات سے بدل دیتے ہیں، ان کو ہٹا کر ان کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیتے ہیں اور ان کی تفسیر ایسی بگڑی ہوئی کرتے ہیں جو حق و صواب سے دور ہوتی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تحریف کی کیفیت کے کئی پہلو ہیں، کبھی وہ اصل لفظ ہی بدل دیتے، جیسے تورات میں رَبعَةٌ کے بجائے آدَمُ طَوِيلٌ لکھ دیا، یا رجم (سنگسار) کی سزا کو مٹا کر اس کی جگہ جلد (کوڑے) لکھ دیا، کبھی باطل شبہات اور فاسد تاویلات کے ذریعے آیات کے صحیح معانی کو غلط رخ پر موڑ دیتے، جیسا کہ آج کل بعض بدعتی حضرات اپنی رائے کے خلاف آیات کو مختلف لفظی چالوں سے گھما دیتے ہیں، یہی زیادہ درست معنی ہے، کبھی وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آکر کوئی بات پوچھتے، آپ ﷺ جواب مرحمت فرماتے، لیکن جب باہر نکلتے تو آپ ﷺ کے کلام کو بدل کر بیان کرتے اور زیادہ مناسب یہی ہے کہ یہود کی تحریف ان سب صورتوں پر مشتمل تھی، کیونکہ وہ ہر طرح کے باطل ہتھکنڈے اختیار کرتے تاکہ لوگوں کو اسلام کی دعوت سے پھیر سکیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ (تفسیر فخر الدین رازی)

علامہ زمخشری فرماتے ہیں: اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہاں (النساء میں) اللہ تعالیٰ نے عَنْ مَّوَاضِعِهِ فرمایا اور سورۂ مائدہ میں مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ کیوں فرمایا؟ تو جواب یہ ہے، عَنْ مَّوَاضِعِهِ کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے کلمات کو ان مقامات سے ہٹا دیا جہاں حکمت نے ان کے رکھے جانے کا تقاضا کیا تھا اور اپنی خواہشات کے مطابق ان کی جگہ دوسروں کو بدل ڈالا اور مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات کے ایسے مقامات تھے جن کے لیے وہ زیادہ موزوں اور لائق تھے، لیکن جب انہوں نے ان کو بدل ڈالا تو وہ (کلام) ایسے رہ گئے جیسے کوئی اجنبی جو اپنے مقامات اور ٹھکانوں کے بعد بے جگہ رہ جائے اور یہ دونوں معانی آپس میں قریب قریب ہیں۔ (تفسیر الکشاف)

وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی گمراہی کی ایک دوسری صورت بیان کی اور فرمایا: اور وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی، یعنی وہ نبی اکرم ﷺ سے جب کسی بات کا حکم

پاتے تو زبان سے کہتے: ہم نے آپ ﷺ کی بات سن لی، مگر ساتھ ہی دل میں اور عمل میں یہ کہتے: ہم نے نافرمانی کی، گویا وہ اعتراف کرتے تھے کہ ہم آپ ﷺ کی بات کو سمجھتے ہیں مگر اس کے باوجود ہم آپ ﷺ کی اطاعت نہیں کرتے، کیونکہ ہم اپنی یہودیت پر قائم ہیں۔

وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ: یہاں اللہ تعالیٰ نے یہود کے مکر و فریب کی ایک تیسری صورت بیان کی اور فرمایا، **وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ** یہ جملہ پچھلے کلام پر معطوف ہے اور اسی سابقہ قول میں شامل ہے، یعنی یہ بات وہ نبی کریم ﷺ سے خطاب کے دوران کہا کرتے تھے اور یہ ایسا کلام تھا جس کے دو رُخ تھے، ایک ایسا رخ جو برائی پر دلالت کرتا تھا، یعنی آپ سنیں مگر آپ کو کوئی ایسی بات سنائی نہ جائے جو آپ کو خوش کرے، دوسرا رخ بظاہر خیر پر محمول کیا جا سکتا تھا، یعنی آپ ہماری بات سنیں اور آپ کو کوئی ایسی بات نہ سنائی جائے جو آپ کو ناگوار گزرے، اللہ ان یہودیوں پر لعنت کرے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو ایسے دو رُخی کلام سے خطاب کرتے تھے جس میں بظاہر خیر کا احتمال دکھا کر دوسروں کو دھوکا دیتے، حالانکہ ان کے دلوں میں صرف شر ہی چھپا ہوتا تھا اور یہ سب کچھ نبی ﷺ اور مسلمانوں سے ان کے حسد و کینہ کی وجہ سے تھا۔

وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے خبث و شرارت کی ایک اور قسم بیان فرمائی کہ وہ کہتے ہیں راعِنا، اپنی زبانوں کو مروڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے، یہ جملہ بھی پچھلے اقوال پر عطف ہے اور اسی گفتگو کا تسلسل ہے، لفظ راعِنا ایک ذو معنیٰ (دو معنوں والا) لفظ ہے، ایک پہلو یہ کہ اس سے مراد ہو "ہماری رعایت کیجیے"، "ہم پر نظر رکھیے" یا "ہمارا ذرا انتظار کیجیے کہ ہم آپ سے بات کر لیں"۔ لیکن دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہودی اس کو ایک عبرانی گالی یا رُعُونَةٌ (یعنی حماقت) کے معنی میں بولتے تھے۔

امام راغب کہتے ہیں یہودی یہ لفظ رسول اللہ ﷺ سے مذاق اور طعن کے طور پر کہتے، جس سے ان کا مقصد آپ ﷺ کو رَعُونَةٌ (بیوقوفی) سے متہم کرنا ہوتا اور بظاہر وہ یہ وہم ڈالتے کہ ہم تو صرف رَاعِنَا یعنی "ہماری حفاظت کیجیے" کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ "رَعُن" کے معنی ہیں احمق۔ لفظ لَيًّا

دراصل "لَوْیًا" سے ماخوذ ہے، جس میں واؤ، یاء میں ادغام ہوگئی۔ "لیّ" کے معنی ہیں: مروڑنا، کج کرنا، یا موڑ دینا، یعنی وہ اپنی زبانوں کو موڑ کر یہ لفظ اس طرح ادا کرتے کہ سننے والے کو اچھا معنی سمجھ آئے، لیکن دراصل وہ برا اور فحش معنی مراد لیتے تھے، یعنی حقیقت یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے مذاق اور استہزاء کے طور پر "راعِنا" کہتے، اور اپنی زبان کو اس طرح گھما کر بولتے کہ لفظ بظاہر اچھا لگے لیکن ان کا ارادہ برائی اور گالی دینا ہوتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو منع فرمایا کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کو ایسے الفاظ سے مخاطب نہ کریں جو ذو معنیٰ (دو معنیٰ) ہوں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو منع فرمایا کہ وہ کافروں کی گفتار اور کردار کی مشابہت اختیار کریں، کیونکہ یہود جب کہنا چاہتے "ہماری بات سنئے" تو "راعِنا" کہتے، لیکن دل میں رَعُونَۃٌ (بیوقوفی) مراد لیتے، اسی طرح وہ سلام کرتے ہوئے "السام علیکم" (یعنی موت آئے تم پر) کہتے، اس پر ہمیں حکم ہوا کہ جواب میں صرف "وعلیکم" کہا جائے، کیونکہ ان کی بد دُعا ہم پر اثر نہیں کرتی، مگر ہماری بد دُعا ان پر اثر کرتی ہے، الغرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کی نقل اور مشابہت سے روکا ہے، خواہ قول میں ہو یا عمل میں اور وَطَعْنًا فِي الدِّينِ کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ محض دین میں عیب نکالنے اور رسول اللہ ﷺ اور احکامِ دین کا مذاق اڑانے کے لیے کہتے تھے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ان پر لازم تھا کہ اگر عقل رکھتے تو طرزِ کلام اور اندازِ سخن درست اختیار کرتے اور اگر وہ یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور آپ ہماری بات سنیں اور ہماری طرف نظرِ التفات کریں، تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ درست ہوتا۔

یعنی اگر وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق اور خیر کو سن کر یہ کہتے: ہم نے آپ ﷺ کی بات کو قبول کیا اور آپ ﷺ کے حکم کی اطاعت کی، بجائے اس کے کہ کہتے: ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور اگر وہ آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہتے ہماری بات سن لیجیے اور ہمیں مہلت دیجیے تاکہ ہم آپ

ﷺ سے اچھی طرح سمجھ سکیں، بجائے اس کے کہ نازیبا الفاظ کہتے سن، نہ کہنے کے لائق یاراعنا (جس سے وہ اپنے دل کی خباثت ظاہر کرتے تھے)۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا یہ طرزِ گفتار ان کے لیے بہتر اور سیدھا ہوتا، ان کی پہلی باطل باتوں سے کہیں زیادہ درست اور نفع مند ہوتا، لیکن چونکہ ان کی طبیعتیں خراب اور سرکش تھیں، اس لیے انہوں نے ایسا نہ کیا اس لیے دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت واجب ہوگئی۔

وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: جب یہود دنیا اور آخرت میں لعنت کے مستحق قرار پائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سیاہ اَعمالیوں کی بناء پر ان پر واضح کیا، ارشاد ہوا لیکن اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی، پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا، یعنی انہوں نے وہ بات نہیں کہی جو ان کے لیے بہتر اور زیادہ سیدھی تھی بلکہ وہ بات کہی جو شر اور باطل پر مبنی تھی، اسی وجہ سے وہ اللہ کی لعنت کے مستحق ہوئے اور لفظ قَلِيْلًا اس جملے میں اس طرح آیا ہے کہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سب پر لعنت ہوئی سوائے چند کے جو ایمان لے آئے، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان لانا بھی بہت ہی کمزور اور ناقص تھا، ایسا ایمان جس کی کوئی حیثیت نہیں اور جو اللہ کے عذاب سے انہیں بچا نہیں سکتا، کیونکہ وہ ایمان صحیح نہیں تھا، اس لیے کہ وہ اللہ کے رسولوں میں تفریق کرتے تھے، کچھ پر ایمان لاتے اور کچھ کا انکار کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُّفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا {۱۵۰} أُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا {۱۵۱} النساء

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق ڈالیں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، اور چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نکال لیں۔ یہی لوگ ہیں جو حقیقی کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہود کی قباحتیں، شرک اور خود ستائی کی بیماری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا {۴۷} اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا {۴۸} اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا {۴۹} اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا {۵۰} النساء

جواب ترجمہ: اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا جو تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے کہ ہم چیزوں کو مٹا دیں پھر ان کو الٹی جانب کی طرح بنا دیں یا ہم ان پر لعنت کر دیں، جیسا کہ ہم نے ہفتہ کے دن والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ بیشک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے اور اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے بخش دے گا اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے تو اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی جانوں کو پاکیزہ بتاتے ہیں بلکہ اللہ جس کو چاہے پاکیزہ بناتا ہے اور لوگوں پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے کے برابر بھی ظلم نہ ہو گا۔ دیکھیے یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں اور ان کا یہ افتراء صریح گناہ ہونے کے لیے کافی ہے۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے بڑے علماء سے گفتگو کی ان میں عبد اللہ بن صوریا اور کعب بن اسد تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اے یہود کے گروہ! اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ اللہ کی قسم! تم جانتے ہو اس بات کو کہ تمہارے پاس حق لے کر آیا ہوں، وہ کہنے لگے اے محمد! ہم اس کو نہیں جانتے تو اس بارے میں یہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ نازل ہوئی۔ (ابن اسحاق، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، الدلائل للبیہقی، در منثور)

② سدی رحمہ اللہ سے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے بارے میں مروی ہے کہ یہ آیت مالک بن صیف اور رفاعہ بن زید بن تابوت کے بارے میں نازل ہوئی جو قبیلہ بنو قینقاع (یہودی قبیلہ) میں سے تھے۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، در منثور)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: اللہ عزوجل یہود و نصاریٰ کو حکم دیتا ہے کہ میں نے اپنی زبردست کتاب اپنے بہترین نبی ﷺ پر نازل فرمائی ہے جس میں خود تمہاری اپنی کتاب کی تصدیق بھی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ اس خطاب میں جب یہ کہا گیا، اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ، تو اس کا مقصد انہیں ایمان لانے پر اُبھارنا اور ترغیب دینا ہے، کیونکہ اللہ نے انہیں کتاب کا علم عطا فرمایا اور یہ علم ان کے لیے باعث ہونا چاہیے تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے اور محض دینی تعصب کو رکاوٹ نہ بناتے، جیسے اہلِ مکّہ کو جاہلی تعصب نے روک رکھا تھا۔

انہیں جس ایمان کی طرف بلایا جارہا ہے، وہ دراصل یہ ہے کہ وہ اس قرآن کو مانیں جو اللہ نے اپنے نبی ﷺ پر نازل فرمایا ہے، کیونکہ یہ قرآن اپنی حقیقت و جوہر میں ان کتابوں کے مطابق ہے جو اللہ نے پچھلے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائیں، جن پر اہلِ کتاب ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، چونکہ نازل کرنے والا (اللہ) ایک ہی ہے، لہٰذا ان پر لازم ہے کہ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی ہر کتاب پر ایمان لائیں۔

یہاں ان کا ذکر اُوْتُوا الْكِتٰبَ، جنہیں کتاب دی گئی، کے الفاظ سے کیا گیا ہے تاکہ انہیں ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی ہی کتاب کی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں، اس سے پہلے انہیں اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ، جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا کہا گیا تھا، وہاں مقصد ان کے احوال پر تعجب ظاہر کرنا اور ان کے مقام کو کمتر بتانا تھا۔

خلاصہ یہ ہے، اے یہود کے گروہ! جنہیں اللہ نے ہدایت کے لیے تورات عطا کی، ایمان لاؤ اس

قرآن پر جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، کیونکہ یہ قرآن تمہارے پاس موجود تورات کی تصدیق کرتا ہے، دونوں کا مقصد ایک ہے، توحیدِ الٰہی کی دعوت دینا، اخلاقِ حسنہ کی ترغیب دینا، گناہوں اور فواحش سے روکنا اور یہ قرآن ان اَوصاف کی بھی تائید کرتا ہے جو تورات میں محمد ﷺ کے متعلق درج ہیں اور جو تمہیں ان پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔

قرآن کو بِمَا نَزَّلْنَا (جو ہم نے نازل کیا) کہہ کر یاد کیا، تاکہ اس کے عظیم و ربانی ہونے کا اشارہ ملے اور تورات کو لِمَا مَعَكُمْ، جو تمہارے پاس ہے، کہا، تاکہ اس حقیقت کی طرف متوجہ کریں کہ یہ کتاب ان کے پاس موجود ہے اور وہ براہِ راست اس کی شہادت سے واقف ہیں، لیکن جب وہ اس کی گواہی کے باوجود رسول اللہ ﷺ کو نہ مانیں، تو ان کی مثال بالکل اس گدھے کی طرح ہے جو صرف کتابوں کا بوجھ اٹھاتا ہے مگر ان کے علم و ہدایت سے کچھ فائدہ نہیں پاتا۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ: اس سے پہلے کہ ہم تمہاری صورتیں مسخ کر دیں یعنی منہ بگاڑ کر رکھ دیں، آنکھیں بجائے اِدھر کے اُدھر ہو جائیں، یا یہ مطلب کہ تمہارے چہرے مٹا دیں، آنکھیں کان ناک سب مٹ جائیں، پھر یہ مسخ چہرہ بھی الٹا ہو جائے، اور اَلطَّمْسُ کے معنی ہیں نشان کو مٹا دینا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ یعنی ستارے مٹا دیے گئے اور ان کا نشان ختم ہو گیا۔

اور مفسرین رحمہم اللہ کے درمیان یہاں لفظ طمس کے مفہوم کے بارے میں دو آراء ہیں، پہلی رائے یہ ہے کہ اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے، یعنی چہرے میں جو اعضاء ہیں انہیں مٹا دینا اور ان کے نشان کو ختم کر دینا، پس مطلب یہ ہو گا کہ، اے اہلِ کتاب! ایمان لے آؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے جو اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں، یعنی ان کی شکل و صورت کے نشانات (آنکھ، ناک، منہ اور بھنویں) کو مٹا دیں اور ان کو ان کی پیٹھوں کی طرح بنا دیں، اس طرح کہ چہرے بالکل دب گئے ہوں جیسے گردن کے پچھلے حصے، اسی معنی کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ رحمہ اللہ اور دیگر گئے ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ معنی اللہ تعالیٰ نے بطور سزا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ اس میں بدنماہی، بگاڑ اور رسوائی ہے اور اس موقع پر غم اور حسرت بڑھ جاتی ہے اور ان مفسرین رحمہم اللہ میں سے جنہوں نے الفاظ کو حقیقی معنی پر محمول کرنے کو ترجیح دی، امام ابن جریر ہیں، انہوں نے فرمایا: ''سب سے درست قول وہ ہے جس نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے پہلے کہ ہم ان کی آنکھوں کو مٹا دیں اور ان کے نشانات کو مٹا کر برابر کر دیں جیسے گردن کے پچھلے حصے، یعنی ان کے چہرے اُلٹے کر دیے جائیں اور گردن کے پچھلے حصے چہرے کی جگہ ہو جائیں، تو وہ پیچھے کی طرف چلیں، یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے مفسرین کرام کا ہے۔

اس رائے کے ماننے والوں میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ یہ سزا آخری زمانے میں ہو گی، کچھ کہتے ہیں کہ یہ آخرت میں ہو گی اور کچھ کے نزدیک یہ سزا اس شرط کے ساتھ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایمان نہ لائے، لیکن چونکہ بعض ایمان لے آئے، جیسے عبد اللہ بن سلام وغیرہ، اس لیے یہ سزا عام نہ ہوئی، جبکہ دوسرا رجحان رکھنے والے مفسرین رحمہم اللہ نے اس کو مجازی معنی پر محمول کیا ہے، ان کے نزدیک طمس سے مراد معنوی طمس ہے، پس مطلب یہ ہو گا: ایمان لے آؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے، اس سے پہلے کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں اور ہم ان پر مہر لگا دیں کیونکہ وہ گمراہی پر قائم رہنے اور ضد میں بڑھنے کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس رجحان کی تائید کی اور فرمایا: یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے ان کے لیے بیان فرمائی کہ وہ کس طرح حق سے پھیر دیے گئے اور باطل کی طرف لوٹا دیے گئے اور سیدھی راہ سے پھر کر ضلالت کی راہوں پر پیچھے کی طرف چلنے لگے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا، یعنی یہ ایک بری مثال ہے جو اللہ نے ان کی گمراہی اور ہدایت سے محرومی کے لیے ذکر فرمائی۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوهًا کا مطلب ہے صراطِ حق سے اندھا کر دینا اور فَنَرُدُّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا یعنی ضلالت میں لوٹا دینا، سدی نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں حق سے اندھا کر دیں اور وہ پھر کافر بن جائیں۔

فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے جب آیت کا مطلب پہلے قول کے مطابق بیان کیا تو فرمایا، دوسرا قول یہ ہے کہ **طمسِ وجوہ**، چہروں کو مٹانا، سے مراد مجازی معنی ہیں، پھر اس میں چند احتمالات ذکر کیے گئے ہیں: پہلا احتمال: حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہم ان کے چہروں کو ہدایت سے پھیر دیتے ہیں اور انہیں ان کے پیچھے لوٹا دیتے ہیں، یعنی ان کی گمراہی کی طرف، اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں طرح طرح کی محرومیوں اور گمراہیوں کی تاریکیوں میں ڈال دیتا ہے۔

دوسرا احتمال: اس سے مراد دلوں کی تبدیلی اور حالت کی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ اور **وجوہ** سے مراد ان کے سردار اور معزز لوگ ہیں، مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے معزز سرداروں کے حالات بدل دے، ان سے عزت و مقام چھین لے اور ان پر ذلت و خواری اور رسوائی طاری کر دے۔

تیسرا احتمال: عبد الرحمٰن بن زید رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ وعید پہلے ہی یہودیوں کو پہنچ چکی ہے اور گزر چکی، انہوں نے اس کی تفسیر قبیلۂ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے شام کی طرف جلاوطن ہونے سے کی، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو ان کی پیٹھوں کی طرف لوٹا دیا، جب وہ اُذرعات اور اریحاء (شام کی بستیوں) کی طرف واپس بھیجے گئے، اس صورت میں **طَمْسُ الوُجُوہ** کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کے نشان عرب کی سرزمین سے مٹا دیے گئے اور ان کی حالت کو وہاں سے ختم کر دیا گیا۔

فخر رازی رحمہ اللہ نے اسی دوسرے قول کو ترجیح دی اور فرمایا کہ اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا اور بعض علماء نے کہا، بظاہر نص سے جو چیز سمجھ میں آتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان، **مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا** یہ ہے کہ اس سے مراد انہیں جنگ میں کچل دینا ہے اور اس پر مجبور کرنا ہے کہ وہ شکست کھا کر پیٹھ دکھائیں، پس ان کے چہرے اپنی اصل صورت کے ساتھ ظاہر نہ رہیں گے، کیونکہ پہلے وہ چہروں کے ساتھ سامنے تھے، پھر تلوار اور خوف نے ان کے چہروں کو چھپا دیا اور ان کی پیٹھیں ظاہر ہو گئیں، گویا چہروں کی صورت مٹ گئی اور اس کی جگہ پیٹھوں کی صورت نمایاں ہو گئی۔

اس بنا پر مطلب یہ ہو گا، تم اپنی گمراہی اور ضلالت میں پڑے ہوئے ہو، اس کے باوجود ہم تمہیں

ہدایت اور ایمان کی طرف بلا رہے ہیں، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب دنیا میں تم پر نازل ہو اور وہ اہل ایمان کو تم پر مسلط کر دے، پھر وہ تمہیں جنگ کی سختیوں کا مزہ چکھائیں گے اور تم شکست کھا کر بھاگو گے اور تمہارے چہرے چھپ جائیں گے۔

یہ چند وجوہات ہیں جن کو ان مفسرین رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں طمس سے مراد معنوی مٹانا ہے اور الفاظ کو مجازی معنی میں لیا گیا ہے اور غالباً یہی رخ زیادہ درست ہے، کیونکہ یہ ان اعتراضات اور اشکالات سے محفوظ ہے جنہیں بعض مفسرین رحمہم اللہ جیسے رازی رحمہ اللہ اور آلوسی رحمہ اللہ نے آیت کی تفسیر کرتے وقت ذکر کیا ہے۔

یہ عذاب ان کے بد اعمال کا بدلہ ہے یہی وجہ ہے کہ یہ حق سے ہٹ کر باطل کی طرف، ہدایت سے پھر کر ضلالت کی جانب بڑھے چلے جا رہے ہیں بایں ہمہ اللہ تعالیٰ انہیں احساس دلا رہے ہیں کہ اب بھی باز آجاؤ اور اپنے سے پہلے ایسی حرکت کرنے والوں کی صورتوں کے مسخ ہونے کو یاد کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی طرح تمہارا منہ الٹ دوں تاکہ تمہیں پچھلے پیروں چلنا پڑے تمہاری آنکھیں گدی کی طرف کر دوں اور اسی جیسی تفسیر بعض نے اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ) یس :۸) کی آیت میں بھی کی ہے غرض یہ ان کی گمراہی اور ہدایت سے دور پڑ جانے کی بری مثال بیان ہوئی ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں سچ مچ حق کے راستے سے ہٹا دیں اور گمراہی کی طرف متوجہ کر دیں، ہم تمہیں کافر بنا دیں اور تمہارے چہرے بندروں جیسے کر دیں، ابوزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوٹا دینا یہ تھا کہ ارضِ حجاز سے بلادِ شام میں پہنچا دیا، یہ بھی مذکور ہے کہ اسی آیت کو سن کر حضرت کعب رحمہ اللہ مشرف با اسلام ہوئے تھے۔

حضرت کعب رحمہ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان ہوئے، یہ بیت المقدس جاتے ہوئے مدینہ میں آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے اور فرمایا اے کعب! مسلمان ہو جاؤ انہوں نے جواب دیا تم تو قرآن میں پڑھ چکے ہو کہ جنہیں تورات کا حامل بنایا گیا انہوں نے اسے کما حقہ قبول نہ کیا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بوجھ لادے ہوئے ہو اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میں بھی ان

لوگوں میں سے ہوں جو تورات اٹھوائے گئے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا یہ یہاں سے چل کر حمص پہنچے وہاں سنا کہ ایک شخص جو ان کے گھرانے میں سے تھا اس آیت کی تلاوت کر رہا ہے جب اس نے آیت ختم کی انہیں ڈر لگنے لگا کہ کہیں سچ مچ اس آیت کی وعید مجھ پر صادق آجائے اور میرا منہ مسخ ہو کر پلٹ نہ جائے، یہ جھٹ سے کہنے لگے یَارَبِّ اَسلَمتُ میرے اللہ میں ایمان لایا، پھر حمص سے ہی واپس اپنے وطن یمن میں آئے اور یہاں سے اپنے تمام گھر والوں کو لے کر سارے کنبے سمیت مسلمان ہو گئے۔

ابن ابی حاتم میں حضرت کعب رحمہ اللہ کے اسلام کا واقعہ اس طرح مروی ہے کہ ان کے استاذ ابو مسلم جلیلی ان کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے میں دیر لگانے کی وجہ سے ہر وقت ملامت کرتے رہتے تھے، پھر انہیں بھیجا کہ دیکھیں کہ آپ ﷺ وہی پیغمبر ہیں، جن کی خوشخبری اور اوصاف توراۃ میں ہیں؟ یہ آئے تو فرماتے ہیں جب میں مدینہ شریف پہنچا تو ایک شخص قرآن کریم کی اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا کہ اے اہل کتاب! ہماری نازل کردہ کتاب تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرتی ہے، بہتر ہے کہ اس پر اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم تمہارے منہ بگاڑ دیں اور انہیں الٹا کر دیں، میں چونک اٹھا اور جلدی جلدی غسل کرنے بیٹھ گیا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا کہ کہیں مجھے ایمان لانے میں دیر نہ لگ جائے اور میرا چہرہ الٹا نہ ہو جائے، پھر میں بہت جلد آکر مسلمان ہو گیا۔

اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یا ہم ان پر لعنت کریں جیسے کہ ہفتہ والوں پر ہم نے لعنت نازل کی یعنی جن لوگوں نے ہفتہ والے دن حیلے کرتے ہوئے شکار کھیلا حالانکہ انہیں اس کام سے منع کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بندر اور سؤر بنا دیئے گئے۔

لعنت سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور، یہ آیت کریمہ یہودیوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ محمد ﷺ پر ایمان لے آئیں، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور ان کے نورِ بصیرت کو چھین لے، یہاں تک کہ وہ حق کی طرف نہ متوجہ ہوں اور نہ ہی اس کی طرف مائل ہوں، یا اس سے پہلے کہ اللہ انہیں اپنی رحمت سے دور کر دے اور اپنی لعنت کا شکار بنا کر دوسروں کے لیے عبرت بنا دے۔

اصحاب السبت وہ یہودی تھے جن پر اللہ نے ہفتے کے دن شکار کو حرام کر دیا تھا، لیکن انہوں نے مکاری سے اللہ کی اس حرمت کو توڑنے کی کوشش کی اور قبیح حیلے اختیار کیے، تو اللہ نے ان پر اپنا عذاب نازل فرمایا اور انہیں بندر بنا دیا۔

اور آیت میں لفظ أَوْ اس لیے ہے کہ دونوں میں سے کوئی سزا ان کے لیے خالی نہ ہو، یعنی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ایک جماعت کو پہلی سزا دے اور دوسری جماعت کو دوسری سزا، اگر وہ اپنی گمراہی اور سرکشی پر قائم رہے اور آیت کے لفظ نَلْعَنَهُمْ میں جو ضمیر ہے، وہ یا تو اصحابِ وجوہ (جن کے چہرے مٹانے کا ذکر ہوا) کی طرف لوٹتی ہے، یا پھر اہلِ کتاب کی طرف بطورِ التفات۔

وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا: کا مطلب ہے، اللہ کا ہر حکم اور ہر فیصلہ ہمیشہ ہی نافذ اور یقینی ہے، کیونکہ زمین و آسمان میں کوئی بھی چیز اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی۔ یہ آیت مبارکہ ایک نتیجہ خیز انجام کے طور پر ان ضدی اور گمراہ لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہے تاکہ وہ ہوش کے ناخن لیں، اپنی گمراہی چھوڑ دیں اور مخلصانہ طور پر ایمان والوں کی صف میں شامل ہو جائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ: بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، یہ آیت پچھلی وعید کی تاکید اور ایمان کے حکم کی پابندی کو لازم قرار دینے کے لیے نازل ہوئی ہے، کیونکہ جب ایمان نہ ہو تو پھر مغفرت بھی نہیں ہے، یہاں شرک سے مراد مطلق کفر ہے، لہٰذا اس میں یہود کا کفر بدرجۂ اولیٰ شامل ہے۔

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کافر کو ہرگز نہیں بخشتا جو کفر پر مر جائے اور کفر کے علاوہ باقی گناہوں اور نافرمانیوں کو جس کے لیے چاہے بخش دیتا ہے، بشرطیکہ وہ بغیر توبہ کے مرے، تو جو مسلمان اپنے گناہوں کے ساتھ بغیر توبہ کے فوت ہوا، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اگر چاہے تو اس کو معاف کر کے سیدھا جنت میں داخل کر دے اور اگر چاہے تو سزا دے کر پھر جنت میں داخل کرے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا: جو کوئی اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک کرے، تو اس نے ایسا گناہ کمایا جس پر کبھی مغفرت کا تعلق نہیں ہوتا، کیونکہ اس شرک کے ذریعے اس نے اللہ پر

بہت بڑا جھوٹ باندھا، کھلا ہوا اِفتراء کیا اور کائنات کا سب سے بڑا جرم اِنجام دیا اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے تو اس نے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا، یہ آیت اس بات کی مزید وضاحت ہے کہ شرک کیوں نہیں بخشا جاتا اور مشرک کے حال کو سخت قبیح اور سنگین بتانے کے لیے ہے۔

اس آیت میں اس بات کا واضح طور پر اعلان فرما دیا کہ شرک کرنے والا جو بغیر ایمان لائے مر جائے اس کی بخشش کبھی نہ ہو گی اور شرک کے علاوہ دوسرے جو گناہ ہیں اللہ جن کو چاہے گا معاف فرما دے گا اور جس گناہ پر چاہے گا عذاب دے گا، شرک بہت ہی بڑا جرم ہے، پیدا کیا اللہ نے، زندہ وہ رکھے، کھانے پینے کو وہ دے، حاجتیں وہ پوری کرے اور عبادت میں یا اِستعانت میں یا ایسی تعظیم میں جو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے زیبا ہے دوسروں کو شریک کر لیا جائے عقلی طور پر بھی یہ بہت بڑی حماقت ہے اور سفاہت ہے اور ناانصافی ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ توحید کا حکم فرمایا صرف اللہ تعالیٰ کو خالق ومالک اور رب سمجھیں اور صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کریں، شرک کی جگہ جگہ مختلف عنوانات سے تردید فرمائی ہے اور مشرکین کی بے عقلی پر تنبیہ فرمائی۔

دنیا میں کوئی شخص کسی چیز کا مالک ہو اور دوسرے لوگ کسی شخص کے بارے میں کہنے لگیں کہ وہ بھی اس میں شریک ہے تو مالک کو کتنا ناگوار ہوتا ہے حالانکہ وہ صرف مالک مجازی ہے، نہ مالک حقیقی ہے نہ خالق ہے، پھر بھی اسے دوسرے کی شرکت کا تصور ناگوار ہوتا ہے جن کو مشرکین اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، وہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں ان کو موت بھی آتی ہے ٹوٹتے پھوٹتے بھی ہیں، کھاتے پیتے بھی ہیں، عاجز محض ہیں ان کو خدائی کا درجہ دینا نہایت ہی حماقت کی بات ہے اور خالق کائنات جل مجدہ کی ناراضگی کا باعث ہے جو بھی کوئی شخص حالت شرک میں مرے گا، ہمیشہ کے لیے دوزخ کے عذاب میں داخل ہو گا جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے اَولاد تجویز کرتے ہیں جیسے مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بتاتے تھے اور جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بتاتے ہیں اور جیسے یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کے اللہ کا بیٹا ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں یہ سب شرک ہے۔ (انوار البیان)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے چند روایات جمع فرمائی ہیں، جن میں شرک کا ناقابل معافی ہونا واضح دکھائی دیتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلدِّوَاوِيْنُ عِنْدَ اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ: دِيوَانٌ لَا يَعْبَأُ اللّٰهُ بِهِ شَيْئًا، وَدِيوَانٌ لَا يَتْرُكُ اللّٰهُ مِنْهُ شَيْئًا، وَدِيوَانٌ لَا يَغْفِرُهُ اللّٰهُ، فَأَمَّا الدِّيوَانُ الَّذِي لَا يَغْفِرُهُ اللّٰهُ، فَالشِّرْكُ بِاللّٰهِ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: {إِنَّهُ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ} (الْمَائِدَة: ۷۲) وَأَمَّا الدِّيوَانُ الَّذِي لَا يَعْبَأُ اللّٰهُ بِهِ شَيْئًا، فَظُلْمُ الْعَبْدِ نَفْسَهُ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ رَبِّهِ، مِنْ صَوْمِ يَوْمٍ تَرَكَهُ، أَوْ صَلَاةٍ تَرَكَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ ذٰلِكَ وَيَتَجَاوَزُ إِنْ شَاءَ وَأَمَّا الدِّيوَانُ الَّذِي لَا يَتْرُكُ اللّٰهُ مِنْهُ شَيْئًا، فَظُلْمُ الْعِبَادِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا، الْقِصَاصُ لَا مَحَالَةَ (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین دیوان (نامۂ اعمال کے دفتر) ہیں: ایک دیوان ایسا ہے جس کی اللہ تعالیٰ پرواہ نہیں فرماتا، ایک دیوان ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑے گا (یعنی پورا حساب لے گا) اور ایک دیوان ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔

① جو دیوان اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا، وہ شرک ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے تو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے۔ (المائدہ: ۷۲)

② اور وہ دیوان جس کی اللہ تعالیٰ کوئی پرواہ نہیں کرتا، وہ ہے بندے کا اپنے نفس پر ظلم، جو اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا، مثلاً کسی دن کا روزہ چھوڑ دینا یا نماز ترک کر دینا، تو اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بخش دے گا اور چاہے تو درگزر فرما دے گا۔

③ اور وہ دیوان جس میں سے اللہ تعالیٰ کچھ بھی نہیں چھوڑے گا، وہ ہے بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا، اس کے بارے میں لازماً قصاص (بدلہ) لیا جائے گا۔ اس حدیث شریف کا بغور مطالعہ کریں تو تین باتیں واضح دکھائی دیتی ہیں، شرک کبھی معاف نہیں ہوگا، حقوق اللہ میں کوتاہی اللہ چاہے تو معاف کر دے، حقوق العباد میں کی جانے والی زیادتی کا بدلہ لازماً لیا جائے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلظُّلْمُ ثَلَاثَةٌ، فَظُلْمٌ لَّا يَغْفِرُهُ اللّٰهُ، وَظُلْمٌ يَغْفِرُهُ اللّٰهُ، وَظُلْمٌ لَّا يَتْرُكُهُ اللّٰهُ: فَأَمَّا الظُّلْمُ الَّذِي لَا يَغْفِرُهُ اللّٰهُ

فَالشِّرْكُ، وَقَالَ {إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ} (لُقْمَانَ:١٣) وَأَمَّا الظُّلْمُ الَّذِي يَغْفِرُهُ اللهُ فَظُلْمُ الْعِبَادِ لِأَنْفُسِهِمْ فِيمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ رَبِّهِمْ، وَأَمَّا الظُّلْمُ الَّذِي لَا يَتْرُكُهُ فَظُلْمُ الْعِبَادِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا، حَتَّى يَدِينَ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ،

ظلم کی تین قسمیں ہیں، ایسا ظلم جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتا یہ شرک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے (لقمان:١٣) ایسا ظلم جو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں یہ وہ ظلم ہے جو بندے اپنے نفس کے حق میں یا اپنے اور اپنے رب کے حق میں کرتے ہیں، ایسا ظلم جو اللہ باقی نہیں چھوڑتا یہ وہ ظلم ہے جو لوگ ایک دوسرے پر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دوسرے کے حقوق کے لیے حساب دینا پڑتا ہے۔ (مسند البزار)

ابو ادریس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللهُ أَنْ يَغْفِرَهُ، إِلَّا الرَّجُلَ يَمُوتُ كَافِراً، أَوِ الرَّجُلَ يَقْتُلُ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا ہر گناہ کی معافی کی امید ہے، سوائے اس شخص کے جو کافر ہو کر مر جائے، یا وہ شخص جو جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے۔ المسند، نسائی)

ایک حدیث قدسی ہے، ابن غنم کہتے ہیں کہ انہیں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرکے بتایا کہ إِنَّ اللهَ يَقُولُ: يَا عِبَادِي، مَا عَبَدْتَنِي وَرَجَوْتَنِي فَإِنِّي غَافِرٌ لَّكَ عَلَى مَا كَانَ فِيكَ، يَا عِبَادِي، إِنَّكَ إِنْ لَّقِيتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيئَةً مَّا لَمْ تُشْرِكْ بِي، لَقِيتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً (مسند احمد، ابن کثیر) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے میرے بندے! جب تک تُو میری عبادت کرتا رہے اور مجھ سے امید رکھتا رہے، میں تیرے تمام گناہوں کو بخش دوں گا، خواہ تیرے اندر کتنی ہی کوتاہیاں کیوں نہ ہوں۔ اے میرے بندے! اگر تُو میرے سامنے زمین بھر گناہوں کے ساتھ حاضر ہو، بشرطیکہ تُو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، تو میں تجھے زمین بھر مغفرت کے ساتھ ملوں گا۔ یہ حدیث قدسی ہمیں اللہ کی عظیم مغفرت اور معافی کی طرف راغب کرتی ہے، خاص طور پر اس شرط کے ساتھ کہ بندہ اللہ کے ساتھ کسی بھی قسم کا شرک نہ کرے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، ثُمَّ مَاتَ عَلَى ذٰلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ، قُلْتُ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ، قُلْتُ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ، ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ فِي الرَّابِعَةِ: عَلَى رَغْمِ أَنْفِ أَبِي ذَرٍّ! قَالَ: فَخَرَجَ أَبُو ذَرٍّ وَهُوَ يَجُرُّ إِزَارَهُ وَهُوَ يَقُولُ: وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ، وَكَانَ أَبُو ذَرٍّ يُحَدِّثُ بِهٰذَا بَعْدُ وَيَقُولُ: وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ (مسند احمد، بخاری، مسلم)

جو بندہ یہ کہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پھر اسی (عقیدے) پر مر جائے، تو وہ ضرور جنت میں داخل ہو گا، (راوی کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: اگرچہ اُس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگرچہ اُس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو، میں نے پھر عرض کیا: اگرچہ اُس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگرچہ اُس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ (یہ بات آپ ﷺ نے) تین بار فرمائی، پھر چوتھی بار فرمایا: باوجود اس کے کہ ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہو! (یعنی اگرچہ ابوذرؓ کو یہ بات ناگوار گزرے، مگر یہ حقیقت ہے) راوی کہتے ہیں: ابوذر رضی اللہ عنہ باہر نکلے، اپنا تہبند گھسیٹتے جا رہے تھے اور فرما رہے تھے اور اگرچہ ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہو، پھر جب بھی ابوذر رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان کرتے، یہی الفاظ دہراتے اور کہتے: اور اگرچہ ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہو!

یہ حدیث توحید کی عظمت اور ایمان کی قبولیت کو ظاہر کرتی ہے، چاہے انسان کے اعمال کیسے بھی ہوں، اگر وہ سچی توحید اور ایمان کے ساتھ مر جائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرماتا ہے، جملہ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ یعنی ابوذر کی ناپسندیدگی کے باوجود، یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ فیصلہ اللہ کی مرضی اور رحمت سے ہے، کسی کی مخالفت سے نہیں، یہ محاورہ عربی میں کسی کام یا فیصلے کے لیے کسی کی ناراضگی یا مخالفت کے باوجود کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی ابوذر کی مخالفت یا ناراضگی کے باوجود، عام فہم الفاظ میں یوں کہہ لیجیے "چاہے کوئی خوش نہ ہو، پھر بھی" یہ محاورہ بنیادی طور پر کسی عمل یا فیصلے میں جرأت یا استقلال ظاہر کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حرۃ المدینہ (مدینہ کی کالے پتھروں والی زمین) میں چل رہے تھے، لمبی روایت ہے، اس کے آخر میں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ذَاكَ جِبْرِيْلُ أَتَانِيْ فَقَالَ: مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِكَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ، قُلْتُ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ (مسند احمد، بخاری، مسلم)

یہ جبریل علیہ السلام تھے، جو آئے اور کہا: آپ ﷺ کی امت میں جو شخص مرے گا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے گا، وہ جنت میں داخل ہو گا، میں نے کہا: اگر وہ زنا کرے یا چوری کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اگر وہ زنا کرے اور چوری کرے، پھر بھی جنت میں جائے گا، بس شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

یہ حدیث ایمان اور توحید کی عظمت کو بیان کرتی ہے، کہ سب سے بڑی شرط ایمان ہے اور شرک سے بچنا ہے اور دیگر گناہوں کے باوجود اگر شخص شرک نہ کرے تو جنت میں جائے گا، ایک دوسری روایت میں یہی واقعہ ذرا مختلف الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس میں جبریل سے نبی کریم ﷺ نے مؤحد کی معافی سے متعلق پوچھا کہ اگرچہ وہ زنا کرے، چوری کرے، جبریل علیہ السلام نے کہا اگرچہ وہ چوری کرے یا زنا کرے، اگر اس نے شرک نہیں کیا ہو گا تو وہ جنت میں داخل ہو گا، اس میں آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ اگرچہ وہ شراب نوشی کرے؟ اس پر جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ اگرچہ وہ شراب نوشی کرے۔ (بخاری، مسلم بحوالہ ابن کثیر)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زنا اپنی جگہ بڑا گناہ ہے، جو شادی شدہ کریں تو انہیں سنگسار کرنے کی سزا شریعت میں دی گئی ہے، اگر غیر شادی شدہ کریں تو سو کوڑے مارنے کی سزا دی گئی ہے، چوری بھی بڑا گناہ ہے، چور مرد اور چور عورت ایک خاص مقدار تک کی چیز چرائیں تو ان کے ہاتھ کاٹنے کا شریعت نے حکم دیا ہے، شراب نوشی کرنے والے کی بھی سزا مقرر کی گئی ہے، یہ سب بڑے گناہ ہیں، توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوں گے، توبہ کریں تو معاف ہو جائیں گے، شرک بہت ہی بڑا گناہ ہے، اگر انسان شرک سے باز آجائے اور توحید اختیار کرے تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے، ورنہ قرآن کی اٹل تعلیم ہے کہ مشرک دوزخ میں جائے گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ يَا رَسُولَ اللهِ، مَا الْمُوجِبَتَانِ؟ قَالَ: مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ، وَمَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ (عبد بن حمید، ابن کثیر) یارسول اللہ ﷺ! مُوجِبَتَانِ، دو چیزیں جو انجام کو لازم کر دیتی ہیں، کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں مرے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، اس کے لیے جنت واجب ہے اور جو شخص اس حال میں مرے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہو، اس کے لیے جہنم واجب ہے۔

موجبتان کا مطلب: وہ دو اعمال یا حالتیں جو اپنے انجام کو "واجب" (یقینی) کر دیتی ہیں: توحید پر موت آجائے تو جنت واجب ہو جاتی ہے، جب کہ شرک پر موت آجائے تو جہنم واجب ہو جاتی ہے، دین اسلام اور قرآن کریم کی روشن تعلیمات میں توحید کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کو بہت ہی ناپسند ہے، شرک کی اللہ کے ہاں معافی نہیں ہے، بڑے سے بڑا گناہ اللہ معاف کر دیں گے مگر شرک ایسا بڑا گناہ ہے جسے اللہ معاف نہیں کریں گے، شرک کرنے والے کا دائمی ٹھکانہ دوزخ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید نجات کا سبب سے بڑا سبب ہے، اس کے مقابلے میں شرک ہے، شرک دراصل اللہ کی حاکمیت اور اُلوہیت میں دوسروں کو شریک کرنا ہے، جو کفرِ عظیم ہے، اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ صرف کلمہ پڑھ لینے سے جنت واجب ہے چاہے انسان ہر طرح کے گناہ کرتا رہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر کوئی توحید پر قائم رہ کر مرے، تو بالآخر جنت میں جائے گا، اگرچہ ممکن ہے گناہوں کی سزا پہلے بھگتنی پڑے، مسلمان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک شرک سے پاک عقیدہ رکھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا تَزَالُ الْمَغْفِرَةُ عَلَى الْعَبْدِ مَا لَمْ يَقَعِ الْحِجَابُ، قِيلَ: يَا نَبِيَّ اللهِ، وَمَا الْحِجَابُ؟ قَالَ: الْإِشْرَاكُ بِاللهِ، قَالَ: مَا مِنْ نَفْسٍ تَلْقَى اللهَ لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا إِلَّا حَلَّتْ لَهَا الْمَغْفِرَةُ مِنَ اللهِ تَعَالَى، إِنْ يَشَأْ أَنْ يُعَذِّبَهَا، وَإِنْ يَشَأْ أَنْ يَغْفِرَ لَهَا غَفَرَ لَهَا (ابن ابی الدنیا، ابن عدی فی الکامل، ابن کثیر) بندے پر

(اللہ کی) مغفرت ہمیشہ جاری رہتی ہے جب تک کہ اس کے اور اللہ کے درمیان حجاب (آڑ) نہ آجائے، عرض کیا گیا: یا نبی اللہ! حجاب کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، پھر فرمایا: جو جان بھی اللہ کے سامنے حاضر ہو اور اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت لازم ہو جاتی ہے، یعنی اگر اللہ چاہے تو اسے عذاب دے اور اگر چاہے تو معاف فرمادے، اللہ کی مغفرت عام ہے، بندہ جب تک شرک سے بچا رہتا ہے، اللہ کی مغفرت کی امید قائم رہتی ہے، سب سے بڑا حجاب (رکاوٹ) شرک ہے، شرک ایسا گناہ ہے جو بندے کو اللہ کی رحمت و مغفرت سے محروم کر دیتا ہے، کیونکہ شرک کے ساتھ بندہ براہِ راست اللہ کی اُلوہیت اور کبریائی کو توڑتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ (مسند احمد، ابن کثیر) جو شخص فوت ہوا اور اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، وہ جنت میں داخل ہو گا، یہ حدیث توحید اور ایمان کی اصل اہمیت کو واضح کرتی ہے، اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ شرک سے بچنا ایمان کا سب سے بنیادی اصول ہے اور اس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ جنت میں داخلہ عطا فرماتا ہے، یہاں تاکید ہے کہ اعمال و گناہوں کے باوجود اگر انسان اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے تو اللہ کی رحمت سے جنت میں جائے گا۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ ذَاتَ يَوْمٍ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ لَهُمْ: إِنَّ رَبَّكُمْ، عَزَّ وَجَلَّ، خَيَّرَنِي بَيْنَ سَبْعِينَ أَلْفًا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ عَفْوًا بِغَيْرِ حِسَابٍ، وَبَيْنَ الْخَبِيئَةِ عِنْدَهُ لِأُمَّتِي، فَقَالَ لَهُ بَعْضُ أَصْحَابِهِ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَيُخْبَأُ ذَالِكَ رَبُّكَ؟ فَدَخَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ خَرَجَ وَهُوَ يُكَبِّرُ، فَقَالَ: إِنَّ رَبِّي زَادَنِي مَعَ كُلِّ أَلْفٍ سَبْعِينَ أَلْفًا وَالْخَبِيئَةُ عِنْدَهُ قَالَ أَبُو رُهْمٍ: يَا أَبَا أَيُّوبَ، وَمَا تَظُنُّ خَبِيئَةَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَأَكَلَهُ النَّاسُ بِأَفْوَاهِهِمْ فَقَالُوا: وَمَا أَنْتَ وَخَبِيئَةُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟! فَقَالَ أَبُو

أَيُّوبَ: دَعُوا الرَّجُلَ عَنْكُمْ، أُخْبِرُكُمْ عَنْ خَبِيئَةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا أَظُنُّ، بَلْ كَالْمُسْتَيْقِنِ، إِنَّ خَبِيئَةَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَقُولَ: مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ مُصَدِّقًا لِسَانُهُ قَلْبُهُ أَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ (مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ”بیشک میرے رب عزوجل نے مجھے اختیار دیا کہ یا تو میں ستر ہزار ایسے لوگوں کو (جنت میں لے جاؤں) جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں اور یا یہ کہ وہ (فضل و کرم کی) ایک چیز اپنے پاس میری امت کے لیے چھپا کر رکھے، تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ کے رب نے یہ بات چھپائی ہے؟ پھر رسول اللہ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور جب باہر آئے تو اللہ اکبر کہہ رہے تھے، اور فرمایا: ”میرے رب نے مجھے مزید عطا کیا: ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ہزار مزید، اور ساتھ ہی وہ (چھپی ہوئی چیز) بھی اپنی بارگاہ میں رکھی ہے۔ ابورُہم نے کہا: اے ابوایوب! آپ کیا گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ چھپی ہوئی چیز کیا ہے؟ تو لوگ کہنے لگے: اس چھپی ہوئی چیز سے کیا سروکار؟ ابوایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسے چھوڑو، میں تمہیں بتاتا ہوں جیسا کہ میرا یقین ہے، بلکہ یوں سمجھو کہ میں اس پر مطمئن ہوں: رسول اللہ ﷺ کی وہ چھپی ہوئی چیز یہی ہے کہ وہ فرمائیں گے، جو شخص دل سے تصدیق کرتے ہوئے زبان سے گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی امت پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور فضل کی خبر دیتی ہے، پہلے ستر ہزار افراد کو بغیر حساب کے جنت ملنے کی خوشخبری ہے، پھر مزید اضافہ ہوا کہ ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ہزار مزید اور سب سے بڑی خوشخبری یہ کہ خبیئہ (چھپی ہوئی نعمت) یہ ہے کہ توحید اور رسالت کی سچی گواہی دینے والا جنتی ہے یعنی اصل معیار ایمانِ صادق ہے، زبان سے کلمہ کہنا، دل سے

تصدیق کرنا، یہ عقیدہ اور اخلاص انسان کو جنت میں داخل کرنے والا ہے، اگرچہ گناہوں کی وجہ سے کسی کو سزا بھی ملے، لیکن آخر کار اس کا انجام جنت ہی ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میرا بھتیجا حرام کاموں سے باز نہیں آتا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا دین کیسا ہے؟ اس نے کہا: وہ نماز پڑھتا ہے اور اللہ کو ایک مانتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے اس کا دین ہبہ (تحفہ) میں مانگ لو، اگر نہ دے تو خرید لو، وہ شخص اپنے بھتیجے کے پاس گیا لیکن اس نے انکار کر دیا، پھر واپس آکر نبی ﷺ کو بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اسے اس کے دین میں بخیل پایا، تب یہ آیت إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ نازل ہوئی۔

نبی ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ ایمان اور توحید کی بنیاد اگر انسان کے پاس ہے تو اس کی گناہ گاری کے باوجود امیدِ مغفرت باقی ہے، اگرچہ گناہوں سے باز آنا ضروری ہے، لیکن اصل کفر و شرک سے بچنا سب سے بڑی کامیابی ہے، آیت کریمہ نے واضح کر دیا کہ شرک ناقابلِ معافی جرم ہے، جبکہ باقی گناہ اللہ چاہے تو معاف کر دے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا، اس نے آکر خدمت نبوی میں عرض کیا کہ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، مَا تَرَكْتُ حَاجَةً وَلَا ذَا حَاجَةٍ إِلَّا قَدْ أَتَيْتُ، قَالَ: أَلَيْسَ تَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ؟ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَإِنَّ ذَالِكَ يَأْتِي عَلَى ذَالِكَ كُلِّهِ (مسند ابو یعلیٰ، مجمع الزوائد ہیثمی)

یا رسول اللہ! میں نے کوئی حاجت یا حاجت مند نہیں چھوڑا جس کے پاس نہ گیا ہوں (یعنی ہر در پر گیا ہوں، سب سے سوال کیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ (آپ ﷺ نے یہ بات تین بار فرمائی) اس نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: تو یہی (کلمہ) ان سب پر غالب آجاتا ہے (یعنی ان تمام حاجات کو کفایت کرتا ہے اور اصل ضرورت کو پورا کر دیتا ہے)۔

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اصل نجات اور سب سے بڑی حاجت توحید اور رسالت کی گواہی ہے، انسان دنیاوی حاجات کے لیے اِدھر اُدھر جاتا ہے، لیکن سب سے بڑی حاجت بندے کے لیے ایمان و عقیدہ ہے، جو شخص اخلاص کے ساتھ کلمہ شہادت کا اقرار کرلے، اس کی یہ شہادت اس کے سارے گناہوں اور کمی کو ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس کے لیے بخشش اور جنت کا ذریعہ بن جاتی ہے، گویا کلمہ ایمان دنیاوی و اخروی تمام ضروریات کے پورا ہونے کی اصل بنیاد ہے۔

ضمضم بن جوس یمامی سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ مجھے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا يَا يَمَامِيُّ لَا تَقُولَنَّ لِرَجُلٍ: وَاللهِ لَا يَغْفِرُ اللهُ لَكَ، أَوْ لَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ أَبَدًا. قُلْتُ: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ إِنَّ هَذِهِ كَلِمَةٌ يَقُولُهَا أَحَدُنَا لِأَخِيهِ وَصَاحِبِهِ إِذَا غَضِبَ قَالَ: لَا تَقُلْهَا، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: كَانَ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ رَجُلَانِ كَانَ أَحَدُهُمَا مُجْتَهِدًا فِي الْعِبَادَةِ، وَكَانَ الْآخَرُ مُسْرِفًا عَلَى نَفْسِهِ، وَكَانَا مُتَآخِيَيْنِ وَكَانَ الْمُجْتَهِدُ لَا يَزَالُ يَرَى الْآخَرَ عَلَى ذَنْبٍ، فَيَقُولُ: يَا هٰذَا أَقْصِرْ، فَيَقُولُ: خَلِّنِي وَرَبِّي! أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيبًا؟ قَالَ: إِلَى أَنْ رَآهُ يَوْمًا عَلَى ذَنْبٍ اسْتَعْظَمَهُ، فَقَالَ لَهُ: وَيْحَكَ! أَقْصِرْ! قَالَ: خَلِّنِي وَرَبِّي! أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيبًا؟ فَقَالَ: وَاللهِ لَا يَغْفِرُ اللهُ لَكَ أَوْ لَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ أَبَدًا قَالَ: فَبَعَثَ اللهُ إِلَيْهِمَا مَلَكًا فَقَبَضَ أَرْوَاحَهُمَا وَاجْتَمَعَا عِنْدَهُ، فَقَالَ لِلْمُذْنِبِ: اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِي. وَقَالَ لِلْآخَرِ: أَكُنْتَ بِي عَالِمًا؟ أَكُنْتَ عَلَى مَا فِي يَدِي قَادِرًا؟ اذْهَبُوا بِهِ إِلَى النَّارِ. قَالَ: فَوَالَّذِي نَفْسُ أَبِي الْقَاسِمِ بِيَدِهِ لَتَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَوْبَقَتْ دُنْيَاهُ وَآخِرَتَهُ

ضمضم بن جوس یمامی کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: اے یمامی! کسی شخص سے یہ نہ کہو کہ اللہ تمہیں معاف نہیں کرے گا یا تمہیں کبھی جنت میں داخل نہیں کرے گا، میں نے کہا: اے ابو ہریرہ! یہ لفظ انسان اپنے بھائی یا ساتھی پر غصے میں کہہ دیتا ہے، ابوہریرہ نے فرمایا: یہ نہ کہو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے، ایک عبادت میں محنتی اور نیک تھا اور دوسرا اپنے نفس پر زیادتی کرنے والا تھا، یہ دونوں دوست تھے، محنتی شخص ہمیشہ دوسرے

کو گناہ کرتے دیکھ کر کہتا: اے بھائی! بس کرو! تو دوسرا کہتا: مجھے چھوڑ دو، میرے رب پر چھوڑ دو! کیا تم نے میرے اوپر نگہبان بھیجا ہے؟ ایک دن جب اس نے دوسرا شخص ایک بڑا گناہ کرتے دیکھا تو غصے میں کہا: اللہ تمہیں کبھی معاف نہ کرے یا جنت میں نہ داخل کرے! اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا اور دونوں کی روحیں قبض کر لیں، فرشتے کے پاس حاضر ہوئے، اللہ نے گناہ کرنے والے سے فرمایا: جا اور میری رحمت سے جنت میں داخل ہو اور نیک آدمی سے فرمایا: کیا تم میرے علم میں تھے؟ کیا تم میرے اختیار میں تھے؟ پھر اسے جہنم کی طرف بھیج دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! اگر میں نے یہ لفظ کہہ نہ دیا ہوتا تو دنیا و آخرت دونوں بچ جاتیں۔ (مسند احمد، ابن کثیر)

یہ حدیث ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ غصے میں بھی کسی پر قطعی طور پر اللہ کی ناراضی یا سزا کی بات نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ انسان کا علم اور اختیار محدود ہے، جو شخص دوسروں کی نیکی و برائی کا قاضی بنتا ہے، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون کس کے لیے کیا فیصلہ کرے گا، گناہگار کی رحمت یا نیکی کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے اور انسان کو صرف نصیحت اور یاد دہانی کرنی چاہیے، نہ کہ حتمی فیصلہ، کسی کی نجات یا ہلاکت کے بارے میں قطعی لفظ استعمال نہ کریں، اگر کسی کو نصیحت کرنا ہے تو محبت اور ادب کے ساتھ کریں، نہ کہ الزام اور دھمکی کے ساتھ، انسان کی یہ محدود عقل اور محدود علم اس پر حقائق کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔

ایک حدیث قدسی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَنْ عَلِمَ أَنِّي ذُو قُدْرَةٍ عَلَى مَغْفِرَةِ الذُّنُوبِ غَفَرْتُ لَهُ وَلَا أُبَالِي، مَا لَمْ يُشْرِكْ بِي شَيْئًا جو شخص یہ جان لے کہ میں اپنی قدرت سے گناہوں کو معاف کرنے والا ہوں، تو میں اس کے گناہ معاف کر دوں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں، بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرے۔ (طبرانی، ابن کثیر)

یہ حدیث قدسی اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمت اور مغفرت کو بیان کرتی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت گناہوں کو معاف کرنے میں کامل ہے اور وہ اپنے بندے کی نیت اور اس کی توحید کو

دیکھ کر گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، شرط یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے (شرک سے دور رہے)، کیونکہ شرک اللہ کی مغفرت کے راستے کو بند کر دیتا ہے، اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ کی مغفرت پر یقین رکھنا اور توحید پر قائم رہنا ہماری زندگی میں بہت اہم ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ وَعَدَهُ اللهُ عَلَى عَمَلٍ ثَوَابًا فَهُوَ مُنْجِزُهُ لَهُ، وَمَنْ تَوَعَّدَهُ عَلَى عَمَلٍ عِقَابًا فَهُوَ فِيهِ بِالْخِيَارِ (البزار، ابویعلیٰ، ابن کثیر) جس شخص سے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل کا ثواب دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ وعدہ اللہ کی طرف سے یقینی ہے اور اللہ اسے اس شخص کے لیے پورا کرے گا، اور جس پر کسی عمل کے عقاب کا وعدہ کیا ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے کہ وہ توبہ کرے یا اس پر ثابت رہے۔

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی عدل و حکمت اور انسان کی اختیاریت کو بیان کرتی ہے، نیک اعمال پر اللہ کا وعدہ یقینی ہے، یعنی جو شخص نیک عمل کرے گا، اسے اس کا صلہ ملے گا، گناہوں پر اللہ کا وعدہ سزا کے لیے ہے، لیکن انسان کو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حالت بدل سکتا ہے، یعنی توبہ کر کے سزا سے بچ سکتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ يَا رَسُولَ اللهِ، أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ؟ قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ (ابن کثیر) یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے شریک بناؤ جبکہ وہی تمہیں پیدا کرنے والا ہے۔

اس حدیث میں سب سے بڑے اور سنگین گناہ شرک کی نشاندہی کی گئی ہے، شرک وہ عمل ہے جس میں انسان اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، یہ گناہ سب سے عظیم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و مالک ہے اور اس کا شریک ٹھہرانا اس کی کبریائی اور توحید کی نفی ہے، باقی گناہوں کی مغفرت ممکن ہے، مگر شرک کی مغفرت بغیر توبہ کے نہیں۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا أُخْبِرُكُمْ بِأَكْبَرِ

الْكَبَائِرِ: الشِّرْكُ بِاللهِ (ابن مردویہ، ابن کثیر) میں تمہیں سب سے بڑے گناہ کے بارے میں آگاہ کرتا ہوں وہ اکبر الکبائر اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے یعنی شرک کرنا یہ سب سے بڑا گناہ ہے، یہ کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے۔

اس حدیث میں نبی ﷺ نے سب سے بڑا اور خطرناک گناہ بیان فرمایا ہے وہ ہے شرک، شرک کا مطلب ہے اللہ کی ذات، صفات یا عبادت میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرانا، یہ گناہ اتنا سنگین ہے کہ اسلام میں اسے سب سے بڑا اور ناقابل معافی گناہ قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ آدمی توبہ نہ کرے، باقی تمام گناہ اللہ کی طرف رجوع اور توبہ کرنے سے معاف ہو سکتے ہیں، لیکن شرک ہزار توبہ کے باوجود معاف نہیں ہو سکتا، ہاں شرک سے توبہ کرلے، توحید کا علم تھام لے تو پھر بخشش کی امید ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ایک اور قباحت بیان فرمائی، کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی تعریف کرتے ہیں؟ بلکہ اللہ ہی جسے چاہے پاک کرتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جاتا، دیکھو وہ کس طرح اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑتے ہیں اور یہی ان کے لیے بڑا گناہ ہے۔

مفسرین نے اس آیت کے سبب نزول میں بیان کیا ہے کہ کچھ یہودی حضرات اپنے بچوں کے ساتھ نبی ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ اے محمد! کیا ان بچوں پر کوئی گناہ ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: نہیں، تو انہوں نے کہا: واللہ! ہم بھی ان کے جیسے ہیں، جو ہم نے دن میں کیا، وہ رات میں معاف کر دیا جاتا ہے اور جو رات میں کیا، وہ دن میں معاف کر دیا جاتا ہے۔

قرآن نے یہودیوں کے بارے میں بھی ذکر کیا کہ وہ کہتے تھے: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّاماً مَّعْدُودَةً، ہم پر آگ صرف چند دن ہی اثر کرے گی اور یہ بھی بیان کیا کہ وہ دنیاوی مال و دولت کے بارے میں کہتے تھے، يَأْخُذُونَ عَرَضَ هٰذَا الْأَدْنَى وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا یہ سب حاصل کر لیا، تو ہمیں معاف کر دیا جائے گا، قرآن نے یہودیوں اور نصرانیوں کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ وہ کہتے تھے: نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاؤُهُ، ہم اللہ کے بیٹے اور اللہ کے محبوب ہیں۔

استفہام یعنی سوالیہ انداز أَلَمْ تَرَ یہاں تعجب اور طنز کے لیے استعمال ہوا ہے تاکہ ان کی حالت کو کم تر دکھایا جاسکے، کیونکہ وہ اپنے بارے میں مبالغہ آمیز دعوے کرتے تھے، حالانکہ وہ جھوٹے تھے اور يُزَكُّونَ أَنفُسَهُمْ یعنی اپنی تعریف کرنا، تطہیر یا پاکیزگی کے لیے استعمال ہوا ہے، اس آیت میں مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کی بہت تعریف کرتے تھے حالانکہ وہ اپنی بُرائی کے باعث مذمت کے مستحق تھے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ اے محمد ﷺ! کیا آپ جانتے نہیں کہ یہودی لوگ اپنی تعریف کرتے ہیں اور اپنی برائی چھپاتے ہیں، جبکہ حقیقت میں وہ کفر اور برے اخلاق میں مبتلا ہیں؟ اگر آپ نے ان کی حالت نہیں دیکھی، تو ہم آپ کو ان کے چھپے ہوئے اعمال دکھا رہے ہیں تاکہ آپ ان کے برے اعمال پر تعجب کریں اور ہر عقلمند بھی تعجب کرے۔

اور بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ بلکہ اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے، ان کے باطل اعتقاد کو رد کرنا ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح کرنا ہے کہ کسی کی اپنی تعریف یا تزکیہ اللہ کے فیصلے کے بغیر کام نہیں آتی، اللہ ہی جانتا ہے کہ انسان کے اندر کیا اچھائی اور برائی ہے، اور اللہ کی طرف سے دیا گیا تزکیہ ہی معتبر ہے۔

وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا: اور ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کے کمال عدل کی دلیل ہے کہ وہ اپنے بندوں پر کبھی بھی ظلم نہیں کرتا، نہ کم نہ زیادہ۔ اور فتیل سے مراد وہ چھوٹا سا دھاگہ ہے جو بیج کے شق (نواۃ) میں ہوتا ہے، اس کا ذکر اکثر کم و ناچیز چیز کی مثال کے طور پر کیا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے آپ کو بغیر حق کے پاک اور بہترین ظاہر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی اس جھوٹی پاکیزگی کے مطابق ان کے اعمال کا جائز اور عادلانہ بدلہ دیتا ہے، اس میں کسی قسم کا ظلم نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دیتا ہے، خواہ وہ اچھائی ہو یا برائی۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات پر کسی چیز کی حقارت اور معمولی پن کو بیان کرنے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، فتیل: کھجور کی گٹھلی کا دھاگہ نُماریشہ۔ نقیر: کھجور کی گٹھلی کا چھوٹا سا سوراخ۔ قطمیر: کھجور کی گٹھلی کی باریک جھلی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے حالات پر حیرت کا اظہار کیا اور فرمایا: دیکھیے کہ یہ یہودی کس طرح اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، اپنی خود پسندی میں اپنے آپ کو پاک ظاہر کرتے ہیں حالانکہ وہ کفر و عناد اور برے اعمال کے مرتکب ہیں، جو انہیں ہر طرح کی مذمت اور بری عاقبت کے اہل بناتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ کو اس حد تک حقیقی اور واضح قرار دیا گویا یہ کوئی ایسا معاملہ ہے جو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا: یعنی اللہ پر جھوٹ گھڑنے کا یہ عمل اپنے آپ میں ایک واضح گناہ ہے جو سزا کے مستحق اور شدید سرزنش کے قابل ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی اپنی تعریف اور خود کو پاک ظاہر کرنا لغو ہے اور صرف اللہ کی طرف سے کیا گیا تزکیہ اور بیان کی گئی پاکیزگی ہی معتبر ہے۔ جہاں تک کسی کی تعریف کرنے کی بات ہے تو بخاری میں ابو بکرہ کی حدیث کے مطابق ایک شخص کے بارے میں کسی نے اچھا کہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ یعنی اگر کسی نے کسی کی تعریف کرنی ہے تو حقیقت کے مطابق کرے، جھوٹ یا بڑھا چڑھا کر نہ کرے۔

اصل تعریف یہ ہے کہ کسی کے اچھے اعمال کی طرف ترغیب دلائی جائے تاکہ لوگ اس کی تقلید کریں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعری، خطبات اور مخاطبہ میں تعریف فرمائی اور اپنے صحابہ کی بھی تعریف فرمائی، جیسے إِنَّكُمْ لَتَقِلُّونَ عِندَ الطَّمعِ وَتُكْثِرُونَ عِندَ الفَزَعِ. بیشک تم لوگ لالچی ہونے پر کم اور خوف و ہراس میں زیادہ ہو جاتے ہو۔

یہودیوں کی جسارت، ملعون قرار دیے جانے کی ایک وجہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (۵۱) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا (۵۲) اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ

النَّاسَ نَقِيْرًا (۵۳) اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۵۴) فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (۵۵) النساء

جواب ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا پھر وہ بتوں اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایمان والوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو آپ اس کا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ کیا ان لوگوں کا ملک میں کچھ حصہ ہے، سو ایسی صورت میں لوگوں کو وہ ذرا سی چیز بھی نہ دیتے۔ یا یہ لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو کیوں اپنے فضل سے دے رکھا ہے بس ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت دی اور ہم نے ان کو بڑی سلطنت دی۔ پھر ان میں کچھ لوگ ان پر ایمان لائے اور کچھ ان کے خلاف ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور دوزخ جلانے کے لیے کافی ہے۔

شان نزول: ① حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حُیَیُّ بن اَخطب اور کعب بن اشرف (یہودی) مکہ والوں کے پاس آئے، مکہ والوں نے ان سے کہا کہ تم اہل کتاب ہو اور علم قدیم کے مالک ہو، تم ہمیں ہمارے بارے میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتاؤ، یہودیوں نے کہا کہ محمد کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟ مکہ والوں نے جواب دیا کہ ہم بڑے اونٹ ذبح کرتے ہیں، پانی پلانے کے بعد دودھ پلاتے ہیں، دکھیوں کو آزاد کرتے ہیں اور قرابت داری اور صلہ رحمی کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، ہمارا دین پرانا اور قدیمی ہے اور محمد کا دین نیا ہے یہ سن کر یہودیوں نے مکہ والوں سے کہا کہ تم اس سے زیادہ بہتر اور ہدایت یافتہ ہو، اس پر اللہ نے یہ آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ۔ نازل کی۔ (اسباب النزول)

② مفسرین فرماتے ہیں کہ جنگ اُحد کے بعد کعب بن اشرف (یہودی) ستر گھڑ سوار یہودیوں کو لے کر آیا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے ساتھ معاہدہ کرے اور اس معاہدہ کو توڑ دے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا، کعب (یہودی) ابوسفیان کے ہاں فروکش ہوا اور باقی یہود قریش

کے گھروں میں اُترے، اہل مکہ نے ان سے کہا کہ تم اہل کتاب ہو اور محمد بھی صاحب کتاب ہیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تمہاری طرف سے کوئی فریب نہ ہو، اگر تم چاہتے ہو کہ ہم ساتھ نکلیں یعنی تمہارا ساتھ دیں تو ان دو بتوں کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لاؤ، اس کا ذکر اس قول خداوندی يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ میں ہے۔ اس کے بعد اہل مکہ سے کہا کہ تیس آدمی تم میں سے آئیں اور تیس آدمی ہمارے نکلیں اور اپنے کلیجے خانہ کعبہ کے ساتھ چمٹا دیں اور اس گھر کے رب کی قسم کھا کر معاہدہ کریں کہ ہم محمد کے خلاف اکٹھے جدوجہد کریں گے۔

مکہ والوں نے اس تجویز پر عمل کیا، جب وہ اس کام سے فارغ ہو گئے، تو ابوسفیان نے کعب سے کہا کہ تو ایسا شخص ہے جو کتاب پڑھتا ہے اور جانتا ہے اور ہم اَن پڑھے لوگ ہیں اور کچھ جانتے نہیں ہیں، بتاؤ کہ ہم میں سے کون سا فریق زیادہ ہدایت یافتہ ہے اور حق کے زیادہ قریب ہے کیا ہم ہیں یا محمد ہے؟ کعب (یہودی) نے کہا کہ تم مجھ پر اپنا دین پیش کرو، اس پر ابوسفیان نے کہا کہ ہم حاجیوں کے لیے بڑے بڑے اُونٹ قربان کرتے ہیں، انہیں پانی پلاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، دکھی لوگوں کو دکھ سے چھٹکارا دلاتے ہیں اور صلہ رحمی کرتے ہیں، ہم اپنے رب کا گھر تعمیر کرتے ہیں یا اسے آباد کرتے ہیں، ہم طواف کرتے ہیں اور ہم اہل حرم ہیں، محمد نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے، اس نے قطع رحمی کی، اس نے حرم کو چھوڑ دیا، ہمارا دین پرانا ہے محمد کا دین نیا ہے، اس پر کعب (یہودی) نے کہا کہ بخدا تم اس کے دین کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت پر ہو اس پر یہ آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ نازل ہوئی۔ اس سے مراد کعب بن اشرف یہودی اور اس کے باقی ساتھی ہیں۔ (اسباب النزول)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، ظاہر ہے کہ مکمل توراۃ تو ان کے پاس نہیں ہے، انہوں نے تو اس کو خلط ملط کر دیا ہے، تاہم اس کا کچھ نہ کچھ اصل حصہ موجود ہے، ان

یہودیوں کا حال یہ ہے کہ یہ لوگ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں، جبت کا لفظ پورے قرآن پاک میں صرف ایک اسی جگہ استعمال ہوا ہے، البتہ طاغوت کا لفظ مختلف سورتوں میں سات مرتبہ آیا ہے۔

عام مفسرین جبت کا معنی بت اور طاغوت کا معنی شیطان کرتے ہیں لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ یہودی بتوں اور شیطان کے پجاری ہیں، جیسا کہ ان آیات کے شان نزول میں بیان ہوا کہ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے اسلام دشمنی کی بنا پر مشرکین مکہ کے کہنے پر بتوں کو بھی سجدہ کیا، طاغوت طغویٰ کے مادہ سے ہے جس کا معنی سرکش ہو کر حد سے بڑھ جانا ہے اور یہ شیطان پر ہی صادق آتا ہے، بعض فرماتے ہیں کہ حبشی زبان میں طاغوت شیطان ہی کو کہتے ہیں۔ (معالم العرفان)

مفسرین نے جبت کا معنی سحر بھی کیا ہے، امام ابن ہشام رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَلْجِبْتُ عِنْدَالْعَرَب مَا عُبِدَ مِن دُونِ اللّٰہِ یعنی عربوں کے نزدیک ہر وہ چیز جبت ہے کہ اللہ کے سوا جس کی پوجا کی جائے اور ہر وہ چیز طاغوت ہے کُل مَا اَضَلَّ مِنَ الحَقِّ جو راہ حق سے گمراہ کرنے والی ہو، جبت کی جمع جبوت اور طاغوت کی جمع طواغیت آتی ہے۔ (سیرت ابن ہشام)

ایک دوسری روایت کے مطابق امام ابن ہشام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جبت کا معنی سحر اور طاغوت کا معنی شیطان ہے، سورۃ نحل میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر یہ حکم نازل فرمایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش سے باز آجاؤ، گویا ہر سرکش اور حق سے گمراہ کرنے والا طاغوت ہے خواہ وہ شیطان ہو یا کوئی دوسری شخصیت، ملوک اکثر طاغوت کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے حکم کی بجائے اپنا حکم چلاتے ہیں اور لوگوں کو راہِ راست سے ہٹا کر غلط بات ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں لَا تَحْلِفُوا بِاٰبَآءِ کُم وَلَا بِالطَّوَاغِیتِ یعنی اپنے آباؤ اجداد یا کسی طاغوت کے نام کی قسم مت اٹھاؤ بہر حال گمراہ کرنے والی تمام طاقتیں طاغوت ہیں اور شیطان ان کا سرغنہ ہے۔ (معالم العرفان)

سید طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جبت دراصل ایک بُت کا نام تھا، پھر یہ ہر اُس معبود پر استعمال ہونے لگا جو اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا جائے اور طاغوت ہر باطل چیز پر بولا جاتا ہے اور ہر اُس ہستی پر بھی جو اللہ کے سوا پوجی جائے، یا جو کسی کو گمراہی کی طرف بلائے، یعنی وہ ان دونوں (جبت و طاغوت) کو معبود

مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی عبادت میں شرک کرتے ہیں، یا ان کی باطل باتوں میں ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا: آیت يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ کی درست تفسیر یہ ہے کہ کہا جائے، وہ اللہ کے سوا دوسرے معبودوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں معبود بنا لیتے ہیں، کیونکہ جبت اور طاغوت ہر اس ہستی کے نام ہیں جسے اللہ کے سوا عظمت کے ساتھ پوجا جائے، یا جس کے سامنے اِطاعت و خضوع کیا جائے، خواہ وہ پتھر ہو، انسان ہو یا شیطان۔ (تفسیر ابن جریر، تفسیر الوسیط)

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا: وہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کے لیے یہ توصیفی سند جاری کر رہے ہیں کہ یہ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، یہاں ان یہودیوں کے جھوٹ اور بہتان کی وضاحت کی گئی ہے، یعنی وہ کفار کو راضی کرنے کے لیے کہتے ہیں اور یہ کفار کوئی اور نہیں بلکہ مکہ کے مشرک ہیں، جو نبی کریم ﷺ کی جان کے دشمن تھے اور آپ ﷺ کی سرگرمیوں کو بڑی گہرائی سے دیکھ رہے تھے، یہودیوں نے نبی ﷺ کے ان مخالفین کے بارے میں کہا کہ یہ لوگ (یعنی کفار مکہ) اپنے شرک اور جبت و طاغوت کی عبادت میں محمد ﷺ کے ماننے والوں سے زیادہ سیدھی راہ پر اور بہتر دین پر ہیں۔

آیت کے جملہ لِلَّذِينَ كَفَرُوا میں جو لام ہے وہ لام علت ہے، یعنی وہ یہ بات کفار کو خوش کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ اور هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ کا اشارہ انہی کفار کی طرف ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو ایمان کے وصف سے یاد کرنا یہود کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تاکہ ان کو خوبصورت صفت (ایمان) سے متعارف کرایا جائے اور ان کے مقابلے میں ان یہود کو ذلیل کیا جائے جنہوں نے سب سے بدترین صفت رکھنے والوں (کفار مکہ) کو اہل ایمان پر أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ: اللہ تعالیٰ نے یہود کے برے انجام کو ان کے حق سے انحراف کی وجہ سے بیان فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، یہ وہ لوگ ہیں جن پر شیطان غالب آگیا، انہوں نے مشرکین کی قول اور عمل سے مدد کی، ان کے بتوں کو سجدہ کیا اور ان کے اعمال کی تعریف و

توصیف کی، یہ یہودی وہی لوگ ہیں جن کی یہ صفات ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی، یعنی انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا، اپنی بارگاہ سے دُھتکار دیا اور رسوا کر دیا، کیونکہ انہوں نے کینہ و عداوت میں جھوٹ کا سہارا لیا اور رحمٰن کی اِطاعت کے بجائے شیطان کی عبادت کو ترجیح دی۔

وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا: اور جس پر اللہ لعنت کر دے تو تم اس کے لئے کوئی مدد گار نہ پاؤ گے، یعنی جسے اللہ اپنی رحمت سے دور کر دے، اس کے لیے نہ کوئی مدد گار ہو گا جو اس کی مدد کرے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا جو اس کے حق میں شفاعت کرے۔

اس آیت میں اسم اشارہ أُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور موصول وصلہ اس کی خبر ہیں، اور یہ جملہ ان کے حال کو بیان کرنے کے لیے استئنافیہ ہے، اس میں ان کے برے انجام کو ظاہر کیا گیا ہے، یہاں اسمِ اشارہ لانا انتہائی بلیغ انداز ہے، کیونکہ جو لوگ اس درجہ کی بدحالی اور بدکرداری کو پہنچ جائیں، وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ ان کی طرف تحقیر و حقارت کے ساتھ اشارہ کیا جائے۔

اور فرمانِ باری **وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا** میں یہ وضاحت ہے کہ وہ اپنے قریش کے مشرکین سے مدد مانگ کر بھی کسی کو نفع نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس میں مؤمنین کے لیے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصل نصرت انہی کے لیے ہے، کیونکہ وہ اللہ کے مقرب ہیں اور جسے اللہ قریب کر لے، اس کے لیے کوئی خاذل اور چھوڑنے والا نہیں ہو سکتا۔

یہودیوں کا مشرکین سے اتحاد اور ان کو اہل ایمان پر ترجیح دینا، جیسا کہ قرآن نے بیان کیا، اس کی قباحت کا اعتراف خود ایک یہودی عالم ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب "تاریخ یہود فی جزیرۃ العرب" میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، ان یہودیوں پر لازم تھا کہ وہ اس مہلک خطا میں نہ پڑتے اور نہ ہی قریش کے سرداروں کے سامنے یہ اعلان کرتے کہ بت پرستی اسلام کے توحیدی عقیدہ سے بہتر ہے، چاہے اس کے نتیجے میں ان کی خواہش پوری نہ بھی ہوتی، کیونکہ بنی اسرائیل، جو صدیوں تک اپنے آباؤ اجداد کے نام پر بت پرست قوموں کے درمیان دنیا میں توحید کا علمبردار رہے اور جنہیں ایک خدا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے تاریخ کے مختلف ادوار میں بے شمار قتل و

غارت اور مظالم سہنے پڑے، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی جانیں اور اپنی ہر قیمتی چیز قربان کر دیتے، مگر مشرکین کو تقویت نہ دیتے، اس کے علاوہ، ان کا مشرکین کی طرف رجوع در حقیقت اپنے آپ سے جنگ کرنا تھا اور تورات کی تعلیمات کی کھلی مخالفت تھی، جو انہیں بت پرستوں سے نفرت کرنے اور ان کے ساتھ دشمنی رکھنے کی وصیت کرتی ہے۔ (تاریخ الیہود فی جزیرۃ العرب)

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا: اپنی جھوٹی تعریفیں کرنے والے، اپنے تزکیے پیش کرنے والے، رحمٰن کی بندگانی کی بجائے بتوں کے سامنے ماتھے ٹیکنے والے، اہل ایمان کی بجائے کافروں کو ہدایت یافتہ ماننے والے یہودیوں کو یہاں مزید رسوا کیا جارہا ہے، ان کے بخل کو عالم آشکار کیا جارہا ہے، فرمایا کیا ان کے لیے بادشاہت میں کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگوں کو کھجور کی گٹھلی کے پیٹھ کی ہلکی سی لکیر (نقیر) کے برابر بھی نہ دیتے۔

یہاں "أم" منقطعہ ہے جس کا معنیٰ بل (بلکہ) ہے اور یہ اضراب و انتقال کے لیے لایا گیا ہے اور اس میں استفہام انکاری ہے، یعنی یہودیوں کے اس گمان کی تردید ہے کہ بادشاہت آخر کار ان ہی کی طرف لوٹ آئے گی، جس طرح وہ اپنے مونہوں سے دعوے کیا کرتے تھے، فَإِذاً میں فاء سبب کے لیے ہے جو ایک محذوف شرط پر دلالت کر رہی ہے۔

"نقیر" کھجور کی گٹھلی کی پیٹھ پر چھوٹے سے گڑھے کو کہتے ہیں، اور عربی میں اس سے کم ترین اور حقیر ترین چیز مراد لی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان یہودیوں کا بادشاہت میں کوئی حصہ نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کے اہل ہی نہیں، بلکہ اگر بالفرض انہیں بادشاہت میں کچھ حصہ دے بھی دیا جائے تو اپنی شدید حرص، بخل اور خود غرضی کی وجہ سے وہ کسی دوسرے کو اس میں سے ذرا سا بھی نہ دیں گے، قرآن نے اس "ذرا سا" کو "نقیر" کے لفظ سے تعبیر فرمایا، چنانچہ یہ آیت ان کے اس جھوٹے زعم کو رد کرتی ہے کہ بادشاہت انہی کے لیے ہے اور وہ کسی دوسرے کی پیروی کے لائق نہیں، نیز یہ ان کی صفت بتاتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ بخیل اور عدل و انصاف سے دور لوگ ہیں اور جس میں یہ اوصاف پائے جائیں، اللہ کی حکمت یہ چاہتی ہے کہ اسے بادشاہت اور اقتدار کی نعمت سے محروم کر دے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بخل اور اس جیسی پچھلی برائیوں پر توبیخ کرنے کے بعد، ان کی ایک اور رذیل خصلت یعنی حسد پر انہیں ڈانٹا، جو ان کے دلوں پر غالب آچکی تھی، یہ حسد انہیں گمراہی میں ڈال رہا تھا اور وہ دوسروں کو ملنے والی نعمتوں پر کڑھتے اور چاہتے تھے کہ وہ نعمتیں ختم ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا: کیا یہ لوگ دوسروں سے اس چیز پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کی ہے؟

یہاں "اَم" (کیا) منقطعہ ہے اور اس کے بعد جو استفہام ہے، وہ انکارِ واقع کے معنی میں ہے، یعنی دراصل ان کا حسد کرنا ہی مردود اور مذموم ہے۔ اَلنَّاس سے مراد یا تو نبی اکرم ﷺ ہیں، یا آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ ایمان لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعض کے نزدیک اس سے مراد تمام عرب ہیں۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اکثر مفسرین کے نزدیک اَلنَّاس سے مراد محمد ﷺ ہیں، حالانکہ آپ ایک فرد ہیں، لیکن آپ ﷺ میں وہ تمام کمالات جمع ہو گئے تھے جو عموماً بڑی جماعتوں میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں، اس لیے آپ پر اَلنَّاس کا اطلاق درست ہے اور بعض مفسرین کے مطابق مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ کے اہل ایمان ہیں، کیونکہ اَلنَّاس جمع ہے تو اس کو جمع پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی حقیقی بندگی کرنے والے ہیں، تو یوں سمجھا جائے کہ اصل انسان تو وہی ہیں۔

فضل سے مراد یہاں نبوت، ہدایت اور ایمان ہے۔ یہاں یہود کو خوب ذلیل کیا گیا کہ یہ یہود صرف بخیل ہی نہ تھے، بلکہ ان میں اس سے بھی بدتر خصلت موجود تھی اور وہ ہے حسد۔

فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا: اللہ تعالیٰ یہاں یہود کے حسد کرنے پر انہیں خوب ملامت کر رہے ہیں اور ان پر ایک ایسی بات سے حجت قائم کی گئی ہے جسے وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم اپنے حسد کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ پر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا، اس کو برداشت نہیں کر پا رہے اور یوں شیطان کے راستے پر چل رہے ہو،

حالانکہ اگر تم عقل سے کام لیتے تو ایسا نہ کرتے، کیونکہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آلِ ابراہیم (یعنی ان کی قریبی اولاد جیسے اسماعیل علیہ السلام جو عرب کے جد ہیں، اور اسحاق و یعقوب علیہم السلام وغیرہ) کو کتاب (یعنی آسمانی کتابوں کی جنس جس میں تورات، انجیل، زبور وغیرہ شامل ہیں) عطا فرمائی، اور انہیں حکمت (یعنی نافع علم اور اس پر عمل کی توفیق) دی اور انہیں بڑا اقتدار و سلطنت عطا فرمایا، اس کے باوجود تم نے ان پر حسد نہیں کیا، تو پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کے فضل کی عطا پر حسد کیوں کرتے ہو حالانکہ وہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی ہی نسل سے ہیں؟ یہ آیت ان کی خود غرضی اور حسد پر ملامت ہے، ان پر ان ہی کی کتابوں سے حجت قائم کرنا ہے اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کی دشمنی اور کینہ دراصل ان کی بصیرت کے اندھے پن اور دل کی خباثت کا نتیجہ ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ: اللہ تعالیٰ نے یہاں یہود کے نیکوکار اور بدکار دونوں طبقوں کا انجام بیان فرمایا، ارشاد فرمایا کہ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس (نعمت) پر ایمان لائے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اس سے منہ موڑا، اور جہنم بھڑکتی آگ ہی ان کے لیے کافی ہے، مطلب یہ کہ ان حاسدین اور ان کے باپ دادا میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے آلِ ابراہیم کو دی گئی کتاب و حکمت کو مانا اور تصدیق کی اور کچھ وہ تھے جنہوں نے اس کا انکار کیا اور لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کی۔

یہاں مذکر کی دو ضمیروں بِهٖ اور عَنْهُ کا مرجع وہی نعمت ہے جو آلِ ابراہیم کو دی گئی، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے، یعنی آلِ ابراہیم میں سے کچھ نے ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لایا اور کچھ نے ان سے منہ موڑا اور ان کی تعلیمات کی پیروی نہ کی۔

یہ آیت دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بڑی تسلی ہے، گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے، یہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اور حسد کرنے والے ہیں، انہوں نے تو اپنے ہی پیشوا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا اور ان میں سے اکثر نے ان کی راہ کو چھوڑ دیا، تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان میں سے نہیں ہیں،

پھر آپ ﷺ ان سے یہ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ صلح و سلامتی اختیار کریں گے یا آپ ﷺ کی پیروی کریں گے؟

وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا: اور جہنم بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے، یہ بیان ہے اس عذاب کا جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے تیار کر رکھا ہے، سخت دہکائی گئی آگ ہے جس میں وہ اپنے کفر، عناد اور حق سے انکار کی وجہ سے جلائے جائیں گے، لفظ سَعَّرَ النَّار کا معنی ہے آگ کو بھڑکانا، دہکانا اور سخت طور پر جلانا۔

سورۃ النساء کی یہ چند آیات **أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيباً مِّنَ الْكِتابِ** سے لے کر **وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيراً** تک، یہود کو اس بات پر ملامت کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنا دین دنیا کے بدلے بیچ ڈالا، اللہ کے کلمات کو ان کے اصل مقامات سے ہٹا دیا، دعوتِ حق کا مذاق اُڑایا، اپنے آپ کو ناحق پاکیزہ جتایا، اللہ پر جھوٹ باندھا، بت پرستی کو اللہ کی عبادت پر ترجیح دی، مال و دولت ہونے کے باوجود اسے خرچ کرنے میں بخل سے کام لیا، نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے نوازا اس پر یہودیوں نے حسد کیا، جس پر ان کی مذموم و خبیث صفات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سخت ترین عذاب کی وعید سنائی گئی، اہل ایمان کو ان کے شر و رو مفاسد سے مطلع کیا گیا۔

کفار کا انجام، اہل ایمان کا اعلیٰ مقام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا {٥٦} وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا {٥٧} النساء

جواب ترجمہ: یقیناً جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا آگے ہم ان کو آگ میں جھونکیں گے جب جب ان کی چمڑیاں گل جائیں گی تو ہم دوسری چمڑیوں سے ان کو بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب

چکھتے ہی رہیں، بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے آگے ان کو ہم ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، ان (باغات) میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا: بے شک یہ کفار جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا آگے ہم ان کو آگ میں جھونکیں گے، ان کفار سے مراد یہودی ہیں، عیسائی ہیں، بت پرست ہیں، جنہوں نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی رسالت کو تسلیم نہیں کیا، حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں یہاں **الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا** "جنہوں نے کفر کیا" سے مراد ہر کافر ہے، خواہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہو یا ان کے علاوہ کوئی اور۔

نُصۡلِیۡہِمۡ کا ماخذ **اِصۡلَاءٌ** ہے جس کے معنی ہیں آگ کو بھڑکانا اور یہاں مراد ہے ہم عنقریب انہیں ایک سخت اور ہیبت ناک آگ میں داخل کریں گے اور **سَوۡفَ** کا لفظ جیسا کہ سیبویہ نے کہا سخت وعید اور مستقبل میں آنے والے عذاب کی تاکید کے لیے آتا ہے، خواہ وہ بظاہر دیر سے کیوں نہ آئے اور یہ تاخیر جب تاکید کے ساتھ ہو تو یہ دل کو ہمیشہ کے لیے دہشت اور مسلسل خوف میں مبتلا رکھتی ہے، یہاں تک کہ وہ عذاب واقع ہو جائے۔

یہاں آیت میں فرمایا گیا کہ بے شک وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ ہی عبادت اور اطاعت کے لائق ہے، عنقریب ہم انہیں ایک نہایت بڑی اور ہیبت ناک آگ میں داخل کریں گے۔

کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ: نَضِجَتۡ کا ماخذ نضج ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کا پختگی یا تکمیل کو پہنچ جانا، عربی میں کہا جاتا ہے **نَضِجَ الثَّمَرُ وَاللَّحۡمُ یَنۡضَجُ نُضۡجًا** پھل پک گیا یا گوشت پک گیا، جب وہ اپنی انتہا کو پہنچ جائے، اور یہاں مراد ہے کہ ان کی کھالیں پوری طرح جل جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب بھی ان کی کھالیں جل کر گل جائیں گی تو ہم انہیں دوسری کھالیں بدل دیں گے، یہاں پر کافروں کے لیے عذاب کی شدت اور اس کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی جب بھی ان کی کھالیں جل کر ختم ہو جائیں گی تو ہم ان جلی ہوئی کھالوں کے بدلے نئی اور صحیح سالم کھالیں پیدا کر دیں گے۔

کھالوں اور چمڑیوں کی یہ تبدیلی حقیقی اور مادی تبدیلی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان جلی ہوئی کھالوں کے بجائے نئی کھالیں پیدا کرے گا جو پہلی سے بالکل مختلف ہوں گی اور بعض اہل علم کا قول ہے کہ یہ آیت دائمی عذاب کا کنایہ ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ عذاب کے دوام اور اس کے نہ ختم ہونے کی استعارتاً مثال ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے **كُلَّمَا انْتَهَى فَقَدِ ابْتَدَأَ، وَكُلَّمَا وَصَلَ إِلَى آخِرِهِ فَقَدِ ابْتَدَأَ مِنْ أَوَّلِهِ** جب بھی یہ ختم ہوا تو دوبارہ شروع ہو گیا" یا "جب بھی آخر تک پہنچا تو پھر ابتداء سے شروع ہوا"۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب بھی وہ گمان کریں گے کہ وہ جل کر ختم ہو گئے اور ہلاکت کو پہنچ گئے تو ہم انہیں نئی زندگی اور قوت دے دیں گے تاکہ وہ دوبارہ عذاب چکھیں، پس اس کا مقصود عذاب کے دوام اور اس کے کبھی نہ ختم ہونے کو بیان کرنا ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کو اس کے حقیقی معنی پر ہی رکھا جائے، کیونکہ اللہ کے کلام کو حقیقت سے ہٹا کر مجاز پر محمول کرنا جائز نہیں، الا یہ کہ کوئی سخت مجبوری ہو اور یہاں ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے، کیونکہ جلی ہوئی کھالوں کو بدل کر نئی کھالیں پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ہے۔ نیز امام رازی رحمہ اللہ کا بیان کردہ معنی بھی حقیقی معنی ہی کے اندر شامل ہے، کیونکہ لفظ **كُلَّمَا** بذات خود عذاب کے دوام اور اس کے نہ ختم ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس لیے بھی کہ بہت سے سلف صالحین نے اس آیت کو اسی حقیقی معنی پر لیا ہے۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت تلاوت کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کو دوبارہ پڑھو، اس نے دوبارہ پڑھا، تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا میرے پاس اس کی تفسیر ہے، وہ یہ کہ **تُبَدَّلُ جُلُودُهُمْ فِي**

كُلَّ سَاعَةٍ مَائَةَ مَرَّةٍ ان کی کھالیں ہر گھڑی سو بار بدلی جائیں گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں، اس جملے بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا کی تعلیل ہے، یعنی ہم ان کی کھالیں اس لیے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کی شدت کو بار بار محسوس کریں اور ہر مرتبہ ایسے ہی محسوس کریں جیسے کوئی ذائقہ چکھنے والا چیز کو بار بار چکھ کر اس کا اثر محسوس کرتا ہے اور اگر اصل مادہ (یعنی بدن) موجود رہے اور اس سے جلنے کا اثر زائل کر دیا جائے، تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دوسری جلد (چمڑے) نے گناہ نہیں کیا اور یہ ایسا سوال ہے جو کوئی عاقل تو کیا، فاضل شخص بھی نہیں کرتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ چمڑے کے گناہ کرنے یا اس کے تکلیف پانے اور لذت اٹھانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے پتھروں اور دوسری بے جان چیزوں سے مختلف نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ عذاب نفسِ حساس پر ہے، چاہے وہ کسی بھی بدن میں موجود ہو اور کسی بھی جلد میں قرار پائے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے، کو تذییل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس وعید اور سخت دھمکی کو مزید مؤکد کیا جائے جو اس آیتِ کریمہ میں بیان ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک ایسا ہے کہ وہ غالب ہے، کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا، نہ ہی اس کے عذاب کو کوئی روک سکتا ہے اور وہ حکمت والا ہے، اپنی تدبیر، اپنے اندازے، اپنے عذاب دینے اور اپنے ثواب عطا کرنے میں حکمت رکھنے والا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، یہ اس اچھے بدلے کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندوں سے وعدہ فرمایا ہے، اس سے پہلے اس عذاب کا ذکر تھا جو کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

یہ قرآنِ حکیم کا اُسلوب بیان ہے کہ وہ کبھی کافروں کے انجامِ بد کو ذکر کرتا ہے اور اس کے بعد مؤمنوں کے اچھے انجام کو بیان کرتا ہے، یا اس کے برعکس کرتا ہے، تاکہ عقلمند لوگ کفر اور نافرمانی

کے راستے سے بچیں اور انہیں اطاعت و ایمان کے راستے پر چلنے کی رغبت دلائی جائے۔

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا: وہ لوگ جنہوں نے سچا ایمان قبول کیا اور دنیا میں نیک و صالح اعمال کیے، ہم انہیں قیامت کے دن ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، ہم نے ان کو عظیم عزت و انعام سے نوازا کہ انہیں جنت میں ہمیشہ کے لیے ٹھہرا دیا جائے گا، جہاں نہ وہ مریں گے اور نہ ہی وہاں سے نکالے جائیں گے۔

لَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، یعنی ایسی عورتیں جو ہر قسم کی ظاہری و باطنی ناپاکیوں اور عیوب سے پاک ہوں گی، حیض، نفاس، پیشاب اور پائخانہ سے پاک ہوں گی، جسمانی بدبو اور تعفن سے پاک ہوں گی، قول و عمل کی ناپاکیوں سے پاک ہوں گی، کیونکہ وہ جنت میں ہوں گی اور جنت دارالسرور والحبور یعنی خوشیوں اور راحتوں کا گھر ہے۔

وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا: اور ہم انہیں ٹھنڈے، گھنے اور خوشگوار سائے میں داخل کریں گے ایسا سایہ جو گھنا اور خوشنما ہو گا، جس کے نیچے نہ گرمی ستائے گی اور نہ ہی لُو یا گرم ہوا چھوئے گی۔ ظل (سایہ) اس اثر کو کہتے ہیں جو سورج اور اس کی گرمی کو روکنے والی کسی چیز کے باعث پیدا ہو، اور ظلیل سائے کی صفت ہے جو اس کے کمال کو ظاہر کرتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''لیل أ لیل'' یعنی ایسی رات کہ اپنی نوع میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔

علامہ زمخشری نے کہا: ''ظلیل'' وہ صفت ہے جو لفظ ''ظل'' ہی سے ماخوذ ہے تاکہ اس کے معنی کی پختگی ہو، جیسے کہا جاتا ہے: لیل أ لیل اور یوم أ یوم وغیرہ، یعنی ایسا سایہ جو لمبا، پھیلا ہوا اور دائمی ہو، جس میں کوئی کمی یا انقطاع نہ ہو اور جو ہمیشہ قائم رہے، جسے سورج زائل نہ کرے، وہ سایہ خوشگوار ہو گا، نہ گرم اور نہ ٹھنڈا اور یہ کیفیت تو صرف جنت کے سائے کی ہی ہے۔ (کشاف)

عربی زبان میں اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جیسے حربُ الحربِ بڑی جنگ، أمرُ الأمرِ، نہایت اہم معاملہ، فتنۃُ الفتنِ، بہت بڑی آزمائش، لیلُ اللیالی، انتہائی تاریک رات، سیفُ السیوفِ، بہت کاٹنے والی تلوار، دھرُ الدھورِ، نہایت طویل زمانہ، ساعۃُ الساعاتِ، فیصلہ کن

گھڑی، نارُ النیرانِ، سب سے شدید آگ، ملکُ الملوکِ، بادشاہوں کا بادشاہ، حقّ الحقّ، خالص سچائی، باطلُ الباطلِ، سراسر باطل، خیرُ الخیرِ، سب سے بہتر بھلائی، شرُّ الشرِّ، سب سے بڑا شر، نورُ الأنوارِ، سب سے روشن نور، ظلمۃُ الظلماتِ، انتہا درجے کی تاریکی، عدلُ العدلِ، کامل عدل وانصاف، جمالُ الجمالِ، حسن کی انتہا، علمُ العلومِ، سب سے اعلیٰ علم، (یعنی علمِ الٰہی یا علمِ قرآن) دینُ الأدیانِ، سچّا اور کامل دین۔

بیتُ البیوتِ، سب سے معزز گھر، (کعبہ معظمہ) سُبحانُ السُبحانِ، کامل پاکی، قلبُ القلوبِ، سب سے زیادہ پاک دل، موتُ الموتِ، وہ موت جو سب موتوں کو مٹادے (یعنی قیامت) فیصلہ کن موت، حیاۃُ الحیاۃِ، حقیقی زندگی، دنیاالدُنیا، سب سے پست دنیا، سلطان السلاطین، بادشاہوں کا بادشاہ، کرم الکرما، بہت زیادہ سخی، نصرۃ النصر، کامل مدد کرنا، صبر الصبور، بہت زیادہ صبر۔

وقت الاوقات، بہت قیمتی وقت، عین الاعیان، سردار، بحر البحور، بڑا دریا، صوت الاصوات، توانا آواز، سرورالسرور، کامل درجے کی مسرت، حزن الاحزان، شدید غم، ودالودود، شدید محبت، خوف الخوف، بہت زیادہ ڈر، امل الآمال، انتہائی امید۔

کلیمۃ الکلم، فیصلہ کن بات، طریق الطرق، بڑا راستہ، ذکر الاذکار، اونچا ذکر، مجدُ الأمجاد، بہت بزرگی، سعادۃ السعادات، نعمتوں کے اونچے درجے، ظلم الظلم، سب سے بڑھ کر ظلم، حب الاحبۃ، سب سے پیارا عشق، روح الارواح، اعلیٰ ترین جوہر، نجم النجوم، درخشندہ ترین ستارہ، فرح الافراح، بہت بڑی خوشی، نطق النطقاء، فصاحت کی انتہاء، سعید السعدا، سب سے خوش نصیب۔

فضل الافضال، تمام فضائل میں سب سے بڑا، نعمۃ النعم، سب سے بڑی نعمت، بلاء البلاء، سخت آزمائش، ارض الاراضی، سب سے نیچی یا وسیع زمین، جھل الجھال، انتہائی نادانی، کذِب الکذِب، صریح جھوٹ، وجہ الوجوہ، سب سے نمایاں چہرہ، سعید الایام، سب سے مبارک دن، عجیب العجائب، عجیب چیزوں میں سب سے عجیب، فضل اللہ الفضیل، اللہ کا اعلیٰ فضل، قدرۃ القدرات، تمام طاقتوں پر غالب طاقت، رحمۃ الرحمٰن، سب سے عظیم رحمت۔

نہایۃ النہایات، آخری حد، اوّل الاوائل، سب سے پہلا، آخر الاواخر، انجام، کتاب الکتب، سب سے جامع کتاب، ذنب الذنوب، گناہوں میں بڑا گناہ، ثوب الثیاب، کپڑوں میں سب سے عمدہ، نصرۃ

النصراء، مددگاروں کی مدد، بلاء الزمان، زمانے کی آزمائش، وغیرہ

امانتیں امانت والوں کے سپرد کرنے کا حکم

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے نیز بتائیے کہ اس کے نزول کا سبب کیا ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا {۵۸} النساء

جواب ترجمہ: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچادو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو بیشک اللہ تمہیں نہایت اچھی نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت عثمان بن طلحہ حجبی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو قبیلہ بنی عبد الدار سے تھا، یہ شخص کعبہ کا متولی (خادم، دربان) تھا جب نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے روز مکہ میں داخل ہوئے تو عثمان نے خانہ کعبہ کے دروازے کو تالا لگادیا اور خود چھت پر چڑھ گیا رسول اللہ ﷺ نے چابیاں طلب کیں تو آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ چابی عثمان کے پاس ہے آپ ﷺ نے اس سے چابی طلب کی تو اس نے چابی دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اگر میں جانتا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو چابی دینے سے انکار نہ کرتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ مروڑا اور اس سے چابی پکڑ لی اور دروازہ کھولا رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوگئے اور دو رکعت نماز ادا کی۔

جب آپ ﷺ خانہ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے آپ ﷺ سے چابی دینے کو کہا تاکہ ان کے پاس سقایہ اور سدانہ (سقایہ: حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت، سدانہ: بیت اللہ کی چابیاں رکھنے اور خدمت کا منصب) کے شعبے دونوں اکٹھے ہوں، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں چابی عثمان رضی اللہ عنہ کو واپس دینے کے لیے کہا اور اس سے معذرت کرنے کو کہا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم کی تعمیل کی، عثمان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے علی! تو نے جبر کیا اور تکلیف دی اور اب اظہارِ نرمی کرنے آئے ہو؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب

دیا کہ تمہارے بارے میں اللہ نے یہ آیت نازل کی اور پھر یہ آیت اسے پڑھ کر سنائی، اس پر عثمان نے کہا کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں یہ کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا اس پر جبریل آئے اور کہا کہ جب تک یہ گھر سلامت ہے تب تک اس گھر کی سدانت اور چابی عثمان کی اولاد میں رہے گی چنانچہ آج کے دن تک چابی انہیں کے پاس ہے۔ (اسباب النزول)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو، امانات یہ امانت کی جمع ہے، اور یہ اصل میں مصدر ہے جسے مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی امانت سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن پر انسان کو امین بنایا جائے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے، اے ایمان والو! کہ جو حقوق تمہارے سپرد کیے گئے ہیں وہ ان کے مالکوں تک پہنچاؤ، خواہ یہ حقوق اللہ تعالیٰ کے ہوں یا بندوں کے اور خواہ ان کا تعلق عمل سے ہو یا قول سے یا عقیدہ سے۔

اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اپنی طرف منسوب کر کے اس پر تاکید فرمائی ہے تاکہ اس کی اہمیت نمایاں ہو اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ ان سب چیزوں کو جن پر انہیں امین بنایا گیا ہے، مثلاً علم، مال، امانتیں، راز اور ہر وہ چیز جو دائرۂ امانت میں آتی ہے، ان کی حفاظت کریں اور ان کو ان کے اہل تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اصل مالکوں تک انہیں اسی حالت میں پہنچایا جائے جس حالت میں لی گئی تھیں، بغیر کسی کمی، کوتاہی، تبدیلی یا ایسی کسی چیز کے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا اور اطمینان کے ساتھ بیت اللہ شریف میں آئے تو اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف کیا، حجر اسود کو اپنی لکڑی سے چھوتے تھے اس کے بعد عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو جو کعبہ کی کنجی برادر تھے بلایا ان سے کنجی طلب کی انہوں نے دینا چاہی اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ اب یہ مجھے سونپئے تاکہ میرے گھرانے میں زمزم کا پانی پلانا اور کعبہ کی کنجی رکھنا دونوں ہی باتیں رہیں یہ سنتے ہی حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ روک لیا حضور ﷺ نے دوبارہ طلب کی پھر وہی واقعہ ہوا آپ نے سہ بارہ طلب کی حضرت عثمان نے یہ کہہ کر دے دی کہ اللہ کی

امانت آپ کو دیتا ہوں حضور ﷺ کعبہ کا دروازہ کھول کر اندر گئے وہاں جتنے بت اور تصویریں تھیں سب توڑ کر پھینک دیں، حضرت ابراہیم کا بت بھی تھا، جس کے ہاتھ میں فال کا تیر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا مَا لِلْمُشْرِكِينَ قَاتَلَهُمُ اللهُ، وَمَا شَأْنُ إِبْرَاهِيمَ وَشَأْنُ الْقِدَاحِ اللہ ان مشرکین کو غارت کرے بھلا خلیل اللہ کو ان تیروں سے کیا سروکار؟ پھر ان تمام چیزوں کو برباد کر کے ان کی جگہ پانی ڈال کر ان کے نام و نشان مٹا کر آپ ﷺ باہر آئے کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، صَدَقَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ، أَلَا كُلُّ مَأْثُرَةٍ أَوْ دَمٍ أَوْ مَالٍ يُدْعَى، فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ إِلَّا سِدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ (تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ)

کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے وہ اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنے وعدے کو سچا کیا اپنے بندے کی مدد کی اور تمام لشکروں کو اسی اکیلے نے شکست دی، جاہلیت کے تمام جھگڑے اب میرے پاؤں تلے کچل دیئے گئے خواہ مالی ہوں، خواہ جانی ہوں، بیت اللہ کی چوکیداری کا اور حاجیوں کو پانی پلانے کا منصب جوں کا توں باقی رہے گا۔

اس خطبہ کو پورا کر کے آپ بیٹھے ہی تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کہا حضور چابی مجھے عنایت فرمائی جائے تاکہ بیت اللہ کی چوکیداری کا اور حاجیوں کو زمزم پلانے کا منصب دونوں یکجا ہو جائیں، لیکن آپ ﷺ نے انہیں نہ دی مقام ابراہیم کو کعبہ کے اندر سے نکال کر آپ نے کعبہ کی دیوار سے ملا کر رکھ دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ تمہارا قبلہ یہی ہے پھر آپ ﷺ طواف میں مشغول ہو گئے ابھی وہ چند پھیرے ہی پھرے تھے جو حضرت جبریل نازل ہوئے اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے اس آیت کی تلاوت شروع کی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے ماں باپ حضور ﷺ پر فدا ہوں میں نے تو اس سے پہلے آپ کو اس آیت کی تلاوت کرتے نہیں سنا اب آپ نے

حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا هَاكَ مِفْتَاحَكَ يَا عُثْمَانُ ، اَلْيَوْمُ يَوْمُ وَفَاءٍ وَبِرٍّ (سیرت النبی ﷺ ابن ہشام) اے عثمان: یہ اپنی چابی لے لو، آج کا دن وفا، نیکی اور سلوک کا دن ہے۔

امانتیں ان کے مالکوں کے سپرد کرنے کے خطاب بارے حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ خطاب تمام مکلفین کو عام ہے، جیسے کہ امانات تمام حقوق کو عام ہیں جو ان کے ذمہ متعلق ہیں، خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق، چاہے وہ عملی ہوں، قولی ہوں یا اعتقادی اور حکم کا عموم خاص سبب کے ہونے کے منافی نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (بخاری) جس شخص میں یہ چار خصلتیں ہوں وہ پکا منافق ہے، جس میں ان چار میں سے ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی علامت موجود رہے گی جب تک وہ اسے چھوڑ نہیں دیتا، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد و پیمان کرے تو عہد شکنی کرے، جب وہ جھگڑا کرے تو گالم گلوچ کرے۔

امانت کی شریعت اسلامیہ میں بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے، قرآنی تعلیمات اور نبوی فرمودات میں بڑے واضح انداز میں امانت کی حفاظت کی تعلیم دی گئی ہے، ان میں امانت کی عظمت و اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے ادا کرنے اور حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے، إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (الاحزاب) بیشک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اسے اٹھالیا۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ. أُولَئِكَ فِي

جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (المعارج) اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی رعایت کرنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، یہی لوگ جنتوں میں عزت والے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانفال) اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول کے حقوق میں خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔ سورۃ یوسف میں ارشاد ربانی ہے وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (یوسف) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو راہ نہیں دیتا۔ سورۃ انفال میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ بلاشبہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ سورۃ حج میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے ناشکرے کو پسند نہیں فرماتا۔

رحمت دوعالم ﷺ کے فرمودات پر بھی ایک نگاہ ڈالیے، آپ ﷺ نے کس قدر امانت کی حفاظت کی ترغیب دی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ (ترمذی، نسائی) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مؤمن وہ ہے جس پر لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے اعتبار سے امن پائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ، وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ (ترمذی، ابوداؤد) امانت اس شخص کو ادا کرو جس نے تمہیں امانت سپرد کی اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے، تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا ہو اور یہ نہ ارشاد فرمایا ہو کہ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَ لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ ، اس کا کوئی ایمان نہیں جو امانتدار نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پورا نہیں۔ (مشکوٰۃ، انوار البیان)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جب تیرے اندر چار خصلتیں ہوں تو تجھے اس بات کا ضرر نہیں کہ دنیا کی باقی چیزیں تیرے پاس نہیں ہیں۔ ① امانت کی حفاظت ② بات کی سچائی ③ اخلاق کی خوبی ④ لقمے کی پاکیزگی۔ (احمد، شعب الایمان للبیہقی، انوار البیان)

حضرت لقمان حکیم رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ علم و فضل کے اس مرتبے پر کیسے پہنچے انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات کی سچائی، امانت کی ادائیگی اور لایعنی سے پرہیز ان تینوں کی وجہ سے میں اس مرتبہ پر پہنچا۔ (مؤطا امام مالک، مشکوٰۃ المصابیح، انوار البیان)

اداروں کے اموال کی حفاظت میں امانتداری: جن لوگوں کے ہاتھوں میں دوسروں کے اموال ہیں ان میں ملوک اور حکام بھی ہیں اور یتیموں کے اولیاء بھی، مسجدوں کے متولی بھی اور مدارس کے مہتمم بھی اور بیت المال کے نگران بھی اور کہیں پر پڑا ہوا مال اٹھانے والے بھی اور بہت سے عہدیدار ہیں جن پر دوسروں کے مالوں کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، یہ سب لوگ اس بات کے مامور ہیں کہ مالوں کی حفاظت کریں اور ذرا سی بھی خیانت نہ کریں، امانت کی حفاظت اور اس کی ادائیگی بہت بڑی ذمہ داری ہے، یہ سارے عہدے جنہیں دنیا میں خوشی خوشی قبول کر لیا جاتا ہے، پھر ان سے متعلقہ ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا جاتا قیامت کے دن وبال بن جائیں گے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے کسی عمل پر نہیں لگاتے؟ (یعنی مجھے کوئی عہدہ نہیں عنایت فرماتے؟) اس پر آنحضرت ﷺ نے ان کے مونڈھے پر ہاتھ مارا پھر فرمایا اے ابوذر! تو ضعیف ہے اور بلاشبہ یہ عہدہ امانت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا ذریعہ ہوگا سوائے اس شخص کے جس نے حق کے ساتھ لیا اور متعلقہ ذمہ داری کو پورا کیا۔ اور ایک روایت یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! میں تمہیں ضعیف دیکھتا ہوں اور میں تمہارے لیے وہ پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں دو آدمیوں کا امیر مت بننا اور یتیم کے مال کا متولی نہ ہونا۔ (مسلم، انوار البیان)

نااہلوں کو عہدے دینا خیانت ہے: بہت سے لوگ نا اہلوں کو اپنی کوشش سے یا اپنے اقتدار سے چھوٹے بڑے عہدے دے دیتے ہیں یا دلا دیتے ہیں حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ جس کو عہدہ دیا جارہا ہے، یہ اس عہدہ کا اہل نہیں ہے یہ عہدہ ایک امانت ہے اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے لیکن دنیاوی تعلقات اور دنیاوی منافع کے پیش نظر جو فاسقوں، فاجروں ظالموں بے نمازیوں کو عہدے دیئے اور دلا دیے جاتے ہیں، یہ سب امانت میں خیانت ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جسے اقتدار سپرد کر دیا جاتا ہے جب وہ عہدے تقسیم کرنے لگتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ جسے اقتدار سپرد کیا جارہا ہے یہ شریعت اسلامیہ سے واقف ہے یا ناواقف ہے، اس کے عقائد اسلامی ہیں یا غیر اسلامی، جس کو عہدہ دیا جارہا ہے اس پر خدا ترسی کی شان ہے بھی یا نہیں اور یہ دین پر چلے گا یا نہیں، عوام کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہو گا یا برا، عہدہ سپرد کرنے میں رشتہ داریاں، اپنی اپنی پارٹی کا آدمی دیکھا جاتا ہے یا وطنی عصبیتوں کی رعایت کی جاتی ہے، یعنی صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا آدمی ہے، اپنوں کو نوازنا مقصود ہوتا ہے دین خداوندی پر چلنے اور چلانے اور امت مسلمہ کے ساتھ عدل و انصاف اور خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات کا کہیں سے کہیں تک بھی دھیان نہیں ہوتا، اس لیے سارے فیصلے غیر شرعی ہوتے ہیں اور عوام عہدہ داروں کے ظالمانہ فیصلوں کو بھگتتے رہتے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کے متعلقہ امور سے جو شخص کسی امر کا والی بنا پھر اس نے ان پر کسی شخص کو (ذاتی) مروّت اور تعلقات کی بنا پر امیر بنا دیا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے، اس سے کوئی فرض یا نفل قبول نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ اللہ اس کو دوزخ میں داخل فرمادے گا۔ (الترغیب والترہیب)

پھر جن لوگوں کے سیاسی وعدے ہوتے ہیں جب عہدہ مل جاتا ہے تو عوام پر ظلم بھی کرتے ہیں اور وعدہ فراموشی بھی کرتے ہیں اور عذر بھی کرتے ہیں، اس بارے میں جو ارشادات نبویہ ہیں ان سب کو یکسر بھول جاتے ہیں۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ، فَيَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَهُمْ، إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ

عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (بخاری) جو بھی کوئی شخص مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کا والی بنا (یعنی ان کی دیکھ بھال اس کے ذمہ کی گئی) پھر وہ اس حال میں مر گیا کہ وہ ان کے ساتھ خیانت کرنے والا تھا تو اللہ اس پر جنت حرام فرمادے گا۔ دوسری روایت میں جس کسی بندہ کو اللہ نے چند افراد کا نگہبان بنایا پھر اس نے ان لوگوں کو اچھی طرح خیر خواہی نہ کی تو جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا۔ (صحیح بخاری، انوار البیان)

رعیت کو دھوکہ دینا: حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ قیامت کے دن ہر دھوکہ دینے والے کے لیے ایک جھنڈا ہو گا جو اس کے پاخانہ کے مقام پر نصب کیا جائے گا وہ اس کے دھوکہ کے بقدر بلند کیا جائے گا (پھر فرمایا) خبردار جو شخص عوام کا امیر ہو اس کے غدر یعنی دھوکے سے بڑھ کر کسی کا غدر نہیں۔ (مسلم، مشکوٰۃ المصابیح، انوار البیان)

کام پورا نہ کرنا اور تنخواہ پوری لینا خیانت ہے: جو لوگ تنخواہ پوری لیتے ہیں اور کام پورا نہیں کرتے یا وقت پورا نہیں دیتے یہ سب لوگ خیانت کرنے والے ہیں، اسی طرح جو لوگ رشوت لیتے ہیں اور رشوت لینے کی وجہ سے کار مفوّضہ انجام دینے کی بجائے رِشوت دینے والے کی مرضی کے مطابق اس کا کام کر دیتے ہیں، یہ لوگ بھی خیانت کرنے والے ہیں، رشوت حرام ہے، اسی لیے ملازمت کی تنخواہ بھی پوری حلال نہیں ہوتی کیونکہ جس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے اس کے خلاف کام کرتے ہیں، در حقیقت امانتداری کی صفت بہت بڑی صفت ہے اور اس کو پورا کرنا ایمان کا بہت بڑا مطالبہ ہے، یہ ایسی عظیم صفت ہے، جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، یہ صفت صرف مالیات ہی سے متعلق نہیں۔ (انوار البیان)

مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں: دیگر امور میں بھی آنحضرت ﷺ نے امانتداری پر قائم رہنے کا حکم دیا، آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ کہ مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں (رواہ ابو داؤد فی کتاب الادب) یعنی مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں ان کو مجلس سے باہر لے جانا اور تجھ مجھ سے بیان کر دینا امانتداری کے خلاف ہے اور اہل مجلس کی خیانت ہے ہاں اگر مجلس میں کسی کا خون کرنے کا یا زناکاری کا یا کسی کا ناحق مال حاصل کرنے کا مشورہ کیا گیا ہو تو اس کو دوسروں سے بیان کر سکتا ہے تاکہ اس گناہ پر عمل نہ ہو اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ إِلَّا ثَلَاثَةَ مَجَالِسَ: سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ أَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ

وَاقتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ، ایک حدیث میں ہے کہ جب کسی آدمی نے کوئی بات کہی پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا (کہ کوئی سن تو نہیں رہا) تو یہ بات امانت ہے۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد، انوارالبیان)

مشورہ دینا امانت ہے: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے (رواہ الترمذی فی ابواب الزہد) مطلب یہ ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے اس پر واجب ہے کہ صحیح مشورہ دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے کے حق میں بہتر ہو۔ (انوارالبیان) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ مشورہ مصلحت کے خلاف ہے تو اس نے مشورہ لینے والے کی خیانت کی۔ (اخرجہ ابوداؤد فی کتاب العلم)

بلا اجازت کسی کے گھر میں نظر ڈالنا خیانت ہے: آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں کہ جن کا کرنا کسی کے لیے حلال نہیں، ① جو شخص کسی جماعت کا امام بنے پھر ان کو چھوڑ کر صرف اپنے لیے ہی دعا کرے اگر ایسا کیا تو اس نے خیانت کی۔ ② جو شخص اجازت لیے بغیر کسی گھر میں نظر ڈالے اگر اس نے ایسا کیا تو گھر والوں کی خیانت کی۔ ③ کوئی شخص پیشاب پاخانہ روکے ہوئے نماز نہ پڑھے جب تک ہلکا نہ ہو جائے (یعنی ان سے فارغ نہ ہو جائے)۔ (مشکوٰۃ المصابیح، انوار البیان) ان احادیث شریفہ سے معلوم ہوا کہ اموال کے علاوہ دیگر امور میں بھی امانت داری کی صفت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ: اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں دوسروں کی ذمہ داری میں دی ہوئی امانتیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات میں فیصلہ کرتے وقت عدل وانصاف کو لازم پکڑو۔

حَكَمْتُمْ کا مطلب ہے فیصلہ کرنا، یعنی جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کرنا اور حق کو اس کے مالک تک پہنچانا اور الْعَدْل سے مراد ہے حق کے مطابق فیصلہ کرنا، جو اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دیا ہے۔

عدل کا اصل معنیٰ برابری ہے، جیسے کہا جاتا ہے عَدَلَ كَذَا بِكَذَا أَي سَوَّاهُ بِهِ فلاں کو فلاں کے برابر کیا۔ علامہ جمل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں وَإِذَا حَكَمْتُم دراصل ایک محذوف پر موقوف ہے، بصریوں کے نزدیک اس کا مطلب ہے کہ وَأَنْ تَحْكُمُوا بِالعَدْلِ إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اور یہ کہ جب تم فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، جبکہ کوفیوں کے نزدیک یہ اسی پر عطف ہے جو پہلے مذکور ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ: جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا کہ امانتیں ان کے اہل تک پہنچاؤ، اسی طرح یہ بھی حکم دیا کہ جب بھی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو وہ فیصلہ حق اور انصاف پر مبنی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہت کو عدل و حق پر قائم کیا ہے اور جب فیصلے ظلم و ناانصافی کے ساتھ ہوں تو اس سے افراد اور قومیں دونوں بد بختی اور تباہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

بعض علما نے کہا ہے کہ اس آیت میں خطاب ان لوگوں کو ہے جو حکمران یا قاضی ہیں اور جن کے ذمہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس خطاب کو پوری امت کے لیے عام مانا جائے، کیونکہ وہ امت جو اپنی ذمہ داریوں کو خود سنبھالتی ہے، بغیر کسی جابر بادشاہ یا ظالم حاکم کے، وہ خود محکوم بھی ہوتی ہے اور حاکم بھی، وہ اپنے حاکم کو خود منتخب کرتی ہے اور اس انتخاب میں عدل مطلوب ہے، نہ کہ خواہش، رشوت یا ذاتی مفاد، وہ اپنے حاکم کے بارے میں بھی انصاف سے کام لے، اس پر جھوٹی تہمت نہ لگائے، اس سے صرف وہی مطالبہ کرے جو حق پر مبنی ہو، تنقید میں حد سے نہ بڑھے اور نصیحت کرنے سے غفلت نہ کرے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اَلدِّينُ النَّصِيحَةُ: لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِم، دین خیر خواہی کا نام ہے، اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔

قرآنِ کریم میں عدل قائم کرنے اور ظلم کو دفع کرنے کے وجوب کا ذکر بار بار اور وضاحت کے ساتھ آیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل:۹۰) بیشک اللہ

عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ، (ص:۲۶) اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (الأنعام: ۱۵۲) اور جب بھی تم بات کرو تو عدل کے ساتھ کرو اگرچہ (وہ شخص) قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا، اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (المائدۃ:۸) اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

اسی طرح احادیثِ نبویہ میں بھی عدل و انصاف کی تاکید کثرت سے آئی ہے، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللهِ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، عَنْ يَمِينِ الرَّحْمٰنِ عَزَّ وَجَلَّ، وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَالُوا (مسلم) یقیناً انصاف کرنے والے لوگ اللہ کے نزدیک نور کے منبروں پر ہوں گے، جو رحمان کے دائیں جانب ہوں گے اور اللہ کی دونوں جانب دائیں ہی ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں میں، اپنے اہل و عیال کے بارے میں اور جن پر انہیں ذمہ داری دی گئی ہے، عدل کرتے ہیں۔

تفسیر انوار البیان میں حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں بہت ہی عرق ریزی کے ساتھ مضمون تحریر کیا ہے، معارف الفرقان کا مطالعہ کرنے والے باذوق حضرات کے لیے میں تبرکاً انوار البیان سے اس سارے آئندہ مضمون کو نقل کرکے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مصنف انوار البیان کو اپنی جناب سے جزائے عظیم و جزیل نصیب کرے۔

قرآن و حدیث کے خلاف فیصلے ظالمانہ ہیں: انسانوں نے اپنی طرف سے جو دساتیر اور قوانین

بنائے ہیں عموماً وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہیں، قرآن و حدیث کے خلاف فیصلے کرنا ظلم ہے، اگرچہ اہل دنیا اسے انصاف ہی کہتے ہوں، میراث اور وصیت دیت اور قصاص حدود اور جنایات کے شرعی قوانین، تجارت زراعت سے متعلقہ احکام نکاح و طلاق کے مسائل، حکومت سپرد کرنے اور حکومت چلانے کے قوانین اور انسانی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کے اُصول و قواعد جو شریعت اسلامیہ نے بتائے ہیں ان کے خلاف فیصلے دینا ظلم ہے۔

سورۃ مائدہ میں فرمایا وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور جو شخص اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو یہ لوگ ظلم کرنے والے ہیں) جن ملکوں میں کافروں کی عملداری ہے وہاں تو اللہ کی شریعت کے خلاف فیصلے ہوتے ہی ہیں لیکن جن ملکوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اقتدار دیا ہے وہاں کے ذمہ دار بھی اسلامی احکام کو قبول کرنے اور ان کے مطابق فیصلے کرنے کو تیار نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن جب ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اسلامی قوانین نافذ کرو تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ عوام جو مغربی قوانین کے مطابق فیصلوں کے باعث ظلم سہتے ہیں وہ بھی اسلامی نظام نافذ کرنے کے حق میں نہیں، دعویٰ مسلمان ہونے کا کرتے ہیں اور قوانین اور احکام دشمنان دین کے نافذ کرتے ہیں۔

سورۃ مائدہ میں فرمایا اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ، کیا پھر یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے اچھا کون ہو گا، یقین رکھنے والوں کے لیے۔

ظالمانہ فیصلوں کی وجہ سے مصائب کی کثرت: اب جو غیر اسلامی فیصلے ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے آفات اور مصائب کا طوفان آیا ہوا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہو گا جب تمہارے اندر پانچ چیزیں موجود ہو جائیں اور میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ چیزیں تمہارے اندر موجود ہوں:

① جس قوم میں زناکاری کھلم کھلا ہونے لگے گی ان میں طاعون پھیل جائے گا اور ایسے ایسے مرض ظاہر ہو جائیں گے جو ان کے آباؤ اجداد میں نہیں تھے۔

② اور جو لوگ زکوٰۃ دینا روک دیں گے ان کو آسمان کے قطروں سے یعنی بارش سے محروم کر دیا جائے گا، اگر چوپائے نہ ہوں تو (بالکل بھی) بارش نہ ہو۔

③ اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے ان کو قحط بھیج کر سزا دی جائے گی اور ان کو سخت محنت اور صاحب اِقتدار کے ظلم میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

④ اور جس قوم کے امراء اس فیصلے کے علاوہ کوئی فیصلہ کریں گے جو اللہ نے نازل فرمایا تو اللہ تعالیٰ ان پر دشمن مسلط فرمادے گا پھر یہ دشمن ان کے قبضے کی بعض چیزوں پر قبضہ کرلیں گے۔

⑤ اور جو لوگ اللہ کی کتاب کو اور اس کے نبی کی سنت کو معطل کر دیں گے یعنی اس پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے اللہ تعالیٰ ان کے درمیان جنگ وجدال کی صورت پیدا فرمادیں گے۔ (الترغیب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس کسی قوم میں خیانت ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیتے ہیں اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگتے ہیں ان کا رزق کاٹ دیا جاتا ہے اور جو لوگ ظلم کے فیصلے کرتے ہیں ان میں خونریزی پھیل جاتی ہے اور جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں ان پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔ (رواہ مالک فی الموطا وھو موقوف فی حکم المرفوع)

تقویٰ کے بغیر انصاف نہیں ہو سکتا: انصاف جبھی ہو سکتا ہے جبکہ اللہ کا خوف ہو، تقویٰ ہو، حق کا اتباع مقصود ہو، قرآن و حدیث کا علم ہو قضا کے احکام اور مسائل سے واقفیت ہو، امیر و غریب اپنے پرائے، چھوٹے بڑے کی کوئی رعایت نہ ہو، عادلانہ فیصلے کا معیار ایک حدیث میں یوں بتایا **وَحَكَّمُوا لِلنَّاسِ كَحَكَمِهِمْ لِاَنْفُسِهِمْ** کہ لوگوں کے درمیان وہی فیصلے کرتے ہیں جو اپنی جانوں کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں (مشکوٰۃ المصابیح)

مطلب یہ ہے کہ جیسے اپنے لیے حق و انصاف چاہتے ہیں اسی طرح جب دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے لگیں تب بھی حق و انصاف اختیار کریں، آج کل فیصلہ اس کے حق میں ہوتا ہے جو ہم

وطن ہو یا ہم پیشہ ہو یا ہم زبان ہو ایسے حاکم کے لیے آخرت میں سخت عذاب ہے جو ظلم کا فیصلہ دے اور ظالم کا ساتھی بنے اور اس کی رعایت کرے جس سے کسی قوم کا تعلق ہو اور جس کا واقعی شرعی حق بنتا ہو اسے حق سے محروم کر دے، رشوتیں لے کر بھی فیصلے دیئے جاتے ہیں جس نے رشوت دے دی موٹی رقم پکڑا دی اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے، یہ رشوتیں اور موٹی رقمیں نوٹوں کے گڈے دنیا میں اچھے لگتے ہیں لیکن آخرت میں جو ان کا وبال ہو گا اس کی طرف سے بے خبر ہیں۔

انصاف کے فیصلے کرنے والے: جیسے ظلم کرنے والوں کے لیے وعیدیں ہیں ایسے ہی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلے کرنے والوں کے لیے بشارتیں ہیں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قاضی (فیصلہ دینے والے) تین قسم کے ہیں ان میں سے ایک جنت میں ہے اور دو دوزخ میں ہیں، جنت والا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور ظلم کا فیصلہ کیا سو یہ شخص دوزخ میں ہو گا اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو جہالت کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے (اس کو حق ناحق کا کچھ پتہ نہیں) سو یہ بھی دوزخ میں ہو گا۔ (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

جن سات آدمیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ قیامت کے دن وہ اللہ کے عرش کے سائے میں ہوں گے جس دن اللہ کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا ان میں سب سے پہلے امام عادل کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کا وہ اعلیٰ اقتدار والا شخص جو انصاف کرنے والا ہو۔ (رواہ البخاری)

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ اہل جنت تین قسم کے لوگ ہوں گے:

① وہ صاحب اقتدار جو انصاف والا ہے اور اسے خیر کی توفیق دی گئی ہے۔

② وہ شخص جو رحم کرنے والا ہے نرم دل ہے، ہر قرابت دار کے لیے جو مسلمان ہو۔

③ وہ شخص جو صاحب اہل و عیال ہوتے ہوئے (حرام سے اور سوال سے) پرہیز کرنے والا ہو اور پرہیز کرنے کا اہتمام کرتا ہو۔ (رواہ مسلم کما فی الترغیب صفحہ ۱۶۷: ج ۳)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کو سب سے زیادہ پیارا اور اللہ سے سب سے زیادہ قریب مجلس کے اعتبار سے امام عادل ہو گا اور اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض اور مجلس کے اعتبار سے اللہ سے سب سے زیادہ دور امام جائر ہو گا۔ (الترغیب صفحہ ۱۶۷: ج ۳ عن الترمذی والطبرانی) (امام جائر: ظالم بادشاہ)

حکمرانوں کی ذمہ داریاں: حاکم بننا اور فیصلے کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لینا یہ معمولی چیز نہیں یہ ذمہ داری بہت بڑی ہے اور آخرت میں اس کا حساب بہت بڑا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے والا مقرر کر دیا گیا تو وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ (رواہ احمد والترمذی وابو داؤد وابن ماجہ کما فی المشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ اس عہدے کا انجام بہت برا ہے عام طور سے لوگ عدل وانصاف پر قائم نہیں رہتے قیامت کے دن یہ عہدہ وبال بنے گا اور اس عہدے کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے پر جو عذاب ہو گا اس کو اس دنیا میں اس طرح سمجھ لیا جائے جیسے کسی کو چھری کی بجائے (دھار دار آلے کے علاوہ) کسی چیز سے ذبح کر دیا جائے چھری سے ذبح کرنے کی تکلیف ذرا دیر ہوتی ہے لیکن اگر بغیر چھری کے ذبح کیا جائے تو اس کی تکلیف بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔

حاکموں کو ضروری تنبیہ: اس حدیث پر ہر وہ شخص غور کرے جو حاکم و قاضی و مجسٹریٹ بنا ہوا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو بھی کوئی حاکم لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے قیامت کے دن اسے لایا جائے گا پھر جہنم کے کنارے پر اسے کھڑا کر دیا جائے گا پھر اگر حکم ہو گا کہ اسے دھکا دے دیا جائے تو اس کو دھکیل دیا جائے گا جس کے نتیجے میں وہ ستر سال تک گہرائی میں گرتا چلا جائے گا۔ (رواہ البزار کما فی الترغیب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انصاف کرنے والے قاضی پر قیامت کے دن ضرور ایک ایسی گھڑی آئے گی کہ وہ حساب کی سختی کی وجہ سے یہ تمنا کرے گا کہ میں کبھی کسی ایک کھجور کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کرتا تو اچھا تھا۔ (الترغیب صفحہ ۱۵۷: ج ۳)

حاکم کیسے شخص کو بنایا جائے ؟: شاید کسی کو یہ خیال گزرے کہ جب یہ وعیدیں ہیں تو لوگوں کے درمیان جو جھگڑے ہوں ان کے فیصلے کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ شریعت کے اصول کے مطابق اگر کسی کو حاکم بنادیا جائے اور پھر وہ شریعت کے مطابق فیصلے کرے حق وانصاف کو سامنے رکھے قرآن وحدیث کے مطابق اپنی زندگی گزارے اور دوسروں کو بھی اس پر ڈالے تو ایسا قاضی انشاء اللہ کامیاب ہوگا، وہ اصول کونسا ہے جس کے موافق قاضی بنایا جائے ؟ وہ یہ ہے کہ جو شخص قاضی بننے کی تمنا نہ کرے نہ اس کا طلب گار ہو نہ اس کے لیے کوشش کرے نہ سفارشیں کروائے نہ رشوتیں دے اور عہدہ قضا سے بچتا رہے اس کو قاضی بنادیا جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص عہدہ قضا کا طلبگار ہو اور اس سلسلے میں سفارش کرنے والوں سے سوال کرے (جس پر اسے عہدہ دے دیا جائے) تو وہ اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد نہ ہوگی وہ جانے اس کا نفس جانے جب ایسا ہوگا تو ظاہر ہے کہ نفس کے موافق فیصلے ہوں گے) اور جس کو قاضی بننے پر مجبور کیا جائے اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اسے ٹھیک راستے پر چلاتا رہتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عہدہ قضا کا طلبگار ہو اسے تو عہدہ سپرد کیا ہی نہ جائے جس کے دل میں خواہش ہے کہ میں فیصلے کرنے والا بنوں وہ حق پر قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس کی رغبت اور خواہش بتا رہی ہے کہ وہ اس سے دنیاوی منافع حاصل کرے گا اسے جاہ اور مال کی رغبت ہے اس لیے وہ اس عہدے کا طالب ہوا، اس کو عہدہ مل جائے گا تو فیصلے اپنی مرضی کے مطابق کرے گا اور جہالت کے ساتھ کرے گا، رشوتیں بھی لے گا اور اپنے پرائے کا خیال بھی کرے گا اور جس پر زبردستی کر کے عہدہ قضا ڈال دیا گیا وہ اس کی ذمہ داریوں سے جیسا پہلے ڈرتا تھا ایسے ہی اب اپنے نفس کو ذمہ داریاں پوری کرنے کا پابند بنائے گا، یہ ایک ایسا سنہری اصول ہے اسے اختیار کر لیا جائے تو فیصلوں میں جو ظلم ہوتے ہیں ان کی روک تھام ہو جائے گی، اب ہوتا یہ ہے کہ جن کو جج اور مجسٹریٹ بننا ہے وہ پڑھتے ہی اس لیے ہیں کہ ڈگری لے کر اس کام میں لگیں گے پھر درخواستیں دیتے ہیں، سفارشیں

لاتے ہیں رشوتیں دیتے ہیں پھر جن لوگوں کے ہاتھ میں تقرر ہوتا ہے وہ بھی رشوتوں اور سفارشوں اور ڈگریوں کی بنیاد پر جج اور مجسٹریٹ بنادیتے ہیں اور اوپر جسٹس تک یہی سلسلہ چلتا ہے یہ جس کا تقرر تقرر کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ تو دیکھا ہی نہیں جاتا کہ اسے قرآن و حدیث کا کچھ علم ہے یا نہیں اور اس میں تقویٰ کتنا ہے خدا ترسی کتنی ہے، اس سے انصاف کی امید کتنی ہے۔

حاکم تک کوئی شخص خود نہیں پہنچ سکتا وکیل کے بغیر حاکم کے ہاں کسی مظلوم کا کیس پیش نہیں ہو سکتا، اول وہ وکیل کی فیس فراہم کرے پھر اس کا استغاثہ دائر ہو پھر تاریخوں پر تاریخیں پڑتی رہتی ہیں جس سے اس کے وقت اور پیسے کا خون ہوتا رہتا ہے، یہ دشمنان اسلام کا طریق کار ہے مجسٹریٹ اس سے مانوس ہیں اور اسی پر چلتے ہیں اور اسی کی تنخواہ لیتے ہیں مظلوم کی دادرسی کا ذرا دھیان نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ: بے شک اللہ تعالیٰ جس چیز کی تمہیں نصیحت فرماتا ہے وہ بہت اچھی ہے، یہ ایک مستقل جملہ ہے جو اس سے پہلے کے مضمون کی تاکید کے طور پر آیا ہے، اس میں خطاب کیے گئے لوگوں پر مزید لطف اور ان کو اللہ کے حکم کی تعمیل پر خوش اسلوبی کے ساتھ آمادہ کرنے کا پہلو موجود ہے۔

لفظ **نِعِمَّا** دراصل **نِعْمَ مَا** تھا، پھر **نِعْمَ** اور **مَا** کو ملا دیا گیا، پہلی **میم** کی حرکت کو گرا دیا گیا اور دونوں میم کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا گیا، پھر ساکن **عین** کو زیر دے کر حرکت دی گئی تاکہ دو ساکن جمع نہ ہو سکیں، **مَا** یا تو نصب کی حالت میں ہے جو **يَعِظُكُمْ** کی صفت واقع ہوئی ہے، یعنی کیا ہی اچھا ہے وہ چیز جس کے ذریعے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، یا پھر یہ مرفوع اور موصول ہے، یعنی بہترین چیز وہ ہے جس کے ذریعے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور مخصوص بالمدح محذوف ہے، یعنی مراد ہے امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچانا اور لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا، **يَعِظُكُمْ** یہ وعظ سے ہے اس کا مطلب ہے، نیکی کی یاد دہانی اور برائی سے ڈرانا ایسے انداز میں کہ دل نرم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ یہاں اہل ایمان کو مخاطب ہیں کہ اے گروہِ مومنین! امانتیں ادا کرنے اور عدل و انصاف سے فیصلے کرنے کا حکم دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت عظیم چیز ہے جس کے ذریعے اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں اس کی طرف بلاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے جو حکم دیا

ہے اس میں تمہارے لیے بہتری ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور ہدایت تمہارے لیے سراپا بہتر ہے اس میں دنیا و آخرت کی خیر ہے اس کو خوشی سے قبول کرو اور عمل کرو اور جو شخص نصیحت نہ مانے گا خیر کو قبول نہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے اس کی جزا دے دے گا۔ (انوار البیان)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا بے شک اللہ ہمیشہ سننے والا دیکھنے والا ہے، نیکوکاروں کے لیے وعدہ ہے اور گناہ گاروں کے لیے وعید (ڈر سنانا)۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری باتوں کو سنتا ہے، خواہ وہ احکام سے متعلق ہوں یا کسی اور چیز سے اور وہ تمہارے تمام حالات اور اعمال کو دیکھ رہا ہے، پس وہ تمہیں تمہارے اچھے یا برے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

اللہ، رسول اللہ ﷺ اور حکمران کی اطاعت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا {۵۹} النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں پھر اگر آپس میں کسی بات میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیرو اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو یہی بات اچھی ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عرب کے ایک علاقے میں ایک فوجی مہم پر روانہ کیا ان کے ساتھ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ وہ اس قوم کے قریب پہنچ گئے، انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈال دیا تاکہ اگلی صبح ان پر حملہ کریں، ان لوگوں کو کسی ڈرانے والے نے خبر دی چنانچہ ایک آدمی کے سوا جو مسلمان

ہو چکا تھا باقی سب لوگ بھاگ گئے، اس شخص نے اپنے گھر والوں کو چلنے کی تیاری کرنے کا حکم دیا پھر وہ روانہ ہوا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے کیمپ تک پہنچ گیا اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا اے ابو الیقضان میں تم میں سے ہوں میری قوم نے جب تمہارے حملے کی خبر سنی تو وہ بھاگ گئے اور میں اسلام کی وجہ سے ٹھہرا رہا کیا یہ بات میرے لیے مفید ہے یا میں بھی اسی طرح بھاگوں جس طرح وہ بھاگ گئے اس پر عمار رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم ٹھہرے رہو یہ بات تمہارے لیے نفع بخش ہے۔

یہ شخص اپنے گھر والوں کی طرف چلا گیا اور اس نے گھر والوں کو رک جانے کے لیے کہا اگلی صبح خالد رضی اللہ عنہ نے اس قسم کے لوگوں پر حملہ کر دیا انہیں اس ایک آدمی کے سوا اور کوئی وہاں نہ ملا خالد رضی اللہ عنہ نے اسے پکڑ لیا اور اس کا مال بھی لے لیا، عمار رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اس آدمی کو چھوڑ دیجیے، یہ مسلمان ہے، میں نے اسے امان دے دی تھی اور رک جانے اور ٹھہر جانے کا کہا تھا، خالد رضی اللہ عنہ نے عمار رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم مجھ پر زیادتی کر رہے ہو جبکہ میں امیر ہوں عمار رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں میں تم پر زیادتی کر رہا ہوں، جب کہ تم امیر ہو چنانچہ اس معاملے میں ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعے کی خبر دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو امان دے دی اور عمار رضی اللہ عنہ کی دی ہوئی امان کو جائز قرار دیا اور اسے آئندہ امیر کی اجازت کے بغیر زیادتی کرنے سے منع کر دیا۔ راوی کا کہنا ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ اور خالد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلخ کلامی کی، عمار رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ پر سختی کی خالد رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم غلام کو مجھے گالیاں دینے کے لیے کھلا چھوڑ رہے ہیں؟ اللہ کی قسم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ ہوتے تو یہ مجھے گالی نہ دیتے، امر واقعہ یہ تھا کہ عمار رضی اللہ عنہ ہاشم بن المغیرہ کے غلام تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے خالد! رک جاؤ کیونکہ جو عمار رضی اللہ عنہ کو گالی دے گا، اللہ اسے گالی کا جواب دے گا اور جو عمار رضی اللہ عنہ پر غضبناک ہو گا اللہ اس پر غضبناک ہو گا، عمار رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے خالد رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے چل دیے اور ان کا کپڑا پکڑ کر انہیں راضی ہونے کو کہا عمار رضی اللہ عنہ ان سے راضی ہو گئے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا۔

② حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سریہ (چھوٹا لشکر) روانہ فرمایا اور ایک انصاری رضی اللہ عنہ کو اس پر امیر مقرر کیا اور لشکریوں سے فرمایا کہ اس کی اطاعت کرنا، پھر وہ (امیر) غضبناک ہوا اور کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہاں! اس نے کہا: میرے لیے لکڑیاں جمع کرو، انہوں نے لکڑیاں جمع کیں، اس نے کہا: آگ جلاؤ، انہوں نے آگ جلائی، پھر کہا: اس میں داخل ہو جاؤ، وہ اس میں داخل ہونے کو تیار ہوئے مگر بعض نے ایک دوسرے کو روکا اور کہا: ہم تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آگ سے بچنے کے لیے آئے ہیں، یہاں تک کہ وہ اسی حال میں رہے یہاں تک کہ آگ بجھ گئی اور اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا، جب یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: اگر وہ اس میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک اس سے نہ نکلتے، اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔

ابو عمر ابن عبد البر رحمہ اللہ نے فرمایا: "عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ میں حس مزاح تھی، ان کی اسی حس مزاح میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک سریہ کا امیر بنایا، تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کریں اور آگ جلائیں، جب آگ جل گئی تو انہیں حکم دیا کہ اس میں کود پڑیں، لیکن انہوں نے انکار کیا، انہوں نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی؟ انہوں نے جواب دیا: ہم نے تو اللہ پر ایمان اسی لیے لایا اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی اسی لیے کی کہ ہم آگ سے نجات پائیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس فعل کو درست قرار دیا اور فرمایا: 'خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو)۔ یہ حدیث صحیح الاسناد اور مشہور ہے۔

یہ بات ابن عبد البر رحمہ اللہ کی عبارت سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک اس سریہ کے امیر، جن کا ذکر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے، وہی عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ ہیں جن کا ذکر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، کیونکہ دونوں احادیث کا سیاق بالکل یکساں ہے، ابن القیم رحمہ اللہ نے

بھی ابن عبد البر کی متابعت کی ہے، چنانچہ سیدنا ابن عباس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کی احادیث نقل کرنے کے بعد فرمایا: یہی وہ عبد اللہ بن حذافہ سہمی ہیں۔ (المحرر فی اسباب نزول القرآن)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ: اے اہل ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، یہاں پر اطاعت کے تین درجات بیان کیے گئے ہیں۔ ① پہلا درجہ اطاعت الٰہی کا ہے اور یہ اطاعت علی الاطلاق تمام انسانوں پر فرض ہے، یہ اطاعت مطلقہ اور بالذات ہے، لہٰذا یہ ہر حالت میں ضروری ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، اس سے سرتابی کرنے والا نافرمان، مجرم اور جہنمی ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق، مالک، مربی اور محسن ہے، لہٰذا اس کی اطاعت بہر صورت لازم ہے۔

② دوسرے نمبر پر اطاعت رسول ہے اور یہ بھی مطلق اطاعت ہے تاہم یہ اطاعت بالذات نہیں بلکہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے، اس کے حکم کی تعمیل کرنے اور اس کی مرضیات اور نامرضیات تک پہنچنے کے لیے قطعی اور یقینی واسطہ رسول ہوتا ہے، لہٰذا رسول کی اطاعت بھی لازمی ہے، قرآن پاک میں موجود ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی، کیونکہ رسول دنیا میں اپنا حکم نافذ نہیں کرتا بلکہ اللہ ہی کے حکم کو نافذ کرتا ہے اس لحاظ سے پیغمبر کی اطاعت اس امر کی قطعی علامت ہے کہ کوئی شخص واقعی اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار ہے۔

③ تیسری اطاعت صاحب امر کی ہے اور اس سے مراد حاکم وقت علماء و فقہاء اور ہر ذمہ دار شخص ہے، مسلمان حاکم کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کی شرط پر لازم ہے جب تک حاکم وقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند رہے گا، اس وقت تک اس کی اطاعت بھی فرض ہے، اس کی ہر جائز بات ماننا ضروری ہے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن)

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت دو ایسی چیزیں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی گویا کہ اس نے اللہ کی اطاعت کی، طاعت سے مراد ان کے اوامر کا التزام کرنا اور ان کے نواہی سے اجتناب کرنا ہے۔ (التفسیر الوسیط)

اس آیت اطاعت میں دراصل اداء امانت کی صحیح تشریح مذکور ہے یعنی ہر شخص کے دل میں ایک جذبہ اطاعت پنہاں ہے، ہر انسان فطرتاً چاہتا ہے کہ وہ کسی زبردست کے سامنے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جھک جائے، اسے ایک ایسے فارقلیط یا تسلی دینے والے کی ضرورت ہے جو ہر اضطراب اور پریشانی کے وقت اس کے لیے سرمایہ تسکین مہیا کرے، یعنی جذبہ اطاعت وانقیاد کی تکمیل کیونکر ہو؟ یہ ایک سوال ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے، قرآن حکیم نے آیت مذکورہ میں اس سوال کا جواب دیا ہے فرمایا، خدا، رسول اور حاکم عادل جو مسلم ہو، اطاعت کے قابل ہیں، یعنی شرعیات واخلاق میں خدا اور رسول کی باتیں مانو اور وقتی اور ہنگامی مصالح میں اپنے میں سے صاحب حکم وامر کی اطاعت کرو اور اگر تم میں اور حاکم وقت میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو پھر بطور آخری حکم کے صرف اللہ کے رسول کو سمجھو، مقصد یہ ہے کہ بطور حجت وفیصلہ کے مسلمان صرف خدا اور اس کے پیغمبر ﷺ کا تابع ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ حاکم یا قوت حاکمہ سے دیانت داری کے ساتھ اختلاف رکھ سکے۔ (سراج البیان)

وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ** سے مراد امراء اور حکام ہیں، ابن وہب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد سلاطین ہیں، مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد اصحاب فقہ ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد اہل دین اور اہل فقہ ہیں یعنی دیندار علماء، عطاء بن سائب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد صاحبان علم اور اصحاب فقہ ہیں۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد علماء ہیں، مجاہد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ اس سے مراد صحابہ ہیں، امام ابن جریر نے فرمایا ان اقوال میں اَولیٰ یہ ہے کہ **أُولِي الْأَمْرِ** سے مراد ائمہ اور حکام ہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عنقریب میرے بعد حکام ہوں گے (ان میں) نیک حاکم بھی ہوں گے اور فاسق بھی، تم ان کے احکام سننا اور ان کا جو حکم حق کے موافق ہو اس میں ان کی اطاعت کرنا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اگر وہ نیک کام کریں گے تو اس میں تمہارا اور ان کا نفع ہے اور اگر وہ برے کام کریں گے تو تم کو نفع ہوگا اور ان کو ضرر۔ (جامع البیان، تبیان القرآن)

اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ ① خلفاء راشدین۔ ② عہد رسالت میں لشکروں کے حاکم ③ وہ علماء حق جو احکام شرعیہ کے مطابق فتوی دیتے ہیں۔ (کبیر للرازی)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (سنن ابی داؤد، بخاری، مسلم) مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے جی چاہے یا طبیعت روکے لیکن اس وقت تک کہ (اللہ تعالیٰ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب نافرمانی کا حکم ملے تو نہ سنے نہ مانے۔

اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ سے پہلے اَطِیْعُوا کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اس کا پہلے اَطِیْعُوا پر عطف کیا گیا تاکہ ان کی اطاعت بالتبع ہو اس میں یہ نکتہ ہے کہ اللہ کی مستقل اطاعت ہے اور رسول کی بھی مستقل اطاعت ہے اور علماء اور حکام کی مستقل اطاعت نہیں ہے جب ان کے احکام اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کے مطابق ہوں تو ان کی اطاعت ہے ورنہ نہیں ہے۔

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ، فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا، وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا، وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَأَلَّا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ (بخاری و مسلم) ہم نے رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر سننے اور ماننے کی بیعت کی، ہماری خوشی اور ناخوشی کی حالت میں، ہماری تنگی اور آسانی کی حالت میں، چاہے ہمارے اوپر کسی کو ترجیح دی جائے اور ہم نے آپ ﷺ کے دست مبارک پر اس چیز کی بیعت کی کہ ہم اہل سے اس کام کو نہ چھینیں، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَّاحاً، عِنْدَكُمْ فِيهِ مِنَ اللهِ بُرْهَانٌ (بخاری، مسلم) لیکن جب تم ان کا کھلا کفر دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی واضح دلیل بھی ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اِسْمَعُوْا وَأَطِيعُوا وَإِنْ أُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيبَةٌ (بخاری) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنایا گیا ہو چاہے اس کا سر کشمش کی طرح ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں أَوْصَانِي خَلِيلِي أَنْ أَسْمَعَ وَأُطِيعَ ، وَإِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا مُجَدَّعُ الْأَطْرَافِ (مسلم) مجھے میرے خلیل (یعنی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سننے کی وصیت کی اگرچہ ناقص ہاتھ پاؤں والا حبشی غلام ہی ہو۔

ام الحصین فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمارہے تھے وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ يَقُودُكُمْ بِكِتَابِ اللهِ، اسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا چاہے تم پر غلام عامل بنایا جائے جو تمہیں کتاب اللہ کے مطابق چلائے تو تم اس کی سنو اور مانو ایک روایت میں الفاظ یوں ہیں۔عَبْدًا حَبَشِيًّا مَجْدُوعًا اگرچہ تم پر کٹے ہوئے اعضاء والا حبشی غلام ہی امیر کیوں نہ بنایا جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،سَيَلِيكُمْ بَعْدِي وُلَاةٌ، فَيَلِيكُمُ الْبَرُّ بِبِرِّهِ، وَيَلِيكُمُ الْفَاجِرُ بِفُجُورِهِ، فَاسْمَعُوا لَهُمْ وَأَطِيعُوا فِي كُلِّ مَا وَافَقَ الْحَقَّ، وَصَلُّوا وَرَاءَهُمْ ، فَإِنْ أَحْسَنُوا فَلَكُمْ وَلَهُمْ وإِنْ أَسَاءُوا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ) تفسیر الطبری) میرے بعد تم پر حکمران ہوں گے، نیک اپنی نیکی کے ساتھ تم پر حکومت کرے گا، بُرا اپنے گناہوں کے ساتھ تم پر حکمرانی کرے گا، ان کی بات سنو اور اطاعت کرو ہر اس بات میں جو حق کے مطابق ہو، ان کے پیچھے نمازیں ادا کرو، اگر وہ بھلائی کریں تو ان کے لئے بھی بہتر ہے اور تمہارے لئے بھی بہتر ہے، اور اگر وہ برائی کریں تو تمہارے لئے نقصان نہیں ہے اور ان کے لئے نقصان ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ قَالُوا : يَارَسُولَ اللهِ، فَمَا تَأْمُرُنَا ؟ قَالَ : أَوْفُوا بِبَيْعَةِ الْأَوَّلِ فَالْأَوَّلِ، وَأَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ ، فَإِنَّ اللهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ (بخاری، مسلم) بنو اسرائیل میں مسلسل لگاتار رسول آیا کرتے تھے ایک کے بعد ایک اور میرے بعد کوئی نبی نہیں مگر خلفاء بکثرت ہوں گے لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ! پھر ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا پہلے کی بیعت پوری کرو پھر اس کے بعد آنے والے کی ان کا حق انہیں دے دو اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں سوال کرنے والا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَكَرِهَهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ يُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَيَمُوتُ إِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً (بخاری، مسلم) جو شخص اپنے امیر کا کوئی ناپسندیدہ کام دیکھے اسے صبر کرنا چاہیے جو شخص جماعت سے بالشت بھر جدا ہو گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ ، لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً (مسلم) جو شخص اطاعت سے ہاتھ کھینچ لے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے حجت و دلیل بغیر ملاقات کرے گا اور جو اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اُولی الامر سے مراد فقہ اور دین والے لوگ ہیں، مجاہد رحمہ اللہ، عطا رحمہ اللہ، حسن بصری رحمہ اللہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اُولی الامر سے مراد علماء کرام ہیں۔

علامہ زمخشری نے فرمایا: اور أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ سے مراد حق کے حکمران ہیں، کیونکہ ظالم و جابر حکمرانوں سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ بری ہیں، اس لیے ان کی اطاعت کو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ شامل نہیں کیا گیا، بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ صرف ایسے امراء کو شامل کیا گیا ہے جو عدل کو ترجیح دیتے ہیں، حق کا انتخاب کرتے ہیں اور انہی کا حکم دیتے ہیں اور ان کے برعکس چیزوں سے روکتے ہیں، جیسے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور وہ لوگ جو ان کے طریقۂ خیر پر چلے اور خلفائے راشدین کہا کرتے تھے، أَطِيعُونِي مَا عَدَلْتُ فِيكُمْ، فَإِنْ خَالَفْتُ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيْكُمْ جب تک میں تمہارے درمیان عدل کرتا رہوں میری اطاعت کرو اور اگر میں عدل سے ہٹ جاؤں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں۔ (تفسیر کشاف)

ابو حازم سے روایت ہے کہ مسلمہ بن عبد الملک نے ان سے کہا: کیا تمہیں اس آیت وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ کے ذریعے ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا؟ تو ابو حازم نے جواب دیا: أَلَيْسَ قَدْ نُزِعَتْ عَنْكُمْ إِذَا خَالَفْتُمُ الْحَقَّ کیا جب تم حق کے خلاف کرتے ہو تو (اطاعت کا حکم) تم سے ہٹا نہیں لیا گیا؟ (التفسیر الوسیط)

اور مِنۡكُمۡ کا تعلق أُولِي الأَمر کی حالت سے ہے، یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی اس حال میں کہ وہ تم میں سے ہوں یعنی تمہارے دین اور ملت کے ماننے والے ہوں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات میں جو لوگ ان کی ملت پر نہیں ہیں، ان کی کوئی اطاعت نہیں ہے۔ (الوسیط)

علماء کی اطاعت: مولانا عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں حاکم چونکہ ظاہری طور پر شریعت کا قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ان کے پاس اقتدار کی امانت ہوتی ہے، اختیار ہوتا ہے، لہٰذا کسی حاکم کا جھوٹ بولنا یا غداری کرنا بہت بڑا جرم تصور ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ تفویض شدہ امانت کے مطابق شرعی احکام نافذ کرے، باقی رہی علماء اور فقہا کی اطاعت، تو وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ حضرات جائز اور ناجائز امور کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کے پاس علم کی امانت ہوتی ہے جسے وہ عوام تک پہنچاتے ہیں، اس ضمن میں علمائے سوء نے تو ہمیشہ غلط راستہ اختیار کیا مگر علمائے حق نے ادائے امانت کے فریضہ کو انجام دینے میں کبھی رورعات نہیں کی۔

اس سلسلہ میں انہوں نے مار کھائی، تکالیف برداشت کیں مگر حق کا دامن نہیں چھوڑا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ چاروں پر اپنے اپنے وقت میں آزمائش آئی، انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، جلاوطن ہوئے مگر صداقت سے روگردانی نہیں کی، بلکہ ہمیشہ سچی بات کی، لہٰذا علماء فقہا کی اطاعت اس وجہ سے ہے کہ وہ جائز اور ناجائز میں تفریق کرتے ہیں، اس ضمن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت اس لیے ہے کہ وہ مالک ہے، رسول کی اطاعت اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا ہے اور علماء کی اطاعت اس لیے کہ وہ تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دینے والے ہیں۔

بہر حال یہ تیسری اطاعت جس میں حکام، فقہا اور علماء آتے ہیں مشروط ہے، اگر وہ اچھی بات کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کی جائے گی اور اگر کوئی غلط بات بتائیں تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا، چنانچہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی فقیہہ ایسا فتویٰ دے یا ایسا مسئلہ بتائے جو کتاب

وسنت کے خلاف ہو تو اس کی بات ماننا گناہ کا ارتکاب ہو گا اور اگر مسئلہ کتاب وسنت کے مطابق ہے تو پھر اس کا ماننا ضروری ہو گا۔ (معالم العرفان)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اعتبار مؤمنین کے اجماع (اتفاقِ رائے) کا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے آغاز میں فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اے ایمان والو! پھر فرمایا: وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ اور تم میں سے اولی الامر، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصل اعتبار اہلِ ایمان کے اجماع کا ہے، لہٰذا دیگر فرقے جن کے ایمان میں شبہ ہو، ان کے قول و اجماع کا کوئی اعتبار نہیں۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ: پھر اگر کسی چیز میں تم آپس میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ مومنوں پر لازم ہے کہ جب ان کے درمیان کسی دینی معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے۔ یہاں "تنازع" سے مراد اختلاف اور بحث ہے، جو "نزع" (کھینچنے) سے ماخوذ ہے، گویا ہر ایک اپنی دلیل کو دوسرے سے کھینچنے اور جیتنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: مَالِي أُنَازَعُ الْقُرآنُ مجھے قرآن میں کیوں جھگڑایا جا رہا ہے؟ یعنی دوسرے میری قراءت میں جھگڑنے اور کھینچنے لگے، اس کا سبب یہ ہوا کہ کچھ مقتدی آپ ﷺ کے پیچھے اونچی آواز سے قرأت کرنے لگے جس سے آپ ﷺ کی تلاوت میں خلل آیا، تو آپ ﷺ نے انہیں نماز میں پیچھے قرأت بلند کرنے سے منع فرما دیا۔

آیت کے اس حصے کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! اگر تم اور تمہارے حکمرانوں کے درمیان دین کے کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، یعنی اس حکم یا مسئلے کو اللہ کی کتاب کی طرف اور رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ، آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں براہِ راست آپ ﷺ سے دریافت کرو اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی سنت کی طرف رجوع کرو۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم اپنے دین کے کسی معاملے میں جھگڑو یا اختلاف کرو تو اس حکم کو اللہ کی کتاب یا رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ، آپ ﷺ کی زندگی میں براہِ راست دریافت کرو اور بعد از وفات آپ کی سنت سے رہنمائی لو، اور جس نے ایسا نہ کیا اس کا ایمان ناقص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت کے اس حصے فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ سے یہ دلیل ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی واجب العمل ہے اور اس پر عمل ضروری ہے، چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا: مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ، فَاجْتَنِبُوهُ وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ، وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ جس چیز سے میں نے تمہیں روکا ہے اس سے بچو، اور جس بات کا تمہیں حکم دیا ہے اسے اپنی طاقت کے مطابق بجالاؤ۔ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ اپنے انبیاء سے بہت زیادہ سوال کرتے اور ان کے ساتھ اختلاف کرتے تھے (صحیح مسلم)۔

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ يَأْتِيهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ لَا نَدْرِي مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ اتَّبَعْنَاهُ (ابوداؤد) میں ہرگز تم میں سے کسی کو نہ دیکھوں کہ وہ اپنی آرام دہ مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور میرے پاس میرے کسی حکم یا ممانعت کی خبر پہنچے، تو وہ یہ کہنے لگے کہ ہمیں تو صرف وہی ماننا ہے جو اللہ کی کتاب میں ملے۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے وعظ کے موقع پر حاضر تھے، آپ ﷺ فرمارہے تھے، أَيَحْسَبُ أَحَدُكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ قَدْ يَظُنُّ أَنَّ اللَّهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا إِلَّا مَا فِي هٰذَا الْقُرْآنِ أَلَا وَإِنِّي وَاللَّهِ قَدْ أَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ إِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْآنِ أَوْ أَكْثَرُ (ترمذی، قرطبی، الوسیط) کیا تم میں سے کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اپنی مسند پر ٹیک لگائے یہ سمجھے کہ اللہ نے صرف وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں؟

خبر دار! اللہ کی قسم! میں نے بھی احکامات دیے ہیں، نصیحتیں کی ہیں اور بعض چیزوں سے منع کیا ہے، یہ سب کچھ قرآن ہی کی طرح ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے اس سے بھی زیادہ مؤکد ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے آیت کے اس حصہ کے ذیل میں باریک نقاط پیش فرمائے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: پھر اگر کسی بات میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قیاس پر عمل کرنا صحیح ہے، تو ہم یوں کہتے ہیں کہ جس طرح یہ آیت اس اصل (یعنی قیاس) پر دلیل ہے، اسی طرح یہ بہت سے فروعی مسائل پر بھی دلالت کرتی ہے جو قیاس کے قاعدے پر مبنی ہیں اور ہم ان میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلی فرع: اس فرمانِ باری تعالیٰ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ پھر اسے اللہ کی طرف لوٹاؤ، کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس واقعے کی طرف پھیرو جس کا حکم اللہ نے واضح کر دیا ہے اور اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ مراد یہ ہو کہ اسے اس واقعے کی طرف لوٹایا جائے جو اس سے مشابہ ہو، کیونکہ اگر اس سے مراد یہ ہوتا کہ اس کو اس واقعے کی طرف لوٹایا جائے جو صورت اور صفت میں اس کے مخالف ہو، تو پھر کسی ایک صورت کی طرف لوٹانا دوسرے پر ترجیح نہ رکھتا اور یوں حکم لوٹانا ہی ناممکن ہو جاتا، اس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ایسے واقعے کی طرف لوٹایا جائے جو اس سے صورت اور صفت میں مشابہ ہو، پھر یہ معنی حدیث اور اثر دونوں سے بھی مؤکد (پختہ) ہے۔ حدیث سے دلیل:

فَإِنَّهُمْ لَمَّا سَأَلُوهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قُبْلَةِ الصَّائِمِ فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: أَرَأَيْتَ لَوْ تَمَضْمَضْتَ، جب صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے روزہ دار کے بوسہ لینے کے بارے میں سوال کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے اگر تم کلی کرو؟ یعنی کلی کھانے کی تمہید ہے، جیسے کہ بوسہ جماع کی تمہید ہے، پس جس طرح کلی کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اسی طرح بوسہ لینے سے بھی نہیں ٹوٹتا۔

اور جب خثعم کی عورت نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اگر اس کے والد پر حج باقی ہو اور وہ ادا نہ کر سکے تو کیا وہ اس کی طرف سے کر سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أَبِيكِ دَيْنٌ

فَقَضَيْتِهِ هَلْ يُجْزِى فَقَالَتْ نَعَمْ :قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: فَدَيْنُ اللهِ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ، تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہارے والد پر قرض ہو اور تم ادا کر دو، تو کیا وہ ادا ہو جائے گا؟ اس عورت نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا قرض تو زیادہ حق رکھتا ہے کہ ادا کیا جائے۔

اثر سے دلیل: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اعْرِفِ الْأَشْبَاهَ وَالنَّظَائِرَ وَقِسِ الْأُمُورَ بِرَأْيِكَ، مشابہات اور نظائر کو پہچانو اور مسائل کو اپنی رائے سے ان پر قیاس کرو، یہ سب کچھ، یعنی آیت کی دلالت، حدیث کی دلالت اور اثر کی دلالت اس بات پر ہے کہ اللہ کا یہ فرمان: فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ ، پھر اسے لوٹاؤ، دراصل اس چیز کو اس کے مشابہ پر لوٹانے کا حکم ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے صورت اور صفت میں مشابہت کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ جس مسئلے کا حکم نص میں نہیں آیا، اس کا حکم اس مسئلے کے حکم کی طرح ہے جس کا حکم نص میں موجود ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ "قیاسِ اشباہ" کہتے ہیں، اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ اسے "قیاسِ طرد" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

پس یہ آیت اس کی صحت پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ جب یہ دلیل سے ثابت ہو گیا کہ اللہ کے فرمان: فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ، پھر اسے لوٹاؤ، سے مراد ہے کہ اسے اس کے مشابہ کی طرف لوٹایا جائے، تو جان لیا گیا کہ بابِ قیاس میں اصل اعتماد محض مشابہت پر ہے، یہ ایک لمبی بحث ہے اور ہمارا مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ کس طرح آیات سے مسائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔ (تفسیر الکبیر للرازی)

دوسری فرع: یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قیاس سے استدلال کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کتاب و سنت کا کوئی نص موجود نہ ہو، کیونکہ اللہ کا فرمان فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ اس شرط کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

تیسری فرع: یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب کسی پیش آمدہ معاملے میں کتاب، سنت یا اجماع سے کوئی نص نہ ملے تو وہاں قیاس کا استعمال جائز ہے، چاہے وہ کسی بھی قسم کا مسئلہ ہو، اس طرح ان لوگوں کا قول باطل ہو گیا جنہوں نے کہا کہ کفارات یا حدود وغیرہ میں قیاس کا استعمال جائز

نہیں، کیونکہ اللہ کا فرمان فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ عام ہے ہر اس مسئلے کے بارے میں جس میں نص موجود نہ ہو۔

چوتھی فرع: یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص کسی صورت میں قیاس کے ذریعہ حکم ثابت کرے تو ضروری ہے کہ اس کو ایسی صورت پر قیاس کرے جس کا حکم نص کے ذریعے ثابت ہوا ہو اور یہ جائز نہیں کہ اسے ایسی صورت پر قیاس کرے جس کا حکم خود قیاس سے ثابت ہوا ہو، کیونکہ اللہ کا فرمان فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر معاملے کو اس حکم کی طرف لوٹانا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول کے نص سے ثابت ہوا ہو۔

پانچویں فرع: یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں ایک قیاس قرآن کے اصل پر ہو اور دوسرا قیاس سنت کے اصل پر ہو، تو قرآن پر مبنی قیاس کو خبر (یعنی سنت) پر مبنی قیاس پر ترجیح دی جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں کتاب کو سنت پر مقدم ذکر کیا ہے، جیسے فرمایا: أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ اور فرمایا: فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ، اسی طرح معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی یہی ترتیب ملتی ہے۔

چھٹی فرع: یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر دو قیاس آپس میں معارض ہوں، جن میں سے ایک قرآن کے کسی اشارے سے تقویت پاتا ہو اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی کسی خبر کے اشارے سے تقویت پاتا ہو، تو پہلا قیاس دوسرے پر مقدم ہو گا، یعنی جیسا کہ پانچویں شاخ میں ذکر کیا گیا ہے۔ (تفسیر الکبیر للرازی)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فَهٰذِهِ الْمَسَائِلُ الْأُصُولِيَّةُ اسْتَنْبَطْنَاهَا مِنْ هٰذِهِ الْآيَةِ فِي أَقَلَّ مِنْ سَاعَتَيْنِ، وَلَعَلَّ الْإِنْسَانَ إِذَا اسْتَعْمَلَ الْفِكْرَ عَلَى الِاسْتِقْصَاءِ أَمْكَنَهُ اسْتِنْبَاطُ أَكْثَرِ مَسَائِلِ أُصُولِ الْفِقْهِ مِنْ هَذِهِ الْآيَةِ، " یہ تمام اصولی مسائل ہم نے اس آیت سے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں اخذ کیے ہیں اور ممکن ہے کہ اگر کوئی شخص غور و فکر کے ساتھ مزید استقصاء (پوری چھان بین، کسی بات یا چیز کو ہر پہلو سے دیکھنا، کمال درجہ کی تحقیق)

کرے تو وہ اصولِ فقہ کے اکثر مسائل اسی ایک آیت سے مستنبط کرلے۔ (الکبیر للرازی)

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو جھگڑوں کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کی طرف لوٹاؤ اور جو کچھ تمہارے درمیان اختلاف ہو اس میں انہی کے مطابق فیصلہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص جھگڑے، تنازعے، اختلاف، انتشار اور فتنے کے موقع پر کتاب و سنت کی طرف رجوع نہ کرے اور ان سے فیصلہ نہ چاہے تو وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ ہی یومِ آخرت پر۔

حضرات علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ احکام شرعیہ کے دلائل چار ہیں، ① کتاب اللہ (قرآن کریم) ② سنت رسول اللہ ﷺ ③ اجماع امت۔ ④ قیاس۔ کیونکہ احکام شرعی یا تو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ میں منصوص ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ، اور یا وہ ایسے امور ہیں جن پر اُولوالامر کا اجماع ہو، جو کسی معلوم دلیل پر مبنی ہوتا ہے، اس کی طرف أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ سے اشارہ ہے۔

اور اگر کوئی مسئلہ منصوص نہ ہو اور نہ اس پر اجماع ہو تو اس کا راستہ اجتہاد ہے اور اللہ و رسول ﷺ کی طرف رجوع ہے اور یہی قیاس ہے، اسی کو قیاس کہتے ہیں، جو دلائل فقہاء اور اصولیوں نے ان چار کے علاوہ ذکر کیے ہیں، جیسے احناف کا استحسان، یا مالکیہ کا مصالح مرسلہ کے مطابق احکام ثابت کرنا، یا شافعیہ کا استصحاب، تو یہ سب اگر ان چار دلائل کے علاوہ مانے جائیں تو اس آیت کے ظاہر کے مطابق مردود ہیں، البتہ اگر وہ انہی چاروں میں واپس آجائیں تو پھر ثابت ہوا کہ اصل دلائل صرف چار ہی ہیں۔

استحسان: لغوی طور پر کسی چیز کو اچھا جاننا۔ اصطلاح میں: کسی جزوی دلیل کی وجہ سے قیاسِ جلی کو چھوڑ کر اس کے مقابلہ میں ایک قوی اور قریبی دلیل کو اختیار کرنا۔ احناف استحسان کو دلیل شرعی مانتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ وہ صورت ہے جہاں عام قیاس سختی یا حرج پیدا کرے تو کسی دوسری قوی دلیل (نص، اجماع، ضرورت، عرف، ضرورتِ خاصہ) کی بنا پر اس قیاس کو چھوڑ دیا جائے۔ مثال: پانی نہ ملنے پر وضو کے بجائے تیمم جائز کرنا۔ مالکیہ کے نزدیک: مالکیہ بھی "استحسان" کو

دلیل مانتے ہیں، لیکن وہ زیادہ تر "مصالح مرسلہ" پر زور دیتے ہیں۔ شوافع کے نزدیک: امام شافعی رحمہ اللہ نے استحسان کو بطور دلیل تسلیم نہیں کیا بلکہ فرمایا: "مَنِ استَحسَنَ فَقَد شَرَعَ، (جو استحسان کرے وہ شریعت بناتا ہے)۔ ان کے نزدیک نصوص اور قیاس کے بغیر کسی چیز کو محض اچھا جان کر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

مصالح مرسلہ: کا معنی ہے آزاد مصالح، اصطلاح میں ایسی مصلحت جو کسی نصِ خاص یا شرعی اصل کے ساتھ مقید نہ ہو، لیکن وہ شریعت کے مقاصد (جان، مال، عقل، دین، نسل کی حفاظت) کے موافق ہو، مالکیہ کے نزدیک: امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بطور دلیل اختیار کیا، وہ کہتے ہیں کہ جہاں نص نہ ہو اور مصلحت ظاہر ہو جو مقاصد شریعت کے مطابق ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

مثال: قرآن و حدیث میں کاغذی کرنسی کا ذکر نہیں، لیکن لوگوں کی مصلحت کی بنا پر اسے رائج کیا گیا، احناف مصالح مرسلہ کو بذاتِ خود مستقل دلیل نہیں مانتے، بلکہ وہ اسے قیاس یا استحسان کے دائرے میں داخل کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہر مصلحت کو شریعت کے کسی اصول سے جوڑنا ضروری ہے، شوافع نے بھی مصالح مرسلہ کو مستقل دلیل کے طور پر تسلیم نہیں کیا، وہ کہتے ہیں، ہر مصلحت کو نص یا قیاس کے ساتھ مربوط ہونا چاہیے۔

استصحاب: کا لغوی معنیٰ ہے ساتھ لے جانا، اصطلاح میں کسی سابق حکم یا حالت کو دلیل کی بنا پر اس وقت تک قائم رکھنا جب تک اس کے خلاف کوئی نئی دلیل نہ ملے، احناف استصحاب کو دلیل مانتے ہیں، خصوصاً جب کسی مسئلہ میں کوئی نص یا قیاس نہ ہو۔

مثال: اگر کسی چیز کی طہارت پہلے سے ثابت ہو تو وہ پاک ہی رہے گی جب تک اس کے ناپاک ہونے کی دلیل نہ ملے، مالکیہ بھی استصحاب کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کو زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ ان کے ہاں مصالح مرسلہ پر زیادہ زور ہے۔ شوافع کے اصول میں استصحاب ایک معتبر دلیل ہے، خاص طور پر "اصل برأت" (یعنی اصل برائتِ ذمہ) کے اصول میں۔

مثال: کسی شخص پر جب تک جرم ثابت نہ ہو وہ بے گناہ ہی سمجھا جائے گا۔ احناف: استحسان اور

استصحاب کو مضبوط دلائل مانتے ہیں، مصالح مرسلہ کو براہِ راست نہیں بلکہ قیاس، استحسان کے تحت لاتے ہیں۔ مالکیہ: مصالح مرسلہ اور استحسان پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ شوافع: استحسان اور مصالح مرسلہ کو رد کرتے ہیں، صرف نصوص، قیاس اور استصحاب کو مانتے ہیں۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا: اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، اُولی الامر کی اطاعت، جھگڑوں میں اور اختلافات میں کتاب اللہ و سنت رسول کی طرف فیصلہ لانا اور ان کی طرف رجوع کرنا ہی بہتر ہے اور یہی نیک انجام خوش آئند ہے اور یہی اچھے بدلے دلانے والا کام ہے، بہت اچھی جزا اسی کا ثمر ہے، یہ کام دنیا میں بھی تمہارے لیے بہتر ہے اور آخرت میں بھی تمہارے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔

شرعی فیصلے سے انحراف پر منافقین کی مذمت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا {٦٠} وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا {٦١} فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۚ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا {٦٢} اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۡ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا {٦٣} النساء

جواب ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے جو جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی ایمان لائے جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ شیطان کی طرف اپنا قضیہ لے جائیں، حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کے منکر ہوں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہ کر کے دور کی گمراہی میں ڈال دے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ آجاؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے نازل فرمایا اور آجاؤ رسول کی طرف تو آپ منافقین کو دیکھیں گے کہ وہ آپ سے ہٹتے ہیں۔ پس کیا حال ہو گا جب ان کو کوئی مصیبت پہنچے ان کے ہاتھوں کے کیے ہوئے

کرتوتوں کی وجہ سے پھر وہ آئیں آپ کے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی کی صورت نکل آئے اور آپس میں موافقت ہو جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اسے جانتا ہے، سو آپ ان سے اعراض کیجیے اور ان کو نصیحت کیجیے اور ان کی ذاتوں کے متعلق ان سے ایسی باتیں کہہ دیجیے جو ان کے حق میں خوب زیادہ فائدہ مند ہو۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت ایک منافق کے بارے میں نازل ہوئی، اس منافق (بشر) اور ایک یہودی کے درمیان تنازعہ ہوا، یہودی نے کہا کہ چلو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلتے ہیں، منافق نے کہا کہ نہیں بلکہ کعب بن اشرف کے پاس جاتے ہیں، اس کو اللہ نے اس آیت میں طاغوت کہا ہے، یہودی نے کعب بن اشرف کے پاس جانے سے انکار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے جانے پر اصرار کیا، جب منافق نے یہ اصرار دیکھا تو اس یہودی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگیا اور انہوں نے مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا جب یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلے تو منافق نے اس سے کہا کہ چلو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس چلتے ہیں، چنانچہ یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، یہودی نے کہا کہ میں نے اور اس شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں فیصلہ کیا، لیکن یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ ہوا اور سوچا کہ مقدمہ آپ کے پاس لایا جائے، یہ میرے ساتھ چمٹ گیا، تو میں اس کے ساتھ آگیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منافق سے پوچھا کہ کیا یہی معاملہ ہے؟ اس نے کہا ہاں!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو ٹھہرنے کو کہا تاکہ وہ اندر سے ہو کر باہر آئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر کے اندر داخل ہوئے اور تلوار تھام لی اور تلوار لے کر ان کی طرف نکلے اور تلوار سے منافق کو مار ڈالا حتی کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا اور کہا کہ میں اس شخص کے متعلق یہ فیصلہ کرتا ہوں جو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتا، یہودی بھاگ گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور جبریل نے کہا کہ بیشک عمر رضی اللہ عنہ نے حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کر دیا اسی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ الفاروق کہلائے۔

اسباب النزول میں علامہ واحدی رحمہ اللہ نے ان آیات کے بہت سے شان نزول بیان فرمائے ہیں، ان میں سے ایک شان نزول یہ ہے کہ ابوبردہ الاسلمی کاہن تھے، جو یہود کے باہم جھگڑوں کے فیصلے کیا کرتے تھے کچھ مسلمان بھی ان کے پاس اپنا مقدمہ لے گئے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

ایک شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے، یہ آیت ایک انصاری آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جس کا نام قیس تھا اور ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی، ان دو شخصوں کے درمیان تنازعہ ہو گیا، یہ اپنا مقدمہ مدینے کے ایک کاہن کے پاس لے گئے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اور انہوں نے نبی کو چھوڑ دیا چنانچہ اس آیت میں اللہ نے ان دو شخصوں پر عتاب کیا، یہودی اس انصاری شخص کو نبی کریم ﷺ کے پاس چلنے کو کہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ نبی کریم ﷺ اس پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے، جبکہ انصاری یہودی کو کاہن کے پاس چلنے کو کہہ رہا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی، اس شخص کو عیب لگایا جو مسلمان ہونے کا دعوی کرتا تھا یہودی کو بھی مورد الزام ٹھہرایا کیونکہ وہ اہل کتاب تھا۔ (اسباب النزول)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے جو اللہ نے آپ کی طرف نازل فرمایا اور اس پر بھی ایمان لائے جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، شان نزول میں اس واقعہ کی وضاحت ہو چکی ہے، یہاں اَلَمْ تَرَ استفہام ان منافقوں کے حال پر تعجب ظاہر کرنے اور ان کے قبیح کردار کی مذمت کرنے کے لیے ہے، کیونکہ وہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے روگردانی کر کے دوسروں کے فیصلوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لفظ يَزْعُمُوْنَ اصل میں زَعم سے ہے، جو عموماً ایسے قول کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس میں یقین اور حقیقت نہ ہو، بلکہ اکثر جھوٹ اور بے بنیاد بات کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا: هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ یعنی اپنے جھوٹ کے ساتھ کہا، البتہ کبھی زعم سچی بات پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے سیبویہ نے "الکتاب" میں

بار بار کہا ہے: زَعَمَ الْخَلِيلُ كَذَا ان باتوں میں جنہیں وہ درست سمجھتے ہیں، لیکن یہاں "زعم" سے مراد جھوٹ ہے، کیونکہ آیت منافقین کے بارے میں ہے جو ظاہر میں ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر دل میں اس کے خلاف چھپاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ: اے محمد ﷺ! کیا آپ کو ان منافقوں کے حال کی خبر نہیں پہنچی جو جھوٹ اور افترا کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس قرآنِ عظیم اور عادلانہ شریعت پر ایمان لائے جو آپ پر نازل ہوئی ہے، اور یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان تمام آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ سے پہلے رسولوں پر اتاری گئیں؟ اگر آپ کو ابھی ان کا حال معلوم نہ ہوا یا آپ نے ان پر نظر نہ ڈالی، تو لیجیے ہم آپ کو ان کی خبر دیتے ہیں تاکہ آپ بھی ان سے ہوشیار رہیں اور اپنی امت کو بھی ان کے شر سے خبردار کریں۔

اس استفہام کا مقصد ان منافقوں کے حال پر تعجب دلانا ہے اور رسول ﷺ اور ان کی امت کو ان کے مکارانہ راستوں کو پہچاننے کی ترغیب دینا ہے، تاکہ ان کے فریب سے بچ سکیں اور ان منافقین کی یہ جھوٹی نسبت کہ وہ رسول ﷺ پر نازل ہونے والی وحی اور آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر اتاری جانے والی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے حال پر مزید تعجب کو بڑھانے اور ان کے طرزِ عمل پر شدید ملامت کرنے کے لیے ہے، کیونکہ ان کے اس دعوے اور ان کے عمل میں کھلی مخالفت اور مکمل تضاد پایا جاتا ہے، ایمان کا لازمی تقاضا تو رسول ﷺ کی طرف رجوع اور ان سے فیصلہ کروانا تھا، مگر انہوں نے اس کے برعکس دوسروں کی طرف دوڑ لگادی۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ: منافق چاہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس لے جاکر فیصلہ کرائیں، یہاں ان کی عجیب حالت اور برے اوصاف کے قابلِ تعجب پہلو کو بیان کیا گیا ہے، یہاں "طاغوت" سے مراد شریعت اسلام کے علاوہ وہ تمام باطل فیصلے اور قوانین ہیں جو حق سے دور ہیں، جنہیں یہ منافق اپنے بڑوں اور پیشواؤں سے لیتے ہیں اور بعض مفسرین کے نزدیک "طاغوت" سے

مراد کعب بن اشرف (یہودی) ہے، کیونکہ منافقین اسی کے پاس فیصلہ کروانا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے طاغوت اس کی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی اور رسول ﷺ کی سخت دشمنی کی وجہ سے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ یہ منافق بظاہر تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس وحی پر ایمان لائے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی اور جو آپ ﷺ سے پہلے اتری، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ محبت اور دل کے رجحان کے ساتھ طاغوت کے پاس فیصلہ کرانا چاہتے ہیں، یعنی ایسے لوگوں کے پاس جنہیں وہ بڑا مانتے ہیں، ان کی بات مانتے ہیں اور ان کے فیصلے پر راضی ہو جاتے ہیں، اللہ کے فیصلے کو چھوڑ کر۔

وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ: حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں، یہاں اس حال کی وضاحت ہے کہ ان کا طاغوت کے پاس فیصلہ کرانا اس وقت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صاف حکم دیا تھا کہ وہ طاغوت کو نہ مانیں بلکہ صرف ان فیصلوں کو تسلیم کریں جو نبی اکرم ﷺ فرمائیں۔

وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا: اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بہت دور کی گمراہی میں ڈال دے، یہ بھی پہلے جملے پر عطف ہے اور اسی تعجب کے مضمون میں شامل ہے، کیونکہ جس کا مقصد صرف ان کو گمراہ کرنا ہے، اس کی پیروی کرنا اور اس ذات سے منہ موڑ لینا جو ان کی ہدایت چاہتا ہے، انتہائی تعجب کی بات ہے۔ **ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا** (دور کی گمراہی) سے مراد ہے کفر اور حق و ہدایت سے مکمل دوری اور "بعید" کا اضافہ شدت اور سختی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، گویا ان کی گمراہی اس شخص کی طرح ہے جو بہت ہی لمبے فاصلے پر بھٹک گیا ہو۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ آیت ان لوگوں پر سخت انکار اور ملامت ہے جو یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم اس وحی پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ پر اور پچھلے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے جھگڑوں اور فیصلوں میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے بجائے دوسروں کے فیصلے کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق سے منہ موڑنے اور شریعتِ الٰہی سے بیزاری اختیار کرنے کا حال بیان فرمایا اور فرمایا، اور جب ان ایمان

کے جھوٹے دعوے داروں، قرآن اور پہلی کتابوں پر ایمان رکھنے کے جھوٹے مدعیوں سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس (حکم) کی طرف جو اللہ نے قرآن کریم میں نازل فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر اپنے معاملے کا فیصلہ کرواؤ۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ان کے لیے حق کو قبول کرنے کی ترغیب ہے اور اللہ کی شریعت پر عمل کرنے کی تاکید ہے، کیونکہ اسی شریعت کو تسلیم کرنے میں ان کی حقیقی سعادت ہے، لیکن یہ لوگ اپنے دلوں کی بیماری کی وجہ سے اللہ کی نازل کردہ شریعت کے فیصلے سے بھاگتے ہیں اور باطل طاغوتی فیصلوں کی طرف لپکتے ہیں۔

رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا: تو (اے محمد ﷺ) آپ دیکھتے ہیں کہ یہ منافقین آپ ﷺ سے کمال درجے کا منہ موڑتے ہیں، جب ان منافقوں سے کہا جائے کہ اللہ کے حکم اور اس کے رسول کے فیصلے کو قبول کرو، کیونکہ اصل بھلائی اور کامیابی اسی میں ہے جو اللہ نے نازل کیا اور جس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے کیا، تو آپ ﷺ دیکھتے ہیں کہ یہ منافق، باوجود اس کے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اپنے دلوں کی خباثت اور باطن کی پستی کی وجہ سے آپ سے سخت اعراض کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا: **رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ** یہ نہیں فرمایا: **رَاَیْتَهُمْ** یعنی آپ نے انہیں دیکھا، تاکہ ان کے نفاق کو ثابت کرے، ان کی مذمت کرے اور یہ ظاہر کرے کہ اس فیصلے سے روگردانی کی اصل وجہ نفاق ہی ہے، گویا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے نفاق کی وجہ سے آپ ﷺ سے منہ موڑتے ہیں۔ **صُدُوْدًا**، یہ مصدر مؤکد ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ آپ سے پورا پورا اعراض کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ چاہتے ہی نہیں کہ آپ ﷺ کی بات سنیں، کیونکہ آپ ﷺ کا فیصلہ ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتا۔ یہاں مصدر **صُدُوْدًا** لانے کا مقصد تاکید اور مبالغہ ہے، یعنی گویا یوں کہا گیا: **صُدُوْدًا** اس کا معنیٰ ہے خوب سخت منہ موڑنا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ نے منافقین کی ایک کھلی نشانی بیان کر دی ہے، تاکہ مومن ان سے ہوشیار رہیں اور وہ نشانی یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کے اس حکم کی طرف بلایا جاتا ہے جس پر وہ ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، تو وہ اس حکم سے سخت اعراض کرتے ہیں اور اس طرح ان کا جھوٹا دعویٰ اور نفاق کھل کر ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم اور پہلی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ: تو ان کا کیا حال ہو گا جب ان پر کوئی مصیبت آئے گی ان اعمال کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے پہلے بھیجے ہیں، یہاں قرآن کریم ان کے نفاق کا ایک اور پہلو سختیوں اور آزمائشوں کے وقت میں بیان کرتا ہے، آیت میں فَكَيْفَ (پس کیسے) تفریع کے لیے ہے، اور "کیف" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کیا حال ہو گا جب ان پر مصیبتیں اتریں گی اور آفتیں ان کو گھیر لیں گی ان کے اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے اللہ کا حکم چھوڑا اور سرکشی کے فیصلوں کی پیروی کی، پھر یہ تمہارے پاس آئیں گے اور اپنی بداعمالیوں پر عذر پیش کریں گے، حالانکہ وہ جھوٹی قسمیں کھائیں گے اور کہیں گے، ہمارا ارادہ تو صرف بھلائی کرنے اور جھگڑنے والوں میں صلح کرانے کا تھا اور ہم نے آپ کے فیصلے سے بے رغبتی کا کوئی ارادہ نہیں کیا، لہٰذا ہمیں معاف کر دیجیے۔

یہاں "کیف" کا سوالی اُسلوب دراصل ان کے حال کی ہولناکی اور بربادی ظاہر کرنے کے لیے ہے، یعنی جب یہ لوگ اپنے برے اعمال کے نتیجے میں مصیبتوں میں پھنس جائیں گے اور نبی ﷺ کے پاس آکر جھوٹے عذر اور قسمیں پیش کریں گے تو ان کا حال نہایت ذلت آمیز اور رسوائی بھرا ہو گا، کیونکہ ان کے پاس اپنی بدکاریوں کے جواز کے لیے کوئی معقول دلیل نہ ہو گی۔

بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ میں "باء" سبب کے لیے ہے، یعنی یہ مصیبتیں ان گناہوں کے باعث آئیں گی جو انہوں نے خود کیے۔ اور "ہاتھوں کے کرنے" سے مراد ان کے سارے برے اعمال ہیں، خصوصاً سب سے بڑا جرم یہ کہ انہوں نے فیصلے کے لیے اللہ کے بجائے باطل اور طاغوت کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا۔ "ہاتھوں" کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ہاتھ انسان کے افعال کا نمایاں وسیلہ ہیں۔

ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا: پھر یہ لوگ آپ ﷺ کے پاس آئیں گے اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہمارا مقصد تو صرف بھلائی اور صلح کرانا تھا، آیت میں ''ثم'' کا استعمال اس شدید تضاد کو ظاہر کرتا ہے جو ایک طرف ان کے حکمِ خدا سے انکار اور اعراض کرنے میں ہے اور دوسری طرف بعد میں آکر جھوٹی قسمیں کھا کر معافی مانگنے اور اپنے فعل کو نیک نیتی قرار دینے میں ہے۔

ان منافقین کے وہ عذر جو انہوں نے مصیبتوں اور رسوائی کے بعد گھڑے، بالکل ویسے ہی ہیں جیسے آج کے دور کے منافقین کرتے ہیں، جو اللہ کی شریعت سے ہٹ کر غیر شرعی قوانین کی طرف بھاگتے ہیں، جب ان سے باز پرس ہو یا ان کی حقیقت کھل جائے تو وہ یہی بہانہ بناتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو صرف بھلائی کرنا اور مختلف فریقوں کے درمیان صلح و ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، تاکہ غیر مسلم لوگ بھی ناراض نہ ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے عذر اللہ کے عذاب سے کسی کو نہیں بچا سکتے، کیونکہ جو شخص اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر دوسروں کے قوانین کی طرف بھاگتا ہے، اس کے لیے کوئی معافی نہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ: یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرما دیا کہ وہ ان منافقوں کے اعمال سے ہرگز غافل نہیں ہے اور اپنے نبی ﷺ کو ان کے علاج کے طریقے بتائے، پس فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ خوب جانتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نفاق اختیار کیا، اپنی بری نیتوں کو چھپایا اور اللہ کے حکم کو چھوڑ کر طاغوت کے حکم کی طرف گئے، یہ وہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے نفاق اور کفر کی طرف میلان کو خوب جانتا ہے، اگرچہ وہ ظاہری طور پر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ: لہٰذا آپ ﷺ ان سے اعراض کیجیے اور انہیں نصیحت کیجیے، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اپنے فرمان فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ میں ان منافقوں کی اصلاح اور ان کے علاج کے طریقے بیان کیے ہیں، کہ آپ ﷺ ان کی طرف توجہ نہ دیں، ان کی خبیث روشوں سے چشم پوشی کریں اور ان پر التفات نہ کریں تاکہ وہ آپ ﷺ کے اس رویے سے اپنے اعمالِ بد پر آپ ﷺ کی

ناراضگی کو محسوس کریں، یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ انہیں مصلحتاً سزا دینے سے گریز کریں اور ان کے رازہائے سربستہ بھی فاش نہ کریں، تاکہ یہ ڈرتے رہیں اور خوف زدہ رہیں۔

اور **وَعِظْهُمْ** کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نیکی کی یاددہانی اور برائی سے روکنے کی محنت جاری رکھیے، ایسے انداز میں کام کریں جو دلوں کو نرم کرے اور جس میں ترغیب (اچھائی کی طرف رغبت دلانا) اور ترہیب (برائی سے ڈرانا) دونوں باتیں شامل ہوں، یعنی انہیں یاد دلایئے کہ ان کے برے اعمال کا انجام ان کے لیے بہت بُرا ہو گا اور اگر وہ ان کو چھوڑ دیں تو دنیا و آخرت میں ان کے لیے بہت بڑی خیر و بھلائی ہے اور انہیں بتایئے کہ اللہ کی شریعت کے علاوہ کسی اور کے فیصلے کو ماننا دراصل ان کی بربادی کا سبب ہو گا۔

وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا : اور ان سے ان کے دلوں میں اثر ڈالنے والی مؤثر بات کہئے۔ ان سے قول بلیغ میں بات کیجیے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے ایسا کلام کریں جو اپنی قوت اور اثر کے سبب ان کے دلوں کی گہرائیوں تک جا پہنچے، اس انداز میں بات کریں کہ وہ آپ کی بات کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں، یہ آیت نہایت بلیغ اور اثر انگیز انداز بیان پر مشتمل ہے، یہاں گویا یہ تاثر دیا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ جو بات ان سے فرمائیں گے وہ براہِ راست ان کے باطن میں اتر جائے گی اور سیدھی دلوں پر اثر ڈالے گی، ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ انہیں تنہائی میں سمجھایئے جب یہ اکیلے ہوں، کیونکہ اس طرح نصیحت کی بات قبول کی جاتی ہے، اگر کسی کو سب کے سامنے نصیحت کی جائے تو وہ نصیحت کے بجائے جھڑکنے اور شرمندہ کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔

امام زمخشری نے اس کی وضاحت یوں کی ہے، اگر یہ پوچھا جائے کہ **فِيٓ أَنفُسِهِمْ** کا تعلق کس کے ساتھ ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق **بَلِيغًا** کے ساتھ ہے، یعنی ایسا بلیغ اور مؤثر کلام کہ وہ ان کے دلوں کو دکھ دے، انہیں غمگین کرے، ان کے اندر خوف پیدا کرے اور یہ دراصل قتل و قلع قمع کی دھمکی دی گئی ہے کہ اگر ان کا نفاق ظاہر ہو جائے اور وہ اپنے کفر کو آشکار کر دیں، تو ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا، انہیں یہ بتلایا جائے کہ جو کینہ و نفاق تمہارے دلوں میں ہے، اللہ کے علم سے

پوشیدہ نہیں، تم میں اور مشرکین میں کوئی فرق نہیں ہے، بس اتنی بات ہے کہ تم نے ظاہر میں ایمان کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور اندر کفر چھپا رکھا ہے، اگر تم نے اپنے پردے کو چاک کر دیا تو پھر تلوار کا کام ہی باقی رہ جائے گا۔

یا پھر اس کا تعلق قُل لَّهُم سے ہے، یعنی ان کے خبیث نفوس اور نفاق سے بھرے ہوئے دلوں سے ایسا بلیغ کلام کیجیے کہ وہ جان لیں کہ اللہ ان کے دلوں کے راز جانتا ہے، اور ان کا چھپانا کچھ فائدہ نہیں دے گا، پس بہتر ہے کہ اپنے دلوں کو درست کریں، نفاق کو دور کریں اور اپنے باطن کو پاک کریں، ورنہ اللہ تمہیں اسی عذاب میں مبتلا کرے گا جو اعلانیہ شرک کرنے والوں پر نازل کیا گیا، بلکہ اس سے بھی سخت اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ان سے علیحدگی میں، تنہائی کے موقع پر ایسا مؤثر کلام کریں جو سیدھا ان پر اثر ڈالے اور ان کے دلوں کو بدلنے والا ہو۔ (تفسیر کشاف)

آپ دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو منافقین کی اصلاح کے لیے تین طریقے اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی: ① ان سے اعراض کرنا۔ ② ان کو ایسی نصیحت کرنا جو خیر کی طرف راغب کرے اور شر سے ڈرائے۔ ③ ان سے ایسا بلیغ اور دل نشین کلام کرنا جو ان کی روح پر اثر ڈالے اور ان کو اپنی اصلاح پر آمادہ کرے، یہی طریقے دراصل اللہ کی طرف دعوت دینے کے اعلیٰ ترین اور کامیاب ترین اسلوب ہیں، جو انسانوں کو خیر و فلاح کی راہ پر لانے کے سب سے مؤثر ذرائع ہیں۔

اِطاعت رسول ﷺ اور مسئلہ استشفاع

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا {۶۴} النساء

جواب ترجمہ: اور ہم نے تو رسول اسی لیے بھیجا تاکہ اللہ کے حکم سے ان کی بات مانی جائے اور ان لوگوں نے جس وقت اپنا برا کیا تھا وہ اگر آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو وہ اللہ کو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا پاتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ: اور ہم نے تو رسول اسی لیے بھیجا تاکہ اللہ کے حکم سے ان کی بات مانی جائے، جب رسول اللہ ﷺ ان جھگڑالو لوگوں کی فضول باتوں اور منافقوں کے نفاق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کے سامنے ہدایت اور نور کا ہاتھ بڑھاتے ہیں، تو یہ دراصل ان کی حدِ کوشش اور ان کی رسالت کی انتہا ہے، کافروں کا کفر پر قائم رہنا یا منافقوں کا اپنے نفاق کے ساتھ جینا، یہ رسول اللہ ﷺ کی ذمے داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صرف اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ اپنے رب کا پیغام پہنچا دیں، چنانچہ جب وہ پیغام پہنچا دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری ادا کر دیتے ہیں، اب لوگوں کا کام ہے کہ وہ ان کی بات سنیں اور ان پر ایمان لائیں۔ (التفسیر القرآنی للقرآن للخطیب) لیکن اکثر لوگ اس نیک اور سیدھی دعوت کا سامنا ضد اور کجی ہی سے کرتے ہیں۔

یہ ایک جملۂ معترضہ ہے جو منافق کے بارے میں بیان کے دوران آیا ہے، جس نے طاغوت کے پاس فیصلہ کروانے کی کوشش کی اور یہ پھر اصل مقصد کی طرف رجوع ہے اور وہ مقصد ہے ان پر سخت نکیر کرنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فیصلہ کروانے سے انکار کرتے ہیں اور ان کا یہ انکار ان کے نفاق کی دلیل ہے، اس وضاحت کے ساتھ کہ ایمان کا مطلب ہی رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر راضی ہونا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو اس لیے بھیجے گئے کہ ان کی اطاعت کی جائے، تو پھر ان سے منہ موڑنا کیسے ممکن ہے؟) تحریر المعنی السدید و تنویر العقل الجدید من تفسیر الکتاب المجید)

بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اطاعت اللہ کے حکم اور اس کی وصیت کے ساتھ ہو، کیونکہ شریعتوں کا فائدہ بغیر ان پر عمل کیے ظاہر نہیں ہو سکتا، انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کی اطاعت کی گئی اور بعض کی نافرمانی بھی کی گئی، کبھی وقتی طور پر اور کبھی ہمیشہ کے لیے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی بعض مواقع پر ہوئی، عیسیٰ علیہ السلام کی زیادہ تر امور میں نافرمانی ہوئی، لیکن ہمارے پیارے آقا ﷺ کی نافرمانی ان کے مخلص مؤمنین کی طرف سے نہیں ہوئی، سوائے کسی اجتہادی غلطی کے، جیسا جنگ اُحد کے دن پیش آیا واقعہ جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَصَيْتُمْ (آل عمران: ۱۵۲) یہ بھی دراصل ایک اجتہادی نافرمانی تھی، لیکن چونکہ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف تھی اس لیے اسے نافرمانی کہا گیا۔

اسی لیے رسالت کے کامل ترین مظاہر میں یہ بات ہے کہ رسول کو حکومت اور اقتدار کے ذریعے تقویت دی جائے اور وہ اقتدار خود رسول کی ذات میں ہو تاکہ وہ دوسروں کا محتاج نہ ہو، یہ کمال صرف محمد ﷺ کی رسالت میں پورا ہوا، اسی لیے آپ کو نبیُ الملاحم (جنگوں والے نبی) کہا گیا، اس کی جھلک موسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں ظاہر ہوئی لیکن مکمل نہ ہوئی اور محمد ﷺ کی رسالت میں مکمل ہوئی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ (الحدید: ۲۵)

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری، اور ترازو بھی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں جنگی طاقت بھی ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فائدے بھی اور یہ اس لیے تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون ہے جو اس کو دیکھے بغیر اس (کے دین) کی اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتا ہے۔

یہاں جتنی پیغمبرانہ صفات واوصاف ذکر کیے گئے ہیں ان کا کامل ومکمل مصداق رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس ہی ہے، جمع کا صیغہ آپ ﷺ کی عظمت شان کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں اَلْآيَةُ دَالَّةٌ عَلَى أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مَعْصُومُونَ عَنِ الْمَعَاصِي وَالذُّنُوبِ لِأَنَّهَا دَلَّتْ عَلَى وُجُوبِ طَاعَتِهِمْ مُطْلَقًا، فَلَوْ أَتَوْا بِمَعْصِيَةٍ لَوَجَبَ عَلَيْنَا الِاقْتِدَاءُ بِهِمْ فِي تِلْكَ الْمَعْصِيَةِ فَتَصِيرُ تِلْكَ الْمَعْصِيَةُ وَاجِبَةً عَلَيْنَا، وَكَوْنُهَا مَعْصِيَةً يُوجِبُ كَوْنَهَا مُحَرَّمَةً عَلَيْنَا، فَيَلْزَمُ تَوَارُدُ الْإِيجَابِ وَالتَّحْرِيمِ عَلَى الشَّيْءِ الْوَاحِدِ وَإِنَّهُ مُحَالٌ (الکبیر للرازی)

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصیت اور گناہوں سے معصوم ہیں، کیونکہ اس نے ان کی اطاعت کو مطلق طور پر واجب قرار دیا ہے، پس اگر وہ کسی معصیت کا ارتکاب کریں تو ہمارے لیے لازم ہوگا کہ ہم اس معصیت میں بھی ان کی پیروی کریں اور اس طرح وہ معصیت

ہمارے لیے واجب قرار پائے گی، لیکن چونکہ وہ معصیت ہے، اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے حرام بھی ہو، اس طرح ایک ہی چیز پر وجوب اور تحریم دونوں لازم آئیں گے، جو کہ محال ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ: امام رازی رحمہ اللہ کے نزدیک یہاں شانِ نزول کے بارے میں دو پہلو بیان کیے گئے ہیں، پہلا: اس سے مراد وہ منافقین ہیں جن کا پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ یعنی اگر وہ لوگ، جب انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا کہ طاغوت کے پاس فیصلہ کروانے گئے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف فیصلہ کروانے سے بھاگے، اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس آجاتے اور اپنے کیے پر ندامت ظاہر کرتے اور اس سے توبہ کرتے اور اپنے اس گناہ پر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے اور ان کا گناہ بخش دے، تو وہ اللہ کو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان پاتے۔

دوسرا: ابو بکر اصم رحمہ اللہ نے کہا: کچھ منافقین نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف ایک فریب اور سازش پر باہم اتفاق کیا، پھر اس مقصد کے لیے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسی وقت جبریل علیہ السلام آئے اور آپ ﷺ کو اس کی خبر دی، آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ قَوْمًا دَخَلُوْا يُرِيْدُوْنَ أَمْرًا لَا يَنَالُوْنَهُ، فَلْيَقُوْمُوْا وَلْيَسْتَغْفِرُوْا اللّٰهَ حَتّٰى أَسْتَغْفِرَ لَهُمْ فَلَمْ يَقُوْمُوْا، فَقَالَ: أَلَا تَقُوْمُوْنَ، فَلَمْ يَفْعَلُوْا فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قُمْ يَا فُلَانُ قُمْ يَا فُلَانُ حَتّٰى عَدَّ اثْنَيْ عَشَرَ رَجُلًا مِنْهُمْ، فَقَامُوْا وَقَالُوْا: كُنَّا عَزَمْنَا عَلٰى مَا قُلْتَ، وَنَحْنُ نَتُوْبُ إِلَى اللّٰهِ مِنْ ظُلْمِنَا أَنْفُسَنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا، فَقَالَ: الْآنَ اخْرُجُوْا أَنَا كُنْتُ فِيْ بَدْءِ الْأَمْرِ أَقْرَبَ إِلَى الِاسْتِغْفَارِ وَكَانَ اللّٰهُ أَقْرَبَ إِلَى الْإِجَابَةِ اخْرُجُوْا عَنِّيْ

کچھ لوگ میرے پاس ایک ایسا ارادہ لے کر آئے ہیں جسے وہ پا نہیں سکیں گے، تو انہیں چاہیے کہ کھڑے ہو جائیں اور اللہ سے معافی مانگیں تاکہ میں بھی ان کے لیے استغفار کروں۔" لیکن وہ نہ اٹھے، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: "کیا تم کھڑے نہیں ہوتے؟ پھر بھی وہ نہ اٹھے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اے فلاں! اٹھو اے فلاں! یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ان میں سے بارہ آدمیوں کے نام لے لیے، وہ سب کھڑے ہوئے اور کہنے لگے، یقیناً ہم نے وہی ارادہ کیا تھا جس کا آپ نے ذکر کیا اور ہم

اپنے آپ پر ظلم کرنے سے توبہ کرتے ہیں، ہمارے لیے استغفار کیجیے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اب نکل جاؤ! شروع میں تمہارے لیے میرا استغفار کرنے کا رجحان زیادہ قریب تھا اور اللہ بھی اس وقت قبولیت کے زیادہ قریب تھا، اب مجھ سے دور ہو جاؤ۔ (تفسیر کبیر للرازی)

سوال اگر وہ لوگ سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتے تو ان کی توبہ قبول ہو جاتی، تو پھر رسول اللہ ﷺ کے استغفار کو ان کے استغفار کے ساتھ شامل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا جواب چند پہلوؤں سے ہے: ① ان کا طاغوت کے پاس فیصلہ کرانا اللہ کے حکم کی مخالفت بھی تھا اور رسول اکرم ﷺ کی بے ادبی اور آپ ﷺ کے دل میں رنج و غم ڈالنے کا سبب بھی تھا، اس لیے جس کا گناہ اس نوعیت کا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اس گناہ کی معافی دوسرے سے بھی مانگے، اسی وجہ سے ان پر واجب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے کہیں کہ وہ ان کے لئے استغفار کریں۔

② جب ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو قبول نہ کیا تو ان کی طرف سے ایک طرح کی سرکشی ظاہر ہوئی، اب اگر وہ توبہ کریں تو ان پر لازم ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جس سے وہ سرکشی دور ہو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر آپ ﷺ سے اپنے لیے استغفار کی درخواست کریں۔

③ ممکن ہے کہ جب وہ اپنی طرف سے توبہ کریں تو اس میں کوئی کمی کوتاہی رہ جائے، تو اگر اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا استغفار شامل ہو جائے تو وہ توبہ قبولیت کے لائق بن جاتی ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ (الکبیر للرازی)

سوال یہ ارشاد فرمایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے لیے استغفار کریں، یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ رسول اکرم ﷺ کی عظمت و تکریم کے پیشِ نظر ہے اور اس وجہ سے بھی کہ جب وہ آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو حقیقت میں اس ذات کے پاس آتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے ساتھ خاص فرمایا، اپنی وحی کے ساتھ مکرم کیا اور اپنی مخلوق کے درمیان سفیر بنایا اور جو اس مقام پر

فائز ہو، اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت کو رد نہیں فرماتا، پس خطاب یعنی اِستَغفَرتَ کے بجائے غیبت کے صیغے یعنی اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لانے میں یہی حکمت ہے تفسیر کبیر للرازی)

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا: آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ کو لازماً قبول فرماتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کے استغفار کا ذکر کیا تو اس کے بعد فرمایا: تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، مہربان پاتے اور یہ جواب صرف اسی صورت میں درست اور مکمل ہو گا جب اس کے کلام میں تَوَّابًا رَّحِيْمًا کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، ان کی عاجزی و گریہ زاری پر رحم کرے گا اور ان کے استغفار کو رد نہیں کرے گا۔ (کبیر للرازی)

نبی کریم ﷺ کے روضہ اقدس پر استشفاع

شیخ وھبہ بن مصطفے الزحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وَبَعْدَ وَفَاةِ أَيِّ رَسُولٍ يَجِبُ الِاحْتِكَامُ إِلَى الشَّرْعِ الَّذِي تَرَكَهُ وَالْكِتَابِ الَّذِي عَلَّمَهُ لِلنَّاسِ، لِذَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى مُبَيِّنًا وُجُوبَ طَاعَةِ النَّبِيِّ الْمُصْطَفَى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُجُوبَ الِاحْتِكَامِ إِلَيْهِ وَإِلَى قُرْآنِهِ وَسُنَّتِهِ مِنْ بَعْدِ وَفَاتِهِ (التفسیر الوسیط للزحیلی) اور کسی بھی رسول کے وصال کے بعد لازم ہے کہ اسی شریعت کی طرف رجوع کیا جائے جو وہ چھوڑ گئے ہوں اور اسی کتاب کو حکم بنایا جائے جس کی تعلیم انہوں نے لوگوں کو دی تھی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نبی مصطفی ﷺ کی اطاعت واجب ہے اور ان کے وصال کے بعد بھی ان ہی کی طرف اور ان کے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں ایک روایت لائے ہیں، ابو صادق رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا : قَدِمَ عَلَيْنَا أَعْرَابِيٌّ بَعْدَ مَا دَفَنَّا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، فَرَمَى بِنَفْسِهِ عَلَى قَبْرِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَثَا عَلَى رَأْسِهِ مِنْ تُرَابِهِ، فَقَالَ: قُلْتَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَسَمِعْنَا قَوْلَكَ، وَوَعَيْتَ عَنِ اللّٰهِ فَوَعَيْنَا عَنْكَ، وَكَانَ فِيمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ (وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ) الْآيَةَ، وَقَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِي وَجِئْتُكَ تَسْتَغْفِرُ لِي، فَنُودِيَ مِنَ الْقَبْرِ إِنَّهُ قَدْ غُفِرَ لَكَ (الجامع لاحکام القرآن)

ہمارے پاس ایک اعرابی آیا جب کہ ہم تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ کو دفن کر چکے تھے، اس اعرابی نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی قبر انور پر ڈال دیا اور قبر انور کی مٹی اپنے سر پر ڈالنے لگا اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے کہا تو ہم نے آپ ﷺ کا قول سنا، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے کلام یاد کیا اور ہم نے آپ ﷺ سے کلام یاد کیا، جو اس نے آپ ﷺ پر نازل کیا اس میں ہے **وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ** میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں تاکہ آپ میرے لیے استغفار کریں تو قبر انور سے آواز آئی " تجھے بخش دیا گیا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ گناہوں سے بچنے، توبہ کرنے، اور رسول اللہ ﷺ کے حضور حاضر ہو کر استغفار کروانے سے اللہ کی رحمت نصیب ہوتی ہے، اسی تناظر میں انہوں نے مشہور روایت اعرابی کا حضور ﷺ کی قبر پر آکر آیت تلاوت کرنا اور بخشش مانگنا بھی بیان کی ہے، جس میں وہ اس بات کا ثبوت سمجھتے ہیں کہ یہ حکم حیاتِ مبارکہ تک محدود نہیں بلکہ حضور ﷺ کے وِصال کے بعد بھی جاری ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مذکور نبی ﷺ کی طرف سے طلب معافی کی درخواست بظاہر آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کے ساتھ ہی مختص معلوم ہوتی ہے کہ جو کوئی غلطی کا مرتکب آپ کی حیات مبارکہ میں ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، خود بھی استغفار کی اور اللہ کے رسول ﷺ سے بھی طلب معافی کی درخواست کی تو اللہ نے معاف کر دیا، تاہم مولانا رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق عالم برزخ میں بھی قائم ہے۔

عرض اعمال کے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں جن کے مطابق امت کے اعمال ملاء اعلیٰ میں حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے مطابق ملاء اعلیٰ کے ممبران میں تین گروہ شامل ہیں۔ پہلا گروہ ملائکہ مقربین اور دیگر بلند پایہ فرشتوں کا ہے جس میں حاملین عرش فرشتے بھی ہیں۔ دوسرا گروہ بھی فرشتوں کا ہے جو دوسرے نمبر پر ہیں اور تیسرا گروہ بنی نوع انسان میں افاضل الآدمیین کا ہے یعنی وہ کامل الایمان لوگ جو اپنی زندگیاں دین کی خاطر وقف

کر دیتے ہیں اور بنی نوع انسان کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس گروہ میں تمام انبیائے کرام علیہم السلام اور اللہ کے دیگر نیک بندے شامل ہوتے ہیں۔ اور ان ممبران ملاء اعلیٰ کا کام کیا ہے؟ ان کی پہلی مصروفیت یہ ہے کہ ان کی نگاہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی تجلی اعظم پر مرکوز رہتی ہے اور ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔

حاملین عرش کے متعلق تو خود قرآن پاک میں موجود ہے کہ وہ ایمان والوں کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے ہیں اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (سورۃ الغافر ۷) تو مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا سے رحلت کے بعد بھی امت کے اعمال ان کی خدمت میں ملاء اعلیٰ کے مقام پر پیش کیے جاتے ہیں اور وہ امت کے لیے بخشش کی دعا بھی کرتے ہیں، کیونکہ اس گروہ میں شامل ہونے والوں کی ایک مصروفیت طلب بخش بھی ہے۔ (معالم العرفان)

روضہء رسول پر استشفاع: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں آپ سے استشفاع تو بالکل واضح ہے جب کوئی شخص غلطی کرتا، پھر اسے ندامت ہوتی تو وہ حضور ختمی رسالت کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتا، پھر آپ سے بھی بخشش طلب کرنے کی درخواست کرتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے معافی مانگتے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا، اس قسم کے واقعات بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق احادیث میں آتے ہیں۔ مثلاً حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے غلطی ہو گئی تو آپ ناراض ہو گئے، پھر اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، حضور میرے لیے بخشش کی دعا کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا۔

تاہم مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کا عموم بتاتا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر اپنی غلطی کی اللہ سے معافی طلب کرے اور نبی علیہ السلام کی خدمت میں بھی طلب معافی کی درخواست کرے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ (معارف)

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ حضور ﷺ سے استشفاع کی دعا کرنا جائز ہے، صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے بعد بندہ حضور ﷺ سے درخواست کرے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سفارش کریں کہ اللہ میرے گناہ معاف فرمادے میرا خاتمہ بالایمان ہو اور میں آپ ﷺ کی ملت میں شریک رہوں۔ (معالم العرفان للسواتی)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہو جائے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آکر استغفار کریں اور رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لیے اللہ سے درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان پائیں گے۔ (ابن کثیر)

شیخ ابو نصر بن صباغ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الشامل" میں عتبی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آکر کہا السلام علیک یارسول اللہ! میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے، وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ، اور میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں، پھر اس نے دو شعر پڑھے:

يَا خَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ أَعْظُمُهُ ... فَطَابَ مِنْ طِيبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْأَكَمُ

نَفْسِي الْفِدَاءُ لِقَبْرٍ أَنْتَ سَاكِنُهُ ... فِيهِ الْعِفَافُ وَفِيهِ الْجُودُ وَالْكَرَمُ

ترجمہ: اے سب سے بہتر ہستی، جن کے مبارک اعضا زمین میں دفن ہیں ... جن کی خوشبو سے زمین اور پہاڑیاں معطر ہو گئیں۔ میری جان قربان اس قبر پر جس میں آپ آرام فرما ہیں، جس میں عفت ہے، سخاوت ہے اور سراسر کرم ہے۔

یہ اشعار پڑھ کر وہ اعرابی چلا گیا، عتبی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آگئی، میں نے خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کی اور آپ ﷺ نے فرمایا اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جا کر اس کو

خوشخبری دو کہ اللہ نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، الجامع لاحکام القرآن، البحر المحیط مدارک التنزیل علی ہامش الخازن، تبیان القرآن، الوسیط)

شیخ سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیماً و حدیثاً اس کو نقل کیا ہے۔ (تسکین الصدور)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں، کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں آپ ﷺ کے ہم عصر ہوں یا بعد کے اُمتی ہوں اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ ﷺ کا وجود تربیت تمام اُمت کے لیے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے اُمتیوں کا آپ ﷺ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں (آب حیات ص ۴۰)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ،فَثَبَتَ اَنَّ حُكْمَ الْاٰيَةِ بَاقٍ بَعْدَ وَفَاتِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۰ ص ۳۳۰) ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے (شفاء السقام ص ۱۲۸)

مکین گنبد خضراء ﷺ کی زیارت کا سفر

قرآن مجید کی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی قبر انور کے لیے سفر کرنا مستحسن اور مستحب ہے، شیخ ابن تیمیہ نے اس سفر کو سفر معصیت اور سفر حرام کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس سفر میں قصر کرنا جائز نہیں ہے ان کا استدلال اس حدیث سے ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی مسجد کی طرف کجاوے نہ کسے جائیں (سفر نہ کیا جائے) مسجد حرام، مسجد الرسول، اور مسجد اقصی۔ (بخاری ، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، حمیدی، احمد سنن کبریٰ للنسائی، جامع الاصول)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے جواب میں فرمایا ہے: اس حدیث میں ان تین مساجد کے علاوہ مطلقاً سفر سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی مسجد کے لیے سفر کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ مستثنیٰ منہ مستثنیٰ کی جنس سے ہوتا ہے۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۶۵)

حضرت ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ابن تیمیہ حنبلی نے اس مسئلہ میں بہت تفریط کی ہے، کیونکہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے سفر کو حرام کہا ہے اور بعض علماء نے اس مسئلہ میں افراط کیا ہے اور اس سفر کے منکر کو کافر کہا ہے اور یہ دوسرا قول صحت اور صواب کے زیادہ قریب ہے کیونکہ جس چیز کی اباحت پر اتفاق ہو اس کا انکار کفر ہے تو جس چیز کے استحباب پر علماء کا اتفاق ہو اس کو حرام قرار دینا بہ طریق اَولیٰ کفر ہو گا۔ (شرح الشفاء علی ھامش نسیم الریاض)

نورالدین ابوالحسن سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں وَالْعُلَمَاءُ فَهِمُوا مِنَ الْآيَةِ الْعُمُومَ لِحَالَتَيِ الْمَوْتِ وَالْحَيَاةِ، وَاسْتَحَبُّوا لِمَنْ أَتَى الْقَبْرَ أَنْ يَتْلُوَهَا وَيَسْتَغْفِرَ اللهَ تَعَالَى، وَحِكَايَةُ الْأَعْرَابِيِّ فِي ذَالِكَ نَقَلَهَا جَمَاعَةٌ مِّنَ الْأَئِمَّةِ عَنِ الْعُتْبِيِّ (وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ)

اور علماء نے اس آیت سے عام معنیٰ مراد لیا ہے، یعنی زندگی اور وفات دونوں حالتوں کے بارے میں۔ اور یہ بات مستحب سمجھی گئی ہے کہ جو شخص قبر کے پاس آئے وہ یہ آیت تلاوت کرے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرے اور اس بارے میں جو دیہاتی (اعرابی) کا واقعہ ہے، اسے کئی ائمہ نے عتبی سے نقل کیا ہے۔

حافظ ابن الہمام حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زائر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر کھڑے ہو کر یوں عرض کرے وَيَسْأَلُ اللهَ تَعَالَى حَاجَتَهُ مُتَوَسِّلًا إِلَى اللهِ بِحَضْرَةِ نَبِيِّهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَأَعْظَمُ الْمَسَائِلِ وَأَهَمُّهَا سُؤَالُ حُسْنِ الْخَاتِمَةِ وَالرِّضْوَانِ وَالْمَغْفِرَةِ، ثُمَّ يَسْأَلُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشَّفَاعَةَ فَيَقُولُ، يَا رَسُولَ اللهِ أَسْأَلُكَ الشَّفَاعَةَ، يَا رَسُولَ اللهِ أَسْأَلُكَ الشَّفَاعَةَ وَأَتَوَسَّلُ بِكَ إِلَى اللهِ فِي أَنْ أَمُوتَ مُسْلِمًا عَلَى مِلَّتِكَ وَسُنَّتِكَ، وَيَذْكُرُ كُلَّ مَا كَانَ مِنْ قَبِيلِ الِاسْتِعْطَافِ وَالرِّفْقِ بِهِ. (فتح القدیر ج ۳ ص ۱۸۱)

اور وہ (زائر) اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگے، اللہ کے حضور اپنے نبی ﷺ کی حاضری کے وسیلے سے اور سب سے بڑی اور سب سے اہم دعا یہ ہے کہ وہ حُسنِ خاتمہ، رضائے الٰہی اور مغفرت طلب کرے، پھر نبی اکرم ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرے اور یوں کہے: یارسول اللہ! میں آپ سے شفاعت کا سوال کرتا ہوں، یارسول اللہ! میں آپ ﷺ سے شفاعت کا سوال کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کے وسیلے سے یہ دعا کرتا ہوں کہ میں حالت اسلام میں، آپ کی ملت اور سنت پر قائم رہتے ہوئے موت پاؤں، اور پھر وہ ہر اس طرح کے کلمات ذکر کرے جو نرمی، عاجزی اور دلجوئی کے اظہار پر مشتمل ہوں۔

جو شخص روضہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے لیے جائے، اسے کوئی شخص تحفہ سلام دے کر بھیجے کہ میری طرف سے روضہ رسول اللہ ﷺ پر سلام پیش کرنا تو اسے اس شخص کا سلام بھی پیش کرنا چاہیے، علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں وَقَالَ أَبُوْ مَنْصُوْرٍ الْكَرْمَانِيُّ مِنَ الْحَنَفِيَّةِ: إِنْ كَانَ أَحَدٌ أَوْصَاكَ بِتَبْلِيْغِ التَّسْلِيْمِ تَقُوْلُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ مِنْ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ، يَسْتَشْفِعُ بِكَ إِلٰى رَبِّكَ بِالرَّحْمَةِ وَالْمَغْفِرَةِ، فَاشْفَعْ لَهُ. (وفاء الوفا باخبار دار المصطفٰے) امام ابو منصور کرمانی حنفی رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر کوئی تمہیں سلام پہنچانے کی وصیت کرے تو تم یوں کہو: السلام علیک یارسول اللہ! یہ سلام فلاں بن فلاں کی طرف سے ہے، وہ آپ کو اپنے رب کے حضور رحمت اور مغفرت کے واسطے وسیلہ بنا رہا ہے، تو آپ ﷺ اس کے لیے شفاعت فرمائیے۔

حسن بن عمار شرنبلالی، مصری حنفی رحمہ اللہ روضہ رسول اللہ ﷺ پر پیش ہونے اور وہاں عرض معروض کرنے کا طریقہ بیان فرماتے ہیں

يَا رَسُوْلَ اللهِ نَحْنُ وَفْدُكَ وَزُوَّارُ حَرَمِكَ، تَشَرَّفْنَا بِالْحُلُوْلِ بَيْنَ يَدَيْكَ، وَقَدْ جِئْنَاكَ مِنْ بِلَادٍ شَاسِعَةٍ وَأَمْكِنَةٍ بَعِيْدَةٍ، نَقْطَعُ السَّهْلَ وَالْوَعْرَ بِقَصْدِ زِيَارَتِكَ، لِنَفُوْزَ بِشَفَاعَتِكَ وَالنَّظَرِ إِلٰى مَآثِرِكَ وَمَعَاهِدِكَ، وَالْقِيَامِ بِقَضَاءِ بَعْضِ حَقِّكَ، وَالِاسْتِشْفَاعِ بِكَ إِلٰى رَبِّنَا، فَإِنَّ الْخَطَايَا قَدْ قَصَمَتْ ظُهُوْرَنَا، وَالْأَوْزَارُ قَدْ أَثْقَلَتْ كَوَاهِلَنَا، وَأَنْتَ الشَّافِعُ الْمُشَفَّعُ، الْمَوْعُوْدُ بِالشَّفَاعَةِ الْعُظْمٰى وَالْمَقَامِ الْمَحْمُوْدِ

وَالْوَسِيلَةِ. وَقَدْ قَالَ اللهُ تَعَالَى: {وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَحِيمًا} (النِّسَاء: ٦٤) وَقَدْ جِئْنَاكَ ظَالِمِيْنَ لِأَنْفُسِنَا، مُسْتَغْفِرِيْنَ لِذُنُوْبِنَا، فَاشْفَعْ لَنَا إِلَى رَبِّكَ، وَاسْأَلْهُ أَنْ يُمِيْتَنَا عَلَى سُنَّتِكَ، وَأَنْ يَحْشُرَنَا فِي زُمْرَتِكَ، وَأَنْ يُوْرِدَنَا حَوْضَكَ، وَأَنْ يَّسْقِيَنَا بِكَاسِكَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامَى. الشَّفَاعَةَ الشَّفَاعَةَ الشَّفَاعَةَ يَارَسُولَ اللهِ (يَقُولُهَا ثَلَاثًا)

یارسول اللہ! ہم آپ کے دربار کے وفد اور آپ کے حرم کے زائر ہیں، ہمیں یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ ہم آپ ﷺ کے قدموں کے پاس حاضر ہوئے ہیں، ہم دور دراز ملکوں اور بعید وادیوں سے آپ ﷺ کے دیدار اور زیارت کے ارادے سے آئے ہیں، ہم نے ہموار اور دشوار گزار راستے طے کیے تاکہ آپ ﷺ کی زیارت حاصل کریں، آپ ﷺ کی شفاعت سے بہرہ مند ہوں، آپ ﷺ کی یادگاروں اور مقامات کو دیکھیں، آپ ﷺ کے حق کی کچھ ادائیگی کریں اور اپنے رب کے حضور آپ ﷺ کو سفارشی بنائیں، بے شک ہمارے گناہوں نے ہماری کمر توڑ دی ہے اور خطاؤں کا بوجھ ہماری گردنوں کو دبا چکا ہے اور آپ ﷺ ہی وہ شفیع اور قبول شفاعت کیے گئے ہیں، جن سے شفاعتِ کبریٰ، مقامِ محمود اور وسیلہ کا وعدہ کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّاباً رَحِيماً} اور اگر وہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ ﷺ کے پاس آتے، اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی مانگتا تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان پاتے۔ لہٰذا ہم آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے ہیں، اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے، اپنے گناہوں پر اللہ سے بخشش مانگنے والے، پس آپ ﷺ ہمارے لیے اپنے رب کے حضور شفاعت فرمائیں اور اس سے دعا کریں کہ وہ ہمیں آپ کی سنت پر موت دے اور قیامت کے دن آپ ﷺ کے جھنڈے تلے ہمیں جمع کرے اور ہمیں آپ ﷺ کے حوض تک لے جائے اور ہمیں آپ ﷺ کے ہاتھ سے حوضِ کوثر کا جام نصیب کرے، اس حال میں کہ نہ ہم رسوا ہوں اور نہ شرمندہ، یارسول اللہ! ہم طلب گار شفاعت ہیں، ہم طلب گار شفاعت ہیں، ہم طلب گار شفاعت ہیں، یہ کلمات تین بار کہے۔ (مراقی الفلاح شرح نور الایضاح)

اس موضوع پر لکھنے کے دوران میں نے مختلف حضرات کی کتابوں پر نگاہ ڈالی ہے، ان میں علامہ ابن تیمیہ حرانی رحمہ اللہ کے مجموع فتاویٰ پر بھی نگاہ پڑی، جس میں انہوں نے ان تمامی روایات کو ضعیف، موضوع اور کذب پر مبنی قرار دیا ہے، جن میں نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت کا ذکر ہے، ایک مقام پر وہ عام قبروں پر جانے کے فضائل بیان کرتے ہیں، جب کہ نبی کریم ﷺ کی قبر پر جانے کی بات آئی تو وہ روایات پیش کر دیں جن میں نبی کریم ﷺ نے اپنی قبر کو میلہ گاہ بنانے سے منع کیا، پھر یہ حوالہ بھی پیش کیا کہ ایک امام تو زیارت قبر النبی ﷺ کا نام ہی نہیں لیتے تھے، جو چیز ان کی رائے کے خلاف آئی ہے اسے انہوں نے شرک قرار دیا ہے، جو چیز ان کے خیال کے مطابق درست نہیں تھی اسے انہوں نے غلو قرار دیا ہے، جو چیز ان کے فہم میں نہ آئی اسے انہوں نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت قرار دیا ہے، جب کہ سورۃ النساء کی اس آیت کے ذیل میں کتنے مفسرین کرام رحمہم اللہ کی آراء ہم پیش کر چکے ہیں۔

علامہ تقی الدین علی بن عبد الکافی بن علی السبکی الشافعی رحمہ اللہ نے روضہ اقدس کی زیارت سے متعلق جتنی روایات انہیں ملیں وہ انہوں نے اپنی کتاب "شفاء السقام فی زیارت خیر الانام" میں جمع فرمائی ہیں، ان کی یہ کتاب ساڑھے پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کتاب میں انہوں نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف سے پیش کی گئی باتوں کا رد کیا ہے اور اہل اسلام کے دلوں میں اپنے پیارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے، اسی طرح شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ بھی علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہی روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں اور ان پر وہی حکم لگاتے ہیں جو ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لگایا کہ یہ روایات ضعیف ہیں۔

پھر افسوس نواب صدیق حسن خان قنوجی رحمہ اللہ پر جنہوں نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور صاحب الصارم المنکی فی الرد علی السبکی رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ "اور یہ آنا (مراد: رسول اللہ ﷺ کے پاس آنا) آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے زمانے کے ساتھ خاص ہے، آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی قبر پر آنا اس آیت سے مراد نہیں لیا جا سکتا، وصال کے بعد آپ ﷺ کی قبر پر آنا یہ

بعید اور کمزور احتمال ہے، جسے امت کے کسی سلف یا ائمہ نے اختیار نہیں کیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ اور سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی نے اسے اختیار نہیں کیا۔ (فتح البیان)

جب کہ یہ بات درست نہیں ہے، اسلاف کے حوالہ جات ہم بیان کر چکے ہیں، یہ ایک مومن مخلص کی سعادت مندی ہے کہ وہ روضہ رسول اللہ ﷺ پر حاضری دے، تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے "شفاء السقام فی زیارت خیر الانام" میں بہت سی روایات پیش کی ہیں، جن میں آپ ﷺ کا وہ فرمان بھی موجود ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری قبر پر میرے وصال کے بعد حاضری دی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶۴ نقل کرنے کے بعد شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ اپنی کتاب "شفاء السقام فی زیارت خیر الانام" کے پانچویں باب میں ارشاد فرماتے ہیں "یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آنا، اللہ سے مغفرت طلب کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لیے استغفار کرنا باعثِ ترغیب ہے اور اگرچہ یہ آیت بظاہر آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے وقت کے لیے نازل ہوئی، مگر یہ مرتبہ آپ ﷺ کا ایسا ہے جو بطورِ تعظیم آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔ (شفاء السقام فی زیارت خیر الانام)

سوال اگر کوئی کہے: آپ ﷺ کی حیات میں تو لوگوں کا آپ ﷺ کے پاس آنا اس لیے تھا کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں، مگر وفات کے بعد ایسا نہیں۔

جواب آیت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پانا تین امور پر موقوف ہے ① رسول اللہ ﷺ کے پاس آنا۔ ② بندے کا اپنا استغفار کرنا۔ ③ اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لیے استغفار کرنا۔

رہا رسول اللہ ﷺ کا استغفار (دعائے مغفرت کرنا) تو وہ تمام ایمان والوں کے لیے حاصل ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مومن مردوں اور عورتوں کے لیے استغفار فرمایا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (محمد: ۱۹) اور اپنے گناہ اور مومن

مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بخشش مانگو۔ اسی لیے تابعی عاصم بن سلیمان رحمۃ اللہ نے صحابی رسول حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے استغفار کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں، اور تمہارے لیے بھی، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (مسلم، شفاء السقام فی زیارت خیر الانام)

یہ بات ثابت ہوگئی کہ تین امور میں سے ایک امر (یعنی رسول اللہ ﷺ کا تمام مومن مرد و عورت کے لیے استغفار) یقینی ہے، تو جب ان کا (یعنی گناہگاروں کا) آنا اور ان کا اپنا استغفار بھی موجود ہو جائے تو تینوں امور مکمل ہو جاتے ہیں جو اللہ کی توبہ اور رحمت کا سبب ہیں اور اس آیت میں یہ تعین نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا استغفار ان کے استغفار کے بعد ہی ہو، بلکہ آیت مجمل ہے، اور معنی کے اعتبار سے یہ مقتضی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا استغفار برابر ہے خواہ یہ (استغفار) آگے ذکر کیا جائے یا پیچھے، مقصود یہی ہے کہ آنے والوں اور استغفار کرنے والوں کو اس استغفار میں داخل کر دیا جائے جو نبی کریم ﷺ کے استغفار میں شامل ہوتا ہے اور یہ تفسیری پہلو صرف اس وقت درکار ہے جب ہم یہ مانیں کہ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ کو فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ پر عطف کیا جائے، لیکن اگر ہم اسے جَآءُوكَ پر عطف مان لیں، تو پھر اس وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (شفاء)

شیخ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب ہم یہ تسلیم کر لیں کہ نبی کریم ﷺ وفات کے بعد استغفار نہیں فرماتے، لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ آگے ہم آپ ﷺ کی (وفات کے بعد بھی) حیات اور آپ ﷺ کے امت کے لیے استغفار کا ذکر کریں گے اور جب استغفار آپ ﷺ کی طرف سے ممکن ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ آپ ﷺ کی رحمت اور امت پر شفقت کامل ہے، تو یہ لازمی طور پر سمجھا جائے گا کہ آپ ﷺ ایسے لوگوں کے لیے استغفار کو ترک نہیں کریں گے جو آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں۔

پس ہر صورت میں یہ ثابت ہے کہ آیت میں مذکور تینوں اُمور (یعنی: رسول اللہ ﷺ کے پاس آنا، اللہ سے استغفار کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لیے استغفار کرنا) ان سب کو حاصل ہیں جو آپ ﷺ کے پاس آئیں، خواہ آپ کی زندگی میں یا وفات کے بعد۔

شفاء السقام فی زیارت خیر الانام کے اس مقام پر حاشیہ میں شیخ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ نے حدیث سے اپنا مؤقف واضح فرمایا ہے، کہتے ہیں کہ حکیم ترمذی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب نوادرالاصول میں حضرت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَلَآ إِنِّي لَكُم بِمَكَانِ صِدقِ حَيَاتِي وَإِذَا مِتُّ. فَقَالَ عُمَرُ رضی الله عنه: يَارَسُولَ اللهِ! إِذَا مِتَّ؟. قَالَ: لَا أَزَالُ أُنَادِي فِي قَبرِي رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي، حَتَّى يُنفَخَ فِي الصُّورِ النَّفخَةُ الأُولٰى، ثُمَّ لَا تَزَالُ لِي دَعوَةٌ مُّجَابَةٌ حَتَّى يُنفَخَ فِي الصُّورِ النَّفخَةُ الثَّانِيَةُ. خبر دار! میں تمہارے لیے زندگی میں بھی سچائی اور خیر خواہی کے مقام پر ہوں اور جب وفات پا جاؤں تب بھی، اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا جائیں گے تو بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اپنی قبر میں مسلسل پکار کرتا رہوں گا، اے میرے رب! میری امت، میری امت، یہاں تک کہ صور میں پہلی بار پھونکا جائے، پھر میرے لیے ایک دعا قبول شدہ باقی رہے گی، یہاں تک کہ صور میں دوسری بار پھونکا جائے۔ (حاشیہ شفاء السقام فی زیارت خیر الانام)

شیخ تقی الدین سبکی شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں "اور اگرچہ آیت کا نزول مخصوص لوگوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہوا، لیکن علت کی عمومیت کے اعتبار سے یہ حکم ہر اُس شخص کو شامل ہے جس میں یہ وصف پایا جائے، خواہ زندگی میں ہو یا وفات کے بعد، اسی لیے علماء نے اس آیت سے دونوں حالتوں میں عموم سمجھا ہے اور مستحب قرار دیا ہے کہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ انور پر آئے، وہ یہ آیت تلاوت کرے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے۔ (شفاء السقام)

عام لوگوں کی قبروں پر جانے کا حکم: شیخ سبکی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں "اور اس بارے میں "عتبی" کا مشہور واقعہ بھی منقول ہے، جسے تمام مذاہب کے مصنفینِ مناسک اور مؤرخین نے ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو پسند کیا ہے، اور علماء کرام نے اس کو زائر کے آداب اور ان چیزوں میں شمار کیا ہے جو اسے بجالانی چاہئیں، اور ہم نے ان کا ذکر (شفاء السقام کے) بابِ سوم کے آخر میں کیا ہے، رہی سنت، تو وہ ہم نے (شفاء السقام کے) بابِ اوّل اور بابِ دوم میں ذکر کی ہے ان احادیث سے جو خاص طور پر

قبرِ مبارک کی زیارت پر دلالت کرتی ہیں اور صحیح متفق علیہ سنت میں بھی قبروں کی زیارت کا حکم آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا، وَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: زُوْرُوْا الْقُبُوْرَ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ، میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب تم ان کی زیارت کیا کرو۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: قبروں کی زیارت کیا کرو، یہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں۔

حافظ ابو موسیٰ اصفہانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب آداب زیارت القبور میں فرمایا: قبروں کی زیارت کا حکم ان احادیث سے ثابت ہے جو بریدہ رضی اللہ عنہ، انس رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہیں۔ (شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام)۔

مجھے حیرت ہے کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر عالم دین، ناصر الدین البانی رحمہ اللہ جیسے گہری نظر رکھنے والے عالم و نقاد کو زیارت قبر النبی ﷺ والی جملہ روایات کیوں ضعیف دکھائی دیں، کس بناء پر انہیں ضعیف کہا اور بڑی جرأت سے کہا، پھر جب ضعیف، موضوع اور جھوٹ کہنے سے دل نہیں بھرا تو وہ روایات شامل کتب کر دیں جن میں آپ ﷺ نے واضح طور پر اپنی قبر کو میلہ گاہ اور پرستش گاہ بنانے سے منع فرمایا، وہ روایات یہاں لا کر فٹ کر دیں، یہ ٹھیک ہے کہ ان دونوں صاحبان علم کے نزدیک اگر لوگوں کے لیے کسی چیز میں سہولت پیدا کی جائے تو لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی قدم آگے بڑھ جاتے ہیں، جیسے لوگ روضہ رسول اللہ ﷺ پر جا کر کوشش کرتے ہیں کہ وہاں ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگیں، جالیوں کو چومیں اور چاٹیں، دیواروں کو بوسہ دیں، ان چیزوں سے روکنے کے لیے باقاعدہ وہاں کے ذمہ داروں نے اہتمام کر رکھا ہے، مگر ان صاحبان نے تو حد کر دی۔

جب کہ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب شفاء السقام میں ان روایات کو بڑی عقیدت و محبت سے نقل کیا ہے، پھر شومئ قسمت کہ اس بہترین کتاب کے رد میں الصارم المنکی لکھ کر اس کتاب

کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن محبان رسول ﷺ کے دل سے شفاء السقام کی محبت اور اس کے اثرات کھرچنے سے بھی نہیں نکالے جاسکتے۔

قبر مصطفےٰ ﷺ سید القبور: رحمت دوعالم ﷺ ساری کائنات کے سردار ہیں، ساری مخلوقات کے سردار ہیں، بعد از خدا انہی کا مرتبہ اور مقام ہے، نبی کریم ﷺ کی قبر تمام قبروں کی سردار ہے اور ان قبروں کے عموم میں شامل ہے جن کی زیارت کا حکم دیا گیا ہے، جب باقی اہل ایمان کی قبروں پر جانے کا شریعت اسلامیہ نے حکم دیا، پیغمبر اعظم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ قبروں پر جایا کرو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی قبر پر جانے سے کوئی ممانعت کسی طرف سے آگئی ہو، شیخ سبکی نے اپنی کتاب شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالے سے اجماع نقل فرمایا ہے، سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ جان لینا چاہیے کہ علما اس بات پر متفق ہیں کہ مردوں کے لیے قبروں کی زیارت مستحب ہے، بلکہ بعض ظاہریہ نے مذکورہ حدیث کی بنا پر اس کو واجب کہا ہے اور ان حضرات میں سے جنہوں نے مسلمانوں کے اجماع کو استحباب (یعنی قبروں کی زیارت کو پسندیدہ عمل) پر نقل کیا ہے امام ابوزکریا النووی رحمہ اللہ ہیں۔ (شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام)

شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ شریعت سے یہ بات ثابت ہے کہ قبروں کی زیارت مردوں کے لیے جائز ہے اور نبی کریم ﷺ کی قبر اس عموم میں شامل ہے، لیکن ہمارا مقصود آپ ﷺ کی زیارت کے استحباب کو خاص طور پر ثابت کرنا ہے، خاص دلائل کی بنا پر، برخلاف دوسرے لوگوں کے، جن کی قبر کی زیارت ان کی خصوصیت کی وجہ سے مستحب نہیں، بلکہ عام حکمِ زیارتِ قبور کے تحت ہے اور دونوں معنوں میں فرق ظاہر ہے، پس آپ ﷺ کی زیارت عام دلائل سے بھی مطلوب ہے اور خاص دلائل سے بھی، بلکہ میں (سبکی) یہ کہتا ہوں کہ اگر دوسروں کی قبروں کی زیارت میں اختلاف ثابت بھی ہو جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی ﷺ کی قبر کی زیارت میں بھی اختلاف ہو، کیونکہ قبر کی زیارت تعظیم کے لیے ہے اور نبی ﷺ کی تعظیم واجب ہے، جبکہ دوسرے لوگوں کے بارے میں ایسا نہیں ہے، اسی معنی کے اعتبار سے میں (سبکی) کہتا ہوں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ نبی ﷺ کی زیارت میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں، اس لیے

بھی کہ اس طرف جانے میں عورتوں کے لیے کوئی مفسدہ نہیں، البتہ باقی قبروں کے بارے میں مردوں کے لیے ان کی زیارت پر اجماع ہے کہ وہ مستحب ہے۔(شفاء السقام)

شیخ سبکی فرماتے ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنا قربت (یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے، اس پر دلیل "قیاس" بھی ہے اور وہ اس طرح کہ نبی کریم ﷺ بقیع میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی قبروں پر گئے اور اُحد کے شہداء کی زیارت فرمائی اور یہ صرف آپ ﷺ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ دوسروں کے لئے بھی مستحب ہے، پس جب دوسروں کی قبروں کی زیارت مستحب ہے، تو آپ ﷺ کی قبر کی زیارت بدرجۂ اولیٰ مستحب ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا حق اور آپ کی تعظیم واجب ہے۔(شفاء السقام)

سوال دوسروں کی قبر کی زیارت اس لئے ہے کہ ان کے لئے استغفار کیا جائے، کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے اہلِ بقیع کے لئے استغفار فرمایا، اور نبی کریم ﷺ تو اس سے بے نیاز ہیں؟

جواب آپ ﷺ کی زیارت تعظیم کے لئے ہے، آپ ﷺ سے برکت حاصل کرنے کے لئے ہے اور تاکہ ہم پر رحمتیں نازل ہوں ہمارے درود و سلام کی وجہ سے، جیسے کہ ہم درود و سلام پڑھنے کے مکلف ہیں، آپ کے لئے "وسیلہ" مانگنے کے مکلف ہیں، حالانکہ یہ سب کچھ بغیر ہماری دعا کے بھی آپ ﷺ کو حاصل ہے، مگر نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس کی تعلیم دی تاکہ ہم اپنے دعا و سلام کے ذریعے ان رحمتوں کے مستحق بنیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس پر مرتب فرمایا ہے۔(شفاء السقام)

سوال دوسروں کی قبروں کی زیارت میں کوئی خطرہ نہیں، مگر آپ ﷺ کی قبر کی زیارت میں یہ اندیشہ ہے کہ تعظیم میں افراط نہ ہو جائے، یہاں تک کہ (نعوذ باللہ) عبادت تک پہنچ جائے؟

جواب یہ ایسا کلام ہے جس سے بدن لرز جاتے ہیں، اگر جاہل لوگ دھوکے میں نہ پڑ جاتے تو میں اس کا ذکر ہی نہ کرتا، کیونکہ اس میں دلائلِ شرعیہ کو چھوڑ کر باطل خیالی آراء پر تکیہ کرنا ہے، بھلا کیسے یہ بات روا ہو سکتی ہے کہ نبی ﷺ کے اس فرمان کو خاص کر دیا جائے، زُوْرُوا الْقُبُوْرَ قبرستانوں کی

زیارت کیا کرو، یا اس فرمان کو ترک کر دیا جائے، مَنْ زَارَ قَبْرِی وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِی، جس نے میری قبر کی زیارت کی اس پر میری شفاعت واجب ہو گئی۔ (شفاء السقام فی زیارت خیر الانام)

اور کیسے یہ جائز ہو گا کہ سلف اور خلف کے اجماع کی مخالفت کر دی جائے صرف ایسی خیالی باتوں کی بنیاد پر جن کی نہ کتاب سے تائید ہے نہ سنت سے۔ ہاں! آپ ﷺ کی قبر کو مسجد بنانے سے منع کیا گیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے بچاؤ کیا، کیونکہ اس بارے میں ممانعت آئی ہے، لیکن ہم اپنے طور پر دین میں احکام گھڑ لیں، یہ جائز نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ (الشوری:۲۱) کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین میں وہ چیزیں مقرر کیں جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟

مانعین زیارت قبر النبی ﷺ: جو شخص نبی ﷺ کی قبر کی زیارت سے منع کرتا ہے، وہ در اصل دین میں ایسی چیز کو داخل کر رہا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی اور اس کا قول مردود ہے، اگر ہم اس باطل خیالی دروازے کو کھول دیں، تو پھر ہمیں بہت سی سنتیں، بلکہ واجبات بھی چھوڑنے پڑیں گے، یہاں تک کہ قرآن پورا اور وہ اجماع جو دین کی ضروریات میں سے ہے، سب ہی ضائع ہو جائے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تمام علماء اور سلفِ صالحین رحمہم اللہ سب کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی تعظیم اور اس میں مبالغہ کرنا واجب ہے۔

عظمت، تعظیم اور ادب مصطفےٰ ﷺ میں مبالغہ واجب: اور جو شخص قرآنِ کریم پر غور کرے اور اس میں جو تصریح اور اشارے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت و تعظیم اور ادب میں مبالغہ کرنا واجب ہے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بارے میں کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے، تو اس کا دل ایمان سے لبریز ہو جائے گا اور وہ ایسے باطل خیالات کو حقیر سمجھے گا اور اس کی طرف کان دھرنے سے بھی انکار کرے گا اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے دین کا محافظ ہے، جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے، اس کے لیے کوئی ہادی نہیں۔

اور مسلمانوں کے علما پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کو یہ بات واضح کریں کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کتنا ادب و تعظیم لازم ہے اور وہ حد بھی بیان کریں جسے شرعی دلائل کے بغیر پار نہیں کیا جا سکتا، اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کا اندیشہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن جس کے بارے میں اللہ نے ضلالت کا فیصلہ فرما دیا ہو، ان جاہل افراد کو کوئی بھی ہدایت نہیں دے سکتا۔ پس جو شخص منصبِ نبوت کے لیے شرعاً ثابت تعظیم کو چھوڑ دے اور یہ گمان کرے کہ اس طرح وہ ربوبیت کا ادب کر رہا ہے، تو اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور اس نے رسولوں کے حق میں اللہ کے حکم کو ضائع کیا اور جو اس میں حد سے بڑھ جائے حتیٰ کہ ربوبیت کے درجے تک پہنچ جائے، اس نے بھی اللہ کے رسولوں پر جھوٹ باندھا اور اپنے رب کے حق میں کوتاہی اور کمی کی ہے، عدل وانصاف یہ ہے کہ دونوں پہلوؤں میں اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کو ملحوظ و محفوظ رکھا جائے اور مشروع زیارت میں ایسی کوئی تعظیم نہیں ہے جو کسی ممانعت کی طرف لے جائے۔ (شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام)

شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”مخلوق میں آپ ﷺ سے زیادہ بابرکت اور آپ ﷺ سے زیادہ ہم پر حق رکھنے والا کوئی نہیں، پس آپ ﷺ کی قبر کی زیارت میں جو معنیٰ ہے، وہ کسی اور میں نہیں اور نہ کوئی دوسرا آپ ﷺ کا قائم مقام ہو سکتا ہے، جیسے بیت اللہ کا بدل کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی، اسی طرح آپ ﷺ کی قبر کی زیارت بھی خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ اگرچہ خاص دلائل کے بغیر ہو تو بھی درست ہے، لیکن جب آپ ﷺ کی زیارت کے بارے میں احادیثِ خاصہ بھی وارد ہیں، تو پھر تو معاملہ بالکل واضح ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی قبر کی زیارت بذاتِ خود مستحب ہے، کیونکہ اس پر دلائلِ خاصہ بھی ہیں اور ایسے عمومی معنیٰ بھی ہیں جو کسی اور قبر میں جمع نہیں ہوتے۔ (شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام)

شیخ سبکی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں ”نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے علاوہ دیگر قبروں کی زیارت بھی باعثِ اجر ہے اور بعض اوقات یہ زیادہ مؤکد بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قریبی رشتہ دار کی قبر کی زیارت دوسرے کے مقابلے میں زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ اس میں قرابت داری کا تعلق بھی شامل ہے، لیکن

غیر قریبی مسلمان کی قبروں کی زیارت بھی باعثِ ثواب ہے، کیونکہ اس میں عبرت حاصل کرنا، دعا کرنا اور ترحم شامل ہے اور یہ تمام مسلمانوں کے حق میں عام ہے۔ (شفاء السقام)

شیخ سبکی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص کسی خاص قبر کی زیارت کرتا ہے، تو وہ جنسِ قبور کی زیارت کے سنت ہونے کا ثواب پاتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ فلاں خاص قبر کی زیارت بذاتِ خود سنت ہے، الّا یہ کہ اس قبر کے بارے میں خاص فضیلت یا صاحبِ قبر کی صلاحیت و فضیلت معلوم ہو، ورنہ اصل یہ ہے کہ تمام صالحین کی قبروں کی زیارت باعثِ قربت ہے، جیسے نماز عام طور پر ہر مسجد میں مطلوب ہے، مگر کسی خاص مسجد کی نماز بذاتِ خود مطلوب نہیں، سوائے ان تین مساجد (مسجد الحرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ) کے جن کی فضیلت شرعاً ثابت ہے، البتہ افضل مسجد کی فضیلت دوسری مساجد کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے، جیسے مسجد حرام کی فضیلت۔ (شفاء السقام)

سوال اگر کوئی شخص نذر مانے کہ میں نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت کروں گا، تو کیا یہ نذر منعقد ہو گی اور اس پر سفر کرنا لازم آئے گا؟

جواب ہاں! ہم کہتے ہیں کہ یہ نذر منعقد ہو گی اور اس پر قبرِ مبارک کی زیارت واجب ہو گی۔ امام قاضی ابن کج (شافعی فقیہ) نے اس کو صراحتاً ذکر کیا ہے اور ہمارے دیگر اصحاب میں اس کے خلاف کسی کا قول نہیں ملا، البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مستحب عمل نذر سے لازم ہو جائے، کیونکہ قربات کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم: وہ نیک اعمال جو بذاتِ خود عبادت نہیں بلکہ اچھے اخلاق و آداب ہیں، مگر شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے اور ان سے فائدہ عام ہے، مثلاً: مریض کی عیادت، آنے والوں کی ملاقات، سلام کو عام کرنا وغیرہ، اگر کوئی ان کے ذریعہ اللہ کی رضا چاہے تو ثواب ملے گا، اس قسم کی نذر کے لزوم میں دو قول ہیں، اور اصح یہی ہے کہ لازم ہو جاتی ہے، اسی میں جنازے کے ساتھ جانا، چھینکنے والے کو دعا دینا وغیرہ داخل ہے، دوسری قسم: وہ عبادات جو بذاتِ خود مقصود ہیں اور شریعت نے بطورِ عبادت ان کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے، مثلاً نماز، روزہ، صدقہ، حج۔ یہ نذر سے بالاتفاق واجب

ہو جاتے ہیں۔(شفاء السقام)حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ نذر صرف انہی اعمال میں منعقد ہو گی جن کا اصل واجب ہونا شرع میں موجود ہے۔(شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام)

سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ہر وہ عمل جو نذر سے لازم ہوتا ہے وہ قربت (عبادت) ہے، لیکن ہر قربت نذر سے لازم نہیں ہوتی اور نبی ﷺ کی قبر کی زیارت ان قربات میں سے ہے جو نذر سے لازم ہیں، اگر کسی عالم سے یہ منقول ہو بھی کہ نذر سے یہ لازم نہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے قربت ہی نہیں سمجھتے۔

حدیث کا ادھورا مفہوم، اجمالی تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے عشاقان مصطفے ﷺ کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بو دیے ہیں، جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قبر نبی ﷺ کی طرف اسی نیت سے سفر کرنا مشروع نہیں ہے، شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ انہیں متعصب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں ”میں نے بعض متعصب لوگوں کی بات دیکھی ہے جو باطل کی طرف جھکے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ قاضی اسماعیل نے ”المبسوط“ میں ذکر کیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کسی نے نذر مانی کہ وہ نبی ﷺ کی قبر پر آئے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر اس کی مراد مسجدِ نبوی ہے تو وہ وہاں آئے اور اس میں نماز پڑھے اور اگر اس کی مراد قبر ہے تو ایسا نہ کرے، کیونکہ اس حدیث میں آیا ہے: ”سواری نہ باندھی جائے مگر تین مساجد کے لیے۔“(شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام)

میں (حدوٹی) نے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاویٰ پر نگاہ ڈالی، جس میں وہ جب بھی کسی حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں یا امت مسلمہ کے کسی اجماعی خیال کو، نظریے کو اپنے خیالات کے مطابق نہیں پاتے تو وہ یہ بات کہہ کر اذہان کا رخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں کہ امام مالک مدینہ میں وہ شخص تھے جو نبی کریم ﷺ کی سنتوں کو بہت زیادہ جانتے تھے، ان کا عمل یہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں، وہ یہ کرتے تھے، حالانکہ اس بات سے کسی بات پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، نبی کریم ﷺ کے بہت سے ارشادات میں قبر نبی ﷺ پر حاضری کے بارے میں فرمایا گیا ہے، جو زیارت قبر النبی ﷺ کے لیے نہیں جاتے انہیں جفاکار کہا گیا ہے۔

شیخ سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات واضح ہوگئی کہ امام مالک رحمہ اللہ کے اس قول میں یہ مفہوم نہیں کہ زیارت قربت نہیں اور نہ یہ کہ سفر زیارت قربت نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سب علماء کے نزدیک زیارت قربت ہے، اسی لیے اگر کسی نے صرف مسجد نبوی جانے کی نذر مانی، تو وہ لازم ہے، البتہ اس کے ساتھ کوئی قربت مثلاً نماز کی نیت ہونا ضروری ہے، شیخ ابو علی السنجی رحمہ اللہ نے کہا: صرف زیارت ہی کافی ہے، رافعی رحمہ اللہ نے کہا: یہی ظاہر ہے۔ اور امام رحمہ اللہ نے اس میں توقف کیا، لیکن یہ توقف اس وجہ سے تھا کہ زیارت کا تعلق مسجد کی تعظیم سے نہیں، نہ یہ کہ زیارت قربت نہیں ہے۔ یہ تو کسی نے نہیں کہا، ہم نے پہلے امام عبدی المالکی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا کہ مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے جانا (قبرِ نبوی کی زیارت کے ساتھ) کعبہ اور بیت المقدس کی زیارت سے افضل ہے۔ (شفاء السقام فی زیارت خیر الانام)

مصطفوی فیصلہ دل سے ماننا تقاضائے ایمان ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز اس کے شان نزول پر روشنی ڈالیے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا {٦٥} النساء

جواب ترجمہ: بس نہیں آپ کے رب کی قسم وہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے جھگڑوں میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے جی میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کردیں۔

شان نزول: عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ زبیر رضی اللہ عنہ بیان کیا کرتے تھے کہ انہوں نے ایک انصاری شخص (جو غزوہ بدر میں شریک تھا) کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھگڑا کیا، یہ جھگڑا اس نہر (نالی) کے بارے میں تھا جو حرّہ کے علاقے میں تھی اور جس سے دونوں زمینوں کو پانی دیا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے زبیر! تم اپنی زمین کو سیر اب کرلو، پھر پانی اپنے

پڑوسی کے لیے چھوڑ دینا، یہ سن کر وہ انصاری شخص ناراض ہوا اور بولا: یارسول اللہ! کیا یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ (زبیر) آپ کی پھوپھی زاد بھائی ہیں؟

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: اے زبیر! اپنی زمین کو سیر اب کرو، پھر پانی کو روک لو یہاں تک کہ وہ (تمہاری زمین کے) کناروں تک پہنچ جائے، چنانچہ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا پورا حق صاف صاف دلوادیا، اس سے پہلے آپ ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک رائے دی تھی جس میں زبیر رضی اللہ عنہ اور انصاری دونوں کے لیے آسانی تھی، لیکن جب انصاری نے آپ ﷺ کو ناراض کیا تو آپ ﷺ نے صاف عدالتی حکم کے مطابق زبیر رضی اللہ عنہ کا پورا حق دلوادیا۔ عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: زبیر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم! مجھے گمان ہے کہ یہ آیت **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** اسی بارے میں نازل ہوئی (بغوی، اسباب النزول)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ: یہاں اللہ تعالیٰ نے دوبارہ قسم کھاتے ہوئے فرمایا: اے محمد (ﷺ)! آپ ﷺ کے رب کی قسم! یہ لوگ ہر گز ایمان نہیں لائیں گے یعنی وہ مجھ پر اور آپ ﷺ پر اس وقت تک سچا ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ﷺ کو اپنے آپس کے جھگڑوں اور اختلافات میں جج نہ بنائیں۔

فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ ان معاملات میں جن میں وہ آپس میں جھگڑ پڑیں اور جن میں شبہ اور الجھن پیدا ہو جائے، عرب کا محاورہ ہے، **شَجَرَ بَيْنَهُمُ الْأَمْرُ يَشْجُرُ شَجْرًا وَشُجُورًا** یعنی معاملہ ان کے درمیان تنازعہ اور اختلاف پیدا کرے، اس لفظ کی اصل "تداخل اور اختلاط" ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے، **شَجَرَ الْكَلَامُ** جب ایک کلام دوسرے میں داخل اور مخلوط ہو جائے اور اسی سے **اَلشَّجَرُ** (درخت) کا نام ہے، کیونکہ اس کی شاخیں آپس میں داخل اور گتھم گتھا ہوتی ہیں، ہودج کی لکڑیوں کو شجار کہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہیں، اسی طرح **تَشَاجُر** کو منازعہ اور جھگڑے کے لیے بولا جاتا ہے، کیونکہ جھگڑنے والوں کی باتیں ایک دوسرے کے خلاف اور دعوے متعارض ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا: پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے جی میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔ اور اس آیت میں اسمِ جلیل (اللہ تعالیٰ کا نام) کو نبی اکرم ﷺ کی طرف اضافت کے ساتھ ذکر کرنا "وَرَبِّكَ" اور آپ کے رب کی قسم، دراصل نبی کریم ﷺ کی تکریم اور عزت افزائی ہے اور آپ کی بلند شان و عظمت کو اجاگر کرنے کا ایک انداز ہے۔

حَرَجاً کے معنی ہیں: تنگی اور شک، اس کا اصل مطلب ہے کسی چیز کا جمع اور گھیراؤ ہونا، اسی سے گھنے اور جھنڈ والے درخت کو "حرج" کہا جاتا ہے کہ وہاں تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے، پھر یہ لفظ "دل کی تنگی" کے لیے استعمال ہونے لگا، جب کوئی بات ناپسند ہو یا بوجھ لگے، تو حاصلِ مفہوم یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو خبر دی تھی، تو یہ منافق لوگ، آپ کے رب کی قسم، کبھی بھی حقیقی ایمان نہیں لائیں گے، وہ ایمان جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہو، جب تک کہ وہ آپ ﷺ کو اپنے اختلافات میں حاکم نہ بنائیں اور ان معاملات میں آپ کی طرف رجوع نہ کریں جن میں وہ متنازع اور پریشان ہوں۔

آیت کے آخری حصہ میں ارشاد فرمایا وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کہ جب تک وہ آپ ﷺ کو پورا پورا تسلیم نہ کر لیں، ظاہری و باطنی تابعداری نہ کر لیں، دل و جان سے آپ ﷺ کا حکم تسلیم نہ کر لیں۔ فعل کی تاکید ہے، گویا کہ اسے دہرانے کے برابر ہے۔ یعنی ظاہری اور باطنی طور پر کامل طور پر تسلیم کرنا، بغیر کسی انکار، جھگڑے یا مخالفت کے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو جائے۔ (ابو نعیم، طبرانی)

غور و فکر و تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ مؤمن کا ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں تین اوصاف موجود نہ ہوں:

پہلا وصف: یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ کی طرف رجوع کرے (فیصلے کے لیے) اور آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی شریعت کی طرف۔ دوسرا وصف: یہ کہ اسلامی شریعت کے فیصلے کو جسے نبی ﷺ لے کر آئے، خوش دلی اور رضامندی کے ساتھ قبول کرے اور کامل یقین رکھے کہ جو کچھ شریعت فیصلہ کرے وہی حق اور عدل ہے۔ تیسرا وصف: یہ کہ اللہ کی شریعت کے احکام کے سامنے کامل طور پر جھک جائے اور ظاہراً و باطناً پوری طرح مطیع ہو، یعنی وہ مکمل اور حقیقی طور پر اطاعت و فرماں برداری اختیار کریں۔

عصمت انبیاء علیہم السلام: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں مسئلہ عصمت انبیاء کے بارے میں فرماتے ہیں، آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام فتویٰ دینے اور احکام بیان کرنے میں خطاء سے معصوم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فیصلوں کے سامنے جھکنے کو واجب قرار دیا ہے اور اس وجوب میں نہایت مبالغہ کیا ہے اور یہ وضاحت فرمائی ہے کہ یہ انقیاد و اطاعت ظاہر و باطن دونوں میں لازم ہے اور یہ بات ان سے خطا کے صدور کو ناممکن قرار دیتی ہے۔ (تفسیر الکبیر المعروف مفاتیح الغیب للامام الرازی)

اگر جانوں کے قتل اور گھروں سے خروج کا حکم دیا جاتا؟

سوال ان آیات کا ترجمہ مع تفسیر بیان کیجیے،

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا {٦٦} وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا {٦٧} وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا {٦٨} وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا {٦٩} ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا {٧٠} النساء

جواب ترجمہ: اور اگر ہم ان پر یہ لازم ہی قرار دے دیتے کہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دو یا

اپنے وطن سے نکل جاؤ تو ان میں بہت ہی کم لوگ اس پر عمل کرتے اور جس چیز کی نصیحت ان کو کی جارہی ہے اگر وہ اس پر عمل کرلیں تو ان کے لیے بہتر ہو اور زیادہ ثابت قدمی کا باعث ہو۔ اور اس وقت ان کو ہم اپنے پاس سے ضرور اجر عظیم عطا کرتے۔ اور ہم ان کو سیدھے راستے پر چلاتے۔ اور جو لوگ اللہ کی اور رسول کی فرمان برداری کریں سو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کافی ہے جاننے والا۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ: اور اگر ہم ان پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کرو یا یہ حکم دیتے کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو اس پر تھوڑے سے لوگ ہی عمل کرنے والے ہوتے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا اس وقت حکم دیا تھا جب سامری نے بچھڑے کی پوجا پر انہیں لگایا تھا، بچھڑے کی پوجا کرنے پر ایک لاکھ بندہ مشرک بن گیا تھا، ان کی معافی کی صورت یہ بنائی گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں، اس جرم کی پاداش میں ستر ہزار لوگوں کو قتل کیا گیا تھا، ان کے علاوہ تیس ہزار کی اس لیے بخشش ہوگئی تھی کہ وہ سچے دل سے قتل ہونے کے لیے تیار بیٹھے تھے، اگر نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کرنے والوں کے بارے میں بھی یہی حکم دیا جاتا کہ تم لوگ اس جرم کی پاداش میں ایک دوسرے کو قتل کرو تو کتنے لوگ ان میں ایسے تھے جو اس حکم کی تعمیل کرتے، اسی طرح اگر انہیں اپنے گھروں سے نکلنے کا حکم دے دیا جاتا، جیسے بنی اسرائیل کو مصر سے کوچ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو کتنے لوگ ایسا کرتے، اس پر فرمایا کہ تھوڑے ہی لوگ اس حکم کی تعمیل کرتے۔

ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ "جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے حکم دیں کہ اپنی جان کو قتل کروں تو میں ضرور ایسا کر گزروں گا، آپ ﷺ نے فرمایا اے ابو بکر رضی اللہ عنہ! تم نے سچ کہا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اگر یہ چیز فرض کی جاتی تو یہ بھی انہی قلیل افراد میں سے ہوتے

جو اس پر عمل کر لیتے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی آنحضرت ﷺ نے ایسا فرمایا، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے چند حضرات نے کہا کہ اگر ہمیں یہ حکم ہو گا تو ضرور عمل کریں گے، ان لوگوں کی یہ بات آنحضرت ﷺ کو پہنچ گئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ إِنَّ مِنْ أُمَّتِي رِجَالًا، اَلإِيمَانُ أَثْبَتُ فِي قُلُوبِهِم مِّنَ الرَّوَاسِي ایمان ان کے قلوب میں مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے پہاڑوں سے بھی زیادہ جما ہوا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے سب تعریف ہے جس نے ہمیں عافیت سے رکھا اگر ہمیں حکم ہوتا کہ اپنی جانوں کو قتل کریں تو ہم ضرور ایسا کر لیتے، آنحضرت سرور عالم ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ میری امت میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان جمے ہوئے پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ (روح المعانی، معالم التنزیل)

اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا کرنے کا حکم دیا جاتا تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایسا کرتا، اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایسا کرنے کا حکم دیا جاتا تو عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ایسا کرتے۔

علامہ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”مراد یہ ہے کہ ہم نے لوگوں پر اپنی جانوں کو ہلاک کرنا یا اپنے گھروں سے نکل جانا لازم نہیں کیا، کیونکہ اگر ہم ایسا کرتے تو ان میں سے بہت ہی تھوڑے لوگ اس پر قادر ہوتے، بلکہ جو ہم نے ان پر فرض کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں، ان کے فیصلے کے سامنے ظاہر و باطن میں جھک جائیں اور چھپے اور کھلے ہر حال میں آپ ﷺ کی ہدایت کو قبول کریں، آیت کریمہ کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر اپنے فضل و رحمت کا ایک پہلو ظاہر فرمایا ہے اور لوگوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پیروی کریں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا: آیت کے اس حصے میں اُن عمدہ نتائج کا ذکر ہے جو اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، مطلب یہ کہ اگر یہ لوگ،

جنہیں ہم نے اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے، وہی کچھ کر گزرتے جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے یعنی ہمارے رسول ﷺ کی پیروی کرتے اور ان کے فیصلے کے سامنے جھک جاتے، کیونکہ وہ سچے اور حق پر قائم ہیں اور خواہشِ نفس سے کچھ نہیں کہتے تو اگر وہ واقعی ایسا کرتے تو وہ عمل ان کے لیے دنیا اور آخرت میں بہتر ہوتا اور انہیں حق پر مزید ثابت قدمی عطا کرتا اور گمراہی سے محفوظ رکھنے والا ثابت ہوتا۔

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: اگر وہ (منافق) ہماری اطاعت پر قائم رہتے تو ہم اپنی طرف سے انہیں ایسا عظیم اجر عطا کرتے جس کی مقدار کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور ہم ان کو قبول کرتے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتے اور وہ راہ اسلام ہے کہ جس پر چلنے سے وہ اپنی دنیا اور آخرت میں کامیاب و خوش نصیب ہو جاتے۔

صاحبِ کشاف نے کہا: وَاِذًا دراصل ایک مقدر سوال کا جواب ہے، گویا پوچھا گیا ہو، ان کے ثابت قدم رہنے کے بعد انہیں اور کیا ملے گا؟ تو جواب دیا گیا: وَاِذًا لَوْ ثَبَتُوا لَاٰتَيْنَاهُمْ کیونکہ وَاِذًا یہاں جواب و جزا کے معنی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس عطیہ کو کئی طریقوں سے عظمت دی ہے، ایک یہ کہ لَاٰتَيْنَاهُمْ اور وَلَهَدَيْنَاهُمْ میں اپنی ذات کو عظمت کے صیغے سے ذکر فرمایا اور جب کوئی کریم و عظیم ہستی اپنی عظمت کے ساتھ عطیہ کا وعدہ کرے تو یہ اس عطیہ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ مِنْ لَّدُنَّا فرمایا، یعنی یہ عطیہ خاص ہماری طرف سے ہوگا، کسی اور کی طرف سے نہیں، اس خاص نسبت سے عظمت اور شرف کا اندازہ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا، وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ تیسرا یہ کہ اس اجر کو اَجْرًا عَظِيْمًا کہہ کر نکرہ لایا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اجر نہ کسی حد میں مقید ہے اور نہ ہی عقل اس کے کمال کا احاطہ کر سکتی ہے، یہی اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ فضلِ عظیم والا ہے۔

اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ یہ آیات اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ سے یہاں تک منافقوں کی نافرمانی اور فسق کو واضح کرتی ہیں، ان کے جھوٹے بہانوں کو بے نقاب کرتی ہیں، اللہ کے حکم سے ان کی نفرت کو خوبصورت اسلوب میں عیاں کرتی ہیں اور ان کی رذیل صفات کو اس انداز میں بیان کرتی ہیں

کہ اہلِ عقل انہیں حقیر جانیں اور ان سے دور رہیں, پھر ساتھ ہی ان کے علاج کا بہترین طریقہ بھی بتایا، توبہ کا دروازہ ان پر کھولا تاکہ وہ راہِ راست کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی جانوں کو برائی سے پاک کریں، اسی طرح امتِ مسلمہ پر اللہ کی تخفیف و آسانی کا ایک پہلو بھی واضح کیا، پھر اطاعت کرنے والوں کو اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا اور اللہ کے حکم کو چھوڑ کر غیر کے حکم کو ماننے والوں کو عذابِ الیم (دردناک عذاب) کی وعید سنائی اور انہیں بے ایمان قرار دیا۔

قرآن کریم کی ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے، مطالعہ کرتے ہوئے، ان پر غور و فکر و تدبر سے کام لیتے ہوئے یہ بات بہت ہی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جب ایک مسلمان کے پاس اللہ کے احکامات موجود ہیں، کتاب اللہ موجود ہے، کتاب اللہ میں روشن تعلیمات موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ کے فرامین وارشادات مرتب و مدوّن شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، ان کی شروحات کرنے والے علماء امت موجود ہیں، تو ان کی موجودگی میں اغیار کے پاس فیصلوں کے لیے جانا، اغیار کو اپنا رول ماڈل بنانا، اغیار کی نقالی کرنا یہ انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔

حضرات صحابہ کرام اور منافقین میں جہاں اور بہت سے امتیازات تھے وہاں سب سے نمایاں پہلو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور ارشادات پر سر تسلیم خم کرتے تھے، آپ ﷺ کی ایک ایک بات کو وہ عملی جامہ پہناتے تھے، جب کہ منافقین اپنے مطلب کی باتوں پر خاموشی اختیار کرتے تھے اور مطلب کے خلاف باتوں پر چیں بہ جبیں ہوتے، بڑبڑاتے، تبصرے کرتے اور لوگوں کے اَذہان خراب کرنے کی ناپاک کوشش کرتے، اسی لیے تو قرآن کریم میں باقی کافروں کے مقابلے ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اگر کافروں کو جہنم میں پھینکنے کی بات کی گئی ہے تو منافقوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکنے کی بات کی گئی ہے، حضرات مفسرین کرام نے اپنے عمدہ پیرایہ بیان میں اس کی وضاحت فرمائی ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالے سے فرمایا:

پہلی دلیل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ، یہاں طاغوت کے پاس فیصلہ کرانے کو اس پر ایمان قرار دیا اور طاغوت پر ایمان لانا یقیناً اللہ کا انکار کرنے کے مترادف ہے، جیسے کہ طاغوت کے کفر کو اللہ پر ایمان قرار دیا گیا ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ فرمایا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ ... وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا، یہ نص ہے کہ جو رسول ﷺ کے فیصلے پر راضی نہ ہو وہ مومن نہیں۔

تیسری دلیل یہ کہ فرمایا: فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ یعنی جو رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کرے، وہ بڑے فتنے یا دردناک عذاب کے خطرے میں ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ مخالفت بہت بڑا جرم ہے، ان آیات سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ یا رسول ﷺ کے کسی بھی حکم کو رد کرے، وہ اسلام سے خارج ہے، چاہے شک کی بنیاد پر رد کرے یا سرکشی کی بنا پر، اسی بنیاد پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زکوٰۃ کے منکرین کو مرتد قرار دیا، ان سے جنگ کی اور ان کی اولاد کو غلام بنایا۔ (تفسیر کبیر للرازی، تفسیر الوسیط للطنطاوی)

شیخ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ نے حضرت ولی اللہ تبریزی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا کہ امام مسلم نے روایت کی ہے: حضرت بلال بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ، إِذَا اسْتَأْذَنُوكُمْ عورتوں کو مسجد جانے سے نہ روکو، جب وہ اجازت مانگیں, تو بلال (بیٹے) نے کہا: وَاللهِ، لَنَمْنَعُهُنَّ واللہ ہم انہیں روکیں گے، یہ سن کر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی بات سنا رہا ہوں اور تم کہتے ہو، ہم روکیں گے؟ اور پھر انہوں نے بیٹے کو سخت برا بھلا کہا۔ (مسلم)

امام احمد کی روایت میں ہے کہ انہوں نے بیٹے سے عمر بھر کلام نہیں کیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ (الوسیط) سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر نے ان کی یہ بات سن کر انہیں اس قدر برا بھلا کہا کہ انہیں زندگی بھر ایسے کہتے نہیں سنا گیا۔ (الوسیط) یہ اس بات کی مثال ہے

کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کس قدر رسول اللہ ﷺ کی سنت پر سختی سے قائم تھے، یہاں تک کہ اپنے بیٹے کی اس غلطی پر ان سے کلام تک کرنا چھوڑ دیا، انہیں ڈانٹا، اس سے ناراض ہوئے، تعلقات توڑ ڈالے۔

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک بار امام ابن ابی ذئب نے نبی ﷺ کی حدیث بیان کی: مَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ، إِنْ أَحَبَّ أَخَذَ الْعَقْلَ، وَإِنْ أَحَبَّ فَلَهُ الْقَوَدُ جس کا کوئی مقتول ہو، وہ دو میں سے ایک اختیار رکھتا ہے، چاہے دیت (الْعَقْلَ) لے یا قصاص (الْقَوَدُ) لے، یہ سن کر ابو حنیفہ بن سماک نے کہا: کیا آپ بھی اس پر عمل کریں گے تو ابن ابی ذئب غضبناک ہوئے اور کہا، میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں اور تم پوچھتے ہو کہ میں اس پر عمل کروں گا یا نہیں؟ یہ ہم سب پر فرض ہے، اللہ نے محمد ﷺ کو چنا اور انہیں ذریعۂ ہدایت بنایا، پس مسلمانوں کے لیے رسول کریم ﷺ کی اتباع، اطاعت اور پیروی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا" ہمارا دین یہی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث آجائے اور اس کے خلاف کوئی ناسخ نہ ہو، تو ہم پر فرض ہے کہ اسی پر عمل کریں اور جو بھی اس کے مخالف ہو اسے چھوڑ دیں، خواہ وہ کتنا بڑا عالم کیوں نہ ہو، کیونکہ ممکن ہے کہ حدیث راوی کو بھول گئی ہو، یا اسے سمجھ نہ آئی ہو، یا اس نے کمزور تاویل کرلی ہو، یا وہ گمان کرے کہ اس کے خلاف کوئی دلیل ہے حالانکہ حقیقت میں نہ ہو، یا پھر وہ اپنے کسی بڑے کے قول پر اعتماد کرلے۔ (تفسیر الوسیط)

اللہ نے دونوں جہانوں کی سعادت رسول ﷺ کی اتباع کے ساتھ مشروط کی ہے اور دونوں جہانوں کی بد بختی آپ ﷺ کی مخالفت کے ساتھ جوڑی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ سلف صالحین رحمہم اللہ کس قدر سختی کے ساتھ سنتِ رسول ﷺ سے جڑے ہوئے تھے اور جو کوئی بھی اس سے پہلو تہی کرتا، اس سے اعراض وروگردانی کرتا تو وہ اس سے تعلق توڑ دیتے اور اسے چھوڑ دیتے تھے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا

شانِ نزول: کلبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت ثوبان مولی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازل ہوئی

جو رسول اللہ ﷺ کے بڑے چہیتے تھے اور ان کے لیے سخت بے قرار رہتے تھے، یہ ایک دفعہ آپ کے پاس آئے ان کا رنگ بدلا ہوا تھا اور جسم لاغر تھا، ان کے چہرے سے دکھ اور غم کے آثار نظر آرہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ اے ثوبان! تمہارے چہرے کا رنگ کیوں بدلا ہے انہوں نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی تکلیف یادَرد نہیں ہے، بات صرف یہ ہے کہ جب میں آپ ﷺ کو دیکھ نہیں پاتا تو میں آپ ﷺ کا مشتاق ہو کر اُداس ہو جاتا ہوں اور آپ ﷺ سے ملنے تک سخت وحشت کا شکار ہو جاتا ہوں، پھر مجھے آخرت کا دھیان آتا ہے تو مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ ﷺ کو وہاں نہ دیکھ سکوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے اور اگر میں جنت میں داخل بھی ہوا تو میں آپ ﷺ کے ادنی درجے میں ہوں گا اور اگر خدانخواستہ مجھے جنت میں داخل ہونا نصیب نہ ہوا پھر تو میں کبھی بھی آپ کو نہ دیکھ سکوں گا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

اس آیت میں چار قسم کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ فضیلت اور درجہ کے لحاظ سے بلند تر مقام رکھتے ہیں۔ ① انبیاء علیہم السلام اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ نبی ہی اپنی امت کا افضل ترین فرد ہوتا ہے جسے اللہ نبوت کے لیے چن لیتا ہے۔ ② صدیق سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے ہر معاملہ میں راست باز ہو حق کا ساتھ دینے والا، ہمیشہ سچ بولنے والا، حق کی فوراً گواہی دینے والا اور باطل کے خلاف ڈٹ جانے والا ہو۔ ③ شہید کا بنیادی معنٰی گواہ ہے اور اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرز عمل سے شہادت دیتا ہے، حتیٰ کہ اپنی جان دے کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا اسے فی الواقع درست سمجھتا تھا۔ ④ صالحین یہ صالح کی جمع ہے، صالح سے مراد ایسا نیک آدمی ہے جس کے ہر عمل اور ہر حرکت سے اس کی نیکی ظاہر ہوتی ہو اور اپنی پوری زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔

جو شخص اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہو، اس آیت میں اسے اُخروی زندگی میں مندرجہ بالا چار قسم کے لوگوں کی رفاقت کی خوشخبری دی گئی ہے اور یہ دراصل اس کے اعمال کا بدلہ نہیں بلکہ محض اللہ کا فضل ہو گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اور رسول اللہ ﷺ مسجد سے باہر نکل رہے تھے، دروازے پر ہمیں ایک آدمی ملا اور کہنے لگا، یارسول اللہ ﷺ! قیامت کب آئے گی؟ آپ نے اس سے پوچھا، مَا أَعْدَدْتَ لَهَا، فَكَأَنَّ الرَّجُلَ اِسْتَكَانَ ثُمَّ قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ مَا أَعْدَدْتُ لَهَا كَبِيْرَ صِيَامٍ وَّلَا صَلَاةٍ وَّلَا صَدَقَةٍ وَّلٰكِنِّي أُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ قَالَ أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ، کیا تونے قیامت کے لیے کچھ تیاری کر رکھی ہے؟ وہ کچھ جھینپ سا گیا اور کہنے لگا، یا رسول ﷺ! میں نے نہ کچھ لمبے چوڑے روزے رکھے ہیں نہ نماز ہے اور نہ صدقہ، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا تو قیامت کے دن اسی کے ساتھ ہو گا جس سے محبت رکھتا ہے۔ (بخاری، کتاب الاحکام)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مَا مِنْ نَبِيٍّ يَمْرَضُ إِلَّا خُيِّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ہر نبی کو اس کے مرض میں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہے تو دنیا میں رہے اور چاہے تو آخرت کو پسند کرے۔

پھر آپ ﷺ جب مرض الموت میں تھے تو میں نے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے، مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء ٦٩) تو میں سمجھ گئی کہ آپ کو بھی یہ اختیار ملا (اور آپ ﷺ نے سفر آخرت کو پسند فرمایا)۔ (بخاری)

ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ كُنْتُ أَبِيْتُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَتَيْتُهُ بِوُضُوْئِهِ وَحَاجَتِهِ، فَقَالَ لِيْ: سَلْ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ، فَقَالَ: أَوْ غَيْرَ ذَالِكَ؟ قُلْتُ: هُوَ ذَاكَ، قَالَ: فَأَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ میں رات کو رسول اللہ ﷺ کے پاس رہا کرتا اور آپ کے پاس وضو اور حاجت کا پانی لایا کرتا، ایک دفعہ (میں آپ کو وضو کروا رہا تھا تو) آپ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے؟ میں نے کہا، میں جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا، اس کے علاوہ کوئی اور بات بتاؤ، میں نے کہا، میں تو یہی چیز مانگتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا تو پھر کثرت سجود (نماز نوافل وغیرہ) کو اپنے آپ

پر لازم کرلو اور اس طرح اس سلسلہ میں میری مدد کرو۔ (مسلم، کتاب الصلوۃ) کیونکہ سجدہ ہی وہ عبادت ہے جس میں بندے کو اللہ سے نہایت قرب حاصل ہوتا ہے۔

مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر اس نے عرض کیا: يَا رَسُولَ اللهِ شَهِدْتُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللهِ وَصَلَّيْتُ الْخَمْسَ وَأَدَّيْتُ زَكَاةَ مَالِي وَصُمْتُ شَهْرَ رَمَضَانَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ مَّاتَ عَلَى هٰذَا كَانَ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ هٰكَذَا وَنَصَبَ أُصْبُعَيْهِ مَا لَمْ يَعُقَّ وَالِدَيْهِ (مسند احمد بن حنبل، بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

یارسول اللہ! میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بے شک آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتا ہوں، اپنے مال کی زکوٰۃ دیتا ہوں اور رمضان کے روزے رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: جو اس پر مرے گا وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا، آپ ﷺ نے انگلی کھڑی کی اور فرمایا جب کہ وہ اپنے والدین کا نافرمان نہ ہو۔

مسند احمد میں ہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ قَرَأَ أَلْفَ آيَةٍ فِي سَبِيلِ اللهِ كُتِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ، وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا، إِنْ شَآءَ اللهُ (مسند احمد، بحوالہ ابن کثیر) جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک ہزار آیات پڑھیں، وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ لکھا جائے گا اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی اچھی ہو گی۔

ترمذی میں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ، سچا، امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے احکام مانے گا، اللہ کی نواہی سے بچے گا، رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرے گا وہ کامیاب ہو جائے گا، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں مَنْ عَمِلَ بِمَا أَمَرَهُ اللهُ وَرَسُوْلُهُ، وَتَرَكَ مَا نَهَاهُ اللهُ عَنْهُ وَرَسُوْلُهُ، فَإِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يُسْكِنُهُ دَارَ كَرَامَتِهِ، وَيَجْعَلُهُ

مُرَافِقًا لِلْأَنْبِيَآءِ ثُمَّ لِمَنْ بَعْدَهُمْ فِي الرُّتْبَةِ ، وَهُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ، ثُمَّ الشُّهَدَآءُ،ثُمَّ عُمُوْمُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَهُمُ الصَّالِحُوْنَ الَّذِيْنَ صَلُحَتْ سَرَائِرُهُمْ وَعَلَانِيَتُهُمْ (ابن کثیر)

جس شخص نے اس پر عمل کیا جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا تھا اور اس چیز کو چھوڑ دیا جس سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے منع کیا تھا، تو اللہ اسے اپنی عزت والے گھر میں ٹھہرائیں گے، اسے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا رفیق بنائیں گے، پھر ان کے بعد جن کا رتبہ اور مقام ہے ان کا رفیق بنائیں گے، وہ صدیقین، شہدا کا رفیق بنائے گا، پھر عام ایمان والوں کا رفیق بنائے گا اور وہ وہ لوگ ہوں گے جن کا ظاہر اور باطن نیک تھا۔

آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا اور اچھے ہیں وہ رفیق، یہ پچھلی بات کی تاکید کے لیے ہے اور یہ نیک عمل کرنے کی ترغیب کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے ہے، جو مسلمان کو ان بلند مرتبہ بزرگوں کی رفاقت تک پہنچاتا ہے، لفظ حَسُنَ فعل ہے جو مدح (تعریف) کے لیے بولا گیا ہے اور نِعْمَ کے حکم میں ہے اور اس میں ان کی حسن وخوبی پر تعجب کا مفہوم بھی شامل ہے، اشارہ أُولٰٓئِكَ ان چاروں گروہوں کی طرف ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی طرف۔

رفیق اس ساتھی کو کہتے ہیں جو کسی کام، سفر یا کسی اور چیز میں ساتھ رہے، اسے رفیق اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رہتا ہے اور آپ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے اپنی ضروریات کے پورا کرنے میں مدد لیتے ہیں، یہ لفظ رفق سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں نرمی اور خوش اخلاقی کے ساتھ رہنا، یہ لفظ جمع کی صورت میں نہیں آیا کیونکہ فَعِيْلٌ کا صیغہ واحد اور جمع دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ پس معنی یہ ہوا کہ ان نیک بندوں میں سے ہر ایک خواہ وہ نبی ہوں یا صدیقین ہوں، یا شہدا ہوں، یا صالحین ہوں جنت میں نہایت اچھے رفیق اور ساتھی ہوں گے، کیونکہ ان میں سے کسی کی بھی رفاقت دلوں کو کشادہ کرتی ہے اور روح کو مسرت بخشتی ہے۔

یہاں مدح کا مخصوص لفظ حذف کیا گیا ہے، گویا مطلب یہ ہوا ان میں سے ہر ایک رفیق کتنا اچھا

ہے، یا یہ کہ مذکورین یا تعریف کیے گئے لوگ کتنے اچھے رفیق ہیں کیونکہ حَسُنَ کا حکم نِعْمَ جیسا ہے، لفظ أُولٰٓئِكَ فاعل ہے حَسُنَ کا اور رَفِيْقًا اس کی تمیز ہے۔

صاحبِ کشاف نے کہا کہ اس جملے وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقاً میں تعجب کا معنی پایا جاتا ہے، گویا کہا گیا ہو، وَمَا أَحسَنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا، یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں اور اسی لیے چونکہ اس میں تعجب کا مفہوم خود ہی موجود ہے، اس کی ایک قرأت میں حَسُن کو سکونِ سین کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا: یہ اللہ کا فضل ہے، جو نیکوکاروں کو عطا ہو گا، یہ عظیم فضل اللہ کی طرف سے ہے، کسی اور کی طرف سے نہیں۔

آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا اور اللہ ہی علم رکھنے والا کافی ہے، سے مقصود یہ ہے کہ یہ نیک لوگ جنہوں نے بہترین اعمال کیے اور سب سے اعلیٰ اجر کے مستحق ٹھہرے، اگرچہ لوگ انہیں نہ پہچانیں، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے اور اس نے انہیں وہی بدلہ عطا فرمایا جس کے وہ مستحق ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و عطا کے مستحق اور غیر مستحق کو بخوبی جانتا ہے، وہ ایسی ذات ہے جس پر اپنی مخلوق کے کسی بھی حال کی کوئی بات پوشیدہ نہیں، یہ آیتِ مبارکہ دراصل مسلمان کو نیک اعمال کی تیاری کی ترغیب دیتی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے اور ان سے ان کے اعمال پر حساب لینے والا ہے، تو عقل مند کے شایانِ شان ہے کہ وہ نیکی میں رغبت کرے اور گناہوں سے دور بھاگے۔

جہاد فی سبیل اللہ اور دفاعی تیاری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا {۷۱} وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا {۷۲} وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا {۷۳} النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! (دشمن سے مقابلے کے وقت) اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ رکھو، پھر الگ الگ دستوں کی شکل میں (جہاد کے لیے) نکلو، یا سب لوگ اکٹھے ہو کر نکل جاؤ۔ اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ضرور ہو گا جو (جہاد میں جانے سے) سستی دکھائے گا، پھر اگر (جہاد کے دوران) تم پر کوئی مصیبت آجائے تو وہ کہے گا کہ اللہ نے مجھ پر بڑا انعام کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ اور اگر اللہ کی طرف سے کوئی فضل (یعنی فتح اور مال غنیمت) تمہارے ہاتھ آئے تو وہ کہے گا گویا تمہارے اور اس کے درمیان کبھی کوئی دوستی تو تھی ہی نہیں۔ کہ کاش میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتا تو بہت کچھ میرے بھی ہاتھ لگ جاتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ: اے ایمان والو! (دشمن سے مقابلے کے وقت) اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ رکھو، امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کی اُمت کے مخلص اہل ایمان کے نام ہے، اس میں ان کو کافروں سے جہاد کرنے، اللہ کے راستے میں نکلنے اور دین کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور اس کا پچھلی آیات سے ربط یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ذکر کیا گیا تو اب ان اہلِ طاعت کو حکم دیا گیا کہ وہ دین کو زندہ کرنے اور اس کی دعوت کو بلند کرنے کے لیے کھڑے ہوں، ساتھ ہی ان کو یہ بھی تاکید کی گئی کہ وہ بغیر تحقیق و احتیاط کے دشمن پر حملہ نہ کریں، بلکہ پہلے دشمن کی قوت اور حالت معلوم کریں، پھر مناسب حکمتِ عملی اختیار کریں، اسی لیے فرمایا گیا: **خُذُوْا حِذْرَكُمْ** دشمن سے مقابلے کے وقت اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ رکھو یعنی ان کو جنگی تربیت دی گئی، دشمن کے مقابلے میں تیاری یہ ایسا حکم دیا گیا ہے جو ہرگز توکل کے خلاف نہیں، بلکہ یہ عین توکل ہے۔

لفظ **حِذْرٌ** اور **حَذَر** دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، جیسے **إِثْرٌ** اور **أَثَر**، کہا جاتا ہے: **أَخَذَ فُلَانٌ حِذْرَهُ** فلاں نے اپنا حفاظتی سامان لے لیا ہے یعنی وہ ہوشیار اور محتاط ہو گیا ہے جس چیز سے وہ ڈرتا تھا، گویا اس نے حذر (حفاظتی سامانا) کو اپنی ڈھال اور بچاؤ کا ہتھیار بنا لیا ہے، یہاں یہ بات بطورِ کنایہ اور

تخیل بیان کی گئی ہے کہ گویا حذر (حفاظتی سازوسامان) ایک ہتھیار ہے جس سے انسان اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اے مؤمنو! اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے ہمہ وقت تیار رہو، بیدار رہو اور ہمیشہ مضبوط ایمان اور ایسے ہتھیار کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو جو ان کے ہتھیاروں کو توڑ دے۔

شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے اس بارے میں نہایت عمدہ بات کہی ہے، فرماتے ہیں: ''حِذرٌ'' کا مطلب ہے دشمن کے شر سے بچاؤ کے لیے احتیاط اور تیاری، یہ تیاری اس طرح ہو کہ دشمن کی حالت، اس کی قوت اور تیاری کی سطح معلوم کی جائے، اس کی زمین اور علاقے کی واقفیت حاصل کی جائے، کیونکہ عرب کے محاورے میں ہے قَتَلَتْ أَرضٌ جَاهِلَهَا زمین اپنے جاہل کو ہلاک کر دیتی ہے، حذر میں یہ سب داخل ہے کہ ہتھیاروں کو جانا جائے اور ان کے استعمال کی مہارت ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے دشمن کی زمین اور حالات سے واقف رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ کی خبریں لانے والے جاسوس بھی تھے، جب انہوں نے خبر دی کہ قریش نے صلح کا عہد توڑ دیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً مکہ فتح کرنے کی تیاری کی اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جنگِ یمامہ کے موقع پر خالد رضی اللہ عنہ کو فرمایا، حَارِبْهُمْ بِمِثْلِ مَا يُحَارِبُونَكَ بِهِ، اَلسَّيْفَ بِالسَّيْفِ، وَالرُّمْحَ بِالرُّمْحِ جس ہتھیار سے وہ تم سے لڑیں، اسی ہتھیار سے تم بھی لڑو، تلوار کے مقابلے میں تلوار، نیزے کے مقابلے میں نیزہ، یہ نہایت حکیمانہ جملہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ قول و عمل واضح کرتا ہے کہ تیاری ہمیشہ دشمن کی قوت اور حالت کے اعتبار سے ہوگی۔ (تفسیر المنار ج ۵) ملاحظہ فرمائیے کہ یہ مختصر جملہ خُذُوا حِذْرَكُمْ ہر زمانے اور ہر مقام کے مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر ممکن تیاری کریں، مختلف طریقے اور وسائل اپنائیں تاکہ امت مسلمہ کے دشمن ان سے مرعوب رہیں، چاہے وہ اندرونی ہوں یا بیرونی۔

فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا: پھر نکلو (جہاد کے لیے) تھوڑے تھوڑے گروہ ہو کر یا سب کے سب اکٹھے، یہ اس لیے ہے کہ جب وہ اپنا حذر (بچاؤ کا سامان) اختیار کر لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا

کہ جہاد کے لیے کون سا طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ لفظ اِنْفِرُوْا کا مطلب ہے کسی کام کے لیے جلدی سے نکل کھڑا ہونا، قرآن میں دوسرے مقام پر ہے وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبہ: ۱۲۲) اور یہ مناسب نہیں کہ سب کے سب مؤمن نکل کھڑے ہوں، پھر ایسا کیوں نہ کیا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل جائے تاکہ وہ دین میں سمجھ بوجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم کی طرف پلٹیں تو انہیں ڈرائیں، تاکہ وہ (گناہوں سے) بچیں۔

عرب کے محاورے میں آتا ہے: نَفَرَ الْقَوْمُ یعنی لوگ دشمن کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اِستَنفَرَ الإِمَامُ النَّاسَ یعنی امام نے لوگوں کو جہاد پر ابھارا۔ النَّفِیر ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو جہاد کے لیے نکلیں۔ ثُبَات، ثُبَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں جماعت یا دستہ۔ یہ لفظ ثَبَا یَثْبُو سے ہے یعنی جمع ہونا، اس کا مفہوم یہ ہے، اے مؤمنو! اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے ہمیشہ تیار رہو، ان کی چالوں سے غافل نہ رہو، جب ان سے لڑنے کا وقت آئے تو جلدی سے ان کے مقابلے کے لیے نکلو، کبھی گروہ در گروہ، اور کبھی سب کے سب مل کر، کیونکہ کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوگا کہ مرحلہ وار گروہ نکلیں اور کبھی ضروری ہوگا کہ ایک بڑا لشکر اکٹھا ہو کر نکلے، پس اپنی جنگی حکمتِ عملی حالات کے مطابق اپناؤ تاکہ دشمن کو شکست دو اور غالب آؤ، ثُبَات اور جَمِیْعاً دونوں حال ہیں اِنْفِرُوا کی ضمیر سے، یعنی نکلو یا تو الگ الگ، اکیلے اکیلے ہو کر یا سب کے سب جمع ہو کر، دستے بنا کر، ٹولیاں بنا کر، جتھوں کی صورت میں۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اِنْفِرُوا جَمِیْعًا یعنی ایک ساتھ اکٹھے ہو کر، جب لشکر جمع ہوتا ہے تو اسے کَتِیْبَةٌ کہا جاتا ہے (فوج کا بڑا دستہ، بٹالین) اگر اس میں سے ایک حصہ الگ نکلے تو اسے سَرِیَّةٌ کہا جاتا ہے، جو پانچ آدمیوں سے لے کر تین سو یا چار سو تک ہوتا ہے، اس سے زیادہ ہو تو مَنْسَر کہلاتا ہے جو آٹھ سو تک ہوتا ہے، اس سے زیادہ ہو تو جَیْشٌ کہا جاتا ہے، یہ چار ہزار تک پر بولا جاتا ہے، پھر اگر اس سے بھی بڑھ جائے تو جَحْفَلٌ کہا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ بڑھنے پر خَمِیْسٌ

کہا جاتا ہے جو ایک بہت بڑا لشکر ہے اور اگر سرّیہ (چھوٹا دستہ) مزید تقسیم ہو جائے تو اسے بَعث کہتے ہیں۔ (روح المعانی بحوالہ تفسیر الوسیط)

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اگرچہ یہ آیت جنگ کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں میں بھی جس طرح ممکن ہو جلدی کرنی چاہیے، اس سے پہلے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ (الوسیط)

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ: یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور کمزور ایمان والوں کے دلوں کی خرابی کو ظاہر فرمایا اور فرمایا اور تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ضرور سستی اور کسل مندی سے کام لیں گے، یعنی جہاد سے پیچھے رہ جائیں گے اور اس میں سستی کریں گے، یہ لفظ بَطَّأَ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں دیر کرنا، پیچھے رہ جانا، اصل میں یہ فعل لازم ہے، مگر کبھی متعدی کے طور پر بھی آتا ہے، اسی اعتبار سے یہاں اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی پیچھے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی جہاد سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، منافقوں اور کمزور ایمان والوں نے دونوں باتیں جمع کر لیں، وہ خود جہاد سے پیچھے رہتے، جھوٹے بہانے بناتے اور پھر دوسروں کو بھی جہاد کے لئے نکلنے سے روکتے۔

قرآن نے لفظ لَيُبَطِّئَنَّ کے ذریعے ان کی کیفیت کو انتہائی بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، گویا ان کے باطن کی حالت دکھائی جا رہی ہے کہ وہ اپنے دل کو باندھتے ہیں، وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور دوسرا پیچھے ہٹا لیتے ہیں، یہ طریقہ وہ اس وقت اختیار کرتے ہیں جب اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کا حکم دیا جاتا ہے۔

یہ آیت کئی تاکیدوں پر مشتمل ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ منافق لوگ کبھی بھی بغاوت کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، وہ پورے زور اور محنت کے ساتھ مجاہدین کے حوصلے توڑتے ہیں اور انہیں مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جائیں، یہی منافقین کی عادت ہے۔

اللہ نے فرمایا، مِنْكُمْ یعنی وہ تمہارے ہی اندر سے ہیں، تمہارے ساتھ رہتے ہیں، رشتہ داری رکھتے ہیں، اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں منافق ہیں، مدینہ میں منافقین اور مخلص

مسلمانوں کے درمیان کئی قسم کے تعلقات موجود تھے، جو تاریخ اسلامی کا مطالعہ رکھنے والے طالب علموں کو اچھی طرح معلوم ہیں جیسے منافقوں کے سردار عبد اللہ بن اُبَی بن سلول کا بیٹا ایک سچا مومن تھا۔ قرآن کریم نے مومنین کو خطاب کیا تاکہ ان پر ان منافقوں کو ظاہر کر دے جو ان کی صفوں میں گھسے ہوئے ہیں، تاکہ وہ ان سے بچ کر رہیں، محتاط رہیں۔

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ لَمَنْ میں جو لام ہے وہ ابتدائیہ ہے، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: إِنَّ اللّٰهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ اور لَيُبَطِّئَنَّ دراصل ایک محذوف قسم کا جواب ہے، گویا یوں کہا جارہا ہے: وَإِنَّ مِنْكُم لَمَن أَقسَمَ بِاللّٰهِ لَيُبَطِّئَنَّ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ضرور سستی کریں گے، یہاں مَن کے ساتھ جملہ اس کا صلہ ہے اور اس کا ضمیر لَيُبَطِّئَنَّ ہی کی طرف لوٹتا ہے اور یہ خطاب دراصل رسول اللہ ﷺ کے لشکر کے لئے ہے۔ (تفسیر کشاف)

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھیے کہ منافقین کی ایک بڑی تعداد حضور ﷺ کے ارد گرد تھی، جو آپ ﷺ کے بیانات سنتے تھے، مجلسوں میں بیٹھتے تھے، ان کی حرکات وسکنات سے قرآن کریم آگاہ کرتا چلا جاتا ہے، جہاں بھی مسلمانوں، کافروں اور منافقوں کا ذکر آئے گا وہاں سب سے زیادہ عتاب اور غصہ منافقین پر ہی دکھایا گیا ہے، ان کے سارے مکر وفریب کو عالم آشکار کیا گیا ہے، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی گردن ناپنے کا خیال کرتے تو نبی کریم ﷺ شماتتِ اَعداء کی وجہ سے انہیں روک دیتے تھے۔

فَإِنْ أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا: اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا، اندازہ لگائیے کہ منافقوں کے دلوں میں کس قدر فساد اور کھوٹ چھپا ہوا ہے اور ان کی زبانوں پر کیسا برا کلام جاری ہوتا ہے، پہلے پہل تو منافقین یوں کرتے ہیں کہ وہ جہاد میں سستی دکھاتے ہیں، اسی سستی کاہلی اور درونی کھوٹ اور اسلام دشمنی کی وجہ سے جہاد کے لیے بذات خود نہیں نکلتے، پھر ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی ان کی طرح پیچھے رہ جائیں، میدان جہاد میں اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت آجائے، جیسے

وقتی شکست یا مسلمانوں میں سے کچھ لوگ شہید ہو جائیں، تو یہ منافقین خوشیاں مناتے ہیں، بغلیں بجاتے ہیں، پھر یہ منافقین ترنگ میں آکر کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم پر بڑا انعام کیا کہ ہم ان کے ساتھ موجود نہ تھے، یعنی اگر ہم ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہوتے تو ہمیں بھی قتل، زخم یا درد و اَذیت پہنچتی، یہاں اگرچہ قرآن کریم میں منافقین کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن ان میں سے ہر منافق کا اندازِ گفتگو اور طرزِ سخن یہی تھا، الغرض یہ آیت منافقوں کے حال کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ مومنوں کے ساتھ جہاد میں شریک نہ ہونے کو نعمت سمجھتے ہیں۔

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا: لیکن اگر مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے غلبہ مل جائے، فتح و نصرت حاصل ہو اور غنیمت ہاتھ آئے، تو یہی منافق حسرت و ندامت میں کہتے ہیں، کاش ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے تو ہمیں بھی بڑا فائدہ حاصل ہوتا، قرآن ان کا یہ حال بیان کرتا ہے کہ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح، مالِ غنیمت یا کامیابی ملے تو یہ منافق اس طرح کہے گا جیسے تمہارے اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا، کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو مجھے بھی بڑا فائدہ ملتا۔

مفسر قرآن ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا کہ اگر یہ منافق جنگ میں شریک ہوں گے تو صرف غنیمت کے لالچ میں شریک ہوں گے اور اگر پیچھے رہیں گے تو دل کے شک اور کمزوری کی وجہ سے رہیں گے، نہ ان کا شریک ہونا ثواب کی نیت سے ہے اور نہ پیچھے رہنے پر وہ اللہ کی پکڑ سے ڈرتے ہیں۔ (تفسیر ابن جریر ج ۵)

اللہ تعالیٰ نے یہاں فضل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ، لیکن "مصیبت" کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا، اس میں ادبِ الٰہی کی تعلیم ہے، اگرچہ ہر چیز اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، لیکن فضل و انعام کا عطا کرنا اسی کی شان ہے اور روک لینا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔

آیت میں جملہ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ بطورِ اعتراض آیا ہے تاکہ ان منافقوں

کے حال پر طنز و تعجب کیا جائے، یعنی وہ مومنوں کے ساتھ رہتے ہوئے، ان کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی جہاد میں شریک نہ ہوئے اور جب مسلمانوں کو مالِ غنیمت ملا تو اس پر حسرت کرتے ہیں کہ کاش ہم بھی ساتھ ہوتے، حالانکہ یہ حسرت بے موقع ہے، کیونکہ انہیں جہاد اور اس کے نتائج کا علم تھا، اگر چاہتے تو شامل ہو سکتے تھے، لیکن بدنیتی اور کج روی کی وجہ سے شامل نہ ہوئے۔

گویا اللہ تعالیٰ مومنوں سے فرماتا ہے، دیکھو اور تعجب کرو! یہ ہیں منافقین کہ جب تمہیں مصیبت پہنچی تو خوش ہوئے اور جب تمہیں فتح و غنیمت ملی تو افسردہ ہوئے اور حسرت کرنے لگے، حالانکہ ان کی حسرت لاحاصل ہے، ان کے اس قول یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا کاش! میں ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا، سے ان کے حالات پر تعجب دلانا مقصود ہے، ان کے رویے کی تحقیر مقصود ہے اور ان پر بد دعا کی گئی ہے کہ وہ اپنی حسرت پر مزید حسرت میں مبتلا ہوں۔

ان آیات میں مومنین کو حکم ہے کہ ہر وقت دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہیں، ساتھ ہی منافقوں کی رذیل خصلتیں ظاہر کی گئی ہیں کہ وہ مومنوں کے نقصان پر خوش ہوتے ہیں اور ان کی کامیابی پر حسرت کرتے ہیں، یوں یہ آیات منافقوں کے چہروں سے نقاب ہٹا دیتی ہیں اور مومنین کو ان کے شر سے ہوشیار کرتی ہیں۔

میدان جہاد میں مسلمان کی فتح یا شکست کا صلہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا {۷۴} وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا {۷۵} اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا {۷۶} النساء

جواب ترجمہ: لہٰذا اللہ کے راستے میں وہ لوگ لڑیں جو دنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ دیں۔ اور جو اللہ کے راستے میں لڑے گا، پھر چاہے قتل ہو جائے یا غالب آجائے، (ہر صورت میں) ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے۔ اور (اے مسلمانو) تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو یہ دعا کر رہے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لائیے جس کے باشندے ظلم توڑ رہے ہیں، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حامی پیدا کر دیجیے، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کر دیجیے۔ جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ طاغوت کے راستے میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا (اے مسلمانو!) تم شیطان کے دوستوں سے لڑو۔ (یاد رکھو کہ) شیطان کی چالیں درحقیقت کمزور ہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ: اور اس سخت ملامت اور سرزنش کے بعد جو جہاد سے کترانے والوں پر کی گئی، قرآنِ کریم نے مسلمانوں کے حوصلے اور عزائم کو جہاد کے لیے ابھارنا شروع کیا، اللہ کے راستے میں وہ لوگ لڑیں جو دنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ دیں۔ یہاں فاء دراصل ایک شرط مقدر کے جواب کو واضح کرنے کے لیے آئی ہے، یعنی اگر یہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے جہاد اور قتال سے پیچھے ہٹیں اور سستی دکھائیں، تو پھر ایمان دار اور سچے مسلمان لڑیں، جو اپنی دنیاوی زندگی کو اس کی لذتوں اور خواہشات سمیت بیچ دیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا آخرت میں حاصل کر سکیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** اللہ کے راستے میں، اس سے یہ تنبیہ مقصود ہے کہ یہی قتال اللہ کے نزدیک معتبر اور قابلِ قبول ہے، کیونکہ ایک مومنِ صادق جنگ اس لیے نہیں کرتا کہ نام پیدا کرے یا مال غنیمت حاصل کرے یا دوسروں کا حق چھینے، بلکہ وہ صرف اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور کافروں کا کلمہ دب جائے۔

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا: اور جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے، پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب آجائے، تو ہم عنقریب اسے بڑا اجر عطا کریں گے، یعنی جو

بھی اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے جہاد کرے، چاہے وہ شہادت پا جائے یا دشمن پر فتح پائے، ہم اسے ایسا عظیم اجر دیں گے جس کا اندازہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں لگا سکتا، اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف دو حالتوں کا ذکر کیا ہے، شہادت اور دشمن پر غلبہ، اس لیے کہ ایک سچا مجاہد جہاد کرتے وقت انہی دو باتوں کو اپنے سامنے رکھتا ہے، یا تو شہید ہو جانا یا اللہ کے دشمنوں پر غالب آنا، جب وہ اپنے آپ کو ان دونوں پر راضی کر لیتا ہے، تو وہ جم کر لڑتا ہے اور اخلاص کے ساتھ جہاد کرتا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے قتل کو غلبہ سے پہلے ذکر کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مخلص مجاہد کی تمنا شہادت کی نسبت فتح پر زیادہ ہوتی ہے۔

اور فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا عنقریب ہم اسے عظیم اجر عطا کریں گے، میں "سوف" کا استعمال اس بات کے لیے ہے کہ یہ اجر ضرور مستقبل میں حاصل ہو گا، اس میں کوئی شک نہیں، اللہ نے اجر کو نکرہ ذکر کیا اور اسے "عظیم" فرمایا تاکہ یہ بات سمجھا دے کہ یہ ایسا اجر ہے جس کی نہ کوئی حد متعین کی جا سکتی ہے، نہ اس کی حقیقت کو الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے، اس کا اصل حال صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا: یہاں اللہ تعالیٰ نے نہایت بلیغ انداز میں مؤمنوں کو جنگ پر آمادہ کیا اور فرمایا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے؟ یہ خطاب مؤمنوں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لیے التفات کے اُسلوب میں کیا گیا ہے تاکہ زیادہ مؤثر ہو اور جہاد کے وجوب پر زور دیا جا سکے۔ مَا یہاں استفہامیہ ہے اور لَكُمْ اس کی خبر ہے اور جملہ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حال کے طور پر آیا ہے، اس سوالیہ انداز سے مقصود مؤمنوں کو جہاد پر اُبھارنا اور ان پر یہ نکیر کرنا ہے کہ تمہاری لڑائی سے رکنے کی کیا وجہ ہے، جبکہ اس کے اسباب و محرکات موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم کیوں نہیں لڑتے؟ تمہارا نہ لڑنا تمہارے ایمان کے منافی ہے، کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور ان مظلوم مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر لڑو جنہیں کفار نے ظلم و ستم میں جکڑ رکھا ہے، یہ آیت جہاد پر نہایت مؤثر انداز میں اُبھارتی ہے اور ہر قسم کی تاویل و عذر کو ختم کرتی ہے۔

مُسْتَضْعَفِيْنَ سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مکہ میں ہجرت نہ کر سکے، یا تو اس لیے کہ وہ کمزور اور بے بس تھے، یا اس لیے کہ مشرکین نے انہیں ہجرت کرنے سے روک دیا تھا، جو حضرات ضعفاء تھے ہجرت نہ کر سکتے تھے اور مکہ معظمہ میں مشرکین کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے ان میں ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ بھی تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے لیے نماز میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر (آخری رکعت میں) دعا فرمایا کرتے تھے (مشکوٰۃ المصابیح)

پھر یہ حضرات کافروں کی بندش سے آزاد ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہو گئے تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ، وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ، وَعَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيْعَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِي يُوْسُفَ (بخاری، مسلم، ابن ماجہ، نسائی،) اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات عطا فرما اور سلمہ بن ہشام کو اور عیّاش بن ابی ربیعہ کو اور کمزور و بے بس مؤمنین کو (بھی نجات دے)۔ اے اللہ! قبیلہ مُضَر پر اپنا سخت عذاب نازل فرما اور ان پر ایسے سال مسلّط کر دے جیسے یوسف علیہ السلام کے (قحط و سختی کے) سال تھے۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ کا عطف فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پر ہے، یعنی اللہ کی راہ میں اور مستضعفین کی خاطر لڑو تاکہ انہیں کفار کے ظلم سے نجات دلاؤ، ان کا ذکر علیحدہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کی نصرت پر زیادہ زور دیا جائے، کیونکہ ایک شریف انسان کی غیرت و مروّت کمزوروں کی مدد کے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتی، مستضعفین کی وضاحت مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ سے کی گئی ہے، یعنی وہ مرد، عورتیں اور بچے جو نہ ہجرت کر سکتے تھے اور نہ اپنی حفاظت کر سکتے تھے، خصوصاً عورتوں اور بچوں کا ذکر جہاد پر مزید اُبھارنے کا ذریعہ ہے، کیونکہ اگر انہیں مشرکین کے ظلم میں چھوڑ دیا جاتا تو یہ مؤمنوں کے لیے باعثِ عار تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کمزوروں کی دعا بھی نقل فرمائی، جو یہ کہتے ہیں "اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی (یعنی مکہ) سے نکال لے جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی کارساز مقرر کر دے اور اپنی طرف سے کوئی مددگار بنا دے" یعنی اے اللہ! ہمارے دین کی حفاظت کے لیے کوئی

ولی اور ہمارا دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی مددگار عطا فرما، کیونکہ جو تیری پناہ میں آجائے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔

الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا سے مراد مکہ ہے، مکہ کو براہِ راست "ظالم" نہیں کہا گیا بلکہ الظَّالِمِ أَهْلُهَا فرمایا، اس لیے کہ مکہ اللہ کا حرم ہے اور اس کی نسبت ظلم کی طرف نہیں کی جاتی، لیکن یہاں اس زمانے میں رہنے والے لوگ ظالم تھے، جن کے قہر و ظلم سے مجبور ہو کر مسلمانوں نے دوبار حبشہ کی طرف ہجرت کی، جن کے قہر و جبر سے پریشان ہو کر اللہ کے حبیب نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، مکہ مکرمہ کی دھرتی پر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے، یہاں بلال حبشی کو پیٹا گیا، یہاں رسول اللہ ﷺ کی پشت مبارک پر اُونٹ کی گندی اوجھ ڈالی گئی، یہاں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے پیغمبر ﷺ پر آوازے کسے گئے، یہاں کے رہنے والوں نے مسلمانوں اور ان کے قائد نبی ﷺ پر شعب ابی طالب میں تین سال تک مظالم ڈھائے، اس لیے اس بستی کے رہنے والوں کو ظالم قرار دیا گیا۔

یہ دعا نہایت ادب و اخلاص پر مشتمل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے رہائی، صالحین کے ساتھ وابستگی اور ظالموں پر فتح و نصرت مانگتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، بعض کو مدینہ ہجرت کی توفیق ملی اور بعض فتح مکہ تک وہاں رہے، پھر اللہ نے ان کے لیے بہترین کارساز اور مددگار رسول اللہ ﷺ کو بنایا۔

وِلْدَان کا ذکر اس لیے ہے تاکہ کفار کی زیادتی کی شدت ظاہر ہو، کہ انہوں نے بے گناہ بچوں تک کو اذیت پہنچائی اور مستضعفین (کمزور لوگ) اپنی دعاؤں میں بچوں کو بھی شامل کرتے تھے تاکہ ان کی وجہ سے رحمتِ الٰہی جلد نازل ہو، جیسے استسقاء کے وقت بچوں کو ساتھ لایا جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلم اور کافر دونوں فریقوں کے مقاصد لڑائی واضح کیے، جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں، تو اے مؤمنو! شیطان کے مددگاروں سے لڑو، بیشک شیطان کی چال ہمیشہ کمزور ہے، یعنی مؤمنوں کی جنگ کا مقصد اللہ کے دین کو سربلند کرنا اور حق کو

غالب کرنا ہے اور کافروں کی جنگ کا مقصد شیطان کے حکم پر ظلم وطغیان کو پھیلانا ہے، پس مؤمنوں کو چاہیے کہ شیطان کے ساتھیوں سے بھرپور جہاد کریں، کیونکہ ان کی تدبیر کمزور اور ان کی چال ناکام ہے، جبکہ اللہ اپنے مخلص بندوں کی مدد کرتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ایک نیا کلام ہے جو مؤمنوں کو حوصلہ دینے اور انہیں جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے، اس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ہر گروہ جس مقصد کے لیے لڑ رہا ہے وہ مختلف ہے، مؤمنین کی غایت اور منزل نصرتِ الٰہی ہے، اس لیے ان کا انجام لازمی طور پر کامیابی اور غلبہ ہو گا، کیونکہ اللہ ان کا کارساز اور مددگار ہے۔

فرمانِ الٰہی فَقَاتِلُوْا میں جو فَاء ہے وہ تفریع کے لیے ہے، یعنی جب تمہارا مقصد یہ ہے اور دشمنوں کا مقصد اس کے برعکس ہے تو اے ایمان والو! تمہیں چاہیے کہ تم ان سے لڑو اور ان سے نہ ڈرو اور نہ ہی ان سے گھبراو، کیونکہ اللہ اپنی نصرت اور تائید کے ساتھ تمہارا پشتی بان ہے اور وہ تمہارے دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ شیطان ان کے ساتھ ہے جو خود کمزور اور فاجر ہے، یہاں شیطان کے کید (مکر) سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو بہکا کر، ان کے دلوں میں وسوسے ڈال کر اور لوگوں کو مؤمنوں کے خلاف بھڑکا کر ان پر ظلم و زیادتی کے منصوبے تیار کرتا ہے، شیطان کے دوستوں سے مراد یہاں کافر ہیں، پس تم یقیناً ان پر غالب آؤ گے، تو بہت بڑا فرق ہے اس کے درمیان جو اللہ رحمن کی راہ میں لڑتا ہے اور اس کے درمیان جو شیطان کی راہ میں لڑتا ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کَیْد کے معنی ہیں، کسی کی حالت بگاڑنے کے لیے تدبیر اور چالاکی کے ساتھ کوشش کرنا، عربی میں کہا جاتا ہے: کَادَہٗ یَکِیْدُہٗ یعنی اس پر کسی نہ کسی تدبیر سے نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کَانَ ضَعِیْفاً میں کَانَ کے لانے کا فائدہ یہ ہے کہ شیطان کے مکر کی کمزوری کو مزید پختہ طور پر ظاہر کیا جائے، یعنی وہ اپنی ابتداء ہی سے کمزور اور ذلیل ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں اختیار کیے گئے اسلوب بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو جہاد کی ترغیب سب سے اعلیٰ انداز، سب سے پاکیزہ مقصد اور سب سے بلند حوصلے اختیار کرنے کے

لیے دی ہے، انہیں حکم دیا گیا کہ اگر وہ حقیقت میں ایمان والے ہیں جو دنیا کو بیچ کر آخرت خریدتے ہیں تو انہیں قتال کرنا ہی ہو گا، میدان کارزار میں اترنا ہی ہو گا، ان کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ خواہ وہ میدانِ جنگ میں شہید ہوں یا غالب آئیں، بہر حال اللہ کی رضا اور بہترین اجر ان کا مقدر ہے، ان پر تعجب ظاہر کیا گیا کہ جب ہر دینی، اخلاقی اور شرافت کے تقاضے انہیں جہاد پر اُبھارتے ہیں تو پھر وہ کس طرح سستی اور بوجھل پن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں؟

مزید یہ کہ انہیں بتایا گیا کہ جب کفار، جو شیطان کی مدد کے لیے لڑتے ہیں، پوری جرأت سے جنگ پر اُتر آتے ہیں تو ایمان والوں کو بدرجہ اولیٰ چاہیے کہ وہ اللہ کی راہ میں، جو سراسر حق کی نصرت ہے، خالص دل سے نکلیں خواہ ہلکے ہوں یا بوجھل، آخر میں انہیں بشارت دی گئی کہ انجام کار غلبہ انہی کو ملے گا، کیونکہ کفار تو شیطان کے دھوکے پر بھروسہ کرتے ہیں جو کہ نہایت کمزور اور باطل ہے، مگر مؤمنین اللہ کی پناہ میں ہیں، وہ اللہ جو اپنے ماننے والوں کو کبھی رسوا نہیں کرتا اور نہ ہی اسے ناکام ہونے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

جہاد، منافقین کا طرز عمل، موت سے ڈر، منافقوں کی ہرزہ سرائی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا {۷۷} اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۗ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا {۷۸} مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۗ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا {۷۹} النساء

جواب ترجمہ: کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ ہاتھوں کو روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو پھر جب ان پر قتال لازم کیا گیا تو ان میں ایک گروہ کو لوگوں کا ایسا ڈر محسوس ہونے لگا جیسے اللہ کا ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر، اور انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آپ نے قتال کیوں لازم کیا کاش کہ آپ تھوڑی مہلت ہم کو اور دے دیتے، آپ کہہ دیجیے دنیا کا عیش تھوڑا ہی ہے اور جس نے اللہ کا ڈر اختیار کیا اس کے لیے آخرت ہی بہتر ہے اور بال برابر بھی تمہارے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی۔ تم جہاں کہیں بھی ہو موت تم کو آکر رہے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ ہو اور اگر ان کو کچھ بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری طرف سے ہے، آپ فرما دیجیے سب اللہ ہی کی طرف سے ہے تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا، یہ کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ تم کو جو کوئی بھلائی ملتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس کی جانب سے ہے اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ گواہ کافی ہے۔

شان نزول: ① کلبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی، جن میں عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ، قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ شامل تھے، انہیں مشرکین کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں پہنچی تھیں یہ حضرات رسول اللہ ﷺ سے کہتے رہتے تھے یا رسول اللہ! ہمیں ان مشرکین کے ساتھ لڑنے کی اجازت دیجیے، آپ ﷺ فرماتے کہ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ یعنی ان سے اپنے ہاتھ روکے رکھو، مجھے ان کے ساتھ لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا، جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے اور اللہ نے انہیں مشرکین کے ساتھ لڑنے کا حکم دیا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ ناگوار ہوا اور ان پر یہ امر شاق گزرا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول، تفسیر کبیر للرازی)

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور ان کے کچھ دوست نبی ﷺ کے پاس مکہ حاضر ہوئے، انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم عزت والے تھے حالانکہ ہم مشرک تھے لیکن جب ہم ایمان لائے تو ہم ذلیل ہو گئے آپ ﷺ نے جواب دیا کہ مجھے عفو

اور درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے تم لوگ ان دشمنوں سے لڑائی نہ کرو، پھر جب اللہ نے آپ ﷺ کو مدینہ کی طرف موڑا تو وہاں اللہ نے آپ ﷺ کو قتال کا حکم دیا تو یہ لوگ جنگ کرنے سے رک گئے، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ۔(اسباب النزول، المقتطف من عیون التفاسیر)

③ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں شان نزول میں دو قول ذکر فرمائے ہیں، ایک تو اس کا شان نزول کلبی کے حوالے سے بیان کیا، جو یہاں اول نمبر میں ہم نے نقل کیا ہے، جب کہ امام رازی نے اس کے شان نزل میں دوسرا قول یہ نقل کیا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس قول کو اختیار کرنے والوں نے دلیل یہ دی ہے کہ آیت میں ایسے امور موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ خاص طور پر منافقین ہی کے بارے میں ہے۔(الکبیر للرازی)

امام رازی رحمہ اللہ نے یہ نہیں تحریر کیا کہ یہ قول کس کا ہے، اس شان نزول کا راوی کون ہے؟ ہاں امام رازی رحمہ اللہ نے شان نزول کا مصداق منافقین کو قرار دیتے ہوئے قائلین کے ان نقاط سے استدلال کیا ہے کہ یہ آیت ایسے امور پر مشتمل ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ آیت منافقین کے ساتھ مختص ہے، اس میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف یہ بیان کیا کہ وہ لوگوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے یا اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ صفت تو منافقین کی ہے، کیونکہ مومن کے شایان شان یہ بات نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ انسانوں سے ڈرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بات یہاں نقل فرمائی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر قتال کیوں فرض کیا؟ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا یہ کافروں اور منافقوں کی صفت ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے فرماتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ دنیا کا ساز و سامان تھوڑا ہے اور آخرت ڈرنے والوں کے لیے بہتر ہے، یہ کلام بتاتا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کا شوق زیادہ رکھنا یہ منافقین کی صفات میں سے ہے۔(الکبیر للرازی)

امام رازی رحمہ اللہ آگے لکھتے ہیں" اور پہلے قول کو اختیار کرنے والوں نے ان دلائل کا جواب ایک ہی بات سے دیا اور وہ یہ ہے کہ زندگی کی محبت اور قتل (یعنی مارے جانے) سے نفرت یہ انسانی طبیعت کی لازمی چیزوں میں سے ہے، پس اس آیت میں جو خوف ذکر ہوا ہے، وہ اسی معنی پر محمول ہے اور ان کا یہ کہنا: لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ، ہم پر قتال کیوں فرض کیا گیا؟ یہ اس خواہش پر محمول ہے کہ تکلیف ہلکی ہو جائے، نہ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ کہہ دیجیے دنیا کا سامان تھوڑا ہے، یہ اس لیے نہیں کہ وہ لوگ اس بات کے منکر تھے، بلکہ اس لیے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں یہ کلام سنا دے جو دل پر اس زندگی کی حقیقت کو ہلکا کر دے، پھر اس کے بعد ان کے دلوں سے قتال سے نفرت اور زندگی کی محبت دور ہو جائے اور وہ مضبوط دل کے ساتھ جہاد پر آمادہ ہو جائیں۔

پس یہ دونوں اقوال کی تقریر ہوئی اور اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کو منافقین پر محمول کیا جائے، کیونکہ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ (النساء: ۷۸) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کلام منافقین کا ہے، تو جب یہ آیت اس آیت پر معطوف ہے جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں، اور معطوف منافقین کے بارے میں ہے تو لازم ہوا کہ معطوف علیہ بھی انہی کے بارے میں ہو۔ (تفسیر کبیر للرازی)

بندہ عاجز راقم الحروف نے کلبی کے حوالے سے اسباب النزول سے شان نزول یہاں لکھ دیا، لکھنے کے بعد جب آیات کے سیاق وسباق پر نگاہ ڈالی تو ایک مرتبہ کانپ گیا، مجھے بہت تشویش ہوئی کہ شان نزول میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نام آرہا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جلیل القدر اور آیات میں کیا کہا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ کو جزائے خیر عطا کرے، انہوں نے ہماری اس پریشانی کا پہلے ہی حل پیش کر دیا، ان کی تفسیر میں شان نزول سے متعلق دو قول لکھے گئے، ایک یہی جو ہم نے لکھا اور دوسرا منافقین کے بارے میں، پھر پہلے قول کی بجائے دوسرے قول کو ترجیح دی، پھر پہلے قول کا بطلان پیش کیا، جس پر دل کو اطمینان ہوا، الحمد للہ

پریشانی کے اس عالم میں ہم امام رازی رحمۃ اللہ کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ آیتِ کریمہ کو منافقین پر محمول کرنا ہی زیادہ درست ہے، ان اسباب کی وجہ سے جو انہوں نے بیان فرمائے ہیں، ہم امام رازی رحمۃ اللہ کی بات میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جو شخص آیات کے سیاق وسباق پر غور کرے، وہ دیکھے گا کہ یہ آیت منافقین اور ان جیسے کمزور ایمان والوں کے بارے میں ہے، جن کی کمزور نفسیات اور دنیا سے محبت انہیں قتال سے کراہت اور اس کی سختیوں سے خوف زدہ کر دیتی تھی۔

چنانچہ اگر آپ ان آیات کو دیکھیں جو اس آیت سے پہلے ہیں تو وہ ان کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں جو باوجود ایمان کے دعوے کے طاغوت کی طرف فیصلہ کے لیے جانا چاہتے تھے اور جو جنگ میں پیچھے رہنے میں خوش ہوتے تھے کہ انہوں نے خطرے سے جان بچالی، پھر اگر آپ ان آیات کو پڑھیں جو اس آیت کے بعد آتی ہیں تو وہ ان کی اس حالت کو بیان کرتی ہیں کہ بھلائی کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اور برائی کو رسول اللہ ﷺ کی طرف اور مومنوں کے راز اگل دیتے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ یہ آیت منافقین اور ان جیسے کمزور ایمان والوں کے بارے میں ہے جنہوں نے آرام کو ترجیح دی او اللہ کے دین کی سربلندی اور مظلوموں کی مدد کے لیے لڑنے کے بجائے گھروں میں بیٹھ رہنا پسند کیا۔

علامہ واحدی کی اسباب النزول میں، علامہ سیوطی کی لباب النقول میں اور تفسیر کبیر میں شان نزول سے متعلق دو قولوں میں سے پہلا قول کسی صورت یہاں قابل قبول اور قابل تسلیم نہیں ہو سکتا، جس میں کہا گیا کہ یہ آیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اسے درست تسلیم کرنے کی صورت میں بعد میں آنے والی آیات کا ان پر انطباق کسی صورت درست نہیں ہو گا، یوں شان نزول اور آیات کے مفہوم میں گہرا تضاد دکھائی دے گا، اس لیے یہی بات درست اور بہتر ہے کہ شان نزول اہل ایمان کی بجائے منافقین کے بارے میں تسلیم کیا جائے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلبی سے نقل کی گئی یہ روایت کمزور ہے، جس میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ، قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے، یہ روایت صرف کمزور ہی نہیں ہے بلکہ معتبر کتب حدیث میں بھی موجود نہیں ہے، اگرچہ ہماری تفسیر میں بیان کیے گئے

شانہائے نزول میں کئی روایات کلبی سے منقول ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود نا قابل اعتماد راوی ہیں۔ (تفسیر الوسیط)

مصری عالم شیخ محمد عبدہ نے اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: میں اس روایت کو خواہ اس کی سند کچھ بھی ہو باطل قرار دیتا ہوں، کیونکہ میں ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے سعد رضی اللہ عنہ اور عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو ایسے طعن سے پاک سمجھتا ہوں، یہ آیت اپنے ماقبل سے جڑی ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے قتال کے لیے تیاری اور حذر کا حکم دیا اور اُن لوگوں کی حالت بیان کی جو کمزوریِ قلب کی وجہ سے پیچھے رہتے تھے، ہجرت کے بعد اسلام نے اپنے پیروکاروں کو صلح اور عبادت کے ذریعے نفس کی تربیت کا حکم دیا اور لڑائی جھگڑے سے روکا، یہاں تک کہ وقت کی ضرورت کے تحت قتال فرض کر دیا گیا، جسے کمزور دل والوں نے ناپسند کیا۔ (تفسیر المنار ج ۵)

دوسری بات یہ ہے کہ اہل ایمان کے بارے میں یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ جنگ سے خوف کھائیں یا اس میں شریک نہ ہونے کی تمنا کریں، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ وہ موقع ملتے ہی آگے بڑھتے اور اپنے دین کے دفاع اور ظالموں کے مقابلے میں صفِ اول میں شریک ہوتے رہے جیسا کہ حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کا حکم دیں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں، اللہ کی قسم! ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا، تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، بلکہ ہم یہ کہیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب جائیں اور لڑیں، ہم آپ کے ساتھ لڑنے والے ہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں برک الغماد تک لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ لڑیں گے یہاں تک کہ اسے پالیں۔

(برک الغماد: ① مکہ سے پانچ راتوں کی مسافت پر ایک مقام کا نام ہے۔ ② یمن میں ایک شہر کا نام ہے جہاں عبد اللہ بن جدعان تیمی مدفون ہیں۔ ③ سرزمین ہجر کے کنارے پر ایک جگہ کا نام ہے۔ فتوح البلدان) ایسی اور بھی کئی باتیں اور واقعات ہیں جو ان کی شجاعت و بہادری اور ایمان کی پختگی پر دلالت کرتے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اس آیت کے بارے میں راجح بات یہی کہی کہ یہ منافقین کے بارے میں ہے، انہوں نے کہا، مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا یہودیوں کے بارے میں ہے، حسن رحمہ اللہ نے فرمایا یہ مؤمنین کے بارے میں ہے یَخْشَوْنَ النَّاسَ ،وہ لوگوں سے ڈرتے ہیں یعنی مشرکینِ مکہ سے اور یہ خوف انسانی فطرت کے اعتبار سے ہے، نافرمانی کے معنیٰ میں نہیں۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو قتال فرض ہونے سے پہلے مسلمان ہوئے اور جب قتال فرض ہوا تو انہوں نے کراہت کی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ منافقین کی صفت ہے، یعنی وہ مشرکین کے ہاتھوں قتل سے ایسے ڈرتے تھے جیسے اللہ سے مرنے کا ڈر ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

پھر قرطبی رحمہ اللہ نے کہا، یہی بات آیت کے سیاق سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے، کیونکہ اللہ نے ان لوگوں کا قول نقل فرمایا، رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ، اے ہمارے رب! تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا؟ کیوں نہ ہمیں تھوڑی مدت کی مہلت دی؟)۔

یہ قول کسی صحابی سے صادر ہونا ممکن نہیں، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ موت کا وقت مقرر ہے اور رزق تقسیم ہو چکا ہے اور وہ اللہ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے اور دنیاوی زندگی کے بجائے اُخروی زندگی کو بہتر جانتے تھے، ہاں البتہ یہ کلام کسی ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جو ایمان میں کمزور ہو اور جس کا دل اسلام کی روشنی سے پوری طرح منور نہ ہوا ہو، کیونکہ اہلِ ایمان میں درجے ہوتے ہیں، کچھ کامل، اور کچھ ناقص اور یہ ناقص وہ ہیں جو مشکل اور مشقت کے وقت حکم کو بوجھل سمجھتے ہیں۔

المختصر یہ کہ ہمارے دل کو اسی بات پر اطمینان ہوتا ہے کہ یہ آیت منافقین اور کمزور ایمان والوں کے بارے میں ہے، جو اللہ کی اطاعت سے دور تھے، جن کے دلوں میں بزدلی تھی اور جو دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کو پسند کرتے تھے، اہلِ ایمان ان اوصاف سے بالکل پاک ہیں، کیونکہ ان کا ایمان اور ان کی جرأت مندی اس بات سے بعید ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ ہاتھوں کو روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، یہاں اَلَمْ تَرَ میں استفہام تعجب کے لیے ہے، یعنی ان لوگوں کے حال پر حیرت دلانے کے لیے جو بظاہر جنگ کی بڑی خواہش اور شوق ظاہر کرتے تھے، لیکن جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو وہ بزدلی دکھانے لگ گئے، كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ میں کف کا مطلب ہے رک جانا یا باز رہنا، یعنی ان سے کہا گیا کہ ابھی جنگ سے باز رہو، قتال میں ہاتھ نہ ڈالو، اس وقت تک کہ تمہیں اس کا حکم دیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ! آپ ﷺ نے ان لوگوں کے عجیب حال پر غور نہیں کیا؟ یا اسے تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھا؟ یہ وہ لوگ تھے جو قتال کے بڑے خواہش مند اور شوقین تھے، پھر جب ان سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روک لو، یعنی قتال سے باز رہو کیونکہ ابھی تمہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا اور اس کی بجائے نماز قائم کرو، کیونکہ نماز دل کو گناہوں کی میل کچیل سے صاف کر دیتی ہے اور انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرو، کیونکہ زکوٰۃ نفس کو بخل اور حرص سے پاک کرتی ہے اور لوگوں کے درمیان محبت اور تعاون کا رشتہ قائم کرتی ہے۔

یہاں کون سی نماز کے بارے میں حکم دیا گیا؟ اس بارے میں شیخ سرفراز رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب آنحضرت ﷺ کو جبل نور کی چوٹی پر غار حرا میں نبوت ملی اور حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر تشریف لائے تو احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کی چوٹی پر پانی کا چشمہ ظاہر فرما دیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے وضو کیا اور فرمایا کہ آپ ﷺ نے اس طرح وضو کرنا ہے اور نماز بھی بتائی ! یہ نماز فرض نہیں تھی، کیونکہ نماز فرض ہوئی ہے معراج کی رات، اس سے پہلے آپ ﷺ دو نمازیں پڑھتے تھے، ایک فجر کی اور ایک عصر کی بلکہ چاشت کی نماز بھی تھی، مطلب یہ ہے کہ نماز کا تصور اور طریقہ پہلی ہی وحی میں بتا دیا گیا تھا اور یاد رکھنا نماز تمام عبادات میں مقدم ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً

پس جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا اور انہیں اس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا، اس وقت جبکہ مسلمانوں

کی مدینہ میں ایک ریاست قائم ہو چکی تھی، تو ایسا ہوا کہ ان میں سے ایک گروہ، یعنی وہ لوگ جن کا ایمان کمزور تھا، جن کا یقین ڈانواں ڈول تھا اور جن کے دلوں میں شک وشبہ تھا، وہ لوگوں سے ڈرنے لگے، یعنی کافروں سے سخت خوف کھانے لگے، جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی زیادہ ڈرنے لگے، یعنی وہ ان کافروں سے یوں خوفزدہ تھے کہ کہیں وہ انہیں قتل نہ کر ڈالیں، بالکل اسی طرح جیسے اللہ کے عذاب کے اترنے سے ڈرا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، یہ منافقین کے احوال بیان کیے جا رہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈرنے والے نہیں تھے، ان کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا۔

پس آیت کے الفاظ يَخْشَوْنَ النَّاسَ میں "لوگوں" سے مراد وہ کافر دشمن ہیں جن سے لڑنے کا اللہ نے حکم دیا تھا اور ان دشمنوں کو "لوگ" کہہ کر ذکر کرنے میں مزید ملامت اور سرزنش ہے، اس لیے کہ اگر وہ سچے مؤمن ہوتے تو اللہ کے حکم کو شوق واطاعت سے قبول کرتے اور محض انسانوں جیسے لوگوں سے یوں نہ ڈرتے، آیت کے الفاظ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ مفعول مطلق ہے، یعنی وہ ان لوگوں سے ایسا ڈرتے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے، یہ ان کی بزدلی، کم ہمتی اور فاسد سوچ کی عکاسی کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ کی خشیت کے مقابلے میں لوگوں کی خشیت کو لا کھڑا کیا، حالانکہ اللہ سے ڈرنا سب سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔

اور آیت کے الفاظ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً اس پر معطوف ہیں اور یہاں أَشَدّ حال کے طور پر آیا ہے کیونکہ نکرہ کی صفت اگر اس سے پہلے آجائے تو وہ حال شمار ہوتی ہے، اس جملے میں مزید ملامت اور سخت سرزنش پائی جاتی ہے اور ان کی بری حالت کو اور زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، کیونکہ اگر عقل مند کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اللہ کی طرح کسی سے ڈرے، تو یہ اور بھی زیادہ قبیح ہے کہ وہ اللہ سے بڑھ کر انسانوں سے ڈرے۔

سوال اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کے الفاظ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً، یا اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں، تو گویا شک پیدا کرتے ہیں، حالانکہ عالم الغیب پر شک محال ہے؟

جواب امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں أَوْ کا مطلب "بلکہ" ہے، یا پھر یہ

"تنویع" کے لیے ہے، یعنی کچھ لوگ ان سے اللہ کی طرح ڈرتے تھے اور کچھ ان سے اس سے بھی زیادہ ڈرتے تھے، یا پھر یہ لفظ سننے والے پر ابہام ڈالنے کے لیے آیا ہے، یعنی ان کی حالت ان دو میں سے کسی ایک کیفیت پر تھی، یا تو وہ ان سے اللہ کی طرح ڈرتے تھے یا ان سے اور بھی زیادہ ڈرتے تھے، یہ تعبیر قریب تر ہے آیت وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ کے مفہوم سے۔ (الکبیر) یعنی جو بھی انہیں دیکھتا وہ یہی کہتا کہ یہ یا تو ایک لاکھ ہیں یا اس سے زیادہ۔

وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۖ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کمزور دل لوگوں کا حال بیان کیا، جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو وہ کہنے لگے، اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا؟ کاش! تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے دی ہوتی، یعنی یہ لوگ صرف اس بات پر ہی نہیں ٹھہرے کہ جہاد فرض ہوتے ہی ان پر خوف و ہراس اور گھبراہٹ طاری ہو گئی، بلکہ اس پر مزید یہ بھی کہا اور وہ بھی جھنجھلاہٹ اور درد بھرے انداز میں کہ اے رب! تو نے ہم پر اس وقت جہاد کیوں لازم کر دیا؟ کیوں نہ ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے دیتا تاکہ ہم بغیر اس جنگی مشقت کے طبعی موت مرتے،، جس میں جان و مال کا خطرہ ہے۔

یوں قرآن ان کمزور دلوں کی گمراہی اور پریشانی کی کیفیت کو نہایت بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے، وہ لوگ جہاد فرض ہونے سے پہلے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے اور لڑائی میں شریک ہونے کے شوق کا اظہار کرتے تھے، لیکن جیسے ہی جہاد فرض ہوا تو وہ ڈر گئے، کانپنے لگے اور وہی نامناسب باتیں کرنے لگے، دراصل یہی حال اکثر جذباتی اور ناپختہ لوگوں کا ہوتا ہے کہ وقتِ عمل سے پہلے وہ سب سے بڑھ کر نعرے لگاتے اور جوش دکھاتے ہیں، مگر جب وقتِ عمل آتا ہے تو وہی سب سے پہلے میدان چھوڑ کر بھاگتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل بہادر اور عقل مند لوگ دشمن سے مقابلے کی آرزو نہیں رکھتے، نہ ہی از خود لڑائیاں شروع کرتے ہیں، وہ حالات کو اچھی طرح پرکھتے ہیں اور ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتے ہیں، لیکن جب ضرورت پیش آجائے اور میدان میں اترنا لازم ہو جائے، تو وہ جم کر ڈٹ جاتے ہیں اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہیں، جبکہ وہ لوگ جو نہ ایمان سے مضبوط ہوتے ہیں، نہ عقل سے

رہنمائی لیتے ہیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ وہ حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگاتے، اس لیے مشکل وقت میں سب سے پہلے گھبرا جاتے ہیں، پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ کون لوگ تھے جنہیں قرآن نے اس طرح بیان کیا کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو لوگوں سے ویسے ہی ڈرتے تھے جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا؟ کاش! ہمیں کچھ وقت کی مہلت دے دیتا؟

جواب حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کی تفاسیر دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ آیت اہلِ ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس کے بارے میں ہم شان نزول کے ذیل میں لکھ چکے ہیں، کلبی کی روایت کے حوالے سے مذکورہ سطور میں وضاحت کر چکے ہیں، اور بعض کا خیال ہے کہ یہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، امام رازی رحمہ اللہ نے ایک قول کے مطابق مومنین اور ایک قول کے مطابق منافقین کو اس کا مصداق قرار دیا، لیکن اَولیٰ اور بہتر مصداق اس آیت کا منافقین کو قرار دیا ہے، کلبی والی روایت کا بطلان ثابت کیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ یہ مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، بہر حال قرآنی اسلوب نگارش سے واضح ہوتا ہے کہ اس آیت کا مصداق وہ منافقین ہیں جو مسلمانوں میں گھل مل کر رہ رہے تھے، انہی میں اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے تھے، مگر تھے وہ منافق، جنہیں قرآنی آیات کا نزول اچھا لگتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے محبت رکھتے تھے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا : یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری بیان کروائی جا رہی ہے، ارشاد ہوا اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجیے کہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور تم پر دھاگے کے ریشے کے برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ یہ آیت اُن برے رویوں اور فاسد باتوں کا جواب ہے جو منافقوں اور کمزور ایمان والوں کی طرف سے ظاہر ہوئیں، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت دی ہے کہ دنیا کی زندگی کا سامان اور لذتیں کتنی ہی بڑی کیوں نہ دکھائی

دیں، حقیقت میں وہ تھوڑی اور فانی ہیں، جبکہ آخرت میں مومنوں کے لیے دائمی نعمتیں اور لازوال انعامات ہیں، جو دنیا کی ہر لذت سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔

مَتَاعٌ اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان دنیا میں فائدہ اٹھاتا ہے جیسے مال واسباب اور فَتِیْلٌ کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں موجود باریک دھاگے کو کہا جاتا ہے، جسے مثال کے طور پر کمی اور بے حقیقتی بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، یعنی، اے نبی کریم ﷺ! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے جو دشمنوں سے ملاقات سے ڈرتے ہیں اور قتال سے گھبرا کر دنیا کی زیب وزینت میں لگے رہنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی یہ لذتیں اور منافع وقتی اور معمولی ہیں، جبکہ آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، جو اللہ سے ڈرنے اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے کہیں بہتر ہے، لہٰذا اپنی ساری توجہ اور خوف اللہ ہی کے لیے رکھو، اُس کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں آگے بڑھو، تاکہ تمہیں اللہ کی طرف سے بڑا اجر اور عظیم بدلہ ملے اور جان لو کہ تمہارے ثواب میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی، نہ تمہاری عمر میں کمی ہوگی کیونکہ بزدلی زندگی کو نہیں بڑھاتی اور بہادری عمر کو کم نہیں کرتی۔

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ: یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمادیا کہ موت سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں، تم جہاں کہیں بھی ہوگے، موت تمہیں ضرور پہنچ جائے گی، چاہے جلد یا بدیر۔ چنانچہ فرمایا: تم جہاں کہیں بھی ہو موت تم کو آکر رہے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ ہو۔ بُرُوْجٍ، بُرْجٍ کی جمع ہے اور برج اس مضبوط قلعے یا بلند وبالا حصن کو کہتے ہیں جو انسان کے لیے حفاظت اور بچاؤ کی انتہا سمجھی جاتی ہے اور برج کا اصل مادہ تَبَرُّجٌ ہے جس کے معنی ہیں ظاہر ہونا، عربی میں کہا جاتا ہے تَبَرَّجَتِ الْمَرْأَةُ یعنی عورت نے اپنی زینت ظاہر کی، یہاں بروج سے مراد قلعے اور اونچے مضبوط حصون ہیں۔ مُشَیَّدَةٌ خوب مضبوط اور بلند عمارتیں، یعنی وہ قلعے جو نہایت پختہ اور بلند ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ اے لوگو! جو قتال سے ڈرتے ہو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ لڑائی سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا یا اس سے بچنا تمہیں موت سے بچالے گا، تو تم سخت غلطی پر ہو، موت تو تمہیں ضرور جالے گی، چاہے تم دنیا کے سب سے مضبوط اور محفوظ قلعوں میں کیوں نہ جا بیٹھو، جب موت بہر حال آنی ہے تو بہتر یہی

ہے کہ تمہاری موت اس حالت میں آئے کہ تم حق کی راہ میں ڈٹ کر لڑنے والے ہو، نہ کہ پیٹھ دکھا کر بھاگنے والے۔

یہ آیت بطور استئناف (نیا جملہ) آئی ہے تاکہ ان لوگوں کو رسوا کرے جو قتال سے جی چراتے ہیں اور باقی مؤمنین کو جہاد پر اُبھارے، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ہی کے تسلسل میں ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے فرمادیں "دنیا کا ساز و سامان تھوڑا ہے" اور یہ بھی فرمادیں کہ "تم جہاں بھی ہوگے موت تمہیں ضرور آلے گی" چاہے سفر میں ہو یا حضر میں، خشکی میں ہو یا تری میں موت تمہیں آکر رہے گی، موت ہی سے ڈرتے ہوئے تم جہاد و قتال کی بجائے گھروں میں دبکنے اور بیٹھنے کو ترجیح دیتے ہو، تم موت سے بھاگنا چاہتے ہو موت تمہیں ڈھونڈ لے گی۔

یہاں يُدْرِكْكُّمُ کے لفظ میں یہ نکتہ ہے کہ موت کو ایک ایسے جاندار کی طرح بتایا گیا ہے جو اپنے شکار کو ڈھونڈتا ہے، تعاقب کرتا ہے اور آخر کار اسے پالیتا ہے، چاہے وہ کہیں بھی چھپنے کی کوشش کرے، اور لَو کا جواب محذوف ہے، مطلب یہ ہے، اگر تم مضبوط قلعوں میں بھی ہو تو بھی موت تمہیں جالے گی۔

قرآن و سنت کی روشن تعلیمات میں اس نظریے کو بہت ہی واضح بیان کیا گیا ہے کہ موت کا ایک وقت طے ہے، موت اپنے وقت مقررہ پر دستک دیتی ہے، موت سے کوئی راہ فرار اختیار نہیں کر سکتا، قرآن کریم میں ارشاد ہے قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ، آپ کہہ دیجیے! اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

قرآن کریم میں واضح کیا گیا کہ موت سے بھاگنا سود مند نہیں، بھاگا بھی نہیں جاسکتا، جہاں انسان ہوگا، وہاں اس کی موت کا وقت آئے گا تو پکڑا جائے گا، قرآن کریم میں ارشاد ہے قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ، کہہ دیجیے! بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، وہ تو یقیناً تمہیں آملنے والی ہے، یعنی موت سے نہ بھاگ کر بچا جاسکتا ہے، نہ قتال کو چھوڑ کر، موت ہر حال میں آنی ہے، زہیر بن ابی سلمہ شاعر کہتا ہے

وَمَنْ هَابَ أَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهُ ... وَلَوْ رَامَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمِ

اور جو موت کے اسباب سے ڈرے، وہ (موت) اس کو پالے گی ... چاہے وہ آسمان تک جانے کے اسباب سیڑھی کے ذریعے ہی کیوں نہ تلاش کرے۔ اسی طرح شعری مجموعات میں موت کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں اشارہ دیا گیا کہ ہزاروں احتیاطوں کے باوجود موت آکر رہے گی۔

إِذَا جَاءَ أَجَلُ الْمَرءِ لَمْ يَسْبِقْهُ ... سَاعَةٌ وَلَوْ حَذِرَ الْحَاذِرُ

جب کسی انسان کا وقتِ اجل آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا، خواہ کتنا ہی محتاط کیوں نہ ہو۔

اَلْمَوْتُ حَتْمٌ عَلَى كُلِّ امْرِءٍ ... وَالدَّهْرُ يُبْلِي الْجَدِيدَ وَيُفْنِي

موت ہر انسان پر لازمی ہے اور زمانہ نئی چیزوں کو پرانا اور آخر کار فنا کر دیتا ہے۔

تَجَهَّزْ بِزَادٍ فَإِنَّ الطَّرِيقَ ... بَعِيدٌ وَمَا عَنِ الْمَوْتِ مَفَرُّ

زادِ راہ تیار رکھ، کیونکہ سفر لمبا ہے اور موت سے بچنے کی کوئی پناہ گاہ نہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ... وَإِنْ بَعُدَتْ عَنِ الْمَنَايَا بِحِصْنِ

ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے خواہ وہ قلعوں میں جا کر موت سے کتنی ہی دور رہنے کی کوشش کرے

اَلْمَوْتُ كَأْسٌ، وَكُلُّ النَّاسِ شَارِبُهُ ... مَنْ ذَا يُؤَمِّلُ بُعْدَ الْمَوْتِ أَوْ هَرَبَا؟

موت ایک پیالہ ہے اور سب لوگوں نے اسے پینا ہے ... کون ہے جو یہ امید رکھے کہ موت اس سے دور رہے گی یا وہ اس سے بھاگ نکلے گا؟

ایک حکیم نے موت کی حقیقت کو شعر کی زبان دیتے ہوئے کہا تھا

اَلْمَوْتُ حَقٌّ، فَكُلُّ الْحَيِّ صَائِرُهُ ... كَمَا تَذُوبُ جُمُوعُ الثَّلْجِ فِي الشَّمْسِ

موت برحق ہے، ہر زندہ کو اس کا سامنا کرنا ہے جیسے سورج کی تپش میں برف کا ڈھیر پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔

اَلْمَوْتُ قَدَحٌ كُلُّ نَفْسٍ شَارِبُهُ ... اَلْقَبْرُ بَابٌ كُلُّ نَفْسٍ دَاخِلُهُ

موت ایک پیالہ ہے ہر جاندار اسے پینے والا ہے، قبر ایک دروازہ ہے ہر جاندار اس سے داخل ہونے والا ہے

قعنب نے کہا تھا

إِذَا أَنْتَ لَاقَيْتَ فِي نَجْدَةٍ ... فَلَا تَنْهَيَّبْكَ أَنْ تُقْدِمَا

اگر تم کسی جنگ یا مدد کے موقع پر کسی سے ملو تو ڈر کے پیچھے نہ ہٹو، بلکہ آگے بڑھو۔

فَإِنَّ الْمَنِيَّةَ مَنْ يَخْشَهَا ... فَسَوْفَ تُصَادِفُهُ أَيْنَمَا

کیونکہ موت کا جسے ڈر لگتا ہے، وہ بہر حال جہاں کہیں بھی ہو گا موت سے ضرور ٹکرائے گا۔

وَإِنْ تَتَخَطَّكَ أَسْبَابُهَا ... فَإِنَّ قُصَارَاكَ أَنْ تَهْرَمَا

اور اگر وقتی طور پر موت کے اسباب تم سے ہٹ بھی جائیں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہو گا کہ تم بڑھاپے کو پہنچ جاؤ گے۔

شاعر ابو ذوئب ہذلی نے موت کی حقیقت یوں آشکار کی تھی

وَإِذَا الْمَنِيَّةُ أَنْشَبَتْ أَظْفَارَهَا ... أَلْفَيْتَ كُلَّ تَمِيمَةٍ لَا تَنْفَعُ

اور جب موت اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے، تو تم پاؤ گے کہ ہر تعویذ و تدبیر بے کار ہے۔

وَتَجَلُّدِي لِلشَّامِتِينَ أُرِيهِمُ ... أَنِّي لِرَيْبِ الدَّهْرِ لَا أَتَضَعْضَعُ

اور میری ثابت قدمی کو میں دشمنوں (خوشی منانے والوں) کے سامنے ظاہر کرتا ہوں، تاکہ وہ دیکھ لیں کہ زمانے کے حوادث کے سامنے میں کبھی نہیں جھکتا، یعنی موت بہر حال آکر رہے گی، چاہے میدانِ جنگ میں ہو یا بڑھاپے میں۔

کسی شاعر نے انسان کی حیثیت اور موت کی حقیقت کیسے آشکار کی؟ کہتا ہے

وَالنَّاسُ فِي قِسْمِ الْمَنِيَّةِ بَيْنَهُمْ ... كَالزَّرْعِ مِنْهُ قَائِمٌ وَحَصِيدُ

لوگ موت کی تقسیم میں ایسے ہیں جیسے کھیت کی فصل، جن میں کچھ کھڑے ہوتے ہیں اور کچھ کاٹے جا چکے ہوتے ہیں۔ شاعر نے موت کی حقیقت کو کھیت کی مثال سے واضح کیا ہے۔ جس طرح کھیت میں کچھ بالیاں ابھی تک کھڑی ہوتی ہیں اور کچھ فصل کاٹ دی جاتی ہے، بالکل ویسے ہی دنیا میں کچھ لوگ ابھی زندہ ہیں اور کچھ موت کے ہاتھوں دنیا سے جا چکے ہیں، یعنی انسان کی زندگی بھی فصل کی مانند ہے، ہر ایک کو اپنی باری پر کاٹا جانا ہے، کوئی پہلے جاتا ہے، کوئی بعد میں، لیکن آخر سب کو جانا ہے۔

ایک شاعر تلاش کرتی موت کا یوں ذکر کیا ہے۔

وَكَيْفَ أَرْجُو الْخِلَّ وَالْمَوْتُ طَالِبِي، وَمَا لِي مِنْ كَاسِ الْمَنِيَّةِ فُرْقَانُ

میں دوست (محبوب) سے امید کیسے رکھوں جبکہ موت مجھے ڈھونڈ رہی ہے اور موت کا پیالہ پینے سے کوئی بچاؤ نہیں ہے۔ ایک اور شاعر موت کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے

وَلَقَدْ حَرِصْتُ بِأَنْ أُدَافِعَ عَنْهُمُ ... فَإِذَا الْمَنِيَّةُ أَقْبَلَتْ لَا تُدْفَعُ

میں نے بہت کوشش کی کہ اُن کی طرف سے دفاع کروں، لیکن جب موت سامنے آجاتی ہے تو اسے روکا نہیں جاسکتا، یعنی انسان چاہے جتنی بھی تدبیریں کرلے، موت کے وقت سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

ایک اور شاعر نے اس ناپائیدار زندگی کی حقیقت کس طرح کھل کر بیان کی ہے، کہتا ہے

وَلَمْ نَدْرِ إِنْ حِصْنَا مِنَ الْمَوْتِ حَيْصَةً ... كَمِ الْعُمْرُ بَاقٍ وَالْمَدَا مُتَطَاوِلُ

تَحَيَّصَ مِنْ حُكْمِ الْمَنِيَّةِ جَاهِدًا ... مَا لِلرِّجَالِ عَنِ الْمَنُونِ مُحَاصُ

ہم نہیں جانتے کہ اگر ہم کسی وقت موت سے بچ بھی نکلیں، تو باقی عمر کتنی ہے اور زمانہ (زندگی کی مہلت) کتنا دراز ہے۔ انسان موت کے فیصلے سے پوری کوشش کے ساتھ بچنے کی راہیں ڈھونڈتا ہے، لیکن مردوں کے لیے موت سے بچنے کی کوئی پناہ گاہ نہیں۔ یعنی انسان موت سے تھوڑی دیر بچ بھی جائے تو اسے یہ علم نہیں کہ کتنی زندگی باقی ہے اور وقت کب ختم ہو جائے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنی تمام تدبیریں اور کوششیں کرلے، بھاگے، دوڑے، چھپے، لیکن موت سے نجات پانا ممکن نہیں۔ جس طرح پانی اپنی راہ ضرور بناتا ہے، اسی طرح موت اپنے مقررہ وقت پر انسان کو ضرور پالیتی ہے۔ یعنی موت سے کوئی انسان نہیں بچ سکتا، چاہے کتنا بھی زور لگائے۔ زہیر شاعر کہتا ہے

رَأَيْتُ الْمَنَايَا خَبْطَ عَشْوَاءَ مَنْ تُصِبْ ... تُمِتْهُ وَمَنْ تُخْطِئْ يُعَمَّرْ فَيَهْرَمِ

میں نے موت کو اندھا دھند چلنے والی (آندھی) پایا ہے، جسے یہ جالگے وہ مر جاتا ہے، اور جس سے یہ ٹل جائے وہ لمبی عمر پاتا ہے اور بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔

مَنْ لَمْ يَمُتْ عَبْطَةً يَمُتْ هَرَمًا ... لِلْمَوْتِ كَأْسٌ وَالْمَرْءُ ذَائِقُهَا

جو شخص جوانی یا اچانک موت سے نہ مرے، وہ بڑھاپے میں ضرور مرے گا۔ موت ایک پیالہ ہے اور ہر انسان نے اسے چکھنا ہے۔ یہ اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ موت سے کسی کو مفر نہیں، چاہے اچانک آئے یا بڑھاپے میں، بالآخر ہر انسان کو اس کا ذائقہ چکھنا ہے۔

ہر کہ را آمد اجل، حِیلت کجا؟... بر سرِ بام ار رود یا زیرِ جا

جس پر اجل آجائے، اس کے لیے کیا تدبیر؟ چاہے وہ چھت پر چڑھ جائے یا زمین کے اندر چھپ جائے

چون رسید از اجل ندانی راہ... در حصار و حصین، بہ کوہ و بہ چاہ

جب اجل آ پہنچتی ہے تو کوئی راستہ کام نہیں آتا... چاہے کوئی قلعے میں ہو، پہاڑ پر یا گہرے کنویں میں۔

از اجل گر ہزار بار گریزی... آخر اندر کنارِ وی آویزی

اگر تو ہزار بار موت سے بھاگے آخر کار اسی کی آغوش میں جا گرے گا۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منافقین اور ان کے کفر کے ساتھی کس طرح باطل اور جھوٹ باتیں کیا کرتے تھے اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انہیں کوئی برائی پہنچے تو کہتے ہیں، یہ آپ (محمد ﷺ) کی طرف سے ہے، آپ ﷺ فرما دیجیے: سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے، یعنی یہ منافق اور ان جیسے کمزور ایمان والے اور کافر اس حد تک بے باک ہو گئے تھے کہ جب انہیں کوئی اچھی حالت نعمت، خوشحالی، بارش، غنیمت یا کامیابی نصیب ہوتی تو کہتے، یہ اللہ کی طرف سے ہے، لیکن جب کوئی بُری حالت قحط، مصیبت یا شکست آتی تو کہتے، یہ آپ ﷺ کی وجہ سے ہے، اے محمد، آپ کے شوم قدم اور آپ کی بُری قیادت کے باعث ہمیں یہ نقصان پہنچا، حالانکہ آپ ﷺ اس سے پاک ہیں۔

ان کا یہ طرزِ کلام فرعونیوں کی بات سے مشابہ ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ان کے بارے میں فرمایا گیا: **فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ**، پھر جب ان کے پاس بھلائی آتی تو کہتے، یہ ہمارے لئے ہے اور جب ان پر کوئی برائی آتی تو بدشگونی موسیٰ اور اس کے ساتھیوں سے لیتے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ آیت یہود اور منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا، **مَا زِلْنَا نَعْرِفُ النَّقْصَ فِي**

ثِمَارِنَا وَمَزَارِعِنَا مُذْ قَدِمَ عَلَيْنَا هَذَا الرَّجُلُ وَأَصْحَابُهُ جب سے یہ شخص (محمد ﷺ) اور اس کے ساتھی ہمارے پاس آئے ہیں، ہم اپنی کھیتیوں اور پھلوں میں کمی دیکھ رہے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مِنْ عِنْدِكَ کا مطلب ہے "تمہاری بُری تدبیر کی وجہ سے" اور بعض نے کہا: "تمہارے شوم قدم کی وجہ سے"۔ انہوں نے یہ بات بدشگونی اور توہین کے طور پر کہی۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے باطل دعوؤں کا جواب دیں، یعنی آپ کہہ دیجئے، ہر نعمت اور ہر مصیبت اللہ ہی کی طرف سے ہے، وہی ان کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے، ان کے وقوع میں میرا یا کسی اور کا کوئی دخل نہیں، جیسا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں، تو آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات ہی نہیں سمجھتے؟ یہ جملہ بطورِ اعتراض اور ان کی جہالت و بے وقوفی کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ فَاء کا مطلب یہ ہے کہ جب حال یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے تو پھر ان منافقوں اور ان کے کفر و کمزور ایمان والے ساتھیوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحتوں کو نہیں سمجھتے، ان کی بصیرت اندھی ہو گئی ہے، یہ نہ سنجیدگی سے سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں، اگر یہ ذرا سا بھی سمجھتے تو جان لیتے کہ اللہ ہی قبض و بسط کرنے والا ہے، وہی عطا کرنے والا اور وہی روکنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، اللہ جس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دے، تو کوئی اس کو روکنے والا نہیں، اور جسے وہ روک لے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں، اور وہی زبردست، حکمت والا ہے۔

تفسیر کا نکتہ: آیت قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ، یعنی سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، کا مطلب ہے کہ خلق اور تقدیر کے اعتبار سے ہر چیز اللہ کے حکم سے ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جو بھلائی، نعمت و خوشی، تمہیں پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی، مصیبت و تکلیف، تمہیں پہنچے

وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ یہ خطاب اگرچہ بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے مگر مراد آپ کی امت کا ہر مکلف فرد ہے۔ حَسَنَةٌ (بھلائی) سے مراد وہ نعمتیں اور خوشیاں ہیں جو انسان کو مسرت دیتی ہیں، یہ سب اللہ کے فضل، اس کی توفیق اور رہنمائی کی بدولت ہیں، سَيِّئَة (برائی) سے مراد وہ مصیبتیں اور دکھ ہیں جو انسان کو رنجیدہ کرتے ہیں، ان کا سبب خود انسان کا گناہ اور غلط روش ہے، کیونکہ انسان نے ان اسباب کو چھوڑ دیا جو کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا لَا يُصِيبُ رَجُلًا خَدْشُ عُودٍ، وَلَا عَثْرَةُ قَدَمٍ، وَلَا اخْتِلَاجُ عِرْقٍ، إِلَّا بِذَنْبٍ، وَمَا يَعْفُو اللهُ أَكْثَرُ (ابن کثیر) جس شخص کا ذرا سا جسم کسی لکڑی سے چھل جائے یا اس کا قدم پھسل جائے یا اسے ذرا سی محنت کرنی پڑے جس سے پسینہ آجائے سوائے گناہ کے کام کے اور ابھی تک تو اللہ تعالیٰ جن گناہوں سے چشم پوشی فرماتا ہے جنہیں معاف کر دیتا ہے وہ بہت سارے ہیں۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ هَمٌّ وَلَا حَزَنٌ، وَلَا نَصَبٌ، حَتَّى الشَّوْكَةُ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللهُ عَنْهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ (مسلم بحوالہ ابن کثیر) اس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ایمان دار کو رنج یا جو بھی تکلیف و مشقت پہنچتی ہے یہاں تک کہ جو کانٹا بھی لگتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔

ابو صالح رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ جو برائی تجھے پہنچتی ہے اس کا باعث تیرا گناہ ہے ہاں اسے مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

آیت کے بارے میں دو اقوال ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا اصل کلام ہے، جس میں خطاب نبی ﷺ کو ہے لیکن مراد تمام انسان ہیں، اس میں منافقوں اور کمزور ایمان والوں کی غلط سوچ کی تردید ہے، بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت دراصل منافقین کی بات کو حکایتاً نقل کر رہی ہے، وہ نبی ﷺ پر الزام لگاتے تھے اگر خوشحالی یا فتح ہوئی تو کہتے، یہ اللہ کی طرف سے ہے، تمہارا کوئی کمال نہیں اور اگر شکست یا مصیبت آئی تو کہتے، یہ تمہاری (یعنی رسول ﷺ کی) وجہ سے ہے، مقصد یہ تھا کہ نبی ﷺ کے مقام کو گرانا اور ہر خوبی کو آپ سے منسوب نہ کرنا۔

مَآ أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کا مطلب ہے کہ مصیبت انسان کی خطاؤں اور غلط اسباب اختیار کرنے کی وجہ سے آتی ہے، یعنی: پہلی آیت تقدیر اور قضا و قدر کے پہلو کو واضح کرتی ہے اور دوسری آیت عمل و اسباب کے پہلو کو بیان کرتی ہے۔

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا اور ہم نے آپ (اے محمد ﷺ) کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ ہی آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے کے لیے کافی ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے تاکہ لوگوں کو جہالت و کفر کی تاریکیوں سے نکال کر توحید و ایمان کے نور تک پہنچائیں۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: آپ ﷺ کی رسالت پر اللہ کی گواہی ہی کافی ہے، آپ ﷺ کو ان کے طعنے یا الزام کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ آیت مبارکہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر بھلائی اللہ کے فضل سے ہے، ہر مصیبت انسان کی اپنی کوتاہی اور گناہ کی وجہ سے ہے، سب کچھ تقدیر کے اعتبار سے اللہ ہی کے حکم سے ہے، مگر اسباب کی دنیا میں انسان کے اعمال کا دخل ہے، نبی ﷺ کا منصب رسالت بلند و اعلیٰ ہے، جسے کوئی جھٹلانے والا کم نہیں کر سکتا۔

اطاعتِ رسول ﷺ اللہ ہی کی اطاعت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا {۸۰} وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا {۸۱} اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا {۸۲} النساء

جواب ترجمہ: جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو پھر گیا تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔ اور وہ کہتے ہیں فرمان برداری قبول ہے پھر جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ایک گروہ راتوں رات جو بات آپ کہہ رہے تھے اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے اور وہ جو کچھ

راتوں کو مشورے کرتے ہیں اللہ وہ سب لکھ رہا ہے بس آپ ان سے اعراض کیجیے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے اور کام بنانے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی غیر کے پاس سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ **مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ اَحَبَّنِی فَقَدْ اَحَبَّ اللّٰهَ**، جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی، تو بعض منافقین نے کہا کہ بس جی یہ آدمی تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اسے رب ہی بنالیں، جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو رب بنایا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ (معالم التنزیل)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ: جو شخص اُس بات کو قبول کرے جس کی طرف نبی کریم، رؤف ورحیم حضرت محمد ﷺ بلاتے ہیں اور اُن کی تعلیمات کے آگے سر تسلیم خم کر دے، تو وہ دراصل اللہ کا مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے، کیونکہ رسول ﷺ اللہ ہی کے احکام و نواہی کے مبلغ ہیں، طاعت وعدم اطاعت کا مرجع اللہ کی ذات ہے، اسی فرمان کے نزول پر نصاریٰ کے دل و دماغ پر بجلی گری تھی، وہ اطاعت سے جان چھڑانے میں عافیت سمجھتے تھے، جب کہ اللہ نے واضح کر دیا کہ میرے رسول کی عبادت نہیں اطاعت کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کی اطاعت کرنا۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرمان خداوندی ''جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی'' اس بات کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کتنی محکم اور ثابت ہے اور یہ اس لیے ہے کہ دراصل حکم دینے والا اور منع کرنے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے، رسول کا کام صرف اللہ کے حکم اور ممانعت کو پہنچانا ہے، لہٰذا رسول کی اطاعت اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں بلکہ دراصل اس ذات کی اطاعت ہے جس کا پیغام وہ پہنچا رہے ہیں۔

وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا: یہاں رسول کریم ﷺ کے منصب نبوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے فرائض نبوت میں سے یہ بات ہے کہ پیغام ربانی لوگوں تک پہنچا دیں، یعنی اے محمد ﷺ! جو آپ کی اطاعت کرے گا اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی اور جو آپ کی

اطاعت سے منہ موڑے گا اور آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کرے گا تو وہ اپنے ہی نقصان کا ذمہ دار ہو گا، کیونکہ ہم نے آپ کو لوگوں پر ان کے اعمال کا نگہبان اور محافظ بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ ہم نے آپ ﷺ کو صرف اپنا پیغام پہنچانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور وَمَنْ تَوَلّٰی کے جوابِ شرط کو حذف کیا گیا ہے، یعنی جو منہ موڑ لے اور اعراض کرے تو اے محمد ﷺ! آپ اس سے بے پروا رہیں، کیونکہ ہم نے آپ ﷺ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا، آپ ﷺ رسول ہیں، آپ ﷺ نبی ہیں، آپ ﷺ عرش بریں سے آنے والے پیغام کو صحیح صحیح لوگوں تک پہنچانے والے ہیں، عمل کرنا، اپنی زندگی کے معمولات میں ان تعلیمات کو شامل کرنا ان لوگوں کا کام ہے، اگر یہ ایسا نہیں کرتے تو آپ ﷺ پر اس کا کوئی الزام نہیں ہے، آپ ﷺ کی ذمہ داری بس ابلاغ ہے، ہمارے ذمہ ان کا حساب ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ: منافقین کی دوغلی پالیسی کا بیان ہو رہا ہے کہ اے میرے حبیب! ﷺ یہ منافق جب آپ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کوئی حکم دیتے ہیں تو اپنی زبان سے کہتے ہیں "اطاعت" یعنی ہمارا معاملہ اطاعت ہی ہے، وہ یہ بات زبان سے کہتے ہیں، لیکن ان کے دل ان کی زبان کے خلاف ہوتے ہیں، زبانی کلامی کہتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے تابعدار ہیں، اطاعت گزار ہیں، آپ ﷺ جو فرمائیں ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں مگر یہ لوگ دل سے حکم نہیں مانتے۔

فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ: پھر جب یہ منافقین آپ ﷺ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ایک گروہ راتوں رات جو بات آپ کہہ رہے تھے اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے۔ بَيَّتَ کا مطلب ہے تبییت کرنا، اس کا ماخذ، جیسا کہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں، اَلْبَيْتُوْتَةُ، رات بسر کرنا، ہے، کیونکہ غور و فکر کے لیے سب سے موزوں وقت یہ ہے کہ انسان رات کو اپنے گھر میں بیٹھے، جہاں خیالات زیادہ آزاد اور مشغلے کم ہوتے ہیں، اسی لیے گہری سوچ بچار کو "تبییت" کہا گیا، یا پھر اس کا ماخذ بیتِ شعر ہے، کیونکہ عرب جب شعر کہنے کا ارادہ کرتے تو اس پر نہایت گہری فکر کرتے، اس لفظ کا مطلب ہے، جھوٹ گھڑنا، بہانہ تراشنا اور خفیہ تدبیر کرنا، یعنی یہ منافق لوگ جب آپ ﷺ کے پاس ہوتے اور آپ ان کو کسی بات کا حکم دیتے تو کہتے: اطاعت ہے۔

لیکن جب آپ ﷺ کے پاس سے باہر نکلتے اور آپ سے الگ ہوتے تو ان میں سے ایک گروہ، جو ان کے سردار تھے، آپ کے حکم کے خلاف سازش اور چھپی ہوئی تدبیر کرتا، یعنی وہ آپ ﷺ کے سامنے مکمل اطاعت کا اظہار کرتے ہیں، مگر پسِ پشت ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو اس اطاعت کے بالکل خلاف ہوتی ہیں۔ اور "باہر نکلنے" کو بروز کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہے اور ان کے رویّے میں کیسا کھلا تضاد اور دوغلا پن ہے۔

اس تَبْیِیْت (خفیہ مشورہ و منصوبہ بندی) کو ان میں سے ایک گروہ کی طرف منسوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دراصل وہی لوگ اس کام کے براہِ راست ذمہ دار اور اس کے محرک ہیں، جبکہ باقی ان کے پیروکار ہیں، نہ کہ وہ حقیقتاً اطاعت پر قائم ہیں۔

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ: اور اللہ ان کے خفیہ منصوبوں کو لکھ رہا ہے، کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان چھپے ہوئے منصوبوں اور سازشوں کو ان کے اعمال نامے میں ثبت کر دیتا ہے اور ان کے برے اعمال کی وجہ سے دنیا میں ان کو رسوا کرتا ہے، پھر آخرت میں اس نفاق کی سزا انہیں ان کے لائق جزا کے مطابق دے گا، پس یہ آیت ان کے بُرے طرزِ عمل پر ایک سخت تنبیہ اور ڈانٹ ہے تاکہ وہ نفاق سے باز آجائیں اور ساتھ ہی یہ نبی اکرم ﷺ کے لئے تسلی اور اطمینان کا سبب ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ ان کے بُرے مکر کو آپ ﷺ پر ظاہر فرمادے گا تاکہ آپ ﷺ ان کے شر سے بچ سکیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، آپ ﷺ ان سے دُور رہیے اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ چنانچہ فرمایا: پس آپ ان سے دُور رہیے اور اللہ ہی پر توکل کیجیے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: اور اللہ ہی کارساز کے طور پر کافی ہے، اے میرے حبیب ﷺ جب ان کا یہی حال ہے تو آپ ﷺ ان کی پرواہ نہ کریں، ان کی طرف متوجہ نہ ہوں، اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن کی راہ میں آگے بڑھتے رہیں، کیونکہ اللہ ہی کی حفاظت اور نگرانی کافی ہے اور اللہ ہی کارساز اور کفیل ہے اس کے لیے جو اس پر بھروسہ کرے اور اس کے حکم و منع کی پیروی کرے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ منافقین کی صفات اور اُن کے حالات کے ایک پہلو کو بے نقاب کرتی ہے، پھر اُنہیں اُن کے جرائم پر ڈانٹ اور دھمکی دیتی ہے اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کے لیے اُن کے علاج اور اُن کے شر سے بچنے کی حکیمانہ تدبیر واضح فرماتی ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا: اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی قرآن پر غور و فکر نہ کرنے پر ملامت فرمائی اور انہیں اس کی حکمتوں، احکام اور ہدایتوں پر تدبر کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا، کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ (کتاب) اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو ضرور اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ یَتَدَبَّرُوْنَ کا مطلب ہے کسی بات کے انجام اور اس کے نتیجہ پر غور کرنا۔ زمخشری کے مطابق تدبر کا معنی ہے، کسی معاملہ پر غور کرنا اور یہ دیکھنا کہ وہ کہاں تک پہنچے گا، پھر یہ لفظ ہر قسم کے غور و فکر کے لیے استعمال ہونے لگا، پس قرآن پر تدبر کرنے کا مطلب ہے اس کے معانی پر غور کرنا اور اس میں موجود حقیقتوں اور ہدایتوں کو سمجھنا۔

یہاں استفہام کا مطلب ہے ان کے غور نہ کرنے پر تعجب و انکار، یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے سامنے قرآن ہو، ہدایت کے اسباب مہیا ہوں، پھر بھی وہ غفلت اور نفاق پر جمے رہیں؟ الفاظ "اَفلا" میں "فاء" اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ گویا وہ قرآن سے منہ موڑ رہے ہیں اور اس پر غور نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ منافق اور بیمار دل والے لوگ اپنی بداعمالیوں میں ناکام ہوئے، اللہ نے ان کی حقیقت کھول دی، انہوں نے کافروں کے برے انجام اور مؤمنوں کے اچھے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، پھر بھی ان کو ایمان لانے اور قرآن پر غور کرنے پر آمادہ نہ کیا گیا، حالانکہ اس قرآن میں صاف ہدایتیں، سچی خبریں اور حکیمانہ احکام ہیں جو اس کے اللہ کی طرف سے ہونے کی گواہی دیتے ہیں، اگر یہ قرآن اللہ کے بجائے انسانوں کی بنائی ہوئی کتاب ہوتی تو اس میں باتوں کا تضاد، خبروں کا اختلاف، معانی کا بکھراؤ اور اسلوب کا تفاوت ضرور نظر آتا، لیکن چونکہ یہ کلام اللہ ہے اس لیے اس میں نہ زیادہ اختلاف ہے نہ کم، یہاں "اختلاف" سے مراد ہے اسلوب کا تضاد، حقائق کا ٹکراؤ، خبروں کا جھوٹ یا معانی کا تضاد اور یہ سب قرآن میں موجود نہیں کیونکہ یہ سب اس کی بلاغت اور صداقت کے خلاف ہے۔

صاحبِ کشاف فرماتے ہیں، اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس کے بہت سے حصے مختلف اور متناقض ہوتے، اس کا نظم و بیان ایک جیسا نہ ہوتا، کچھ حصے کمال اعجاز کے درجہ پر ہوتے تو کچھ اس سے کمزور ہوتے جن کی مثل بنائی جاسکتی، کچھ خبریں سچ ہوتیں تو کچھ جھوٹی، کچھ معانی درست ہوتے تو کچھ بے ربط اور باطل، لیکن جب اس کا ہر حصہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت، مضبوط معانی اور سچی خبریں لیے ہوئے ہے تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کلام صرف اسی ذات کا ہے جو سب پر قادر ہے اور جو کچھ جانتا ہے جو دوسرا کوئی نہیں جان سکتا، مختصر یہ کہ یہ آیت ہر زمانے اور ہر جگہ کے انسانوں کو قرآن پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے تاکہ وہ اس کے احکام کو سمجھ کر اس پر عمل کریں اور اس کی ہدایتوں اور رہنمائی کو اختیار کرکے دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں۔

راز کی بات اُڑانے کی ممانعت

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا {۸۳} النساء

جواب ترجمہ: اور جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا ڈر کی پہنچتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو اس کی تحقیق کرتے جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو البتہ تم شیطان کے پیچھے ہو لیتے سوائے چند لوگوں کے۔

شانِ نزول: ① ابن عباس، ضحاک اور ابو معاذ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی اور حضرت حسن رحمہ اللہ اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (روح المعانی)

② علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں

کو طلاق دے دی ہے تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے جب دروازہ پر پہنچے تو آپ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہیے، چنانچہ آپ رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ الخ

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ قرآن کریم نے یہاں منافقوں اور کمزور دل رکھنے والوں کے ایک اور قابلِ مذمت طریقے کو بیان کیا ہے، فرمایا کہ اور جب ان کے پاس امن یا خوف سے متعلق کوئی خبر آتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔ یہاں اَمْرٌ سے مراد وہ خبر ہے جو اگر عام کی جائے تو اس کا اثر پڑے اور اَذَاعُوْا بِهٖ کا مطلب ہے، انہوں نے اسے پھیلا دیا اور مشہور کر دیا، کہا جاتا ہے، اَذَاعَ الْخَبَرَ یعنی اس نے خبر کو ظاہر اور عام کر دیا، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، جب بھی مسلمانوں کے امن یا خوف سے متعلق کوئی خبر سنتے، تو وہ اسے بغیر تحقیق کے مشہور کر دیتے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ کلام منافقوں کی ایک اور بدکاری بیان کرنے کے لیے ہے، یا پھر یہ کمزور ایمان رکھنے والوں کی غلطی کو منافقوں کے بعد ذکر کرنے کے لیے ہے، اس کا حال یہ تھا کہ جب مسلمانوں کی کوئی چھوٹی فوجی جماعت (سریہ) جہاد کے لیے جاتی، تو یہ لوگ یوں کہتے: مسلمانوں نے دشمن کو اتنا نقصان پہنچایا، اور دشمن نے مسلمانوں کو اتنا نقصان پہنچایا، حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوتا۔ (روح المعانی، تفسیر الوسیط) اور کہا گیا ہے کہ بعض کمزور لوگ منافقوں کے منہ سے سنی ہوئی ایسی خبریں، جو صرف گمان پر مبنی اور غیر مصدقہ ہوتیں، آگے مشہور کر دیتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ خبر مسلمانوں کے لیے نقصان اور وبال بن جاتی۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان منافقوں کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ فرمایا، اور اگر وہ اس (خبر) کو رسول اللہ ﷺ یا

اپنے بڑوں (اہلِ امر) کے پاس لے جاتے تو ان میں سے وہ لوگ جو اس کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں حقیقت جان لیتے، اہلِ امر سے مراد بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جو امور کی گہری بصیرت رکھتے تھے، بعض نے کہا اس سے مراد حکام اور لشکروں کے امیر ہیں، یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ کا مطلب ہے، نکالنا، حقیقت کو دریافت کرنا۔

النبط: زمین سے نکلنے والا پہلا پانی، جب کنواں کھودا جائے اور اس سے پہلی بار پانی ظاہر ہو تو اسے نَبط الماء کہا جاتا ہے، کسی معاملے کی خبر یا اطلاع کو بھی نَبط کہا گیا ہے، اسی سے یہ لفظ مستنبط ہوا، یعنی ان منافقوں اور کمزور ایمان والوں کی حالت یہ تھی کہ جب ان کو کوئی خبر ملتی، خواہ وہ امن سے متعلق ہو یا خوف سے، تو وہ اسے بغیر تحقیق کے مشہور کر دیتے تاکہ مسلمانوں میں بے چینی اور فتنہ پیدا ہو، حالانکہ اگر وہ اس خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سپرد کر دیتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ اہلِ بصیرت حضرات اس خبر کی حقیقت جان لیتے اور بتاتے کہ اس کو ظاہر کرنا چاہیے یا چھپانا۔

اس صورت میں مِنۡهُمۡ (ان میں سے) کی ضمیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ امر کی طرف لوٹے گی اور الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ سے مراد وہ منافق ہیں جو ایسی خبریں کھوجتے اور پھیلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَ کہہ کر خاص طور پر ان کے مذموم طریقے کو ظاہر کیا کہ وہ چھپی ہوئی باتوں کو کھود کر نکالتے اور پھر ان کا چرچا کرتے تاکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔

امام فخر رازی رحمہ اللہ نے اس جملے کے دو مفہوم بیان کیے: الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ سے مراد وہی منافق ہیں جو خبریں پھیلاتے تھے، مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ خبریں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ امر کو لوٹاتے تو وہی منافقین ان سے حقیقت معلوم کر لیتے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ سے مراد اہلِ امر میں سے کچھ لوگ ہیں جو گہری سمجھ بوجھ والے تھے، یعنی اگر منافقین خبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ امر کو دیتے تو وہ اہلِ امر جو استنباط کی صلاحیت رکھتے تھے حقیقت کو جان لیتے۔

سوال جب ان خبروں کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان والوں کی طرف لوٹانے کا حکم منافقین کو دیا گیا ہے تو پھر اہلِ امر کو "ان ہی میں سے" کیوں کہا گیا؟

جواب منافقین ظاہری طور پر مسلمانوں کے ساتھ تھے اور ایمان کا دعویٰ کرتے تھے، اس لیے قرآن نے ظاہری نسبت کے مطابق فرمایا "اہلِ امر ان ہی میں سے ہیں"۔ اسی طرح قرآن میں فرمایا: **وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَنْ لَيُبَطِّئَنَّ** اور تم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو پیچھے رہنے والے ہیں، (یعنی بظاہر مسلمان لیکن حقیقت میں منافق تھے)۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا: اے ایمان والو: اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، وہ تمہیں نیکی اور اطاعت کی توفیق نہ دیتا، تو تم بھی تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ شیطان کے بہکانے میں آ جاتے، جیسے یہ منافق اور ان جیسے دوسرے لوگ بہک گئے ہیں، ہاں، تم میں سے تھوڑے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنا دین خالص اللہ کے لیے کر لیا اور اس کے دامنِ رحمت کو تھام لیا، تو شیطان کو ان پر کوئی قابو نہ ملا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ** بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی اختیار نہیں۔

یہاں سے علماء نے اس آیتِ کریمہ سے چند اہم احکام اور آداب اخذ کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ خبریں پھیلانا، خصوصاً جنگ کے مواقع پر، اس وقت تک درست نہیں جب تک ان کی حقیقت واضح نہ ہو جائے اور یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے مفاد کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

اسی سلسلے میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان "اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں" ان لوگوں پر نکیر ہے جو کسی بات کی حقیقت جانے بغیر جلدی سے اسے بیان کر دیتے ہیں، اسے عام کرتے ہیں اور پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اکثر اوقات اس کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں ہوتی۔ (ابن کثیر، الوسیط)

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ**، آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے (بغیر تحقیق) بیان کر دے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیل و قال سے منع فرمایا، یعنی لوگوں کی باتیں بلا تحقیق آگے بڑھانے اور ہر سنی سنائی بات بیان

کرنے سے روکا، اسی طرح ایک اور حدیث صحیح مسلم میں ہے: مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ، فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِينَ جو شخص کوئی بات بیان کرے اور اسے یقین ہو کہ یہ جھوٹ ہے، تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔ اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ زَعَمُوا، کیا ہی بُری سواری ہے آدمی کے لیے یہ کہنا: زَعَمُوا (یعنی لوگوں نے کہا) مطلب یہ ہے کہ بغیر تحقیق و یقین کے ہر بات کو بیان کرنا جھوٹ اور گناہ کا سبب ہے اور مؤمن کو چاہیے کہ وہ زبان اور خبر میں ہمیشہ احتیاط کرے، زبان غلط استعمال نہ کرے، خبر جھوٹی نہ پھیلائے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِباً أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ یعنی کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کردے۔ (معارف القرآن)

بے تحقیق خبریں پھیلانے کے نقصانات: فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے ان نقصانات کو گنوایا ہے جو بغیر تحقیق کے خبریں پھیلانے کی وجہ سے امت کو لاحق ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ① سب سے پہلا نقصان یہ ہے کہ ایسی افواہیں جھوٹ سے خالی نہیں ہوتیں، بلکہ ان میں جھوٹ بہت زیادہ شامل ہو جاتا ہے۔

② دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر خبر امن کے بارے میں ہو تو اس میں بہت سی مبالغہ آمیز باتیں شامل کر دی جاتی ہیں، جب وہ اضافے حقیقت میں پائے نہیں جاتے تو کمزور ایمان والے لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی سچائی کے بارے میں شک پیدا ہو جاتا، کیونکہ منافقین ان افواہوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے اور اگر خبر خوف کے بارے میں ہو تو وہ کمزور مسلمانوں کے دلوں میں تشویش اور اضطراب پیدا کر دیتی ہے اور انہیں حیرت و پریشانی میں ڈال دیتی ہے، یوں یہ افواہیں فتنہ و فساد کا سبب بنتی ہیں۔

③ تیسرا نقصان یہ ہے کہ افواہیں پھیلنے سے لوگوں میں اس خبر کی چھان بین اور تحقیق کی خواہش بڑھ جاتی ہے، اس کثرتِ جستجو کی وجہ سے بہت سے راز ظاہر ہو جاتے ہیں اور یہ ظاہر ہونا مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔

④ چوتھا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان سخت دشمنی قائم تھی، پس جو خبر مسلمانوں کے لیے امن کی ہوتی، وہ کفار کے لیے خطرہ بن جاتی، اگر مسلمانوں کے امن وطاقت اور جنگی تیاریوں کی کوئی خبر پھیلتی تو منافقین اسے اُڑادیتے اور وہ کافروں تک پہنچ جاتی، پھر کافر اپنے بچاؤ کی تدابیر کرنے لگتے اور اگر مسلمانوں کے خوف وکمزوری کی خبر ہوتی تو منافقین اس میں مبالغہ کرتے اور یوں دشمن اس سے فائدہ اٹھاتا، اس طرح یہ افواہیں ہر پہلو سے فتنوں اور آفات کا ذریعہ بنتی ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایسی خبروں کی اشاعت اور تشہیر کو ناپسند کیا اور اس سے منع فرمایا۔ (الکبیر للرازی ج۹)

شیخ محمد المنیر رحمہ اللہ (جو صلیبی جنگوں کے دور میں تھے) اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ آیت ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو جو کچھ سنتے ہیں بیان کر دیتے ہیں، یہی ایک بڑا جھوٹ کافی ہے، خصوصاً جب بات سرایا (جنگی دستوں) یا دشمنوں کے بارے میں ہو، جو عین دشمن کے سامنے ڈٹے ہوں، عام لوگ جب دشمنوں کے بارے میں جو کچھ سنتے ہیں، چاہے خیر کی خبر ہو یا شر کی، اسے دہراتے ہیں تو اس کا بڑا فساد پیدا ہوتا ہے، ہم نے اپنے زمانے میں اس کا مشاہدہ کیا، جب دشمن نے ملک میں داخل ہو کر حملہ کیا، اللہ اسے پاک کرے اور مسلمانوں کو فتح، سکون اور نصرت عطا فرمائے۔

خلاصہ یہ کہ بغیر تحقیق کے خبریں پھیلانا، خصوصاً جنگ کے موقع پر، انتہائی بڑے نقصانات اور فساد کا باعث بنتا ہے، اگر خبر امن سے متعلق ہو تو اس کی وجہ سے غفلت اور بے پروائی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر خبر خوف سے متعلق ہو تو اس کی وجہ سے لشکر اور معاشرے میں اضطراب و انتشار پھیل جاتا ہے، وہی معاشرہ عقل مند اور سمجھدار سمجھا جاتا ہے جہاں خبریں صرف معتبر ذرائع سے آتی ہیں اور جہاں لوگ حقیقت جاننے کے لیے علماء وماہرین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آیت مومنوں کے دلوں میں دین، ریاست اور قیادت کے لیے اخلاص پیدا کرتی ہے، آیت کی ابتدا میں بغیر تحقیق کے خبر پھیلانے کی مذمت ہے، درمیان میں حکم ہے کہ حقیقت معلوم کرنے کے لیے علماء صالحین اور عادل حکام کی طرف رجوع کیا جائے اور آخر میں اللہ کے فضل ورحمت کی یاد دہانی ہے تاکہ لوگ اطاعت پر قائم رہیں اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہیں۔

نبی کریم ﷺ کو جہاد کرنے کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا {۸۴} النساء

جواب ترجمہ: لہٰذا (اے میرے حبیب ﷺ) آپ اللہ کے راستے میں جنگ کریں، آپ پر اپنے سوا کسی اور کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہاں مومنوں کو ترغیب دیتے رہیں، کچھ بعید نہیں کہ اللہ کافروں کی جنگ کا زور توڑ دے۔ اور اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست ہے اور اس کی سزا بڑی سخت۔

شان نزول: جب غزوہ احد شوال میں ہو چکا تو رسول کریم ﷺ نے ذیقعدہ میں کفار کے وعدہ کے موافق بدر میں مقابلہ کے لئے جانا چاہا (جس کو مؤرخین بدر صغریٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اس وقت بعض لوگوں نے تازہ زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہی خبروں کی وجہ سے جانے میں کچھ تامل کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسول کریم ﷺ کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر یہ کچے مسلمان لڑائی سے ڈرتے ہیں تو اے رسول! آپ ﷺ تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کریں، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کا مددگار ہے، اس ہدایت کو پاتے ہی آپ ﷺ ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغریٰ کو تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان کے ساتھ غزوہ احد کے بعد ہوا تھا، حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وہ اپنے وعدے سے جھوٹے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا اور رسول کریم ﷺ اپنے ساتھیوں سمیت سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اس آیت کے پہلے جملہ میں تو رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ تن تنہا جہاد و قتال کے لئے تیار ہو جایئے، کوئی دوسرا آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، مگر ساتھ ہی دوسرے جملہ میں یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ

دوسرے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کا کام بھی چھوڑیں نہیں، ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے، ان کے فعل کی آپ سے باز پرس نہ ہو گی۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: تن تنہا جنگ کرنے میں جو خطرہ ہو سکتا تھا اس کے اِزالہ کے لئے فرمایا کہ اس کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ کو روک دے اور ان کو مرعوب و مغلوب کر دے اور آپ کو تنہا ہی کامیاب کر دے۔

وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا: پھر اس کے بعد اس کامیاب ہونے پر دلیل بیان فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہے جس کی قوت جنگ اور زور جنگ ان کافروں سے بدر جہا زیادہ ہے تو پھر کامیابی بھی یقیناً آپ ہی کی ہے، پھر اسی شدت باس کے ساتھ اپنی سزا کی شدت بھی بیان فرمائی، یہ سزا خواہ قیامت میں ہو جیسا کہ ظاہر ہے، یا دنیا میں ہو جیسا کہ بعض نے کہا، بہر حال جس طرح جنگ کرنے میں ہماری قوت و طاقت بڑھی ہوئی ہے اسی طرح سزا دینے میں بھی ہماری سزا بہت سخت ہے۔ (معارف القرآن) تَنْكِيْلاً مادہ: نَكَلٌ سے ہے، اس کا معنی ہے روک دینا، عبرت دلانا، ایسا عذاب دینا جس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو، قرآن مجید میں "تنکیل" اس عذاب یا سزا کو کہا گیا ہے جو صرف مجرم کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی مثالی عبرت بن جائے۔

سرکار دوجہاں ﷺ نے اسی فرمان کی روشنی میں ارشاد فرمایا تھا کہ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَأَخْرُجَنَّ وَلَوْ وَحْدِيْ، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں ضرور جہاد کے لیے نکلوں گا اگرچہ تن تنہا ہی کیوں نہ ہوں، چنانچہ آپ ﷺ ستر جانثاروں کی قیادت کرتے ہوئے نکلے تو اللہ نے کفار پر رعب ڈال دیا اور وہ میدان میں نہیں آئے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ سب سے زیادہ بہادر اور جنگ کی کیفیت سے سب سے زیادہ واقف تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ ﷺ کو اس بات کا حکم نہ دیتا جب تک آپ ﷺ ان صفات سے متصف نہ ہوتے، اسی کی اقتدا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کی، جب آپ رضی اللہ عنہ نے اکیلے ہی ان لوگوں سے قتال کے لیے نکلنے کا

ارادہ کیا جو زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے تھے اور جو شخص یہ جان لے کہ سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ کوئی کام بھی اللہ کے فیصلے کے بغیر نہیں ہوتا، اس پر یہ بات آسان ہو جاتی ہے، مزید یہ کہ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر رسول اکرم ﷺ کی مدد کرنے والا قتال میں کوئی بھی نہ ہوتا، تب بھی آپ ﷺ کے لیے جہاد سے پیچھے ہٹنا جائز نہ تھا۔ (الکبیر للرازی ج ۱۰)

نیکی اور بدی میں تعاون کرنے والوں کا صلہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا {۸۵} النساء

جواب ترجمہ: جو شخص اچھی سفارش کرے، اسے اس میں سے حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس میں سے حصہ ملے گا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا : یہاں شفاعت سے مراد کسی معاملے میں معاونت ہے، جو کوئی کسی دوسرے کی بھلائی کے کسی کام میں سفارش کرتا ہے اور اس کام میں اس کی مدد کرتا ہے، مثلاً مظلوموں کے بارے میں ظالم کے پاس سفارش کرنا اسے اس کی کوشش اور عمل کے مطابق اس نیک سفارش سے حصہ نصیب ہو گا اور اصل کام کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ (تفسیر السعدی) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اگر کوئی طالب حاجت آتا تو آپ ﷺ اپنے پاس بیٹھنے والوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور ان سے یوں فرماتے تھے سفارش کرو (یعنی اس کی حاجت پوری کرانے میں بات کرو)، تمہیں اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہتا ہے فیصلہ فرما دیتا ہے۔ (تفسیر الوسیط)

صاحبِ کشاف نے فرمایا: ”شفاعت حسنہ وہ ہے جس میں کسی مسلمان کا حق ملحوظ رکھا جائے، اس کے ذریعے اس سے کوئی شر دور کیا جائے یا اس کے لیے کوئی بھلائی حاصل کی جائے اور اس کا مقصد اللہ کی رضا ہو، اس پر رشوت نہ لی گئی ہو اور یہ کسی جائز کام میں ہو، نہ کہ اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے

بارے میں یا کسی ایسے حق میں جو اس پر واجب ہے اور شفاعتِ سیئہ وہ ہے جو اس کے برخلاف ہو۔ (تفسیر کشاف، تفسیر الوسیط)

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا: اور جو کوئی برائی کے کسی کام میں کسی کی مدد کرتا ہے تو اس کے تعاون اور مدد کے مطابق عذاب میں سے اس کو حصہ ملے گا۔ اس آیت کریمہ میں نیکی اور تقویٰ میں تعاون کے لیے بہت بڑی ترغیب ہے۔ اسی طرح گناہ اور زیادتی کے کاموں میں معاونت پر زجر و توبیخ ہے۔

شفاعت: کسی انسان کو دنیاوی یا اخروی نفع پہنچانے یا اسے کسی نقصان سے بچانے کے لیے بات کرکے سفارش کرنا ہے، یہ لفظ "شفع" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے "جوڑا" جو کہ "وتر" (یعنی طاق) کے مقابل ہے۔ گویا جس کے لیے شفاعت کی گئی وہ تنہا (وتر) تھا اور شفیع نے اسے جوڑا (شفع) بنا دیا، اور "شفاعت" کا اطلاق شر کی کوشش پر محض مشاکلت (یعنی مناسبتِ لفظی) کے طور پر ہے، ورنہ شفاعت اصل میں صرف خیر کی وساطت پر استعمال ہوتی ہے۔

نصیب: ہر چیز میں حصہ اور کفل: دوگنا، حصہ اور نصیب۔ امام جمل فرماتے ہیں: "کفل" کا استعمال برائی میں زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت "نصیب" کے، اگرچہ دونوں کا استعمال خیر میں بھی آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ اور چونکہ "نصیب" کا استعمال برائی میں کم اور "کفل" کا استعمال اس میں زیادہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں فرق کرتے ہوئے "سیئہ" کے ساتھ "کفل" اور "حسنہ" کے ساتھ "نصیب" کو ذکر فرمایا۔ مطلب یہ ہے: جو شخص اچھی شفاعت کرے، یعنی کسی ایسے معاملے میں سفارش کرے جس کا نتیجہ بھلائی پر ہو، تو اسے اس شفاعت کا حصہ ملے گا، یعنی اس شفاعت حسنہ کا ثواب ملے گا اور جو شخص بری شفاعت کرے، یعنی وہ سفارش جو خیر کے راستے میں نہ ہو، تو اسے اس کا کفل ملے گا، یعنی اس کا گناہ اور وبال ملے گا، کیونکہ وہ خیر کے بجائے فساد کی کوشش کر رہا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا گواہ اور حفاظت کرنے والا ہے، یعنی وہ ان اعمال کا حساب لے گا اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق جزا دے گا۔ (تفسیر السعدی) قَتَ، یَقُوتُ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں، کھانا دینا، روزی پہنچانا، پرورش کرنا، طاقت دینا۔ مُقِیت اسمِ فاعل ہے، یعنی غذا دینے والا، روزی پہنچانے والا، پرورش کرنے والا، قوت عطا کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے جب "مُقِیت" بولا جاتا ہے تو اس کے معانی یہ ہیں، وہ ذات جو ہر ایک کو اس کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے والی ہے، مقیت وہ ہے جو مخلوق کو قوت و طاقت بخشتا ہے تاکہ وہ زندہ رہ سکے، مقیت وہ جو ہر چیز پر قدرت اور نگہبانی رکھتا ہے۔

اہلِ لغت و مفسرین مقیت کی تفسیریوں کرتے ہیں، ابن فارس: اَلْقَافُ وَالْوَاوُ وَالتَّاءُ أَصلٌ صَحِيحٌ يَدُلُّ عَلَى قُوتٍ وَّغِذاءٍ یعنی قاف، واؤ اور تاء تین حروف سے مرکب لفظ کا مجموعہ قوت بنتا ہے یہ اصل میں قوت و غذا پہنچانے پر دلالت کرتا ہے۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں اَلْمُقِيتُ هُوَ الحَافِظُ وَالشَّاهِدُ وَالمُوصِلُ لِلقُوتِ یعنی مُقِیت کا مطلب ہے، حافظ، گواہ اور روزی پہنچانے والا۔ علامہ طبری فرماتے ہیں اَلْمُقِيتُ هُوَ الرَّزَّاقُ الحَفِيظُ یعنی مُقِیت وہ ہے جو رزق دینے والا اور حفاظت کرنے والا ہے۔ "مُقِیت" کا مطلب ہے: حفاظت کرنے والا، اور "قُوت" سے ماخوذ ہے، یعنی وہ چیز جو زندگی کو سہارا دے اور انسان کی بقا کا ذریعہ بنے اور مطلب یہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی، اور وہ لوگوں کے حالات کا محافظ ہے، ان میں سے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رہتی، اور وہ انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ (تفسیر الوسیط)

اگرچہ یہ آیت عام ہے اور ہر اچھی یا بری شفاعت کے بدلے کا بیان کرتی ہے، لیکن اصل مقصد اس سے یہ ہے کہ مؤمنین کو ترغیب دی جائے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور حق کی نصرت کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جائیں اور ساتھ ہی منافقین کو دھمکی دی جائے جو آپس میں ایک دوسرے کے لیے سفارش کرتے تھے تاکہ نبی ﷺ انہیں جہاد سے پیچھے رہنے کی اجازت دے دیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی رخ کو راجح قرار دیا اور فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''جو کوئی اچھی شفاعت کرے گا اسے اس کا حصہ ملے گا اور جو بری شفاعت کرے گا اسے اس کا کفل ملے گا'' کا مطلب یہ ہے، اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو جوڑ کر ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے دشمن سے جہاد کریں تو وہ اچھی شفاعت والا ہے۔

اور (کافروں سے) ان کا قتال کرنا اللہ کی راہ میں، یہی دراصل نیک سفارش ہے، اس کے لیے بھی اس سفارش میں سے ایک حصہ ہو گا، یعنی اسے اس سفارش کا ایک نصیب ملے گا اور وہ نصیب اللہ کے ثواب اور اس کے عظیم اکرام میں سے حصہ ہے اور جو شخص برعکس سفارش کرے، یعنی اللہ کے منکروں کی طرف سے اہلِ ایمان کے مقابلے میں مدد کرے اور ان سے جنگ کرے، تو یہ بری سفارش ہے اور اس کے لیے اس (بری سفارش) کا بوجھ ہو گا، ''کِفل'' سے مراد حصہ اور نصیب ہے، لیکن وہ گناہ اور وبال کا نصیب ہو گا اور یہ لفظ ''کفل'' کِفْلُ الْبَعِیْرِ وَالْمَرْکَب اونٹ کے کجاوے یا سواری پر ڈالی جانے والی چادر یا اس پر رکھے جانے والے بچھونے سے ماخوذ ہے، جو زین یا پالان کے مشابہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: جَاءَ فُلَانٌ مُکْتَفِلاً یعنی فلاں شخص اس حال میں آیا کہ وہ سواری پر تھا جس پر بیٹھنے کا سامان بچھا ہوا تھا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت انسانوں کے ایک دوسرے کے حق میں سفارش کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ آیت ابتدا میں اس موقع کے بارے میں اتری ہو جس کا ذکر ہوا، پھر اس کا حکم عام کر دیا گیا ہو، تاکہ ہر وہ شخص شامل ہو جائے جو نیکی یا برائی کی سفارش کرتا ہے۔ لیکن ہم نے جس قول کو اختیار کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت اس سیاق میں آئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ مؤمنوں کو جہاد پر اُبھاریں، اس لیے زیادہ مناسب بات یہی ہے کہ یہاں وعدہ ان لوگوں کے لیے ہو جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر لبیک کہا اور وعید ان لوگوں کے لیے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے منہ موڑ گئے، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے بہ نسبت اس کے کہ کہا جائے کہ یہ صرف لوگوں کی باہمی سفارش کے بارے میں ہے، جس کا ذکر نہ اس سے پہلے ہوا ہے اور نہ اس کے بعد۔ (ابن جریر)

سلام اور سلام کا جواب

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا {۸۶} النساء

جواب ترجمہ: اور جب تمہیں کوئی سلام کرے تو تم اس سے بہتر طریقہ پر سلام کرو یا انہی (الفاظ) میں جواب دے دو، بلاشبہ اللہ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا : اللہ تعالیٰ نے جب اپنے بندوں کو اچھی سفارش کرنے کا حکم دیا اور بری سفارش سے منع کیا تو اس کے بعد انہیں ملاقات اور آدابِ ملاقات سکھائے تاکہ آپس میں محبت اور مودّت بڑھتی رہے۔ چنانچہ فرمایا: اور جب تمہیں کسی دعا و سلام کے ساتھ سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم ویسا ہی لوٹا دو۔ تَحِيَّةٌ اصل میں تَحْيِيَةٌ تھا، جیسے تَسْمِيَةٌ اور تَرْضِيَةٌ، لیکن آسانی کے لیے ایک "ی" دوسری "ی" میں مدغم کر دی گئی۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ "تحیۃ" کی اصل "حیات" سے ہے، یعنی جب کہا جاتا "حیاک اللہ" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تجھے زندگی عطا کرے، یہ پہلے خبر کے طور پر استعمال ہوتا، پھر دعا کے طور پر رائج ہو گیا، یوں کہا جاتا: حَيَّا فُلَانٌ فُلَانًا تَحِيَّةً فلاں نے فلاں کو تحیۃ دی یعنی "حیاک اللہ" کہا۔ عربوں کا دستور یہ تھا کہ جب ایک دوسرے سے ملتے تو محبت کے اظہار کے طور پر کہتے: "حَيَّاكَ اللّٰهُ، جب اسلام آیا تو اس کی جگہ سلام اور امانت کا کلمہ لے آیا، یعنی مسلمان اپنے بھائی سے ملتے وقت کہے: السلام علیکم، اور اس میں اللہ کی رحمت اور برکت کی دعا بھی شامل ہو گئی، عربوں میں آج بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو السلام علیکم کے بعد دعائیہ کلمہ کے طور پر حیاک اللہ کہتے ہیں، خوشی کے موقع پر حیاک اللہ کہتے ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم ویسا ہی لوٹا دو، یعنی بہتر جواب دینا مستحب ہے اور برابر کا جواب دینا

فرض۔ (تفسیر ابن کثیر، تفسیر الوسیط)

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: السلام علیک یا رسول اللہ، آپ ﷺ نے فرمایا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ۔ پھر دوسرا آیا اور کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ، تو آپ ﷺ نے جواب دیا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، پھر تیسرا آیا اور کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "وعلیک" اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! فلاں آیا تو آپ نے زیادہ جواب دیا، فلاں آیا تو اور زیادہ، اور مجھے صرف "وعلیک" فرمایا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ہمارے لیے کچھ باقی ہی نہیں چھوڑا، اللہ نے فرمایا ہے: **فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا**، تو ہم نے تمہیں ویسا ہی جواب دیا۔ (تفسیر الوسیط)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کا زیادہ سے زیادہ مسنون صیغہ یہی ہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس سے آگے کا اضافہ مشروع نہیں، ورنہ نبی ﷺ بھی اضافہ فرماتے، کئی لوگ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ومغفرتہ، جنت حلال و جہنم حرام کے الفاظ کہہ دیتے ہیں، یہ اس موقع پر استعمال کرنا خلاف سنت عمل ہے، ایک گروہ یا ایک جماعت کہیں سے گزر رہی ہے تو ان میں سے ایک شخص بھی سلام کر دے تو کافی ہے، (بیہقی) بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، انہیں سلام کیا گیا تو ان میں سے کوئی ایک جواب دے دے تو کافی ہے، کوئی یہودی، کوئی عیسائی، کوئی مجوسی اگر مسلمان کو سلام کرتا ہے تو اس کو اتنا ہی جواب دیا جائے اس سے زائد نہیں، خود انہیں سلام کرنے میں پہل نہ کی جائے، یہاں جو کہا گیا کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس کے جواب میں بہتر جواب دو، یا کم از کم اتنا ہی دو، یہ مسلمانوں کو حکم ہے جب وہ مسلمان کو سلام وعلیکم السلام کریں، کسی کافر کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے، یہاں مسلمانوں کو اچھی طرح جواب دینے اور اہل کتاب کو ان کے سلام جتنا ہی جواب دینے کا فرمایا گیا ہے۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے فرماتے ہیں کہ بعض مقامات پر سلام کرنا مکروہ ہے: مثلاً نمازی پر، قرآن پڑھنے والے پر، اللہ کا ذکر کرنے والے پر، گفتگو کرنے والے پر، خطیب پر، ننگی شرمگاہ والے پر، گانے والے پر، قضائے حاجت کرنے والے پر، کافر پر، اجنبیہ لڑکی پر اور عورتوں کا عورتوں پر سلام

کرنا ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا مردوں پر، یعنی وہ آپس میں سلام کر سکتی ہیں، رہا معاملہ مرد کا عورتوں کو سلام کرنے کا، تو اگر وہ عورتیں ایک جگہ بیٹھی ہوں تو مرد کے لیے مستحب ہے کہ انہیں سلام کرے، بشرطیکہ اسے اپنے اوپر یا ان پر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اس کی دلیل وہ روایت ہے جو اسماء بنت یزید سے مروی ہے، انہوں نے کہا: مَرَّ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَسَلَّمَ عَلَيْنَا ہم عورتوں کے پاس سے رسول اللہ ﷺ گزرے تو آپ ﷺ نے ہم پر سلام کیا۔ (ابو داؤد، ترمذی، حاشیہ المقتطف)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا اور آپ مجلس میں تشریف فرما تھے اس نے کہا سلام علیک آپ نے فرمایا دس نیکیاں دوسرا آدمی گزرا تو اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ آپ نے فرمایا بیس نیکیاں پھر تیسرا آدمی گزرا اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ نے فرمایا تیس نیکیاں (اس کو ملیں گی) (امام بخاری باب ادب المفرد)

یہ آیت مؤمنوں کو تعلیم دیتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تحیۃ کا جواب دیں اور سلام کو عام کریں، کیونکہ سلام کے پھیلانے سے مسلمانوں کے درمیان محبت اور مودّت بڑھتی ہے، اسی لیے احادیث میں بھی کثرت سے سلام کے عام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ، اور ایمان کامل نہ ہو گا جب تک آپس میں محبت نہ کرو، کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اگر تم اسے کرو تو آپس میں محبت پیدا ہو جائے؟ سلام کو عام کرو۔

اِنَّ اللهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا: بیشک اللہ ہر چیز پر حساب لینے والا ہے، آیت کے آخر میں یہ الفاظ لانے کا مقصد لوگوں کو اللہ کے احکام بجالانے اور اس کی ممانعتوں سے بچنے کی ترغیب دینا ہے۔ یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک اپنے بندوں پر نگران ہے، ان کے تمام اقوال و افعال کو دیکھنے والا ہے، زمین و آسمان میں کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی، وہ قیامت کے دن لوگوں سے ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ان کو ان کے اعمال کے مطابق جزا دے گا، جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ بھی اسے دیکھ لے گا، چونکہ معاملہ ایسا ہی ہے، اس لیے عقل مند وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے اور اس کی ممانعتوں سے بچے۔

توحید باری تعالیٰ اور محشر میں حشر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا {۸۷} النساء

جواب ترجمہ: اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تمہیں ضرور بالضرور قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے، اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ بات کا سچا ہو؟

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ : اللہ وہ واحد و یکتا ہے، اکیلا اور سب سے بے نیاز، جس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ وہ تمہیں قبروں سے ضرور اٹھائے گا اور تمہیں بروزِ قیامت حساب کے لیے ضرور جمع کرے گا، اس دن کے بارے میں کوئی شک نہیں، پس اس مبارک جملے نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ عبادت صرف اللہ ربّ العالمین ہی کا حق ہے اور یہ بھی کہ حساب کا دن ضرور آنے والا ہے، خواہ منکرین اس کا انکار کریں یا جھگڑنے والے اس میں جھگڑتے رہیں۔

قیامت لغوی طور پر اٹھنے، کھڑا ہونے یا برپا ہونے کو کہتے ہیں، قرآن و عربی لغت میں قیامت سے مراد ہے، لوگوں کا قبروں سے اٹھ کھڑا ہونا، کسی بڑی چیز کا اچانک برپا ہونا، فیصلے یا عدل کے لیے سب کا جمع ہونا، قیامت شرعی اصطلاح میں اس دن کو کہا جاتا ہے جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں اور جنات کو دوبارہ زندہ کرے گا، ان کو قبروں سے اٹھا کر میدانِ حشر میں جمع کرے گا، ان کے اعمال کا حساب و کتاب ہو گا اور جزا و سزا کا فیصلہ سنایا جائے گا، اسی کو یوم القیامہ یا یوم الدین کہا جاتا ہے، اس دن آسمان پھٹ جائے گا، زمین لرز اٹھے گی، ستارے بکھر جائیں گے اور ہر ذی روح اپنے انجام کو پہنچے گا۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا : یہاں آیتِ کریمہ میں استفہام انکاری اور نفی کے لیے ہے، یعنی اس کائنات میں کوئی ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کی بات، اس کی خبر، اس کے وعدے اور اس کی وعید سے زیادہ سچا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹ قبیح چیز ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قبیح سے پاک ہے، جھوٹ بولنے والا یا تو

کسی نفع کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، یا کسی نقصان کو دور کرنے کے لیے، یا اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کی برائی کو نہیں جانتا، لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے، ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا خالق ہے، پس جو ایسی صفات والا ہو، اس سے جھوٹ کا صدور ممکن نہیں، بلکہ اس کی طرف سے ہمیشہ حق، سچائی اور عدل ہی صادر ہوتا ہے۔

منافقین اور دشمنوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھنا چاہیے؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا {۸۸} وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا {۸۹} اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا {۹۰} سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا {۹۱} النساء

جواب ترجمہ: پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ بن گئے؟ حالانکہ انہوں نے جیسے کام کیے ہیں ان کی بناء پر اللہ نے ان کو اوندھا کر دیا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ایسے شخص کو ہدایت پر لاؤ جسے اللہ (اس کی خواہش کے مطابق) گمراہی میں مبتلا کر چکا؟ اور جسے اللہ گمراہی میں مبتلا

کر دے، اس کے لیے تم ہر گز کبھی کوئی بھلائی کا راستہ نہیں پا سکتے۔ یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح انہوں نے کفر کو اپنا لیا ہے، اسی طرح تم بھی کافر بن کر سب برابر ہو جاؤ۔ لہٰذا (اے مسلمانو) تم ان میں سے کسی کو اس وقت تک دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کے راستے میں ہجرت نہ کر لے۔

چنانچہ اگر وہ (ہجرت سے) اعراض کریں تو ان کو پکڑو، اور جہاں بھی انہیں پاؤ، انہیں قتل کر دو، اور ان میں سے کسی کو نہ اپنا دوست بناؤ، نہ مددگار۔ ہاں وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان کوئی (صلح کا) معاہدہ ہے، یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ ان کے دل تمہارے خلاف جنگ کرنے سے بھی بیزار ہوں، اور اپنی قوم کے خلاف جنگ کرنے سے بھی اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا تو وہ تم سے ضرور جنگ کرتے۔

چنانچہ اگر وہ تم سے کنارہ کشی کرتے ہوئے تم سے جنگ نہ کریں، اور تم کو امن کی پیشکش کر دیں تو اللہ نے تم کو ان کے خلاف کسی کارروائی کا کوئی حق نہیں دیا۔ (منافقین میں) کچھ دوسرے لوگ تمہیں ایسے ملیں گے جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی (مگر) جب کبھی ان کو فتنے کی طرف واپس بلایا جائے، وہ اس میں اوندھے منہ جا گرتے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ لوگ تم سے (جنگ کرنے سے) علیحدگی اختیار نہ کریں، اور نہ تمہیں امن کی پیشکش کریں اور نہ اپنے ہاتھ روکیں تو ان کو بھی پکڑو، اور جہاں کہیں انہیں پاؤ، انہیں قتل کرو۔ ایسے لوگوں کے خلاف اللہ نے تم کو کھلا کھلا اختیار دے دیا ہے۔

شانِ نزول: حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ کے سببِ نزول میں متعدد روایات ذکر کی ہیں، جن میں سب سے اہم دو ہیں ① پہلی روایت یہ ہے کہ یہ آیت اُن منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہوئے، ہوا یہ کہ رسول اللہ ﷺ اُحد کی طرف روانہ ہوئے، مسلمان بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، لیکن راستے میں عبد اللہ بن اُبی بن سلول (منافق) ایک تہائی لشکر کو واپس لے گیا اور اُنہوں نے کہا، اگر ہمیں قتال ہونے کا یقین ہوتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔

اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہوا، بعض نے کہا، یہ منافق ہیں، ان کو قتل کرنا چاہیے کیونکہ یہ کافر ہو گئے ہیں اور کچھ نے کہا: نہیں! یہ کافر نہیں ہوئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، إِنَّهَا طَيْبَةٌ، وَإِنَّهَا تَنْفِي خَبَثَهَا كَمَا تَنفِي النَّارُ خَبَثَ الفِضَّةِ مدینہ پاکیزہ ہے، یہ گندگی کو ایسے ہی نکال دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کی میل کو نکال دیتی ہے۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن، تفسیر الوسیط)

② دوسری روایت یہ ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ میں اسلام کا اظہار تو کرتے تھے مگر مشرکین کی مدد بھی کرتے تھے، امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ کچھ لوگ مکہ میں اسلام لے آئے تھے لیکن مشرکین کی پشت پناہی کرتے تھے، ایک دن وہ کسی ضرورت کے لیے مکہ سے باہر نکلے اور کہنے لگے، اگر ہم محمد کے ساتھیوں سے مل گئے تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا، جب مسلمانوں کو خبر ہوئی کہ یہ لوگ مکہ سے نکلے ہیں، تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے کہا، ان خبیثوں پر حملہ کرو اور قتل کر ڈالو، کیونکہ یہ تمہارے دشمن کی مدد کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے دوسرے گروہ نے کہا، سبحان اللہ! کیا تم ایسے لوگوں کو قتل کرو گے جو کلمہ پڑھ چکے ہیں اور تمہارے ہی جیسے کلمات ادا کر چکے ہیں؟ کیا محض اس لیے کہ وہ ہجرت کر کے تمہارے پاس نہیں آئے، اُن کا خون اور مال تم پر حلال ہو جائے گا؟ اس طرح مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ اختلاف ہوا، لیکن آپ ﷺ نے کسی فریق کو منع نہ کیا، تب یہ آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ نازل ہوئی۔

اور بھی روایات ہیں، جن میں ان آیات کے نزول سے متعلق حضرات مفسرین کرام نے روایات نقل کی ہیں، لیکن جانکار مفسرین کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ دوسری روایت ہی آیات کے سیاق اور تاریخی حالات سے زیادہ ہم آہنگ ہے، کیونکہ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مدینہ کے منافقین کے بارے میں قتال کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اُن کے خلاف دوسری تدابیر اختیار فرمائیں، جن سے وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔

پھر آیت میں جو یہ فرمایا گیا: فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا یہ فرمان اس بات کی تائید کرتا ہے کہ یہاں منافقین سے مراد مدینہ والے منافق نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو مدینہ سے باہر تھے، کیونکہ ہجرت غیر مدینہ سے مدینہ کی طرف ہوتی تھی اور یہ حکم اُس وقت تک برقرار رہا جب تک مکہ فتح نہیں ہوا تھا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی دوسرے سببِ نزول کو ترجیح دی اور فرمایا کہ درست بات یہ ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں اتری جو مکہ میں اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے، اس کی سب سے بڑی دلیل آیت کے اگلے الفاظ ہیں، فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ اہلِ مدینہ میں سے نہ تھے بلکہ باہر کے تھے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ: لفظ فَمَا لَكُمْ کا فاء گذشتہ مضمون پر تفریع کے لیے ہے یا پھر اسے کلام واضح کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ مَا مبتدا ہے اور لَكُمْ اس کی خبر۔ امام جمل لکھتے ہیں کہ فِي الْمُنَافِقِينَ کے تین احتمال ہیں، یہ لَكُمْ سے متعلق ہے، مطلب یہ کہ تمہیں منافقین کے بارے میں کیا ہو گیا؟ یہ فِئَتَيْنِ کے مفہوم سے متعلق ہے، یعنی تم منافقین کے بارے میں دو گروہ کیوں ہو گئے؟ یا یہ فِئَتَيْنِ کی صفت ہے جو حال کے طور پر آئی ہے۔

اس آیت میں استفہام کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منافقین کے بارے میں اختلاف کرنے پر تنبیہ کی جائے اور اُنہیں جھڑکا جائے کہ ان کی حالت تو بالکل واضح ہے، پھر اختلاف کیسا؟ یعنی اے ایمان والو! میں نے تمہارے سامنے منافقین کی ایسی حالت بیان کر دی ہے جو اُن کی خباثت اور مکر کو ظاہر کرتی ہے، اب تمہیں کیا ہو گیا کہ ان کے بارے میں دو رائے رکھتے ہو؟ کچھ لوگ اُن کی صفائی پیش کرتے ہیں اور کچھ ان کی حقیقت پہچان کر ان سے الگ ہو گئے ہیں۔

وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا: اللہ نے ان کے برے اعمال کی وجہ سے انہیں دوبارہ کفر میں لوٹا دیا، أَرْكَسَهُمْ کا مطلب ہے الٹ دینا، جیسے کسی چیز کو سر کے بل گرا دیا جائے۔

أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَهْدُوْا مَنْ أَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا: کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو ہدایت دو جنہیں اللہ نے گمراہ کر دیا ہے؟ حالانکہ جسے اللہ گمراہ کرے، اس کے لیے کوئی راہِ ہدایت نہیں۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً: وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ تاکہ سب برابر ہو جائیں۔

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جب تک وہ لوگ ہجرت کر کے اسلام کی طرف نہ آئیں اور اپنی صداقت کا ثبوت نہ دیں، تم ان سے کسی قسم کی دوستی یارفاقت نہ رکھو۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین، منافقین اور زندیقوں سے دوستی و محبت جائز نہیں، کیونکہ سب سے بڑی چیز دین ہے اور دین میں اختلاف کی وجہ سے دوستی کا رشتہ باقی نہیں رہ سکتا، اسی طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہجرت اُس وقت تک فرض تھی جب تک مکہ فتح نہیں ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں ہر اُس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہے، فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا، فتح کے بعد ہجرت نہیں رہی، البتہ جہاد اور نیت باقی ہے۔ (التفسیر الوسیط)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ: اگر وہ اپنی گمراہی اور ضلالت پر قائم رہیں، یعنی اگر یہ منافق اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت سے منہ موڑ لیں تو ان کے اسلام کو معتبر نہ سمجھو، بلکہ انہیں قید میں پکڑو، ان پر سختی کرو اور تم انہیں جہاں پاؤ وہیں قتل کر ڈالو کیونکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: اور ایسی حالت میں نہ تو انہیں اپنا دوست اور ہمدم بناؤ اور نہ ہی مددگار بناؤ، جس کے ذریعے تم اپنے دشمنوں کے مقابلے میں قوت حاصل کرو، کیونکہ ایسے منافقوں کی ولایت اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی ہے اور ان سے مدد لینا انجام کار ذلت و رسوائی کا

سبب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا، اگر یہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے لیے فساد ہی بڑھاتے، یہ آیت کریمہ مومنوں کو حکم دیتی ہے کہ ایسے منافقوں کو قتل کریں جن کا کفر ظاہر ہو گیا ہو اور انہیں دوست ورفیق بنانے یا ان سے مدد لینے سے منع فرماتی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "مگر وہ لوگ جو ایسے قبیلے سے جا ملیں جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے" اس آیت میں یہ استثناء اُس مفعول (ضمیر) سے ہے جو فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ میں آیا ہے۔ يَصِلُونَ کے معنی ہیں پناہ لینا یا جا ملنا اور مِيثَاقٌ سے مراد ہے مضبوط عہد وپیمان۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ ان منافقوں کو پکڑو اور قتل کرو، جنہوں نے اپنا کفر ظاہر کر دیا ہے، یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ اور جنہوں نے تمہارے علاقے کی طرف ہجرت کرنے سے انکار کیا ہے، وہ تمہیں ان سے دوستی کرنے اور ان کی مدد لینے سے بھی منع کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جو ایسے قبیلے کے ساتھ جا ملے ہیں جن کے اور تمہارے درمیان معاہدۂ امن ہے، کیونکہ ان کی یہ پناہ اختیار کرنا انہیں بھی انہی کے حکم میں داخل کر دیتا ہے جن کے پاس وہ پناہ لے رہے ہیں، یعنی ان کے لیے بھی امن ہے اور ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا۔

علماء نے اس بارے میں مختلف اقوال ذکر کیے ہیں کہ وہ کون سے قبیلے تھے جن کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدۂ امن تھا، بعض نے کہا، وہ بنو اسلم تھے، رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ کی طرف خروج فرمایا تو آپ ﷺ نے ہلال بن عُوَیمر الاسلمی سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ نہ وہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد کرے گا اور نہ آپ ﷺ اس کے خلاف کسی کی مدد کریں گے اور یہ بھی کہ جو شخص ہلال کے پاس آکر پناہ لے گا، اس کے لیے بھی وہی امان ہو گی جو ہلال کے لیے ہے، بعض نے کہا، وہ بنو بکر بن زید تھے اور بعض نے کہا، وہ قبیلہ خُزاعہ تھا۔ (الوسیط)

اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ: یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے سینے تنگ ہوں اس بات سے کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں، اس کا عطف اَلَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ کے صلہ پر ہے، یعنی يَصِلُوْنَ پر۔ حَصِرَتْ کا معنٰی ہے تنگ ہو گئے، یا انقباض میں آ گئے، اسی سے قول میں "حصر" کہا جاتا ہے، یعنی بولنے والے پر بات تنگ ہو گئی، کہا جاتا ہے، حَصَرَ صَدْرُهٗ يَحْصُرُ اس کا سینہ تنگ ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ اے ایمان والو! تم ان منافقوں کو پکڑو اور قتل کرو جنہوں نے اپنے کفر کو ظاہر کر دیا، البتہ ان لوگوں کو نہ پکڑو اور نہ قتل کرو جو ایسے لوگوں کی طرف پناہ گزین ہوں جن کے ساتھ تمہارا عہدِ امان ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو پکڑو اور قتل کرو جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل تنگ ہیں کہ تم سے قتال کریں کیونکہ تم مسلمان ہو اور ان کے دل اس سے بھی تنگ ہیں کہ اپنی قوم سے قتال کریں کیونکہ وہ انہی کی قوم اور قبیلہ ہیں، یا اس وجہ سے کہ وہ اپنی قوم سے لڑیں تو ان کے مال اولاد یا رشتہ داروں پر نقصان آئے گا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ کے استثناء کے ذریعے قتل و گرفت سے دو طرح کے لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا ہے، ① پہلا گروہ، وہ لوگ جو دشمنوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کی طرف پناہ لے لیں جن کے اور مسلمانوں کے درمیان عہد و پیمان ہے، تو وہ ان کے ساتھ پناہ لینے کی وجہ سے اسی امان کے حکم میں ہو گئے۔ ② دوسرا گروہ وہ ہے جو مسلمانوں کے پاس صلح کے ساتھ آتا ہے اور اپنی قوم کو چھوڑ دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ مسلمانوں سے لڑنے کو ناپسند کرتا ہے کیونکہ وہ ان سے محبت کرتا ہے اور اپنی قوم سے بھی لڑنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ اس کی اپنی قوم، قبیلہ اور گھر والے ہیں، یا پھر اس لیے کہ اگر وہ اپنی قوم سے لڑے تو اس کے مال یا اولاد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔۔

اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ تو مجرور ہے ایک مقدر حرف جر کے ساتھ، یعنی ان کے سینے تنگ تھے تم سے یا اپنی قوم سے قتال کرنے سے، یا یہ مفعول لہ (سبب کے طور پر) منصوب ہے۔

یعنی ان کے سینے تنگ تھے تم سے یا اپنی قوم سے قتال کرنے کی کراہت کی وجہ سے اور دوسرے گروہ سے مراد بنو مدلج ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے کہا، جب نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن اہلِ بدر پر غلبہ حاصل کیا اور اطراف کے لوگ اسلام لے آئے، تو مجھے خبر ملی کہ آپ خالد بن ولید کو میرے قبیلہ بنو مدلج کی طرف بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ! آپ ﷺ کو اللہ کی نعمت کا واسطہ، مجھے خبر ملی ہے کہ آپ ﷺ میرے قبیلہ کی طرف کسی کو بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ ان کے ساتھ معاہدہ فرمالیں، اگر آپ کی قوم اسلام لے آئی تو وہ بھی اسلام لے آئیں گے اور اگر وہ اسلام نہ لائیں تو یہ مناسب نہیں کہ آپ اپنی قوم کو ان پر غالب کریں، تو رسول اللہ ﷺ نے خالد کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اس کے ساتھ جاؤ اور جو یہ چاہے وہی کرو، خالد رضی اللہ عنہ نے ان سے صلح کرلی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں اور اگر قریش اسلام لے آئے تو وہ بھی اسلام لے آئیں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ: یہاں اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر اپنے فضل و کرم کے ساتھ اپنی خصوصی حفاظت کا ذکر فرمارہے ہیں، فرمایا اگر اللہ چاہتا تو تمام مشرکین کو تم پر مسلط کر دیتا، ان کے دلوں کو مضبوط اور جری کر دیتا اور وہ ایک صف میں تمہارے مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا بلکہ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، یہاں تک کہ ان میں سے کچھ لوگ تم سے صلح کی طرف مائل ہوگئے اور تمہارے پاس صلح و امن کا پیغام لے کر آئے۔

سوال اللہ تعالیٰ کافروں کو مؤمنوں پر کیسے مسلط کر سکتا ہے؟

جواب ان کی طرف سے صلح اور کنارہ کشی دراصل ان کے دلوں میں ڈالے گئے رعب ہی کی وجہ سے ہے، اگر اللہ کسی مصلحت (مثلاً آزمائش وغیرہ) کے تحت یہ رعب نہ ڈالتا تو وہ تم پر غالب آجاتے اور لڑائی پر آمادہ ہو جاتے، تسلیط کے یہی معنیٰ ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تم پر مسلط اس طرح کر سکتا ہے کہ انہیں تمہارے خلاف قدرت اور طاقت عطا کرے اور یہ کبھی بطورِ سزا اور انتقام ہوتا ہے، جب منکرات کھلم کھلا پھیل جائیں اور گناہوں کا غلبہ ہو جائے، کبھی بطور آزمائش اور امتحان، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ وَنَبْلُوَا أَخْبَارَكُمْ، (اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے تاکہ ہم خوب ظاہر کر دیں کہ تم میں سے کون جہاد کرنے والے ہیں اور کون صبر کرنے والے ہیں اور ہم تمہاری حقیقتوں کو جانچ لیں) اور کبھی یہ گناہوں کی تطہیر اور مومنوں کے تزکیہ کے لئے ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا، وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا (اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو خوب جانچ لے (اور ان کے دلوں کو پاک وصاف کر دے) اللہ کو اختیار ہے کہ جس پر چاہے کسی کو مسلط کرے اور جب چاہے جو چاہے فیصلہ فرمائے۔

آیت کے ربط کے لحاظ سے مطلب یہ ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے حکم دیا کہ منافقین کو قتل کرو جن کے بارے میں تم میں اختلاف ہوا، مگر اس سے مستثنیٰ وہ لوگ ہیں جو ہجرت کر لیں، یا وہ جو ایسے لوگوں کے ساتھ جا ملیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے، تو وہ بھی ان کے حکم میں داخل ہوں گے، اسی طرح وہ لوگ بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل تنگ ہوں تمہارے ساتھ یا اپنی قوم کے ساتھ لڑائی کرنے سے، پس وہ تمہارے ساتھ شامل ہو گئے تو ان کو قتل نہ کرو۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو اس فرمان کے ساتھ ختم فرمایا یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قتل اور گرفتاری سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں، تم سے قتال نہ کریں اور تمہارے سامنے صلح اور امن کی پیش کش رکھیں، تو ان کی صلح کو قبول کر لو اور جب وہ تمہارے سامنے اطاعت و صلح کا ہاتھ بڑھا دیں تو ان سے لڑائی بند کر دو اور جب وہ یہ طرزِ عمل اختیار کریں تو پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کسی بھی طریقے سے ان پر حملہ کرنے یا انہیں قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے "السلام" کے بجائے، تاکہ یہ اشارہ ہو کہ مراد صرف امن کا اظہار نہیں بلکہ حقیقت میں تسلیم و اطاعت ہے، گویا وہ تمہارے سامنے اپنا اختیار ڈال دیتے ہیں اور تمہاری اطاعت قبول کر لیتے ہیں اور جب اللہ نے صاف الفاظ میں یہ بتا دیا کہ تم پر ان کے خلاف کوئی راہ باقی نہیں رکھی گئی تو اس میں بڑی تاکید ہے کہ تمہیں ان پر کسی بھی پہلو سے ظلم یا زیادتی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان تک پہنچنے کی کسی سبیل کو بھی ختم کر دیا تو پھر ان پر زیادتی کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔

البتہ جمہور مفسرین کے نزدیک اس آیت کریمہ کے احکام سورۃ التوبہ کی آیت سے منسوخ ہو گئے، جو یہ ہے، فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور انہیں پکڑو، اور انہیں گھیر لو، اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ (التوبہ:۵)

علامہ جمل رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس آیت میں مشرکین کے ساتھ معاہدہ اور صلح کا جو ذکر ہے وہ آیتِ سیف سے منسوخ ہو گیا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اہلِ اسلام کو غلبہ عطا فرمایا تو پھر حکم یہ ہوا کہ عرب کے مشرکین سے صرف دو ہی چیزیں قبول کی جائیں، یا وہ اسلام لے آئیں یا پھر جنگ کریں۔

فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا: تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر کوئی راستہ (یعنی غلبہ یا کاروائی) مقرر نہیں کیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کے خلاف کسی قسم کی اجازت یا اختیار نہیں دیا کہ تم ان کو قید کرو یا قتل کرو، اس لیے کہ انہوں نے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تمہارے ساتھ صلح و امن کا رویہ اپنا لیا۔

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ: تم ایسے اور لوگوں کو بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں (یعنی تم سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے منافقانہ طریقے اختیار کرتے ہیں) اور اپنے قبیلے والوں سے بھی میل جول رکھتے ہیں تاکہ وہ ان سے بھی امن میں رہیں

یہ وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے پاس آکر ریاکاری کے طور پر اسلام لے آتے، پھر قریش کے کافروں کے پاس واپس جاکر بت پرستی میں گم ہو جاتے، تاکہ مسلمانوں سے بھی بچیں اور اپنے قبیلے سے بھی محفوظ رہیں، یہ لوگ قبیلہ اسد، غطفان اور بنو عبد الدار میں سے تھے۔

كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا: جب کبھی انہیں فتنہ یعنی کفر اور مسلمانوں سے لڑائی کی طرف بلایا جاتا تو وہ فوراً اس میں اُلٹے منہ گر جاتے اور بری طرح پلٹ جاتے، یہاں تک کہ وہ ہر دشمن اور بدکار سے بھی بدتر ہو گئے۔

فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ: پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں، اور تمہیں صلح کی پیشکش نہ کریں اور اپنے ہاتھ قتال سے نہ روکیں، تو ان کو پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کر دو۔

وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: ایسے لوگوں کے خلاف ہم نے تم کو کھلی ہوئی دلیل دے دی ہے، ان سے لڑنے کے جواز کی دلیل موجود ہے کہ ان کی عداوت کھل گئی ان کا حال معلوم ہو گیا ان کا کافر ہونا مسلمانوں سے غداری کرنا اور دکھ پہنچانا سامنے آگیا۔ (مظہری)

قتل خطاء کے احکامات

سوال اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، قتل کی کتنی اقسام ہیں وضاحت کیجیے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۹۲} النساء

جواب ترجمہ: اور مسلمان کا یہ کام نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو مسلمان کو غلطی سے قتل کرے تو ایک مسلمان کی گردن آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے مگر

یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں پھر اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم میں تھا جس سے تمہاری دشمنی ہے تو ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ مقتول مسلمان کسی ایسی قوم میں سے تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہے تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے اللہ سے گناہ بخشوانے کے لیے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

شان نزول: ① یہ آیت عیاش بن ربیعہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی جو ابو جہل کا اخیافی بھائی تھا، جس کا سبب یہ ہوا کہ ہجرت سے پیشتر جب نبی ﷺ مکہ میں تھے عیاش آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا، مگر گھر والوں کے ڈر سے اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کیا اور جب آپ ﷺ ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ آ گئے تو عیاش بن ابی ربیعہ بھی مدینہ آ گیا اور اپنے بھائیوں کے ڈر کے مارے کسی قلعہ میں چھپ کر رہنے لگا، عیاش کی ماں کو جب اس کی خبر ملی تو اس کو سخت قلق ہوا اور عیاش کے غم میں کھانا پینا چھوڑ دیا اور اپنے دونوں بیٹوں حارث اور ابو جہل کو جو عیاش کے اخیافی بھائی تھے عیاش کو واپس لانے کے لیے روانہ کیا اور ماں نے یہ قسم کھائی کہ جب تک تم عیاش کو میرے پاس واپس نہ لاؤ گے اللہ مجھے گھر کا سایہ نہ دے اور نہ دانہ پانی کا مزہ چکھوں گی۔

ماں کا یہ کلام سن کر دونوں بھائی عیاش کی تلاش میں روانہ ہوئے اور حارث بن زید بن امنیہ کنانی بھی ان کے ساتھ ہو لیے بالآخر پتہ لگا کر یہ تینوں مدینہ پہنچے اور عیاش سے جا کر ملے، عیاش قلعہ میں روپوش تھا، ان تینوں نے باہر سے کہا کہ تو قلعہ سے نیچے اتر آ، جب سے تو اپنی ماں سے جدا ہوا ہے اس وقت سے تیری ماں چھت کے نیچے نہیں رہی اور نہ اس نے دانہ پانی کا مزہ چکھا اور اس نے یہ قسم کھائی ہے کہ جب تک تو اس کے پاس لوٹ کر نہیں جائے گا اس وقت تک دانہ پانی اس پر حرام ہے اور ہم خدا کو درمیان میں ڈال کر تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ تجھ کو کسی ایسی بات پر مجبور نہیں کریں گے جو تیرے دین کے خلاف ہو۔

عیاش نے جب ماں کی بے قراری اور بے چینی کا حال سنا تو دل بھر آیا اور قلعہ سے اتر کر ان کے پاس آ گیا اور ان کے ساتھ ہو لیا، مدینہ سے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے عیاش کو ایک تسمہ میں باندھ

دیا اور تینوں میں سے ہر ایک نے عیاش کو سو کوڑے لگائے اور اس طرح اس کو اس کی ماں کے پاس لے گئے، ماں نے دیکھ کر یہ کہا کہ میں تجھے اس وقت تک نہ کھولوں گی جب تک اس کا انکار نہ کرے جس پر تو ایمان لایا ہے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر دھوپ میں چھوڑ دیا اور عرصہ تک اس کو تکلیف دیتے رہے، بالآخر عیاش نے مجبور ہو کر بادل نخواستہ جبراً و قہراً جو انہوں نے کہلایا کہہ دیا۔

اس پر حارث بن زید نے جو نبی کریم ﷺ کے شدید ترین دشمنوں میں سے تھا، اس کو چھیڑا اور کہا اے عیاش! جس دین پر تو تھا اگر وہ راہ ہدایت تھا تو تو نے ہدایت کو کیوں چھوڑا؟ اور اگر وہ گمراہی تھا تو اتنے دنوں گمراہی پر رہا، اس پر عیاش کو سخت طیش آیا اور یہ قسم کھائی کہ اگر بخدا تو مجھے کہیں تنہائی میں مل گیا تو میں تجھے ضرور قتل کروں گا، بعد چندے عیاش نے دوبارہ اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے مدینہ چلا گیا اور اس کے بعد اللہ نے حارث بن زید کو بھی اسلام کی توفیق بخشی اور وہ بھی مسلمان ہو کر مدینہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں ہجرت کر کے حاضر ہوا، اتفاق سے اس دن عیاش مدینہ میں موجود نہ تھا، اس کو حارث کے مسلمان ہونے کی خبر نہ ہوئی، ایک دن عیاش قبا کو جا رہا تھا اتفاقاً اس کو حارث مل گیا عیاش نے اس کو قتل کر دیا اور اپنی قسم کو پورا کیا، جب لوگوں کو اس کا علم ہوا تو عیاش کو ملامت کی کہ تو نے یہ کیا کیا حارث تو مسلمان تھا، عیاش نے یہ سنتے ہی حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! آپ ﷺ کو میرا اور حارث کا قصہ معلوم ہے لیکن جب میں نے اس کو قتل کیا تو مجھے اس کے مسلمان ہونے کی خبر نہ تھی اور اپنی اس غلطی اور لاعلمی پر ندامت ظاہر کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی (تفسیر در منثور ص ۱۹۲ ج ۲، وہکذا تفسیر القرطبی مختصر ص ۳۱۳ ج ۵، و تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۴ ج ۱، معارف القرآن للکاندھلوی رحمہ اللہ)۔

② یہ آیت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے والد کے بارے میں نازل ہوئی جو جنگ اُحد میں مسلمانوں کی غلطی سے مارے گئے، مسلمانوں نے غلطی سے ان کو کافر سمجھ کر ان پر تلواریں چلائیں، حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دُور سے دیکھ کر یہ کہا بھی کہ یہ میرے باپ ہیں، مگر ہنگامہ میں کوئی نہ سمجھا، یہاں تک کہ وہ قتل ہو گئے، جب وہ قتل ہو گئے تب معلوم ہوا کہ یمان رضی اللہ عنہ مسلمان تھے، حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کو تسلی دی

اور کہا کہ اللہ تمہاری غلطی اور خطا معاف کرے، مسلمانوں کو جب اپنی اس غلطی کا علم ہوا تو بہت سخت ملول ہوئے اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (معارف القرآن لکاندھلوی رحمہ اللہ)

③ یہ آیت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، جس کا سبب یہ ہوا کہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کسی لشکر میں تھے، اتفاقاً اپنے لشکر سے جدا ہو کر کسی ضرورت سے پہاڑ کی ایک گھاٹی میں گئے، وہاں ایک شخص کو دیکھا جو اپنی بکریاں چرا رہا تھا، ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اس پر تلوار چلائی اس نے کہا لا الہ الا اللہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ محض اپنی جان بچانے کے لیے یہ کہہ رہا ہے اس لیے اس کو قتل کر دیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر اس کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھا؟ تب ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو اور بھی ندامت ہوئی اس پر یہ آیت نازل ہوئی (در منثور ص ۱۹۳ ج ۲، ابن کثیر ص ۵۳۴ ج ۱، معارف القرآن للکاندھلوی)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا: ارباب تفسیر کے نزدیک اگرچہ یہ آیتِ کریمہ ایک خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کا حکم ہر اُس شخص کو شامل ہے جو کسی دوسرے کو غلطی سے قتل کرے، کیونکہ شریعت میں اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سببِ نزول کے خصوصی پہلو کا، اللہ تعالیٰ کے فرمان **وَمَا كَانَ** میں جو نفی آئی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسا کبھی واقع نہیں ہوگا، کیونکہ اگر یہ مراد لی جائے تو کبھی بھی غلطی سے قتل کا وقوع نہ ہوتا، بلکہ یہاں نفی سے مراد ممانعت اور ناجائز ہونا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان **وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِناً إِلَّا خَطَأً** احکامِ شریعت کی بنیادی آیات میں سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مومن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے، ہاں اگر قتل ہو بھی تو صرف غلطی سے، تو یہاں **وَمَا كَانَ** کا معنی نفی نہیں بلکہ تحریم اور ممانعت ہے، جیسے کہ قرآن میں ہے **وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللهِ**، تمہارے لئے جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچاؤ۔

اگر اس نفی کو حقیقت پر محمول کیا جائے (کہ ایسا کبھی ممکن ہی نہیں) تو پھر کبھی کوئی مومن کسی مومن کو قتل نہ کرتا، کیونکہ جو چیز اللہ نے ناممکن قرار دی، وہ قطعاً واقع نہیں ہو سکتی، مثال کے طور پر

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا، تمہارے بس کی بات نہیں کہ اس کا درخت اگاؤ، اس آیت کے مطابق بندے ہر گز جنت کے درخت نہیں اگا سکتے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے استثناء ذکر فرمایا، جو دراصل اصل حکم سے منقطع ہے اور اس میں إِلَّا کا مطلب "لیکن" ہے۔ گویا مفہوم یوں ہے، کسی مومن کو کسی مومن کو قتل کرنا ہر گز جائز نہیں، لیکن اگر وہ غلطی سے قتل کر بیٹھے تو اس پر یہ کفارہ اور ذمہ داری لازم ہو گی۔ لغوی طور پر خَطَأً اُس فعل کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ اور بلا قصد واقع ہو، یعنی انسان کچھ چاہتا ہے لیکن اس کے برعکس کام سرزد ہو جائے، اسی کو أَخطَأَ کہا جاتا ہے، اور خَطَأٌ اسم، إِخطَاءٌ کے قائم مقام ہے، نیز جو شخص ارادہ کے باوجود غلط نتیجہ پر پہنچے یا غیر صواب کام کرے، اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے: أَخطَأَ اس نے خطا کی۔

قتل خطاء: قتل خطا کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً تیر یا پتھر مارا تو شکار کو تھا لیکن وہ کسی مسلمان کو لگ گیا اور وہ مر گیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ماری تو کوئی چیز عمداً ہی تھی مگر مارنے والے کو ہر گز یہ گمان نہ تھا کہ وہ اس ہلکی سی ضرب سے مر ہی جائے گا۔ تیسری یہ کہ لڑائی وغیرہ کسی ہنگامے میں کسی مسلمان کو کافر سمجھ کر مار ڈالے۔ جیسا کہ جنگ احد میں شکست کے بعد مسلمانوں نے بدحواسی کے عالم میں سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے والد سیدنا یمان رضی اللہ عنہ کو کافر سمجھ کر مار ڈالا تھا، جیسا کہ شان نزول کے زیر عنوان کا اس دلخراش واقعہ کا بیان کیا گیا ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِناً خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَى اَهْلِهٖ إِلَّآ أَنْ يَّصَّدَّقُوا: یعنی جو شخص کسی مومن کو خطاً قتل کر دے تو اس پر یہ فرض ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا ایک باندی آزاد کرے اور ان کا مومن ہونا شرط ہے اور دیت بھی ادا کرے جو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دی جائے پھر فرمایا إِلَّا أَنْ يَّصَّدَّقُوا کہ اگر یہ لوگ (یعنی وارثین) اس قاتل پر دیت کو صدقہ کر دیں یعنی معاف کر دیں تو یہ دیت معاف ہو جائے گی اگر سب معاف نہ کریں تو جو شخص معاف کر دے گا اس کا حصہ معاف ہو جائے گا۔ (انوار البیان)

فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ: یعنی اگر مقتول ایسی جماعت سے ہو جن سے تمہاری دشمنی ہے یعنی وہ حربی کافروں میں رہتا ہے خود تو وہ مومن ہے لیکن اس کی قوم

مسلمان نہیں ہوئی اور ان لوگوں سے صلح بھی نہیں ہے تو بطور کفارہ ایک رقبہ یعنی مومن غلام یا باندی آزاد کرنا ہوگی، رہی دیت تو وہ اس لیے واجب نہ ہوگی کہ اس کے متعلقین کافر ہیں اور دیت میراث کے اصول پر تقسیم ہوتی ہے اور چونکہ کافر اور مومن کے درمیان میراث نہیں چلتی اس لیے دیت واجب نہ ہوگی، کسی کو بھی نہ دی جائے گی۔ (انوار البیان)

وَّإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلٰى أَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةً: یعنی مومن مقتول اگر کسی ایسی قوم سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہو تو اگرچہ وہ قوم کافر ہے لیکن یہ مقتول چونکہ مومن ہے اس لیے اس کے قاتل پر دیت واجب ہوگی جو اس کے خاندان کی طرف سپرد کر دی جائے گی بشرطیکہ اس کے خاندان میں اہل اسلام موجود ہوں اور اگر ان میں کوئی بھی مسلمان نہیں ہے تو دیت واجب نہ ہوگی، البتہ رقبہ مومنہ آزاد کرنا پھر بھی واجب ہوگا۔

واضح رہے کہ قتل مومن میں دیت کا اور تحریر رقبہ یعنی غلام آزاد کرنے کا جو حکم ہے یہ صرف اسی صورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ مقتول ایسی قوم میں سے ہو جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو بلکہ دارالاسلام میں مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہوئے کوئی مومن کسی مومن کو خطاً قتل کر دے تب بھی دیت اور تحریر رقبہ واجب ہے۔ (روح المعانی ج ۵، انوار البیان)

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ: فرمایا کہ جو رقبہ یعنی غلام باندی نہ پائے (مثلاً غلام باندی ملتے ہی نہ ہوں جیسا کہ موجودہ زمانے میں یا ملتے تو ہوں لیکن خریداری کی طاقت نہ ہو) تو دو مہینے کے روزے لگاتار رکھے ان روزوں میں رمضان المبارک کا مہینہ نہ ہو، رمضان کے علاوہ پورے دو مہینوں کے روزے ہوں یہ غلام آزاد کرنے کی جگہ روزے رکھنا بطور کفارہ ہے۔ دیت بہرحال واجب رہے گی۔ (انوار البیان)

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ علیم ہے وہ سب کچھ جانتا ہے اسے قاتل کا بھی علم ہے اور مقتول کا بھی اگر کسی نے قتل کر دیا اور بندوں کو حال معلوم نہ ہوا قاضی تک بات نہ پہنچی تو یہ نہ سمجھے کہ دونوں

جہان میں میرا چھٹکارا ہو گیا، جس کی شریعت ہے وہ دیکھنے والا اور جاننے والا ہے، وہ آخرت کے دن احکام کے خلاف ورزی کی سزا دے دے گا، نیز وہ حکیم بھی ہے اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں، دیت اور تحریر رقبہ وغیرہ جو بھی کچھ احکام بندوں کے لیے مشروع فرمائے ہیں ان سب میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔ (تفسیر انوار البیان)

احکام دیت

دیت کی تعریف: لفظ دیت عربی مادہ وَدْی یا دِیَۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں، خون کے بدلے مال دینا، یا کسی قتل یا زخم کے عوض دیا جانے والا معاوضہ، یعنی لغت میں دیت اس مال کو کہا جاتا ہے جو خون کے بدلے میں دیا جائے۔

دیت کی شرعی تعریف: فقہاء کے نزدیک: هِيَ فِي الشَّرْعِ الْمَالُ الْوَاجِبُ بِالْجِنَايَةِ عَلَى النَّفْسِ أَوْ مَا فِي حُكْمِهَا وَالْأَرْشُ، الْمَالُ الْوَاجِبُ الْمُقَدَّرُ شَرْعًا بِالِاعْتِدَاءِ عَلَى مَا دُونَ النَّفْسِ، أَيْ مِمَّا لَيْسَ فِيهِ دِيَةٌ كَامِلَةٌ مِنَ الْأَعْضَاءِ، وَبِنَاءً عَلَيْهِ تُطْلَقُ الدِّيَةُ عَلَى بَدَلِ النَّفْسِ أَوْ مَا فِي حُكْمِهَا، وَالْأَرْشُ عَلَى دِيَةِ الْعُضْوِ، (الفقہ الاسلامی وادلتہ للزحیلی)

شرع میں دیت اس مال کو کہا جاتا ہے جو جان یا اس کے حکم میں ہونے والی زیادتی کے بدلے میں واجب ہو اور اَرش وہ مال ہے جو شرعاً مقرر کیا گیا ہے جان سے کم تر (اعضاء وغیرہ) پر زیادتی کرنے کے بدلے میں، یعنی ایسے اعضاء جن میں مکمل دیت واجب نہیں ہوتی، لہٰذا دیت کا اطلاق جان یا اس کے قائم مقام کے بدلے پر ہوتا ہے اور اَرش کا اطلاق کسی عضو کی دیت پر ہوتا ہے۔

② اَلدِّيَةُ: هِيَ الْمَالُ الْوَاجِبُ بِجِنَايَةٍ عَلَى الْحُرِّ فِي النَّفْسِ أَوْ فِيمَا دُونَهَا، وَأَصْلُهَا وَدِيَةٌ مُشْتَقَّةٌ مِنَ الْوَدْيِ، وَهُوَ رَفْعُ الدِّيَةِ، وَالْأَصْلُ فِي الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَالْإِجْمَاعِ، دِیَت وہ مال ہے جو کسی جرم (جنایت) کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، چاہے وہ جان پر ہو یا اس سے کم درجے کی کسی چیز پر، دِیَت کی اصل وَدْیٌ سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب ہے دِیَت کو اٹھانا یا ادا کرنا، اس کی اصل دلیل کتاب (قرآن)، سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ لتویجری)

③ دیت وہ مال ہے جو مجنی علیہ (جس پر ظلم یا حملہ ہوا ہو) یا اس کے ورثاء کو جرم کے نتیجے میں دیا جاتا ہے، خواہ وہ جرم جان کے بارے میں ہو، اعضاء کے بارے میں، زخموں کے بارے میں یا منافع (یعنی جسمانی افعال اور صلاحیتوں) کے بارے میں۔ (المطلع علی دقائق زاد المستقنع) اگر قتل واقع ہو جائے تو دیت مقتول کے ورثاء کو دی جاتی ہے، اگر چوٹ یا اعضاء کا نقصان ہو تو دیت یا اس کے جزوی حصے (ارش، حکومت) کی صورت میں متاثرہ شخص کو دی جاتی ہے۔

قتل کی تین قسمیں ہیں: آلہ قتل سے حملہ کیا جائے اور مقتول پر وار کرنا مقصود ہو، اس کو قتل عمد کہتے ہیں، مقتول پر وار کرنا مقصود ہو لیکن حملہ ایسی چیز سے کیا گیا جو عام طور پر قتل کا سبب نہیں ہوتا، یہ شبہ عمد ہے، تیسری صورت قتل خطاء ہے، کہ غلطی سے مقتول کی جان چلی جائے، ورنہ مقتول کی جان لینا مقصود نہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ سمجھنے میں غلطی ہو جائے، جیسے دور سے جانور سمجھا اور گولی چلادی، قریب آئے تو معلوم ہوا کہ وہ آدمی تھا، دوسرے یہ کہ نشانہ لگانے میں غلطی ہو جائے، مثلاً نشانہ لیا شیر کا اور لگ گیا کسی انسان کو، (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ج ۶ ص ۲۲۲) قتل عمد میں قصاص یا دیت واجب ہوتی ہے، شبہ عمد میں دیت، لیکن قتل عمد اور شبہ عمد کی دیت اونٹوں کی عمر کے لحاظ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور قتل خطاء کی دیت عمر کے لحاظ سے نسبتاً ہلکی، (البحر الرائق: ج ۸ ص ۳۲۷) رسول اللہ ﷺ نے قتل خطاء کی دیت سو اونٹ مقرر کی ہے، (سنن ابی داؤد)

دیت میں اصل معیار اونٹنیاں ہیں، البتہ فقہاء نے اپنے اپنے عہد میں اونٹنی کی قیمت کے اعتبار سے مروجہ سکوں میں قیمت مقرر فرمائی ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم کا فتوی اسی لحاظ سے دیا ہے، (بدایۃ المجتہد: ج ۴ ص ۲۴۳، احکام القرآن للعثمانی: ج ۲ ص ۳۱۷) ہمارے عہد میں موجودہ نرخ کے لحاظ سے سو اونٹنیوں کی قیمت کا اعتبار ہے دیت مقتول کے ورثہ کو ادا کی جائے گی، پس مقتول کے لوگوں سے اس کے ورثہ مراد ہیں، یہ تو دیت ہے، جس کا مقصد متأثرین کی اشک شوئی اور دلداری ہے، کفارہ جس سے بار گناہ اترنے کی امید ہے، ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ (آسان تفسیر مولانا سیف اللہ خالد رحمانی)

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں" کفارہ یعنی غلام کی آزادی تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اب مقتول کے وارثوں کا حق یہ ہے فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مقتول کے گھر والوں کو نقدی یا مال کی صورت میں ادا کیا جائے گا، نقدی کی صورت میں ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر درہم چھوٹے سائز کا ہو تو بارہ ہزار دینا ہو گا اور اگر دیت کے طور پر مال دینا ہو تو اس کی مقررہ مقدار ایک سو اونٹ ہیں جو مختلف عمروں کے ہوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق سو اونٹوں کی تفصیل یہ ہے۔ ① جذعہ (عمر چار تا پانچ سال) بیس اونٹ۔ ② حقہ (عمر تین تا چار سال) بیس اونٹ۔ ③ ابن لبون (عمر دو تا تین سال) بیس اونٹ۔ ④ بنت لبون (عمر دو تا تین سال) بیس اونٹنیاں۔ ⑤ بنت محاض (عمر ایک تا دو سال) بیس اونٹیاں۔

فقہائے کرام رحمہم اللہ کے نزدیک اُونٹوں کی یہی تعداد صحیح ہے، تاہم دیت مغلظہ یعنی سخت دیت کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے مطابق پانچ قسم کی بجائے چار قسم کے اونٹ بھی دیت میں ادا ہو سکتے ہیں، اس طرح ہر عمر میں بیس بیس کی بجائے پچیس پچیس فی قسم کے اونٹ آئیں گے، بعض روایات میں تین اقسام کے اونٹوں کا ذکر بھی ملتا ہے، اس کے مطابق تیس تیس اونٹ دو عمروں کے ہوں گے اور چالیس اونٹ تیسری عمر کے، موجودہ زمانے میں یا کسی آئندہ زمانے میں اگر دیت کا قانون نافذ ہو جائے تو سکہ رائج الوقت میں زرِ دیت کا تعین اونٹوں کی قیمت سے لگایا جائے گا یا دینار و درہم کے مبادلے کی مقدار کے مطابق، بہر حال قتل خطا میں مذکورہ کفارہ اور دیت ادا کرنا ہو گا، اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا سوائے اس کے کہ مقتول کے وارثان دیت معاف کر دیں ایسی صورت میں دیت ادا نہیں ہو گی۔ (معالم)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں اور حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر انوار البیان میں اس آیت کے ذیل میں دیت سے متعلق شرعی احکامات درج فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، انہی کی نگارشات ملاحظہ فرمائیے۔

مسائل متعلقہ دیت: مسئلہ: قتل خطا میں ایک جان کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں سے بیس بنت مخاض اور بیس بنت لبون اور بیس ابن مخاض اور بیس حقے اور بیس جذعے ہوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے

اسی طرح مروی ہے۔ (اونٹوں کے یہ القاب ان کی عمروں کے اعتبار سے ہیں اہل عرب نے اونٹوں کے نام اس طرح رکھے تھے)۔

مسئلہ: اگر اونٹوں کے علاوہ دوسرے مال سے دیت دی جائے تو ہزار دینار سونے کے اور دس ہزار درہم چاندی کے دیئے جائیں۔

مسئلہ: حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دیت صرف انہی چیزوں سے ادا کی جائے گی یعنی اونٹوں سے اور دینار سے اور درہم سے، اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گایوں اور بکریوں اور کپڑوں سے بھی ادا کی جاسکتی ہے اگر گایوں سے دیت ادا کی جائے تو سو گائیں دی جائیں اور بکریوں سے دی جائے تو ہزار بکریاں دی جائیں اور کپڑوں سے ادا کی جائے تو دو سو جوڑے ادا کیے جائیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طرح مقرر فرمادیا تھا۔

مسئلہ: عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔

مسئلہ: مسلم اور ذمی کی دیت برابر ہے (ذمی وہ کافر لوگ ہیں جو مسلمانوں کی عملداری میں رہتے ہیں)۔

مسئلہ: قتل خطاً کی دیت عاقلہ پر واجب ہوتی ہے، اور کفارہ (تحریر رقبہ یا صیام شھرین متتابعین) بہر حال قاتل ہی پر واجب ہوتا ہے، عاقلہ سے اہل نصرت مراد ہیں جن میں قاتل رہتا سہتا ہو اور جو آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں اہل نصرت نہ ہوں تو پھر قاتل کا قبیلہ ہی عاقلہ ہوگا، اس اجمال کی تفسیر کتب فقہ میں مذکور ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دیت صرف قاتل کے کنبے اور قبیلے پر ہے۔

سوال یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قتل تو صرف ایک شخص نے کیا ہے اس کی دیت اہل قرابت یا اہل نصرت پر کیوں پڑے؟

جواب ① اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ احادیث اور آثار سے ایسا ہی ثابت ہے۔

جواب ② دوسرا جواب یہ ہے کہ بے احتیاطی قاتل سے ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل نصرت اور

اہل قرابت پر بھروسہ کرتا ہے اور ان کی نصرت اور حمیت کے پیش نظر وہ اپنے اندر ایک قوت محسوس کرتا ہے جن لوگوں پر اسے اعتماد ہے ان لوگوں کو بھی دیت کی ادائیگی میں شریک کرلیا جائے تو وہ بھی اپنے قبیلے کے ہر فرد متعلقین کو جن سے نصرت اور حمیت کا تعلق ہے بہت زیادہ احتیاط کی تاکید کریں گے اور اس طرح سے قتل خطا کا وجود بہت کم ہو گا، دیت کی ادائیگی کے خوف سے وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو برابر منع کرتے رہیں گے کہ دیکھو قتل کا کوئی واقعہ نہ ہو جائے ورنہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔ (انوار البیان)

مسئلہ: عاقلہ سے تین سال میں تھوڑی تھوڑی کر کے دیت وصول کی جائے گی، قاتل کا اپنا قبیلہ اس لائق نہ ہو کہ دیت ادا کر سکے اور اس کے قبیلے سے جو قریب ترین قبیلہ نسب کے اعتبار سے ملتا ہو اس کو بھی ادائیگی دیت میں شامل کرلیا جائے گا، خود قاتل بھی عاقلہ کا ایک فرد ہو گا اور اس سے بھی حصہ مقررہ وصول کیا جائے گا۔

مسئلہ: قتل شبہ عمد وہ ہے جس میں قصداً مارنے کا ارادہ کیا ہو لیکن دھار والے ہتھیار سے یا ہتھیار جیسی چیز سے (جس سے تفریق اعضاء ہو) نہ مارا ہو، مثلاً کوڑوں سے یا لاٹھی سے مارا ہو قتل شبہ عمد میں بھی دیت ہے اور کفارہ ہے، اس کی دیت بھی عاقلہ پر ہو گی، دینار اور درہم سے دیت ادا کی جائے تو وہ تو اسی قدر ہے جتنی قتل خطا میں ہے اور اگر اونٹوں کے ذریعہ ادا کی جائے تو اس میں کچھ فرق ہے اور وہ یہ کہ اونٹ تو سو ہی ہوں گے لیکن اونٹوں کی پانچ قسموں کی بجائے چار قسمیں کی جائیں گی یعنی پچیس بنت مخاص اور پچیس بنت لبون اور پچیس حقے اور پچیس جذعے دینے ہوں گے، یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول اور مروی ہے۔

مسئلہ: کفارہ قتل میں آزاد کرنے کے لیے لفظ رقبہ وارد ہوا ہے یہ لفظ لونڈی اور غلام دونوں کو شامل ہے جسے بھی آزاد کر دے گا کفارہ ادا ہو جائے گا بشرطیکہ مومن ہو اور اعضاء صحیح سالم ہوں۔

مسئلہ: اگر غلام نہ ملے تو دو ماہ کے روزے رکھنا لازم ہو گا، اگر مرض کی وجہ سے تسلسل ٹوٹ جائے تو دو بارہ روزے رکھنے ہوں گے، البتہ عورت کو اگر درمیان میں حیض آجائے تو اس کی وجہ سے تسلسل باطل

نہ ہو گا اور رمضان کے روزے کفارہ کے حساب میں نہیں لگ سکتے۔

قتل کی کچھ اور صورتیں: قتل خطا کے ساتھ فقہاء نے دو چیزیں اور لکھی ہیں ایک مَا اُجری مجری الخطا اور دوسری القتل بسبب پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص سوتے ہوئے کسی پر پلٹ پڑے جس سے وہ قتل ہو جائے، اس میں کفارہ اور دیت دونوں واجب ہوتے ہیں اور دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کی ملک میں کنواں کھود دے یا کوئی پتھر رکھ دے جو کسی کی جان جانے کا سبب بن جائے، اس صورت میں بھی عاقلہ پر دیت واجب ہوتی ہے لیکن اس میں کفارہ نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر کسی حاملہ عورت کے پیٹ میں مار دیا جس کی وجہ سے مرا ہوا بچہ گر گیا تو اس میں ایک غلام یا پانچ سو درہم واجب ہوں گے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو غزہ کہتے ہیں، اور اگر زندہ بچہ گر کر مر گیا تو اس کی پوری دیت دینی ہو گی اور اگر مردہ بچہ گرنے کے بعد ماں مر گئی تو ماں کی پوری دیت دینی ہو گی اور بچے کا غزہ دینا ہو گا اور اگر چوٹ لگنے سے ماں مر گئی پھر بچہ زندہ نکل کر مر گیا تو ماں کی اور بچے کی علیحدہ علیحدہ دو دیتیں دینی ہوں گی اور حمل ساقط ہونے کی وجہ سے جو کچھ واجب ہو گا وہ اس بچے کے وارثوں پر تقسیم ہو گا۔

مسئلہ: جو شخص جانور پر سوار ہو کر جا رہا ہو اس کے ذمہ لازم ہے کہ سلامت روی کے ساتھ چلے اگر اس کی سواری نے کسی کو روند دیا یا ٹکر مار دی یا دانتوں سے کاٹ لیا تو ان سب صورتوں میں ضمان لازم آئے گا۔

مسئلہ: اگر دو گھوڑے سوار جا رہے تھے جو آپس میں ٹکرا کر مر گئے تو ہر ایک کی عاقلہ پر دوسرے کی دیت واجب ہو گی۔

فائدہ: قصاص اور دیت کا نظام درحقیقت جانوں کی حفاظت کے لیے ہے، اللہ کا قانون جاری نہ کرنے کی وجہ سے پورے عالم میں قتل و خون کا بازار گرم ہے، قوانین شرعیہ کو نافذ نہ کرنے والے ظالم ہیں جیسا کہ سورۃ مائدہ میں فرمایا وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں جو اللہ نے نازل فرمایا وہ لوگ ظالم ہیں۔ (انوار البیان)

وزرا حکومت زعمائے سیاست میں جو لوگ احکام خداوندیہ کو ظالمانہ کہتے ہیں وہ کافر ہیں اگرچہ وہ مسلمان ہونے کے مدعی ہوں، قصاص اور قتل کا قانون خداوندی نافذ نہ ہونے کی وجہ سے قاتلین کسی بھی جان کے قتل کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے، وہ بڑی بے باکی کے ساتھ جس کو چاہتے ہیں قتل کر دیتے ہیں، اگر کسی کو قتل کر دیا تو اول تو بغیر رشوت کے مقدمہ درج نہیں ہوتا اور درج ہوتا ہے تو قاتل کو سزا سے بچانے یا ہلکی سزا دلانے کے لیے قاتل سے رشوت لے کر رپورٹ کے الفاظ ہلکے کر دیئے جاتے ہیں جو قانون کی گرفت میں نہیں آتے پھر جب مقدمہ چلتا ہے اور اگر سارے مرحلوں سے گزر کر حاکم نے کسی قاتل کو سزا دے ہی دی تو وہ سزا قید و بند کی صورت میں ہوتی ہے، مقتول کے وارثوں کو ذرا بھی دیت نہیں ملتی، ان سب چیزوں نے امن عام کو برباد کر رکھا ہے، قصداً وارادۃً قتل کرنے کی واردات ہوتی رہتی ہے اور چونکہ قصاص جاری نہیں کیا جاتا اس لیے قاتل بے فکر ہو کر گھومتے پھرتے ہیں۔

حاکم بہت سے بہت عمر قید کا فیصلہ دے دیتا ہے (بشرطیکہ حاکم تک معاملہ پہنچا ہو اور اس نے ہمت کر کے فیصلہ دے دیا ہو) پھر یہ سزا اقتدار اعلیٰ کو رحم کی درخواست دینے سے یا حکومت کے بدل جانے سے (اقتدار جدید کی خوشی میں) معاف کر دی جاتی ہے، مقتول کے ورثاء دیت اور قصاص سے محروم پھرتے ہیں حالانکہ اولیاء مقتول کا حق کسی کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے، جو لوگ قانون الٰہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اسے نافذ نہیں کرتے اس کی بجائے دوسرے قانون نافذ کر رکھے ہیں اور ان کو موجودہ دور کے لیے مناسب سمجھتے ہیں (العیاذ باللہ) ان سب کا جواب اللہ تعالیٰ شانہٗ نے وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا فرما کر دے دیا۔ (انوار البیان، معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ)

قتل عمد کی سزا

سوال اس آیت میں قتل عمد کا ذکر ہے، اس کا ترجمہ و تفسیر لکھیے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ

عَذَابًا عَظِيمًا {۹۳} النساء

جواب ترجمہ: اور جو کوئی کسی مسلمان کو جان کر قتل کرے اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا ہے۔

شانِ نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مقیس بن صبابہ نے اپنا بھائی ہشام بن صبابہ بنو نجار کے قبیلے کے ہاں مقتول پایا، وہ مسلمان تھا مقیس رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کو واقعے کی اطلاع دی، رسول اللہ ﷺ نے بنو فہر کا ایک ایلچی اس کے ساتھ بھیجا اور اس سے کہا کہ بنو النجار کے ہاں جاؤ انہیں سلام دو اور ان سے کہو کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اگر تمہیں ہشام بن صبابہ کے قاتل کا علم ہے تو اسے مقتول کے بھائی کے حوالے کر دو تاکہ وہ قصاص لے اور اگر تمہیں قاتل کا پتہ نہیں تو اس کو دیت ادا کرو۔

فہری ایلچی نے بنو النجار کو نبی کا پیغام پہنچا دیا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم سر آنکھوں پر، خدا کی قسم ہمیں قاتل کا کچھ پتہ نہیں لیکن ہم دیت ادا کر دیں گے، چنانچہ انہوں نے سو اونٹ دیت کے دے دیے، پھر یہ دونوں مدینے کی طرف لوٹے، اب مدینہ قریب تھا کہ مقیس کے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈال دیا، اس نے اپنے آپ سے کہا کہ تم نے یہ کام کیا، تم نے اپنے بھائی کے خون کی دیت قبول کر لی، یہ تو تمہارے لیے شرم کی بات ہو گی، تم اپنے ساتھی کو قتل کر ڈالو، یہ تو جان کا بدلہ جان ہو گا اور دیت اضافے کی ہو گی، چنانچہ اس نے فہری پر ایک پتھر دے مارا اور اس کا سر پھاڑ دیا، اس کے بعد ایک اونٹ پر سوار باقی اونٹوں کو ہانکتا ہوا کافر ہو کر مکہ لوٹا اور یہ شعر پڑھتا رہا،

قَتَلْتُ بِهِ فِهْرًا وَحَمَّلْتُ عَقْلَهُ سَرَاةَ بَنِي النَّجَّارِ أَرْبَابَ فَارِعِ
وَأَدْرَكْتُ ثَأْرِي وَاضْطَجَعْتُ مُوَسَّدًا وَكُنْتُ إِلَى الْأَوْثَانِ أَوَّلَ رَاجِعِ

میں نے اس کے ہاتھوں فہر کو قتل کیا اور اس کا خون بہا (دیت) بنی نجّار کے سرداروں پر ڈال دیا، جو فَارِع کے مالک تھے۔ اور میں نے اپنا بدلہ لے لیا اور اطمینان کے ساتھ تکیہ لگا کر لیٹ گیا، اور میں ہی سب سے پہلے بتوں کی طرف پلٹنے والا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (یہ اشعار اس ذہنیت کو ظاہر

کرتے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی، قتل و انتقام پر فخر کرنا، خون بہا قبیلوں پر ڈال دینا اور بت پرستی کی طرف رجوع کو باعثِ فخر سمجھنا۔)

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی مومن پر زیادتی کرتے ہوئے بلاوجہ اسے قتل کر دے تو اس کی سزا دوزخ ہے، وہ اللہ کی ناراضگی کے ساتھ اور اس کی رحمت سے دور ہو کر اس میں ہمیشہ رہے گا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یہ نہایت سخت دھمکی اور پختہ وعید ہے، اس بڑے گناہ کے مرتکب کے بارے میں، جو قرآن کی کئی آیات میں اللہ کے ساتھ شرک کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ**، اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کو ناحق نہیں مارتے جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

قتلِ نفس کی حرمت پر بہت سی احادیث بھی وارد ہیں، ان میں سے ایک صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ**، قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خون کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا، اسی طرح ابو داود نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن اس وقت تک ہلکا پھلکا اور آزاد رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی ناحق خون میں ملوث نہ ہو، جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو بھاری اور کمزور ہو جاتا ہے اور ایک اور حدیث میں ہے، اللہ کے نزدیک دنیا کا ختم ہو جانا ایک مسلمان کے قتل سے زیادہ ہلکا ہے، پھر امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ جان بوجھ کر مومن کو قتل کرنے والے کے لیے توبہ نہیں۔ (ابن کثیر)

امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اہلِ کوفہ نے اس بارے میں اختلاف کیا تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور پوچھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیت "اور جو کوئی مومن کو عمداً قتل کرے اس کی جزا جہنم ہے" سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے اور اسے کسی آیت نے

منسوخ نہیں کیا، ابن جریر نے بھی سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب کوئی شخص اسلام اور اس کے احکام جان لینے کے بعد کسی مومن کو عمداً قتل کرتا ہے تو اس کی سزا جہنم ہے اور اس کے لیے کوئی توبہ نہیں۔

اس کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، اہلِ علم کی اکثریت، سلف اور خلف، سب کا یہی موقف ہے کہ قاتل کے لیے اللہ کے ہاں توبہ ہے، اگر وہ توبہ کرے، اللہ کے حضور جھکے، نیک عمل کرے تو اللہ اس کی برائیاں نیکیوں میں بدل دیتا ہے اور مقتول کو اس کا حق عطا کرے گا اور اس کی تسلی کر دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کو تو نہیں بخشتا اور اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف فرما دیتا ہے" یہ آیت ہر گناہ کے بارے میں عام ہے، سوائے شرک کے اور اسی سورت میں اس آیت کے بعد اور پہلے ذکر ہوئی ہے تاکہ امید بڑھائی جائے۔

جہاں تک **خُلُود** (ہمیشہ رہنے) کا تعلق ہے، اس سے مراد لمبا قیام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر احادیث ثابت ہیں کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا وہ آخر کار جہنم سے نکال لیا جائے گا، بعض سلف سے جو خلافِ ظاہر باتیں منقول ہیں، ان کا مقصد بھی محض ڈرانا اور توبہ پر آمادہ کرنا تھا، نہ کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ قاتل کی توبہ باطل ہے، لہٰذا اس آیت کا درست مطلب یہ ہے کہ قاتل کی سزا جہنم ہے، بالاتفاق، اگرچہ وہ قتل کو حلال نہ سمجھتا ہو بلکہ اس کی حرمت کا اقرار کرتا ہو، تب بھی وہ فاسق اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے، اس کی سزا جہنم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسا نہیں ہو گا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے، ممکن ہے اللہ معاف کر دے، ممکن ہے جہنم میں ڈالے اور پھر نکال کر جنت میں داخل کر دے۔

آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ آیت مؤمن کو صاف طور پر منع کرتی ہے کہ وہ کسی ایسی جان کو نہ مارے جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے، سوائے حق کے اور جو ایسا کرے تو اللہ کے غضب اور اس کی رحمت سے محرومی اور قیامت کے دن سخت عذاب کا مستحق ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ابدی جہنمی نہیں بلکہ طول مدت تک کے لیے سزا کا مستحق ہے دل میں ایمان موجود ہے تو

کسی نہ کسی وقت جہنم سے خلاصی پالے گا۔(الکبیر) جمہور علماء کے نزدیک خلود اس کے لیے ہے جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے کیونکہ اس کے کفر میں شک نہیں یا خلود سے مراد یہ ہے کہ مدت دراز تک جہنم میں رہے گا یا وہ شخص مستحق تو اسی سزا کا ہے۔(تفسیر عثمانی)

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ: عمداً کسی مسلمان کو قتل کرنے والے کو ایک طویل ترین عرصہ تک دوزخ میں گزارنا ہو گا، اس کے علاوہ غضب اللہ اور اس کی لعنت کا مستحق بھی ہو گا، جس پر اللہ ناراض ہو جائے وہ کتنا معتوب شخص ہو گا، یہود و نصاریٰ کے متعلق اللہ نے فرمایا بدوضع لوگ ہیں، ان پر اللہ کا غضب ہے، یہ عنادی ہیں اور حق کی شدید مخالفت کرتے ہیں، اسی طرح کفر و شرک والا آدمی بھی خدا کی لعنت اور غضب کا شکار ہوتا ہے۔(معالم العرفان)

وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا: اس شخص کو اللہ تعالیٰ سخت ترین عذاب دیں گے اس جرم کے سبب جس کا اس نے ارتکاب کیا ہے، رب العالمین کی ذات عالی اس پر قادر ہے کہ وہ انسانوں کو معاف کر دے اور اہل ایمان پر اپنا فضل کرتے ہوئے انہیں دوزخ میں ہمیشہ نہ رکھے لیکن چونکہ اس بندے نے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس لیے اس کی سزا یہ ہے کہ یہ ہمیشہ دوزخ میں رہے۔

واقعہ کی تحقیق ضروری ہے

سوال اس آیت کریمہ کا شان نزول کیا ہے؟ اس کے بعد اس کی تفسیر بھی کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا {۹۴} النساء

جواب اے ایمان والو! جب اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم پر سلام کہے اس کو مت کہو کہ مسلمان نہیں ہے تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں تم بھی تو اس سے پہلے ایسے ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا تحقیق سے کام لیا کرو بیشک اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے۔

شان نزول: ① حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک آدمی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے ملا جب کہ یہ حضرات جہاد کے لئے جا رہے تھے یہ آدمی اپنی بکریاں چرا رہا تھا، اس نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو سلام کیا، جو عملاً اس چیز کا اظہار تھا کہ میں مسلمان ہوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا کہ اس وقت اس نے محض اپنی جان و مال بچانے کے لئے یہ فریب کیا ہے کہ مسلمانوں کی طرح سلام کر کے ہم سے بچ نکلے، چنانچہ انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کی بکریوں کو مال غنیمت قرار دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص آپ کو اسلامی طرز پر سلام کرے تو بغیر تحقیق کے یہ نہ سمجھو کہ اس نے فریب کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے اور اس کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر حاصل نہ کرو۔ (ابن کثیر)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ مجاہدین کا بھیجا جن میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بھی تھے، جب وہ موقع پر پہنچے تو سب لوگ بھاگ گئے، صرف ایک شخص رہ گیا جس کے پاس بہت مال تھا، اس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے سامنے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه، مگر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھ کر کہ دل سے نہیں کہا بلکہ محض جان و مال بچانے کے لئے کلمہ اسلام پڑھ رہا ہے اس کو قتل کر دیا، حاضرین میں سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ نے برا کیا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہہ رہا تھا حالانکہ وہ شخص اپنے گھر والوں اور مال کے بارے میں مامون تھا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کروں گا، چنانچہ جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا، آپ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو بلا کر سخت تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ بروز قیامت تمہارا کیا جواب ہو گا؟ جب کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه تمہارے مقابلہ میں دعویدار ہو گا اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (معارف القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا: اس آیت کے پہلے جملہ میں ایک عام ہدایت ہے کہ مسلمان کوئی کام بے تحقیق محض گمان پر نہ کریں، ارشاد ہے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا یعنی جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو، محض خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے، اس میں سفر کی قید بھی اس وجہ سے ذکر کی گئی کہ

یہ واقعات سفر ہی میں پیش آئے یا اس وجہ سے کہ شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے، ورنہ اصل حکم عام ہے، سفر میں ہو یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، ”سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔ (بحر محیط، معارف القرآن)

اَلضَّرْبُ فِي الْأَرْضِ سے مراد زمین میں چلنا پھرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں: ”میں نے زمین میں ضرب لگائی“ یعنی میں تجارت، جہاد یا کسی اور مقصد کے لیے سفر پر نکلا، گویا زمین میں چلنے کو اس لیے ”ضرب“ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے چلنے کے دوران زمین پر اپنے قدم مارتا ہے، یہاں ضَرَبٌ فِي الأَرضِ سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے سفر کرنا ہے۔

عربی زبان میں ضرب کے معانی: عربی زبان میں ضرب کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے ① مارنا، پیٹنا، جیسے: فَاضْرِبُوهُ یعنی اسے مارو۔ ② چلنا، سفر کرنا، جیسے: وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ (البقرۃ: ۲۷۳) یعنی زمین میں چلنا (تجارت یا جہاد کے لیے سفر کرنا)۔ ③ مثل بیان کرنا۔ جیسے: ضَرَبَ اللهُ مَثَلًا یعنی اللہ نے ایک مثال بیان کی۔ ④ ڈال دینا، مقرر کرنا، جیسے: فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ، یعنی ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی گئی۔ ⑤ اثر ڈالنا ضَرَبَ الطَّعْنُ فيهِ یعنی اس پر طعن و الزام کا اثر ہوا۔ ⑥ چھاپنا یا سکہ بنانا، ضَرَبَ الدِّرْهَمَ یعنی درہم (سکہ) ڈھالا۔ ⑦ پردہ ڈالنا یا روک دینا، ضَرَبَ الحِجَابَ یعنی پردہ ڈال دیا۔ ⑧ نظر انداز کرنا یا چھوڑ دینا، فَاضْرِبْ عَنْهُمْ یعنی ان سے صرفِ نظر کرو۔ ⑨ مخلوط کرنا، ضَرَبَ اللَّبَنَ یعنی دودھ کو پانی کے ساتھ ملا دیا۔ ⑩ نشان لگانا، ٹھپہ لگانا، ضَرَبَ الخَاتِمَ یعنی مہر لگائی۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا: آیت کے الفاظ میں أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ ارشاد ہے، اس میں لفظ سلام سے اگر اصطلاحی سلام مراد لیا جائے تب تو پہلا واقعہ اس کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے اور اگر سلام کے لفظی معنی سلامت اور اطاعت کے لئے جائیں تو یہ سب واقعات اس میں برابر ہیں اسی لئے اکثر حضرات نے سلام کا ترجمہ اس جگہ اطاعت کا کیا ہے۔ (معارف القرآن)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے شخص کے قتل سے منع فرمایا کرتے تھے جو اپنے آپ کو سپرد کر دے (یعنی ہتھیار ڈال دے) اور وہ اس کے قاتل کو یہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ میں اس کے بدلے اسے قتل کروں گا اور اس بارے میں انہوں نے اپنی فوجوں کے سرداروں کو خط بھیجا تھا، کیونکہ جو لوگ محض مال کے لالچ میں اس شخص کو قتل کرتے ہیں جو امان مانگ لے، ان کا جہاد اللہ کے لیے خالص نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے اعمال اللہ کی رضا کے لائق قرار پاتے ہیں۔ (تفسیر الوسیط)

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ: دوسرے جملہ میں اسی روگ کی اصلاح ہے، جو اس غلطی پر اقدام کرنے کا باعث ہوا، یعنی دنیا کی دولت مال غنیمت حاصل ہونے کا خیال، آگے یہ بھی بتلادیا کہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت بہت سے مقرر اور مقدر کر رکھے ہیں، تم اموال کی فکر میں نہ پڑو۔ تَبْتَغُوْنَ یہ اِلابتِغَاءٌ سے ہے اس کا مطلب ہے، شدید طلب اور سخت خواہش۔ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا سے مراد ہے، اس کی ساری چیزیں اور مال و متاع۔ دنیا کے مال و متاع کو "عرض" اس لیے کہا گیا ہے کہ چاہے وہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، وہ فنا ہونے والا اور غیر پائیدار ہے، ایک ایسی عارضی شے جو باقی رہنے والی نہیں۔

امام راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ "العرض" (بفتح الراء والعین) اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں ثبات نہ ہو، اسی سے متکلمین نے "عرض" کا لفظ استعارتاً ان چیزوں کے لیے استعمال کیا جو اپنی بقا میں "جوہر" کے ساتھ قائم ہوں اور کہا گیا ہے، دنیا ایک حاضر و موجود "عرض" ہے تاکہ اس بات کی طرف توجہ دلائی جائے کہ اس میں پائیداری نہیں اور مَغَانِمُ جمع ہے مَغْنَمٌ کی اور اس کا اطلاق اس مال پر ہوتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا: اس کے بعد ایک اور تنبیہ فرمائی کہ ذرا اس پر بھی تو نظر ڈالو کہ پہلے تم میں بھی تو بہت سے حضرات ایسے ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اپنے اسلام و ایمان کا اعلان نہیں کر سکتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ کفار کے نرغہ سے نجات دیدی، تو اسلام کا اظہار کیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شخص جو لشکر اسلام کو دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا ہے وہ حقیقتاً پہلے سے

اسلام کا معتقد ہو مگر کفار کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کرنے پایا تھا، اس وقت اسلامی لشکر کو دیکھ کر اظہار کیا، یا کہ شروع میں جب تم نے کلمہ اسلام کو پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہا تو اس وقت تمہیں مسلمان قرار دینے کے لئے شریعت نے یہ قید نہیں لگائی تھی کہ تمہارے دلوں کو ٹٹولیں اور دل میں اسلام کا ثبوت ملے، تب تمہیں مسلمان قرار دیں، بلکہ صرف کلمہ اسلام پڑھ لینے کو تمہارے مسلمان قرار دینے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا اسی طرح اب جو تمہارے سامنے کلمہ پڑھتا ہے اس کو بھی مسلمان سمجھو۔ (معارف القرآن)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: اللہ تعالیٰ چھوٹے اور بڑے تمام امور پر مطلع ہے، وہ اس بات سے بھی باخبر ہے جو تمہارے دلوں میں چھپا ہوا ہے اور اس سے بھی جو تم ظاہر کرتے ہو، تمہاری ظاہر و باطن کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی اور وہ تمہاری ان سب باتوں پر محاسبہ کرے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق نیکی یا برائی کی جزا دے گا۔

اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب

اس آیت کریمہ سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا ہے خواہ کلمہ پڑھ کر یا کسی اور اسلامی شعار کا اظہار کر کے مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں، اس کا انتظار نہ کریں کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا کسی مصلحت سے اسلام کا اظہار کیا ہے۔

نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہو گا، فرض کر لو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا لَا نُكَفِّرُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے "بعض روایات حدیث میں بھی اسی قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو، خواہ وہ کتنا ہی گنہگار بد عمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول و فعل کا صدور نہ ہو جو کفر کی یقینی علامت ہے اس وقت تک اس کے اقرار اسلام کو صحیح قرار دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے، اس کی قلبی کیفیات اخلاص یا نفاق سے بحث کرنے کا کسی کو حق نہ ہو گا۔

لیکن جو شخص اظہار اسلام اور اقرار ایمان کے ساتھ ساتھ کچھ کلمات کفر بھی بکتا ہے، یا کسی بت کو سجدہ کرتا ہے، یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرتا ہے جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا ہے، جیسے گلے میں زُنّار وغیرہ ڈالنا وغیرہ وہ بلاشبہ اپنے اعمال کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائے گا آیت مذکورہ میں لفظ تَبَیَّنُوا سے اس کی طرف اشارہ موجود ہے ورنہ یہود و نصاریٰ تو سب ہی اپنے آپ کو مومن مسلمان کہتے تھے اور مسیلمہ کذاب جس کو باجماعت صحابہ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمہ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر نماز اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا اپنی اذان میں اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی کہلواتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول صاحب وحی کہتا تھا جو نصوص قرآن وسنت کا کھلا ہوا انکار تھا، اسی کی بناء پر اس کو مرتد قرار دیا گیا اور اس کے خلاف باجماع صحابہ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ہر کلمہ گو اہل قبلہ کو مسلمان سمجھو اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے؟ اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو، البتہ اظہار ایمان کے ساتھ خلاف ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو، بشرطیکہ اس کا خلاف ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو اور اس میں کوئی دوسرے احتمال یا تاویل کی راہ نہ ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لفظ کلمہ گو یا اہل قبلہ یہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعی اسلام ہونے کے بعد کسی کافرانہ قول و فعل کا مرتکب نہ ہو۔ (معارف القرآن)

مجاہدین اسلام اور قاعدین میں فرق

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا {۹۵} دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۹۶} النساء

جواب ترجمہ: جن مسلمانوں کو کوئی معذوری لاحق نہ ہو اور وہ (جہاد میں جانے کے بجائے گھر میں) بیٹھ رہیں وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں۔ جو لوگ اپنے مالوں و جانوں سے جہاد کرتے ہیں ان کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے۔ اور اللہ نے سب سے اچھائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت دے کر بڑا ثواب بخشا ہے۔ یعنی خاص اپنے پاس سے بڑے درجے اور مغفرت اور رحمت اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

شان نزول: صحیح بخاری میں ہے کہ جب اس آیت کے ابتدائی الفاظ اترے کہ گھروں میں بیٹھ رہنے والے جہاد کرنے والے مومن برابر نہیں، تو آپ ﷺ اسے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو بلوا کر لکھوا رہے تھے اس وقت سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! میں تو نابینا ہوں، معذور ہوں اس پر الفاظ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ نازل ہوئے (بخاری) یعنی وہ بیٹھ رہنے والے جو بے عذر ہوں، ان کا ذکر ہے، روایت میں ہے کہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ قلم دوات اور شانہ لے کر آئے تھے (بخاری) اور حدیث میں ہے کہ سیدنا ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا یا رسول ﷺ! اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ضرور جہاد میں شامل ہوتا، اس پر وہ آیت اُتری، اس وقت نبی کریم ﷺ کی ران سیدنا زید رضی اللہ عنہ کی ران پر تھی، ان پر اس قدر بوجھ پڑا قریب تھا کہ ران ٹوٹ جائے۔ (بخاری)

حدیث میں ہے کہ جس وقت ان آیات کی وحی اتری اور اس کے بعد طمانیت آپ ﷺ پر نازل

ہوئی میں آپ ﷺ کے پہلو میں تھا اللہ کی قسم مجھ پر رسول ﷺ کی ران کا ایسا بوجھ پڑا کہ میں نے اس سے زیادہ بوجھل چیز زندگی بھر کوئی نہ اٹھائی پھر وحی ہٹ جانے کے بعد آپ ﷺ نے عَظِیْمًا تک آیت لکھوائی اور میں نے اسے شانے کی ہڈی پر لکھ لیا اور حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ابھی تو سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے الفاظ ختم بھی نہ ہوئے تھے جو آپ ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی، سیدنا زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ منظر اب تک میری نگاہوں کے سامنے ہے، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ بعد میں اترے ہوئے الفاظ کو میں نے ان کی جگہ پر اپنی تحریر میں بعد میں بڑھایا ہے۔ (ابو داود)۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مراد بدر کی لڑائی میں جانے والے اور اس میں حاضر نہ ہونے والے ہیں (بخاری) غزوہ بدر کے موقع پر سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آکر حضور ﷺ سے کہنے لگے ہم دونوں نابینا ہیں کیا ہمیں رخصت ہے؟ تو انہیں آیت قرآنی میں رخصت دی گئی، پس مجاہدین کو جس قسم کے بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت دی گئی ہے وہ وہ ہیں جو صحت و تندرستی والے ہوں۔ (ترمذی) پس پہلے تو مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر مطلقاً فضیلت تھی لیکن اسی وحی میں جو الفاظ اُترے اس نے ان لوگوں کو جنہیں مباح عذر ہوں عام بیٹھ رہنے والوں سے مستثنیٰ کر دیا جیسے اندھے لنگڑے لولے اور بیمار، یہ مجاہدین کے درجے میں ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ: علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول "بیٹھنے والے برابر نہیں" میں جہاد پر اُبھارنے کی ابتدا ہے تاکہ لوگ جہاد چھوڑنے سے گریز کریں اور ان چیزوں سے توجہ ہٹائی جائے جو جہاد میں نقص پیدا کرتی ہیں، قاعدین (بیٹھنے والوں) سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں جہاد سے پیچھے رہنے کی اجازت دی گئی تھی اور دوسرے ان کی طرف سے کفایت کرنے والے تھے۔

بخاری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوہ بدر میں شریک نہ ہوئے اور یہی بات بظاہر تاریخ کے مطابق ہے جیسا کہ کہا گیا ہے، ابو حمزہ نے کہا کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (بنی)، مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ (بنی عمرو بن عوف) اور ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ (بنی واقف) کے بارے میں نازل

ہوئی، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس غزوہ میں شریک نہ ہوئے، شان نزول میں ہم لکھ آئے ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آیت مختلف مواقع پر پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہے۔

غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ: یہ ایک جملہ معترضہ ہے، جو اس لیے لایا گیا ہے تاکہ یہ واضح کیا جائے کہ وہ (معذور لوگ) مجاہدین کے ساتھ اجر میں مساوات نہ رکھنے کے حکم میں مقصود نہیں ہیں اور **الضَّرَر** مصدر ہے، جیسے مرض، یہ وزن عموماً عیوب اور بیماریوں کے لیے آتا ہے، جیسے عَمٰی (اندھاپن) حصر (تنگی یا بے چارگی) عَرَج (لنگڑاپن) رَمَد (آنکھوں کا درد) وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان **غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ** سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ نہیں جو بیماریوں اور عذر کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوسکتے، جیسے اندھے، لنگڑے، کمزور یا دیگر شرعی معذور افراد۔

وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ برابر نہیں ہوسکتے جو بغیر کسی عذر کے، محض سستی یا دنیاوی مشاغل کی وجہ سے جہاد سے بیٹھ گئے اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے میں شریک نہ ہوئے اور وہ لوگ جو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، البتہ وہ لوگ جو کسی معذوری یا حقیقی رکاوٹ کی وجہ سے جہاد میں شامل نہ ہوسکے، ان کی نیتِ صادقہ انہیں اللہ کے ہاں بلند مرتبہ عطا کرے گی اور وہ مجاہدین کے درجے میں یا ان کے قریب درجے میں شمار ہوں گے۔

اسی پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جو بخاری اور ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تبوک کے سفر کے موقع پر فرمایا، **إِنَّ بِالْمَدِينَةِ أَقْوَامًا، مَا سِرْتُمْ مَسِيرًا، وَلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا إِلَّا كَانُوا مَعَكُمْ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَهُمْ بِالْمَدِينَةِ؟ قَالَ: وَهُمْ بِالْمَدِينَةِ، حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ**، مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم نے جو بھی سفر کیا اور جو بھی وادی طے کی، وہ تمہارے ساتھ ہی رہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ مدینہ ہی میں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! انہیں عذر نے روک لیا تھا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی مفہوم پر شاعر کا یہ قول ذکر کیا ہے

يَا رَاحِلِينَ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ لَقَدْ... سِرْتُمْ جُسُومًا وَسِرْنَا نَحْنُ أَرْوَاحَا

إِنَّا أَقَمْنَا عَلَى عُذْرٍ وَعَنْ قَدَرٍ ..... وَمَنْ أَقَامَ عَلَى عُذْرٍ فَقَدْ رَاحَا

اے وہ لوگو! جو بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے ہو! تم نے اپنے جسموں کے ساتھ سفر کیا اور ہم نے اپنی روحوں کے ساتھ۔ ہم عذر اور تقدیر کی وجہ سے ٹھہر گئے، اور جو عذر کی بنا پر رکے وہ بھی ان جیسے ہیں جو روانہ ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان، لَا يَسْتَوِي برابر نہیں ہیں، دراصل اس بات کی نفی ہے کہ مجاہد (راہ خدا میں جہاد کرنے والا) اور قاعد (میدان کارزار میں نہ نکلنے والا، گھر میں بیٹھنے والا) ایک جیسے ہوں اور اس نفی کا مقصد یہ ہے کہ قاعد اپنی کمی کو محسوس کرے، نیکی میں کوتاہی پر نادم ہو اور مجاہدین کی پیروی کرنے کی تمنا کرے، کیونکہ ظاہر ہے کہ جہاد سے پیچھے رہ جانے والا شخص ثواب اور مرتبے میں جہاد کرنے والے کے برابر نہیں ہو سکتا، لہٰذا یہ اسلوب دراصل قاعدین کو تنبیہ کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ مجاہدین سے سبق لیں۔

سوال یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ بلاعذر بیٹھ جانے والے اور جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے، تو پھر اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟

جواب اس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کے درمیان جو بڑا فرق اور واضح فاصلہ ہے، اسے ذہن میں تازہ کیا جائے تاکہ قاعد (جہاد سے پیچھے رہ جانے والا) اپنی پستی سے شرم محسوس کرے، اپنی حالت بدلنے کا ارادہ کرے اور جہاد کی طرف اٹھے، تاکہ اپنا درجہ بلند کر سکے۔ (تفسیر کشاف)

اسی طرح جیسے قرآن میں آیا ہے، هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ، کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جاہل کو علم کی طرف اُبھارا جائے اور اسے ترغیب دی جائے کہ وہ جہالت چھوڑ کر علم کی شرافت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان، مِنَ الْمُؤْمِنِينَ، ایمان والوں میں سے، یہ قاعدین (بیٹھنے والوں) کی حالت بیان کرنے کے لیے ہے، اس کے ذکر کی حکمت یہ ہے کہ ابتدا ہی میں یہ بات واضح کر دی جائے کہ جہاد سے پیچھے رہنے والے ایمان کے دائرے سے خارج نہیں ہیں، کیونکہ ان کا پیچھے رہنا نفاق یا دین کی

کمزوری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ کسی تاخیر یا دنیاوی مشغولیت کی وجہ سے تھا، ہاں جو لوگ جہاد کا انکار کرتے ہیں، جہاد کے قائل نہیں وہ مومنین کی فہرست سے خارج ہیں۔

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً: اللہ تعالیٰ نے اپنے مال اور اپنی جانیں راہ خدا میں لگا دینے والوں کی فضیلت سنائی ہے کہ بیٹھنے والوں کے مقابلے میں مجاہدین فی سبیل اللہ کو ایک درجہ فضیلت حاصل ہے، یہاں قاعدین سے وہ لوگ مراد ہیں جو کسی رکاوٹ یا مانع کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہو سکے، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنے مال و جان قربان کرنے والے مجاہدین کو ان قاعدین پر ایک درجہ فضیلت عطا فرمائی ہے، کیونکہ مجاہدین نے اپنی جانوں کو خطرات اور مصیبتوں کے سپرد کیا اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اپنی جان و مال نچھاور کیے۔

یہاں "درجہ" بلندیِ معنوی کے لیے بطورِ استعارہ لایا گیا ہے، یعنی اس سے مراد فضیلت، اجر کی فراوانی اور ثواب میں زیادتی ہے اور اس پر جو تنوین آئی ہے وہ تعظیم کے لیے ہے۔

مفسر قرآن حضرت ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اصحابِ عذر قاعدین پر ایک ہی درجہ فضیلت دی ہے، یعنی ایک فضیلت اور یہ ان کے اپنے نفسوں سے جہاد کرنے کے سبب ہے، ورنہ باقی معاملات میں دونوں برابر ہیں۔

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: میدان کارزار میں اپنے مال لٹانے والے اور جانوں کی بازی لگانے والے ایسے عظیم لوگ ہیں کہ ان سب کے لیے جنت لکھ دی گئی ہے، سب اس عظیم الشان نعمتوں والی جگہ پر اپنا دائمی ٹھکانہ بنائیں گے، یہ عظیم مقام اللہ نے ان کے لیے تیار کر دیا ہے، مجاہدین اور قاعدین کے ذکر کے بعد یہ جملہ معترضہ اس لیے لایا گیا ہے تاکہ اس وہم کو دور کیا جا سکے جو ایک گروہ کو دوسرے پر فضیلت دینے سے سمجھا جا سکتا تھا کہ شاید کم درجے والے (مفضول) کو ثواب سے محروم کر دیا گیا ہے، یعنی مجاہدین اور اہلِ ضرر (معذور بیٹھنے والے) دونوں گروہوں میں سے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے نیک بدلہ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ درست ہے اور نیت خالص ہے، البتہ عمل کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ثواب میں زیادتی کا فرق واقع ہو گا۔

یہاں كُلًّا پہلا مفعول ہے اُس فعل کے لیے جو اس کے بعد ذکر ہوا ہے اور اسے مقدم لانے کا مقصد وعدے کی تاکید اور قصر کو ظاہر کرنا ہے، اس کی تنوین اس مضاف الیہ کے بدلے میں ہے جو محذوف ہے اور الْحُسْنٰى دوسرا مفعول ہے۔

وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا: اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی سربلندی کے لیے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو ان لوگوں پر فضیلت بخشی ہے جو بغیر کسی عذر کے جہاد سے بیٹھ گئے، اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین کو اُن قاعدین پر بڑے اجر و ثواب اور بلند مرتبہ سے نوازا، اللہ نے انہیں اجر عظیم سے نوازا۔

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: پھر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم اجر کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی اللہ نے اپنے راستے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بغیر عذر بیٹھنے والوں پر ایسے اجرِ عظیم سے نوازا جو انہیں بلند درجات تک پہنچاتا ہے، انہیں اپنی بارگاہ کے مقاماتِ قرب تک لے جاتا ہے، ان کی کوتاہیوں کو معاف کرتا ہے اور اپنی وسیع رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے اور اللہ اپنے اولیاء کے لیے بہت بخشنے والا اور اپنے فرمانبردار بندوں پر بہت مہربان ہے۔ دَرَجٰتٍ کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس کی عظمت اور کثرت ظاہر ہو، کہ یہ وہ بلندیاں ہیں جن کی نہ کوئی حد ہے نہ مقدار، بلکہ یہ عظیم شرف ہے جو صرف مقربینِ بارگاہ کو نصیب ہو گا۔

یہ جو فرمایا گیا کہ مجاہدین کو معذور قاعدین پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے، جب کہ غیر معذور قاعدین پر کئی درجے فوقیت و برتری رکھتے ہیں، یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کبھی مجاہدین کو "درجہ" کے ساتھ اور کبھی "درجات" کے ساتھ فوقیت دی ہے، تو اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب جنہیں ایک درجے پر فضیلت دی گئی ہے وہ وہ ہیں جو معذور قاعدین پر فائق ہیں اور جنہیں کئی درجات پر فضیلت دی گئی ہے وہ وہ ہیں جو بغیر عذر بیٹھنے والوں پر فوقیت رکھتے ہیں، کیونکہ جہاد فرضِ کفایہ ہے۔

کچھ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ "درجہ" اور "درجات" سے مراد دراصل ایک ہی طبقہ ہے، یعنی وہ لوگ جو بغیر عذر بیٹھ گئے، رہے معذور قاعدین تو وہ اجر میں مجاہدین کے برابر ہیں، اسی رائے کو علامہ

محمود آلوسی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ اللہ نے اپنے راستے میں مال و جان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو غیر معذور قاعدین پر ایک ایسی فضیلت دی جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور دونوں گروہوں (مجاہدین اور قاعدین) کو اللہ نے حسن انجام کا وعدہ دیا ہے، پھر فرمایا کہ اللہ نے مجاہدین کو قاعدین پر اجر عظیم دے کر فضیلت دی اور ممکن ہے کہ "درجہ" اور "درجات" کا تکرار محض تاکید اور بلاغت کے لیے ہو۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے دونوں اقوال نقل کیے، ایک یہ کہ "درجہ" اور "درجات" کا ذکر دراصل تاکید اور مبالغہ ہے، دوسرا یہ کہ مجاہدین کو معذور قاعدین پر ایک درجے کی فضیلت ہے اور بغیر عذر بیٹھنے والوں پر کئی درجوں کی فضیلت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرا قول قابل ترجیح نظر آتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ آیت میں قاعدین سے مراد معذور (اہلِ ضرر) ہیں اور اگرچہ قاعدین معذورین اپنی نیتِ صادقہ کی بنا پر بلند مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ مجاہدین کے ہم پلہ نہیں ہوسکتے جنہوں نے میدانِ جہاد میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا، یہی بات عقلِ سلیم کا بھی تقاضا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کا ہر گروہ کو عطا کیا جانے والا فضل واجر اس کی حکمت اور رحمت کے مطابق ہے، اسی آیت سے علماء نے استنباط کیا ہے کہ جہاد اللہ کے نزدیک افضل ترین اعمال میں سے ہے اور مجاہدین کو بلند مراتب حاصل ہوں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ، أَعَدَّهَا اللهُ لِلْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ، مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ، فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللهَ، فَاسْأَلُوهُ الفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الجَنَّةِ وَأَعْلَى الجَنَّةِ، (بخاری، مسلم)

جنت میں اللہ نے مجاہدین کے لیے سو درجے بنائے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان کا فاصلہ ایسا ہے جیسے زمین اور آسمان کے درمیان، پس جب اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور بہترین حصہ ہے۔

دارالکفر سے دارالایمان کی طرف ہجرت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا

مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا {۹۷} اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا {۹۸} فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا {۹۹} وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۱۰۰} النساء

جواب ترجمہ: بے شک جو لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے انہوں نے جواب دیا ہم اس ملک میں بے بس تھے فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے سو ایسوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے کافی کمزور ہیں جو نکلنے کا کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں پاتے۔ چنانچہ پوری امید ہے کہ اللہ ان کو معاف فرمادے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا بہت بخشنے والا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور بڑی گنجائش پائے گا۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کے لیے نکلے، پھر اسے موت آپکڑے تب بھی اس کا ثواب اللہ کے پاس طے ہو چکا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

شان نزول: یہ آیت مکہ میں رہنے والے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جو اسلام کی باتیں تو کرتے تھے لیکن انہوں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی انہوں نے ایمان لانے کا اظہار تو کیا لیکن وہ نفاق چھپائے ہوئے تھے، جب بدر کا معرکہ پیش آیا تو یہ لوگ مشرکوں کے ساتھ ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے نکلے اور قتل ہو گئے، فرشتوں نے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر ضربیں لگائیں اور انہوں نے ان سے وہ کہا جس کا ذکر خدا تعالیٰ نے کیا۔ (اسباب النزول)

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ: ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ ہر اُس شخص کے بارے میں عام ہے جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے اور وہ ہجرت پر قادر ہو لیکن دین قائم کرنے کے قابل نہ ہو، تو وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے اور سب کے

اتفاق سے اور اسی آیت کے صریح نص کے مطابق وہ حرام کا مرتکب ہے۔

تَوَفّٰهُمُ یہ ماضی کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور تانیث کی علامت اس لیے نہیں لائی گئی کہ اس کے اور فعل کے درمیان فصل ہے اور اس لیے بھی کہ فاعل حقیقی مؤنث نہیں ہے اور یہ مضارع بھی ہو سکتا ہے جس کی اصل **تَتَوَفّٰهُمُ** ہے، جس میں سے ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی، یہ **تَوَفّٰی** سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کو پورے طور پر لے لینا، توفی سے مراد ان کی روحوں کو قبض کر لینا اور موت دینا ہے، بعض نے کہا کہ اس سے مراد ان کو جہنم کی طرف اکٹھا کرنا ہے، ملائکہ سے مراد ملک الموت اور اس کے معاون فرشتے ہیں جو اللہ کے حکم سے روحیں قبض کرتے ہیں۔

اپنے اوپر ظلم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایسا کام کرے جس سے اس کو نقصان پہنچے اور اس کا انجام برا ہو، خواہ وہ کفر ہو یا گناہ، وہ اپنی جان پر اس لیے ظلم کرنے والا کہلاتا ہے کہ اس نے ایسا قول یا فعل اختیار کیا جو سمجھدار لوگ کبھی اختیار نہ کرتے اگر وہ اس کے انجام کو دیکھ لیتے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حالت میں قبض کریں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، یعنی وہ ذلت و خواری پر راضی رہے، ایسی سرزمین میں رہائش اختیار کی جہاں دین پر عمل ممکن نہ تھا اور باوجود قدرت کے ہجرت نہ کی اُن علاقوں کی طرف جہاں ان کے دینی بھائی بستے تھے، تو ایسے لوگوں سے فرشتے روح قبض کرتے وقت یا قیامت کے دن توبیخ اور ملامت کے طور پر پوچھیں گے، تم کس حال میں تھے؟ یعنی کیا تم عزت میں تھے یا ذلت میں؟ تم نے کفار کے ساتھ رہنے پر کس طرح رضامندی ظاہر کی جبکہ وہ تمہیں ذلیل کرتے اور تمہارے دین کا مذاق اڑاتے تھے؟ یا مطلب یہ ہو گا، تم دین کے معاملے میں کس حال میں تھے؟ **فِيْمَ كُنْتُمْ** سے مراد ملامت اور سرزنش ہے کہ تم کسی دین و مذہب کے کام میں نہ تھے، اس لیے کہ تم ہجرت پر قادر تھے مگر ہجرت نہ کی۔

قَالُوْٓا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ: جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، وہ فرشتوں سے کہیں گے ہم دنیا میں اپنے علاقے اور وطن میں مشرکین کے ہاتھوں کمزور بنا دیے گئے تھے، انہوں نے ہمیں ذلیل و خوار کر دیا تھا اور ہم اپنے کسی معاملے کے مالک نہ تھے، یہ دراصل ایک قبیح عذر ہو گا جو ان کی کم ہمتی اور پست ہمتی کو ظاہر کرے گا، اسی لیے فرشتے ان کا یہ بہانہ قبول نہ کریں گے، فرشتوں کی ڈانٹ

ڈپٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کے لیے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت فرض عین ہے، ہاں کمزور مرد، عورتیں اور بچے جو قہر و جبر سہہ نہیں سکتے اور ان مصائب و آلام سے نکلنے کی راہ نہیں پاتے وہ مستثنیٰ ہیں۔

قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا: جب کفار کے ہاں رہنے والوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ کمزور اور مغلوب تھے، اس پر ان لوگوں کو ملامت کی گئی تھی جو اپنی کمزوری کو دلیل بنا رہے تھے کہ وہ ہجرت پر قادر نہیں تھے تاکہ دین پر قائم رہ سکیں، اس عذر پر فرشتوں نے انہیں جھڑکا اور کہا، کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یعنی تم مکہ سے نکل کر ان علاقوں میں جاسکتے تھے جہاں تمہیں اپنے دین کے اظہار اور اس پر عمل کرنے سے نہ روکا جاتا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے ملک یا علاقے میں رہ رہا ہو جہاں وہ دین کو جیسا چاہیے قائم نہ کر سکتا ہو اور دین قائم کرنے میں رکاوٹیں اور اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، یا اسے یقین ہو کہ دوسرے علاقے میں جاکر وہ اللہ کے حق کو بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے اور عبادت میں زیادہ پائیداری حاصل کرے گا، تو اس پر ہجرت لازم ہے۔

اور قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا، اس سوال و جواب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ (مکہ میں رہنے والے) مسلمان ہی مرے تھے لیکن اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے اس لیے کہ انہوں نے ہجرت ترک کر دی تھی، ورنہ اگر وہ کافر مرے ہوتے تو ان سے اس طرح کی بات ہرگز نہ کی جاتی اور ان کا ذکر صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس لیے ترک کر دیا گیا کہ انہوں نے بہت سخت کام (یعنی ترکِ ہجرت) کیا تھا۔

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: یہاں ان لوگوں کے برے انجام کی وضاحت ہے جنہوں نے اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنے کے بجائے کفر کی سرزمین میں ذلت کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کیا، یعنی وہ لوگ جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوئے مرے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، یعنی آخرت میں ان کا وہ مسکن جہاں وہ رہیں گے جہنم ہے اور یہی ان کا انجام ہے جس کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے، **وَسَآءَتْ مَصِيْرًا** یعنی جہنم اپنے رہنے والوں کے لئے کتنا برا ٹھکانا اور کتنا برا انجام ہے، کیونکہ وہ وہاں دردناک عذاب کا مزہ چکھیں گے، یہاں اسمِ اشارہ **فَاُولٰٓئِكَ** اس بات کی طرف اشارہ

کرتا ہے کہ وہ ان صفات کے سبب اس حکم کے مستحق ہیں جو اس کے بعد بیان ہوا ہے، وہ ہجرت پر قادر تھے لیکن کمزور نفسی اور مال و دنیاوی مفادات کی حرص کی وجہ سے انہوں نے ہجرت نہیں کی اور جملے وَسَاءَتْ مَصِيْرًا میں مذمت کے ساتھ مراد جس چیز کو برا قرار دیا گیا ہے، وہ محذوف ہے، یعنی مراد "جہنم" ہے۔

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے برے انجام سے، جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تین قسم کے لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا اور فرمایا یہ برا انجام اور رسوا کرنے والا عذاب ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے ہجرت کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی طرف ہجرت نہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، لیکن کچھ طبقات ایسے ہیں جو ان ظالموں اور اس دردناک انجام سے باہر ہیں، وہ وہ مرد ہیں جو واقعی کمزور ہیں، بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ہجرت پر قادر نہیں، یا وہ عورتیں جو اکیلے نکلنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور ان پر حملے کا اندیشہ ہوتا ہے، یا وہ بچے جو ابھی بالغ نہیں ہوئے، یا ابھی قریب البلوغ ہوئے ہیں لیکن تنگدستی یا دیگر صحیح عذر کی وجہ سے تنہا ہجرت نہیں کر سکتے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا مسلمان اور وسائل محدود ہونے سے یہ مراد ہے کہ ان کے پاس نہ تو کوئی سواری کا بندوبست ہو اور نہ وہ پیدل سفر کی مشقت اٹھانے کے قابل ہوں انہیں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا گروہ سے مستثنیٰ قرار دیا اور ان کے ہجرت نہ کرنے کے قصور کی معافی کا وعدہ فرمایا، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ میں اور میری ماں ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جنہیں اللہ نے معذور رکھا۔ (بخاری، کتاب التفسیر) نیز ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور کئی دوسرے ناتواں مسلمان بھی تھے جن کی نجات کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں رکوع کے بعد دعا فرمایا کرتے۔ (بخاری، کتاب الادب، باب تسمیۃ الولید)

فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ: یہاں ان کمزور لوگوں کا حکم بیان کیا گیا ہے جو نہ کوئی تدبیر کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی راستہ پاتے تھے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہجرت اس وجہ سے ترک کی کہ ان کے پاس ایسے عذر تھے جنہوں نے انہیں ہجرت سے روک دیا، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: امید ہے کہ

اللہ ان سے درگزر فرمائے گا، یعنی ان کی ہجرت پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے ان سے چشم پوشی کرے گا۔

اللہ کے کلام میں عَسَی اور لَعَلَّ دونوں واجب الوقوع کے معنیٰ میں آتے ہیں، اگرچہ مخلوق کے کلام میں یہ امید اور گمان کے لیے آتے ہیں، کیونکہ مخلوق ہی ہے جس پر شک وشبہ کا گزر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے منزہ اور پاک ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کسی چیز کی امید دلاتا ہے تو وہ ضرور اسے عطا کرتا ہے۔ (حاشیہ جمل علی الجلالین)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ کے اس فرمان عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ میں یہ اشارہ ہے کہ ہجرت ترک کرنا بہت بڑا اور نازک معاملہ ہے، یہاں تک کہ وہ مجبور شخص بھی جس کے لیے ہجرت کا واجب ہونا ختم ہو چکا ہے، اسے بھی چاہیے کہ ہجرت کے ترک کو گویا گناہ سمجھے اور مطمئن نہ ہو بلکہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہے اور دل کو ہجرت کی طرف معلق رکھے۔ (روح المعانی)

وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُورًا: آیت کے اس حصہ میں یہ وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے بندوں کے قصور معاف کرنے والا اور ان کی توبہ قبول کرنے والا ہے، وہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرماتا ہے اور سچے دل سے رجوع کرنے والوں کو بخش دیتا ہے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً: یہاں اللہ تعالیٰ نے دین کی سربلندی اور اس کی خاطر ہجرت پر نہایت پرکشش انداز میں ترغیب دلائی ہے، فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں اپنے لیے بہت سے ایسے مقامات پائے گا جہاں وہ دشمنوں سے بچ کر رہ سکے اور رزق وزندگی کی کشادگی بھی اسے ملے گی۔

مُرٰغَمًا سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں انسان سکون اور سہولت کے ساتھ دشمن کی گرفت سے نکل کر اپنی دینی زندگی گزار سکے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلْمُرٰغَمُ کی تفسیر میں اختلاف ہے، مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، مراغم سے مراد ہے بچ نکلنے کی جگہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، مراد ہے پناہ گاہ اور منتقل ہونے کی جگہ، ابن زید رحمہ اللہ نے کہا، مراد ہے ہجرت کی جگہ، یہ سب اقوال معنیٰ کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں اور اس سے مراد وہ مقام ہے جہاں دشمن سے بچ کر نکلا جائے، یہ

لفظ رِغَامٌ (یعنی مٹی، خاک) سے ماخوذ ہے، رَغِمَ أَنفُ فُلَان کا مطلب ہے فلاں کی ناک مٹی سے لگ گئی (یعنی ذلیل ہوا) اور رَاغَمْتُ فُلَانًا کا مطلب ہے، میں نے اس سے کنارہ کشی کی اور اس کی دشمنی کی، یہ سب معنٰی کے اعتبار سے کی گئی تفسیریں ہیں، لیکن اگر خاص لفظی پہلو سے دیکھا جائے تو اَلْمُرَاغِمُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مقابلہ اور مزاحمت ہو، جیسے ہر ایک اپنے حریف کی ناک خاک میں رگڑنا چاہے، یعنی اس پر غالب آجائے، گویا قریش کے کافروں نے مکہ میں مقید مسلمانوں کی ناک خاک میں رگڑ دی تھی (یعنی انہیں ذلیل کر رکھا تھا)، لیکن اگر ان میں سے کوئی ہجرت کرتا تو وہ قریش کی ناک خاک میں رگڑ دیتا، کیونکہ ہجرت کے بعد اسے ایک ایسی پناہ اور طاقت مل جاتی جو قریش کے بس سے باہر تھی اور یہی پناہ وغلبہ مُرَاغَم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے دین کو بلند کرنے اور اس کے کلمے کو غالب کرنے کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کرے، وہ زمین میں ایسی بہت سی جگہیں پائے گا جہاں وہ اپنے دشمنوں کے مکر اور ظلم سے محفوظ رہے گا اور وہاں اسے بھلائی، نعمت اور کشادگیٔ رزق بھی نصیب ہوگی، یہ سب کچھ اس کے ان دشمنوں کے لیے باعثِ ذلت ہوگا جنہیں وہ ان کی بری صحبت اور برے سلوک کی وجہ سے چھوڑ آیا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جو شخص اپنا وطن چھوڑ کر کسی اجنبی علاقے میں جا بسے اور وہاں اس کے حالات سنبھل جائیں، پھر جب یہ خبر اس کے وطن والوں تک پہنچے تو وہ اپنے برے سلوک کی وجہ سے شرمندہ ہوتے ہیں اور ذلت محسوس کرتے ہیں، گویا کہا گیا، اے انسان! تُو اپنے وطن سے ہجرت کرنے کو محض اس لیے ناگوار سمجھ رہا ہے کہ تجھے سفر اور مشقت کا اندیشہ ہے، لیکن ڈر مت، اللہ تعالیٰ تجھے تیرے وطن سے باہر ایسی عظیم نعمتیں اور بلند مراتب عطا کرے گا جو تیرے دشمنوں کے لیے ذلت کا باعث ہوں گے اور تیرے لیے کشادہ زندگی کا سبب بنیں گے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کی رسوائی کے ذکر کو رزق کی کشادگی پر مقدم اس لیے رکھا کہ مظلوم انسان کا سب سے پہلا اور بڑا سکون یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس پر ظلم کیا تھا، وہ ذلیل ورسوا ہوں اور یہی بات اس کے دل کو زیادہ خوشی بخشتی ہے، اس سے بھی زیادہ جو کشادہ روزی اور آرام دہ زندگی

سے ملتی ہے۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ: ارشاد ہے اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے موت آ پکڑے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو گیا، یہ ہجرت کی عظمت کو بیان کرنے والا جملہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ثواب یقینی کر دیا ہے، چاہے ہجرت کرنے والا اپنی منزل تک نہ بھی پہنچ سکے، یعنی جو شخص اپنے گھر بار اور وطن کو چھوڑ کر، اپنے دین کو بچانے کے لیے اس جگہ کی طرف نکلتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دین غالب ہے، مقصد یہ ہے کہ حق اور اہلِ حق کی مدد کرے، پھر راستے ہی میں موت اسے آ لے، تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کا اجر یقینی طور پر لکھا جاتا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے، لہٰذا ایسے مہاجر کی پچھلی کوتاہیوں اور تقصیرات کو معاف فرما دیتا ہے اور اپنی بے پایاں رحمت سے نوازتا ہے۔

ثُمَّ يُدْرِكْهُ کو جزم کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جو شرطی فعل **وَمَنْ يَّخْرُجْ** پر معطوف ہے اور اس کا جواب ہے **فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ**، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور ابن جنی رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ یہ فعل مضارع مرفوع ہے اور **اَلْمَوْتُ** اس کا فاعل ہے، گویا مطلب یہ ہوا کہ پھر اسے موت آ جا پہنچتی ہے، عبارت **فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ** میں مہاجرین کے دلوں کے لیے اطمینان ہے اور ان کو ہجرت کی ترغیب دی گئی ہے، کہ اگر وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے تو کفار کے منہ پر مٹی مل دی اور اللہ نے انہیں اپنی طرف سے رزق عطا فرمایا اور اگر وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے، تو ان کی نیک نیت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کامل ثواب لکھ دیا اور انہیں اجرِ عظیم سے نوازا جس کا اندازہ وہی جانتا ہے۔

روایات میں ہے کہ یہ آیت جندب بن ضمرہ کے بارے میں نازل ہوئی، ابن جریر نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ جب وہ مکہ میں تھے تو انہوں نے یہ آیت سنی، بیشک جنہیں فرشتے اس حال میں وفات دیتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا، مجھے اٹھالو، میں کمزوروں میں سے نہیں ہوں، مجھے راستے کا علم ہے، آج کی رات مکہ میں نہیں گزاروں گا،

چنانچہ انہوں نے انہیں چارپائی پر اٹھایا اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن راستے میں تنعیم کے مقام پر (جو مکہ کے قریب ہے) ان کا انتقال ہو گیا، نزاع کے وقت وہ اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے پر مارتے اور کہتے، اے اللہ! یہ تیرے لیے ہے اور یہ تیرے رسول ﷺ کے لیے، میں اس پر بیعت کرتا ہوں جس پر تیرے رسول ﷺ نے بیعت لی، پھر ان کا انتقال ہو گیا، جب صحابہ رضی اللہ عنہم کو خبر ملی تو کہنے لگے، کاش یہ مدینہ پہنچ جاتے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر الوسیط للطنطاوی)

ان آیات سے فقہاء نے درج ذیل احکام و آداب اخذ کیے ہیں ① ایسی سرزمین چھوڑنا واجب ہے جہاں مسلمان اپنے دین پر عمل نہ کر سکے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ان آیات میں دلیل ہے کہ ایسی زمین کو ترک کیا جائے جہاں گناہ کا غلبہ ہو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا، جب کسی زمین میں گناہ کیے جائیں تو وہاں سے نکل جاؤ اور یہ آیت تلاوت کی، کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ایسی زمین میں رہنا درست نہیں جہاں سلف رحمہم اللہ پر سب و شتم ہو اور حق کے خلاف عمل ہو۔

شیخ جمال الدین القاسمی رحمہ اللہ نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالے سے فرمایا، ہجرت کا معنیٰ ہے ترک کرنا اور شرعی اصطلاح میں ہجرت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی منع کی ہوئی چیز کو چھوڑ دے۔

اسلام میں ہجرت کی دو صورتیں ہوئیں، (الف) دارالخوف سے دارالامن کی طرف جانا، جیسا کہ حبشہ کی ہجرت اور مکہ سے مدینہ کی ہجرت۔ (ب) دارالکفر سے دارالایمان کی طرف جانا، جیسا کہ مدینہ کی طرف ہجرت، یہ حکم مکہ کی فتح تک خاص رہا، بعد ازاں مکہ بھی دارالاسلام بن گیا، مگر دارالکفر سے ہجرت کا عمومی حکم آج بھی باقی ہے۔ (محاسن التاویل)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت ختم ہو گئی، لیکن کفار سے جہاد باقی ہے اور جب تک دنیا میں دارالکفر ہے، وہاں سے ہجرت واجب ہے، امام احمد اور ابو داؤد نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہجرت ختم نہ ہو گی جب تک توبہ باقی ہے اور توبہ ختم نہ ہو گی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے۔

② جو شخص اللہ کے لیے ہجرت کا ارادہ کرے اور راستے میں ہی وفات پا جائے، اللہ تعالیٰ اس کے

اخلاص کی برکت سے پورا اجر عطا فرمائے گا، اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔

صاحبِ کشاف لکھتے ہیں، ہر وہ ہجرت جو کسی دینی مقصد کے لیے ہو، چاہے علم حاصل کرنے کے لیے، یا حج، یا جہاد، یا ایسے ملک کی طرف جانا جہاں زیادہ اطاعت ہو سکے یا دنیا سے بے رغبتی اور پاکیزہ رزق کی تلاش میں ہو، تو یہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت ہے اور اگر موت راستے میں آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ (کشاف)

یہ آیات ان لوگوں پر سخت تنبیہ ہیں جنہوں نے کفار کے ساتھ ذلت ورسوائی کی زندگی کو پسند کیا حالانکہ وہ ہجرت کی طاقت رکھتے تھے اور یہ مومنین کو ہر زمانے میں اللہ کے دین کے لیے ہجرت کرنے کی زبردست ترغیب دیتی ہیں اور ان کو وعدہ دیتی ہیں کہ اگر وہ ہجرت مکمل کریں گے تو دنیا میں عزت ورزق ملے گا اور اگر راستے میں ہی فوت ہو گئے تو کامل اجر وثواب ملے گا، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا فرمائے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: یہاں اللہ تعالیٰ کی خاطر ہجرت کرنے والوں کو معافی کی بشارت سنائی گئی ہے، ہجرت کرنے والا ممکن ہے کہ اپنی زندگی کے پچھلے حصے میں بہت سی کوتاہیاں اور گناہ کر چکا ہو، جب وہ اللہ کے لیے سب کچھ چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی کہ پریشان نہ ہو، تمہارے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے، کیونکہ اللہ بہت بخشنے والا ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو اپنی رحمت کی امید دلائی ہے، ہجرت میں انسان جان، مال، گھر اور خاندان سب کچھ قربان کرتا ہے، ان قربانیوں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اپنی رحمت سے انہیں بے اجر نہ چھوڑے گا بلکہ اپنی خاص مہربانی سے ان کے درجات بلند کرے گا۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی غفوریت ورحیمیت کو ذکر کیا گیا تاکہ اہلِ ایمان ہجرت کے سفر میں خوف، تھکن یا موت کی فکر سے مایوس نہ ہوں، تاکہ معلوم ہو کہ اللہ کا نظام صرف عدل نہیں بلکہ عدل کے ساتھ ساتھ مغفرت اور رحمت پر بھی مبنی ہے، تاکہ یہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور

مہربانی بندے کی محنت سے کہیں زیادہ وسیع ہے، تاکہ یہ سبق ملے کہ ہجرت کرنے والا صرف اجر ہی کا مستحق نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کی سابقہ لغزشیں بھی معاف کر دی جاتی ہیں۔

یہاں ایک روحانی نکتہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ ہجرت توبہ کی عملی شکل ہے، انسان گناہ، ظلم اور کفر کے ماحول کو چھوڑ کر اللہ کی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ اپنے دو صفاتی جلوے غفوریت (بخشش) اور رحیمیت (مہربانی) کو نمایاں کرتا ہے، گویا ہجرت کرنے والا ایک نئے جنم کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے۔

سفری نماز

سوال اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا {۱۰۱} النساء

جواب ترجمہ: اور جب تم سفر کے لیے نکلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں نماز میں سے کچھ کم کر دو اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے بیشک کافر تمہارے صریح دشمن ہیں۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا: یہاں زمین میں چلنے کو سفر اس لیے کہا گیا ہے کہ مسافر اپنے پاؤں یا سواری کے ذریعہ زمین پر چلتا ہے اور یہاں "زمین" سے مراد خشکی اور سمندر دونوں ہیں، یعنی اے ایمان والو! تم جہاں بھی سفر کرو، خواہ خشکی میں ہو یا سمندر میں، تو تم پر کوئی گناہ نہیں، یعنی نہ کوئی حرج ہے نہ ہی گناہ، کہ تم نماز کو قصر کرو، یعنی نماز کو کم کر لو، جس کو اللہ نے تم پر اپنی رحمت سے تخفیف کے طور پر آسان کیا ہے، تَقْصُرُوْا قصر سے ماخوذ ہے جو مد کے مقابل ہے، یعنی کسی چیز کو چھوٹا کر دینا، اس کے کچھ حصے یا اوصاف کم کر دینا اور مِنَ الصَّلَاۃ میں "مِن" یا تو زائد ہے تاکید کے لیے، اس صورت میں نماز براہِ راست تَقْصُرُوْا کا مفعول ہو گا، یا "مِن" تبعیض کے لیے ہے، تو پھر مفعول محذوف ہو گا اور مِنَ الصَّلَاۃ اس کی صفت ہو گی، یعنی تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم نماز کا کچھ حصہ کم کر دو۔

إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر لوگ تمہیں فتنہ میں ڈالیں گے، یعنی یہ جملہ شرطیہ ہے اور اس کا جواب محذوف ہے، جو پچھلے کلام سے سمجھ میں آرہا ہے، یہاں فتنہ سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان والوں کو ایذا دیں، یعنی اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ سفر کے دوران مشرکین تم پر لڑائی یا کسی اور طریقے سے تکلیف دہ حملہ کریں گے، تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم نماز قصر کرلو۔

إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا: یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں، یہاں مومنوں کو ہمیشہ کافروں سے بچنے اور ہوشیار رہنے کی تاکید کی علت بیان کی گئی ہے، کیونکہ ان کی دشمنی مومنوں کے ساتھ بالکل ظاہر ہے اور ان کی نفرت بہت سخت ہے، یعنی اے ایمان والو! کافر تمہارے لئے ہمیشہ سے اور آج بھی کھلی دشمنی ظاہر کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں تمہارے خلاف جو کینہ اور بغض چھپا ہوا ہے وہ اس سے بھی زیادہ شدید اور بڑا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دشمنی کو تین طرح سے مؤکد فرمایا، اِنَّ کے ذریعہ جو تاکید کے لئے ہے۔ کانوا کے ذریعہ جو دوام اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے اور اس دشمنی کو ظاہر و نمایاں قرار دے کر، تاکہ مسلمان ان سے انتہائی درجے کا احتیاط برتیں۔

نماز قصر کا طریقہ: جہاد اور ہجرت میں چونکہ سفر درپیش ہوتا ہے اس لیے ہجرت کے ساتھ سفر میں نماز قصر کرنے کا حکم بھی بیان فرمادیا، بموجب احکام کتاب و سنت مسلمان ہمیشہ نماز پڑھتے آئے ہیں، قصر صرف چار رکعت والی نماز میں ہے یعنی ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعتوں کے بجائے دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، نماز مغرب اور نماز فجر میں قصر نہیں ہے ان کو سفر میں بھی پورا ہی پڑھنا فرض ہے، اگر مسافر کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے بھی امام کی اقتداء میں چار رکعت والی نماز پوری پڑھنی فرض ہے، مقیم اگر مسافر کے پیچھے اقتداء کرلے تو جب امام دو رکعت پر سلام پھیرے تو مقیم مقتدی کھڑے ہو کر اپنی چار رکعت پوری کرنے کے لیے باقی رکعات پڑھے۔

ہر سفر میں قصر پڑھنا درست نہیں ہے اگر تین منزل کا سفر ہو تو قصر کرنا درست ہے ایک منزل سولہ میل کی لینے سے مسافت قصر ۴۸ میل ہے اور کلو میٹر کے حساب سے ۸۸ کلو میٹر ہے یہ مسافت قصر ہے، اتنی مسافت کے لیے جب اپنی بستی کی حدود سے نکل جائے تو نماز سفر شروع کردے اگرچہ ذرا دور ہی پہنچا ہو اور جب تک کسی بستی یا شہر میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے، نماز قصر ہی پڑھتا

رہے، اگر کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرلی تو وہاں سے چلنے تک ہر نماز پوری پڑھے قصر نہ کرے۔ (انوارالبیان)

سفر میں سنتیں پڑھنے کا حکم: سنتوں میں قصر نہیں ہے البتہ اگر جلدی ہو سواری چھوٹ جانے کا ڈر ہو تو سنتیں بالکل ہی چھوڑی جاسکتی ہیں، اطمینان ہو اور جلدی کا تقاضا نہ ہو تو سنتیں بھی پڑھ لے البتہ وتر ہرگز نہ چھوڑے اور فجر کی سنتیں بھی اہتمام سے پڑھ لے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں دو رکعت نماز ظہر پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں آپ کے ساتھ پڑھیں اور اس کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی اور مغرب کی سفر اور حضر میں تین رکعت نماز پڑھی ان میں سفر اور حضر میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی اور یہ دن کے وتر ہیں اور ان کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ (رواہ الترمذی) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھارہ دن سفر میں رہا، میں نے نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج ڈھلنے کے بعد دو رکعتیں چھوڑی ہوں، معلوم ہوا کہ سفر میں سنتیں پڑھنا بھی مشروع ہے۔ (انوارالبیان)

مسافر اگر پوری چار رکعت پڑھ لے؟ قرآن مجید کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کافروں کے فتنے میں ڈالنے یعنی تکلیف پہنچانے کا اندیشہ ہو تو نماز قصر کرنے کی اجازت ہے اسی لیے حضرت یعلی بن امیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو یوں ارشاد فرمایا ہے اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ امن وامان ہو تو قصر نہ ہو، اب تو امن وامان ہو گیا (لہٰذا پوری پڑھنی چاہیے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے بھی اس بات سے تعجب ہوا تھا جس سے تمہیں تعجب ہو رہا ہے (کہ اب امن وامان ہے، لہٰذا پوری نماز پڑھا کریں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے تم پر صدقہ ہے لہٰذا اللہ کا صدقہ قبول کرو۔ (رواہ مسلم صفحہ ۲۴۱: ج۱)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ کافروں کی طرف سے فتنے میں ڈالنے کی شرط جو الفاظ قرآن سے مفہوم ہو رہی ہے یہ شرط ابتداءً تھی بعد میں یہ شرط نہیں رہی اور نماز قصر مستقل ایک حکم بن گئی اور مسافت قصر کے سفر پر ہی قصر کا مدار رہ گیا، کسی قسم کا کوئی خوف اور کافروں کی فتنہ گری

نہ ہو تب بھی چار رکعت والی نماز قصر ہی پڑھی جائے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کا سفر فرمایا اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ تھا، آپ ﷺ دو، دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے۔ (مجمع الزوائد صفحہ ۱۵۶: ج ۲)

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ لوگ خوب زیادہ امن وامان میں تھے (رواہ مسلم صفحہ ۲۴۳: ج ۱) دوسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ نے بصیغہ امر ارشاد فرمایا فَاقْبَلُوا صَدَقَتَه کہ اللہ کے صدقے کو قبول کرو، اسی لیے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قصر کرنا واجب ہے، مسافر پوری نماز پڑھ لے گا تو اچھا نہ کرے گا اور چونکہ اس پر دو رکعتیں فرض ہیں اسی لیے دو رکعتوں پر ہی اس کا قعدہ اخیرہ ہے اگر دوسری رکعت پر بیٹھے بغیر کھڑا ہو گیا اور اس طرح چار رکعتیں پڑھ لیں تو دوبارہ نماز پڑھے کیونکہ ترک فرض ہو گیا اور ترک فرض ہو جائے تو سجدہ سہو سے بھی اس کی تلافی نہیں ہوتی اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں رہا ہوں آپ ﷺ نے دو رکعتوں سے زیادہ (چار رکعت والی فرض) نماز نہیں پڑھی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا ہوں انہوں نے سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ (فرض) نماز نہیں پڑھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا ہوں، انہوں نے بھی سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ (فرض) نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اٹھا لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا ہوں انہوں نے بھی سفر میں دو رکعت سے زیادہ (فرض) نماز نہیں پڑھی یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، البتہ تمہارے لیے اللہ کے رسول کی ذات شریفہ میں اسوہ حسنہ یعنی اچھی اقتداء ہے۔ (صحیح مسلم صفحہ ۲۴۲: ج ۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے آخری زمانہ خلافت میں چار رکعتیں پڑھنے لگے تھے (صحیح مسلم صفحہ ۲۴۳: ج ۱) اس پر لوگوں کو اشکال ہوا تو جواب میں کہا گیا کہ انہوں نے تاویل کر لی ہے، یہ تاویل خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مجمع الزوائد صفحہ ۱۵۶: ج ۲ میں مسند احمد سے نقل کیا ہے کہ عبد الرحمن بن ابی ذباب نے بتایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی تو لوگوں

نے اس کو اچھا نہیں جانا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کی طرف سے انکار دیکھا تو فرمایا کہ میں نے مکہ میں وطن بنالیا ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو کسی شہر میں وطن بنالے تو وہاں مقیم والی نماز پڑھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تاویل کرنا اور وطن بنانے کی نیت کرکے چار رکعت پڑھنا اور حاضرین کا پوری نماز پڑھنے پر تعجب کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسافر کو قصر ہی پڑھنا لازم ہے اگر سفر میں چار رکعت والی نماز پوری پڑھنا جائز ہوتا یا افضل ہوتا تو حاضرین کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پوری نماز پڑھنے پر تعجب نہ ہوتا (جبکہ یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین تھے) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی تاویل نہ کرنی پڑتی۔ (انوار البیان)

مسافت قصر: اہل ظاہر اس آیت کے ظاہری عموم سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ سفر کی کوئی مقدار یا حد معین نہیں ہر سفر میں قصر جائز ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت ہو یہاں تک کہ تین میل کے سفر میں بھی قصر جائز ہے کیونکہ آیت میں سفر کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی لیکن تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ تھوڑے سے سفر میں قصر نہیں اور سب نے الگ الگ سفر کی حد بیان کی ہے فقہاء حنفیہ کے نزدیک قصر صرف اس سفر میں ہے جو تین دن کا ہو جیسا کہ حدیث میں ہے کہ مسافر کے لیے مسح علی الخفین تین دن تک کے لیے جائز ہے اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

لطیفہ: ایک غیر مقلد صاحب اپنے کھیت پر جاتے تو نماز میں قصر کرتے کسی نے سوال کیا کہ بندہ خدا تم بدون مسافت قصر کے کیسے قصر کرتے ہو انہوں نے جواب دیا کہ قصر کے لیے کسی خاص مسافت کا ہونا شرط نہیں اس لیے کہ آیت میں ضربتم فی الارض آیا ہے جس کے معنی زمین میں چلنے کے ہیں اور یہ مفہوم کھیت پر جانے کی صورت میں بھی صادق آتا ہے ایک حنفی عالم نے اس کا خوب جواب دیا کہ پھر تم کو ہمیشہ ہی قصر کرنا چاہیے اس لیے کہ جب تم اپنے گھر سے مسجد جاتے ہو تو سیر فی الارض اس پر بھی صادق آجاتا ہے غیر مقلد صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ (ایضاً)

صلوٰۃ الخوف

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا {۱۰۲} النساء

جواب ترجمہ: اور جب آپ مسلمانوں کے درمیان موجود ہوں اور آپ ﷺ (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہوں تو ایک گروہ تمہارے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہو اور آپ اپنے ہتھیار پاس رکھیں، جب یہ گروہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز ادا نہیں کی، آگے آئے اور آپ کے ساتھ نماز ادا کرے۔ انہیں بھی چاہیے کہ وہ اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار اپنے ساتھ رکھیں، کافر تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ تم پر یکبارگی پل پڑیں، ہاں اگر بارش کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے ہتھیار پہننے میں تکلیف محسوس ہو تو انہیں اُتار دینے میں کوئی حرج نہیں، پھر بھی آپ اپنے بچاؤ کا پورا خیال رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے یقیناً رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر: اور اے نبی کریم ﷺ جب آپ ﷺ مسلمانوں کی فوج میں موجود ہوں، پھر ان کو نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں اور اندیشہ ہو کہ کافر نماز میں حملہ نہ کریں گے تو ایسی حالت میں یہ چاہیے کہ مسلمانوں کے دو گروہ ہو جائیں، ان میں سے ایک گروہ آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا گروہ نگرانی کی خاطر دشمن کے مقابل کھڑا ہو جائے تاکہ دشمن کو دیکھتے رہیں اور جو لوگ آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں کھڑے ہیں وہ بھی نماز میں اپنے ہتھیار ساتھ لیے رہیں شاید کسی وقت ضرورت پڑ جائے، پھر جب یہ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کر چکیں یعنی ایک رکعت پوری

آپ ﷺ کے ساتھ پڑھ چکیں تو پیچھے ہٹ جائیں یعنی دشمن کے مقابلہ پر چلے جائیں اور دوسرا طائفہ (گروہ) آجائے جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی یعنی پہلا طائفہ (گروہ) جس نے آپ ﷺ کے ساتھ ایک رکعت پڑھی ہے وہ تو دشمن کے مقابلہ میں چلا جائے اور دوسرا طائفہ جو اب تک دشمن کے مقابلہ میں تھا وہ آجائے پھر وہ آکر آپ ﷺ کے ساتھ باقی ماندہ نماز میں شریک ہو جائیں اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھیں اور اپنی احتیاط اور بچاؤ کو مضبوط پکڑے رہیں اور اپنے ہتھیار بھی لیے رہیں کافروں کی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور سامان حرب سے غافل ہو تو یکبار گی تم پر حملہ کر دیں اور تم پر ٹوٹ پڑیں اور پس احتیاط اور ہوشیاری کا مقتضا یہ ہے کہ ہتھیار ساتھ لیے رہو۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

اس آیت میں دونوں گروہوں کے ایک ایک رکعت پڑھنے کا ذکر فرمایا بقیہ نماز کا حکم بیان نہیں کیا کہ وہ کس طرح ادا کریں اس کا طریقہ احادیث میں یہ آیا ہے کہ دوسرا گروہ امام کے سلام پھیر دینے کے بعد دشمن کے مقابلہ میں چلا جائے اور ہر گروہ بطور خود اپنی باقی نماز پوری کر لے اور یہ حکم اس وقت کے لیے ہے جب جماعت ممکن ہو اور اگر جماعت ممکن نہ ہو تو پھر ہر شخص تنہا یا جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لے، نیز یہ حکم جب ہے کہ جب سب ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں ورنہ دو جماعتیں کر لی جائیں ایک گروہ کو ایک امام نماز پڑھا دے اور دوسرے گروہ کو دوسرا امام جیسا کہ درّ مختار میں ہے اور عجب نہیں کہ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ سے اشارہ اسی طرف ہو کہ جب آپ ﷺ جیسا امام ہو اور سب اس کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں تو پھر مسلمانوں کی فوج کے دو حصے کر دیے جائیں اور امام ہر ایک حصہ کو ایک ایک رکعت نماز پڑھاوے اس طرح ہر گروہ کی آدھی آدھی نماز اس محبوب امام کے پیچھے ہو جائے اور باقی آدھی نماز دونوں گروہ جدا جدا پڑھ لیں۔ (معارف القرآن)

ہر حال میں ذکر اللہ، فرضیت نماز وقت مقررہ پر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا {۱۰۳} النساء

جواب ترجمہ: پھر جب تم نماز پوری کر چکو تو اللہ کو (ہر حالت میں) یاد کرتے رہو، کھڑے بھی بیٹھے بھی، اور لیٹے ہوئے بھی۔ پھر جب تمہیں (دشمن کی طرف سے) اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز قاعدے کے مطابق پڑھو۔ بیشک نماز مسلمانوں کے ذمے ایک ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ: اے ایمان والو! جب تم نے نمازِ خوف اس طریقے سے ادا کر لی جس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بیان فرمایا ہے اور اس سے فارغ ہو گئے، تو پھر اللہ کو یاد کرو، چاہے کھڑے ہو کر، یا بیٹھے ہوئے، یا اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے، یعنی ہر حال میں اللہ کے ذکر کو کثرت سے کرو، خواہ میدانِ جنگ میں کھڑے ہو، یا آرام کے وقت بیٹھے ہو، یا لیٹے ہوئے ہو، کیونکہ اللہ کا ذکر وہ دائمی عبادت ہے جس سے دل صاف ہوتے ہیں، سینے کھلتے ہیں اور قلوب کو سکون ملتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ**، وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان حالات (خوف اور دشمن کے مقابلے) میں خاص طور پر ذکر کی تاکید فرمائی ہے، حالانکہ عام حالات میں بھی ذکر مطلوب ہے، کیونکہ ایسے مواقع پر بندہ اللہ کی مدد، تائید اور نصرت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے اور ان حالات میں دعا اور تضرع زیادہ قبولیت کے لائق ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ** اے ایمان والو! جب تم دشمن کی جماعت سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ: پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔ یعنی جب خوف کی حالت ختم ہو جائے اور جنگ اپنے اختتام کو پہنچ جائے، تو نماز کو اس کے اصل طریقے پر ادا کرو، جیسا کہ جنگ سے پہلے ادا کی جاتی تھی، یعنی اس کے تمام ارکان، شرائط، آداب اور خشوع کے ساتھ۔

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا: بے شک نماز مؤمنوں پر وقت مقررہ پر فرض

کی گئی ہے، یہ فرمان الٰہی اس بات پر تاکید ہے کہ نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے، یہاں کِتَابًا سے مراد مکتوب ہے یعنی فرض کیا ہوا، اور موقوت کے معنی ہیں وقت باندھا ہوا، وقت مقرر کیا ہوا۔

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے کہ نماز مؤمنوں پر وقت مقررہ پر فرض کی گئی ہے، یعنی ہر نماز کے لیے ایک خاص وقت مقرر کیا گیا ہے جس میں اس کو ادا کرنا لازم ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز کی فرضیت اور وقت کی پابندی کی تاکید ان الفاظ کے ذریعے فرمائی، إِنَّ جو تاکید کے لیے ہے، كَانَ جو دوام اور تسلسل کے لیے ہے، کتاباً فرضیت کو مصدر کے طور پر ذکر کرنا، جس سے تاکید اور بڑھ جاتی ہے، عَلَى الْمُؤْمِنِينَ، جو وجوب اور لازمی ہونے کو ظاہر کرتا ہے، یہ سب کچھ اس لیے بیان کیا گیا تاکہ اہل ایمان نماز کو پوری پابندی اور حفاظت کے ساتھ ادا کریں، ایسا نہ ہو کہ کوئی چیز انہیں نماز سے غافل کر دے یا اس کے ادا کرنے میں رکاوٹ بنے۔

حضرات ارباب تفسیر کی آراء اس آیت کے آخری حصہ کے ذیل میں کیا ہیں، اس کا خلاصہ عرض خدمت ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب ہے، یقیناً نماز مومنوں پر وقت باندھ کر فرض کی گئی ہے، یعنی ہر نماز اپنے وقت پر ہی ادا کرنا واجب ہے، اس کو بلا وجہ آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا، اس آیت میں نماز کی فرضیت اور اس کے اوقات کی پابندی دونوں پر زور دیا گیا ہے۔ (ابن کثیر)

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، كِتَابًا مَّوْقُوتًا سے مراد ہے فرض اور لازمی عمل، جو خاص خاص اوقات میں مقرر کیا گیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نماز کے لئے اوقات متعین ہیں اور بغیر عذر اس کو وقت کے اندر پڑھنا ضروری ہے۔ (جامع لاحکام القرآن)

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نماز کو وقت باندھ کر فرض کیا، جیسے سورج کے ڈھلنے، غروب ہونے اور فجر کے طلوع ہونے پر اور یہ اوقات اللہ نے بندوں پر لازم کیے تاکہ وہ اپنی عبادت کا نظام وقت کے ساتھ باندھیں۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مَوْقُوتًا کے معنٰی ہیں مقرر کیا ہوا وقت، اس میں یہ اشارہ ہے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جسے بغیر وقت کے ادا نہیں کیا جا سکتا، نماز کا تعلق خاص وقت کے ساتھ ہے، جیسے روزہ کا تعلق رمضان کے ساتھ ہے۔ (روح المعانی)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، آیت کا مقصد یہ ہے کہ نماز صرف ایک رسمی یا اخلاقی عمل نہیں بلکہ وقت کے ساتھ بندھی ہوئی ایک لازمی عبادت ہے، اس کا وقت گزر جائے تو نماز قضا ہو جاتی ہے، لیکن اصل مطلوب یہی ہے کہ نماز اپنے وقت پر پڑھی جائے۔ (مظہری)

تعاقب دشمن میں سستی نہ دکھانے کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۱۰۴} النساء

جواب ترجمہ: اور دشمنوں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، اگر تم کو تکلیف ہوتی ہے تو ان کو بھی تکلیف ہوتی ہے جیسا کہ تمہیں تکلیف ہوتی ہے اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ امیدیں نہیں رکھتے اور اللہ علیم ہے حکیم ہے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ: اور دشمن قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، یہ مومنوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ صبر و استقامت کے ساتھ قتال جاری رکھنے کی ترغیب ہے، تَهِنُوا، وَهْنٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کمزوری اور ڈھیلا پن اور اَلِابْتِغَاءُ، باب افتعال کی مصدر ہے، جس کے معنی ہیں طلب کرنا، یعنی اے مومنو! دشمن کے تعاقب اور اس کے طلب میں کمزور نہ پڑو اور جو تکالیف تمہیں پہنچی ہیں وہ تمہیں ان کا پیچھا کرنے سے نہ روکیں، یہاں تک کہ اللہ تمہیں ان پر مکمل غلبہ عطا فرمادے۔

إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے نہایت مضبوط اور عقلی انداز میں ان کو دشمنوں کے پیچھے لگے رہنے پر ابھارا، فرمایا، اگر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو انہیں بھی وہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے تمہیں پہنچتی ہے اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے، اللہ فرما رہے ہیں کہ اے مومنو! اپنے دشمنوں کا پیچھا کرنے اور ان سے لڑنے میں ہرگز سستی نہ کرو، چاہے تمہیں زخم لگے ہوں یا تم تکالیف جھیل رہے ہو، کیونکہ جو درد اور زخم تمہیں پہنچے ہیں، انہی جیسی یا اس سے بھی زیادہ تکالیف ان کو بھی پہنچی ہیں، جو تکالیف تم محسوس کرتے ہو وہی وہ بھی محسوس کرتے ہیں، لیکن

فرق یہ ہے کہ تم اپنی جنگ میں اللہ کی رضا، اس کے کلمے کی سربلندی، اس کے ثواب اور اس کے دین کے غلبے کی امید رکھتے ہو، جبکہ وہ تم سے لڑتے ہیں مگر ان کی جنگ کی کوئی ایسی امید نہیں، وہ تو صرف اپنی خواہشات کی تکمیل، اپنے شیطانوں کو خوش کرنے اور باطل کو غالب کرنے کے لیے لڑتے ہیں، ان دونوں باتوں میں نمایاں فرق ہے وہ اس طرح کہ ان میں ایک وہ فریق ہے جو حق کی نصرت کے لیے لڑتا ہے اور ایک وہ ہے جو باطل کی فتح کے لیے برسرپیکار ہے، اس لیے اے اہل ایمان! جب معاملہ ایسا ہے تو تم اللہ اور اپنے دشمنوں کے خلاف لڑائی کے لیے ڈٹ جاؤ اور تکالیف تمہیں روک نہ سکیں، کیونکہ اللہ نے انجام تمہارے لیے ہی رکھا ہے اور نصرت تمہارے ساتھ ہے۔

سورۃ آل عمران میں بھی اسی طرح کا پیغام دیا گیا، ارشاد ہے: إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ، اگر تمہیں زخم لگا ہے تو ان کو بھی اسی طرح کا زخم لگا ہے اور یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْماً حَكِيْماً: اللہ تعالیٰ نے آیت کے آخر میں فرمایا اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے، یعنی اللہ تمہارے اور ان کے تمام حالات جانتا ہے اور جو کچھ وہ حکم دیتا ہے یا منع کرتا ہے، سب حکمت پر مبنی ہے، اس لیے اے مومنو! اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلو تاکہ اس کی نصرت اور خوشنودی حاصل کرو۔

مفسرین نے اس آیت کے نزول کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ یہ جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مشرکین کے پیچھے نکلیں، حالانکہ مسلمانوں کو سخت زخم آئے ہوئے تھے اور آپ ﷺ نے یہ شرط لگائی تھی کہ اس موقع پر وہی لوگ شریک ہوں جو غزوۂ احد میں شامل ہوئے تھے، لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سببِ نزول کے خاص ہونے کا، لہٰذا یہ آیت ہر زمانے اور ہر جگہ کے مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ اللہ کے فرائض کی حفاظت کریں، ہر حال میں اس کا ذکر کریں اور اپنے دشمنوں سے لڑتے وقت تکالیف کو رکاوٹ نہ بننے دیں، کیونکہ اللہ نے مومنوں کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرائض کی

حفاظت، دشمنوں کے مقابلے کے لیے ہوشیار رہنے، ان کی چالوں کو ناکام بنانے اور ان سے قتال میں ثابت قدم رہنے کا حکم دیا، تو اس کے بعد اپنے نبی ﷺ کے ذریعے سب مومنین کو یہ ہدایت دی کہ وہ ہر حال میں حق کے پابند رہیں، کیونکہ جب امت حق اور عدل کو چھوڑ دیتی ہے تو اس کی کمزوری اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔

حق فیصلہ کرنے کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز شان نزول بیان کیجیے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا {۱۰۵} وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۱۰۶} النساء

جواب ترجمہ۔ بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ دیں جو اللہ نے آپ کو سمجھایا۔ اور نہ ہو جایئے خیانت کرنے والوں کے طرف دار۔ اور اللہ سے بخشش طلب کیجیے بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔

شان نزول: ایک انصاری جس کا نام طعمہ بن ابیرق تھا، یہ بنو ظفر بن حارث قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، اس نے اپنے پڑوسی قتادہ بن نعمان کی زرہ چوری کرلی، وہ زرہ چمڑے کے تھیلے میں تھی، جس میں آٹا تھا، آٹا اس تھیلے کی پھٹن سے بکھرتا رہا، یہاں تک کہ جب یہ گھر پہنچا تو وہاں بھی آٹے کے ذرّات تھے پھر طعمہ نے وہ زرہ ایک یہودی کے ہاں چھپادی، جس کا نام زید بن سمین تھا، وہ زرہ طعمہ کے ہاں تلاش کی گئی تو نہ ملی اور اس نے قسم بھی اٹھالی کہ نہ تو میں نے زرہ اٹھائی ہے اور نہ ہی مجھے اس کا علم ہے، زرہ والوں نے کہا یہ رات کے آخری حصہ میں ہمارے پاس آیا اور زرہ چوری کرلی اور ہم نے اس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ یہ اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور ہم نے آٹے کے نشانات بھی دیکھے، جب اس نے قسم کھالی تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور آٹے کے نشانات دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلے، تو آخر کار یہودی کے گھر پہنچ گئے اور اسے پکڑ لیا، اس نے کہا یہ زرہ میرے پاس طعمہ بن ابیرق نے رکھوائی ہے اور اس پر یہود کے کچھ افراد نے گواہی بھی دی، بنو ظفر جو طعمہ کی قوم تھی نے کہا ہمارے ساتھ رسول

اللہ ﷺ کے پاس چل کر اس بارے میں گفتگو کرو، انہوں نے آپ ﷺ سے اپنے ساتھی کی طرف سے جھگڑا کیا اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ ﷺ ایسا نہ کریں تو ہمارا ساتھی ہلاک ہو جائے گا اور رسوا ہو گا اور یہ یہودی بری ہو گا آپ ﷺ نے ایسا ہی کرنا مناسب سمجھا اور آپ کی خواہش ان بنو ظفر والوں کے حق میں اور یہودی کو سزا دینے کی تھی بالآخر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ، یہی مفسرین کرام کی ایک جماعت کا قول ہے۔ (نیسابوری، ۱۵۱، سیوطی ۹۰، زاد المیسر ۳/ ۱۹۰، قرطبی ۵/ ۳۷۵، ابن کثیر ۱/ ۵۵۱)

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ: یہ آیات کریمہ اگرچہ ایک خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ان کی ہدایات اور احکام ہر زمانے اور ہر مقام کے تمام مکلفین کو شامل ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے محمد ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کی طرف قرآن کریم حق اور عدل کے ساتھ نازل کیا ہے۔

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ: تاکہ آپ لوگوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ کریں جن میں وہ جھگڑتے ہیں، اس علم و ہدایت کے مطابق جو اللہ نے آپ ﷺ کو سکھایا اور وحی کے ذریعے بتایا ہے، لفظ بِالْحَقِّ حال کے طور پر آیا ہے اور اس کا تعلق ایک محذوف سے ہے، مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ ملا کر نازل کیا ہے، بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ کا مطلب ہے جس علم اور بصیرت سے اللہ نے آپ ﷺ کو آگاہ کیا، اسے رُؤیَت یعنی دیکھنے سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یقینی اور شک سے پاک علم اتنا واضح اور روشن ہوتا ہے جیسے دیکھنے کی چیز۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصول کے بعض علماء نے اس آیت سے یہ دلیل لی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اجتہاد کے ذریعے بھی فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا، اس پر وہ صحیحین کی اس روایت کو بھی دلیل بناتے ہیں جسے ام المؤمنین اُم سلمہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حجرے کے دروازے پر جھگڑنے والوں کی آواز سنی تو باہر تشریف لائے اور فرمایا: إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَإِنَّهُ يَأْتِينِي الْخَصْمُ، فَلَعَلَّ بَعْضَهُمْ أَنْ يَكُونَ أَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ، فَأَحْسِبُ أَنَّهُ صَادِقٌ، فَأَقْضِي لَهُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ مُسْلِمٍ، فَإِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِنَ النَّارِ، فَلْيَحْمِلْهَا أَوْ يَذَرْهَا، میں بھی ایک انسان ہوں اور میرے پاس فریق مقدمہ آتے ہیں، تو ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی اپنی بات دوسرے

سے زیادہ خوبصورتی اور مؤثریت کے ساتھ بیان کرے اور میں یہ سمجھ کر کہ وہ سچا ہے، اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ تو (یاد رکھو!) جس کے حق میں میں نے کسی مسلمان کے حق میں (ناحق طور پر) فیصلہ کر دیا، تو وہ دراصل آگ کا ایک ٹکڑا ہے، اب چاہے وہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔ یہ حدیث عدل وانصاف کی گہری تعلیم دیتی ہے اور اس میں سخت تنبیہ ہے کہ جھوٹے دلائل اور چالاکی سے حق دار کا حق چھیننے والا دراصل جہنم کا ایندھن بن رہا ہے۔

امام بخاری نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ دو انصاری آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے ترکے کے جھگڑے میں حاضر ہوئے جس کے دلائل مٹ چکے تھے اور ان کے پاس کوئی گواہی نہ تھی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَلْحَنُ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا، بِقَوْلِهِ: فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ فَلَا يَأْخُذْهَا تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو اور ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل دوسرے سے زیادہ مؤثر اور فصیح طریقے سے پیش کرے، تو میں اس کی بات سن کر اس کے بھائی کے حق میں کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہوں، حالانکہ وہ دراصل اس کے بھائی کا حق ہوتا ہے، تو جس کے لیے میں نے اس کے بھائی کے حق میں سے کوئی چیز فیصلہ کے ذریعے دے دی، تو وہ دراصل آگ کا ایک ٹکڑا ہے، لہٰذا وہ اسے نہ لے۔

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ نے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر کے حوالے سے اس روایت کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے یہ الفاظ بھی مسند احمد کے حوالے سے نقل فرمائے ہیں جن میں یہ ہے کہ یہ سن کر دونوں آدمی رونے لگے اور ہر ایک نے کہا: میرا حق میرے بھائی کو دے دیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَمَّا إِذَا قُلْتُمَا ذٰلِكَ فَاذْهَبَا فَاقْتَسِمَا، ثُمَّ تَوَخَّيَا الْحَقَّ بَيْنَكُمَا ثُمَّ اسْتَهِمَا، ثُمَّ لِيُحَلِّلْ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْكُمَا صَاحِبَهُ، جب تم نے یہ بات کہہ دی ہے تو جاؤ، اپنے درمیان تقسیم کر لو، پھر انصاف کا خیال رکھنا اور آپس میں قرعہ ڈال لو اور ہر ایک دوسرے کو حلال کر دے۔ (الوسیط، ابن کثیر)

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا: اور (اے میرے حبیب ﷺ! آپ ﷺ خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ بنیں، یہ جملہ دراصل اس حکم پر معطوف ہے جو پہلے بیان ہوا کہ ہم نے آپ ﷺ پر یہ

کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ آپ ﷺ اس کے مطابق فیصلہ کریں، یعنی آپ کو کتاب اللہ کے مطابق عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے، لہٰذا کسی خیانت کرنے والے کی طرفداری میں اپنی رائے یا جھکاؤ ظاہر نہ کریں۔

خَصِيْمٌ کا مطلب ہے ایسا شخص جو دوسرے کی حمایت میں جھگڑا کرے اور اس کا مدافع بنے، یہاں مراد یہ ہے کہ آپ خائنوں کی طرف سے سچے اور بے گناہ لوگوں کے مقابلے میں وکیل یا وکیلِ صفائی نہ بنیں، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خَائِن فرمایا، کیونکہ وہ حقیقت میں ایسے ہی تھے اور اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو ان کی حقیقت سے آگاہ فرمادیا تاکہ آپ ان سے خبردار رہیں اور ان پر حسنِ ظن نہ کریں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں علما کا کہنا ہے کہ جب کسی قوم کا نفاق ظاہر ہو جائے تو مسلمانوں میں سے کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ان کی حمایت یا وکالت کرے، یہی واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں پیش آیا اور اسی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں، وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا اور وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اور ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کرو جو اپنی ہی جانوں سے خیانت کرتے ہیں، یہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن دراصل مراد امت کے وہ لوگ ہیں جو خائنوں کی طرفداری کرتے تھے، اس کی دو وجہیں ہیں، آگے اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا: هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی یہ تم لوگ ہو جو دنیا کی زندگی میں ان کی طرف سے جھگڑتے ہو، نبی کریم ﷺ ان کے درمیان حاکم تھے، اس لیے وہ لوگ آپ کے سامنے عذر پیش کرتے تھے، نہ کہ آپ کو کسی کے سامنے عذر پیش کرنے کی ضرورت تھی، اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں خطاب دوسروں کو سمجھانے کے لیے ہے۔

وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے، یعنی اس بات پر اللہ سے مغفرت مانگو کہ تم نے طُعمہ کو بے قصور قرار دینے اور یہودی کو مجرم ٹھہرانے کا قصد فرمایا تھا، کیونکہ ظاہر حال ایسا ہی دکھا رہا تھا، حالانکہ یہ گناہ نہ تھا، مگر چونکہ آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر بھی استغفار کا حکم دیا،

جیسا کہ علماء نے کہا ہے، حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِينَ، نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک کوتاہی شمار ہوتی ہیں۔

یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان خائن لوگوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں تاکہ آپ کی برکت سے وہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کریں، بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو بہت بخشنے والا اور ایمان و تقویٰ والوں پر نہایت رحم فرمانے والا ہے اور یہ استغفار اور اللہ کی طرف رجوع کا حکم دراصل ہر مکلف بندے کو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے واسطے سے دیا گیا ہے۔

خیانت کاروں کی وکالت ممنوع

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا {۱۰۷} يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا {۱۰۸} هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا {۱۰۹} النساء

جواب ترجمہ: اور کسی تنازعے میں ان لوگوں کی وکالت نہ کیجیے جو خود اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں۔ اللہ کسی بھی خیانت کرنے والے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔ یہ لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے ان کو شرم نہیں آتی حالانکہ وہ اس وقت بھی ان کے ساتھ ہے جب وہ رات کو ایسی بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اسے پسند نہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ سب اللہ کے قابو میں ہے۔ ہاں تم لوگوں نے دنیا میں ان کی طرف سے حجت کر بھی لی قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی طرف سے حجت کرے گا یا کون ان کا کام بنانے والا ہو گا۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَهُمْ: اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت نہ کیجیے جو اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے یہاں فرمایا کہ آپ ان لوگوں کی طرف داری اور وکالت نہ کریں جو اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے ہیں، یہ ایسے خیانت کار لوگ

ہیں جو کہیں بھول چوک یا غلطی سے خیانت کاری نہیں کرتے بلکہ وہ بار بار اور ضد کے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جس کے اخلاق وصفات میں خیانت رچ بس گئی ہو اور جس کے معمولات میں گناہوں اور معاصی میں ڈوبے رہنا شامل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ یَخْتَانُون استعمال فرمایا جو خیانت کرنے کے معنی میں ہے، مگر اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے، کیونکہ بابِ افتعال کے صیغے میں تکلف اور بار بار کوشش کا مفہوم شامل ہوتا ہے، اور ان کی غیر کے ساتھ خیانت کو ان کی اپنی جانوں کے ساتھ خیانت قرار دیا گیا ہے، اس لیے کہ اس خیانت کا برا انجام انہی پر پلٹ کر آنا ہے، نیز اس لیے بھی کہ مسلمان سب ایک جسم کی مانند ہیں، پس جو شخص یہ ظاہر کرے کہ وہ مسلمانوں میں سے ہے اور پھر ان ہی میں کسی کے ساتھ خیانت کرے، تو گویا اس نے اپنی ہی جان کے ساتھ خیانت کی اور اپنی جان کو ہلاکت اور بربادی کی طرف دھکیل دیا، کیونکہ اس نے اسلامی جماعت کے حقوق پر حملہ کیا اور اس کے امن وسکون کو متزلزل کیا، آیت میں جن لوگوں کی طرف اشارہ ہے، اس سے مراد طعمہ بن ابیرق اور اس جیسے دیگر خائن لوگ ہیں، یا وہ اور اس کی قوم کے وہ لوگ جنہوں نے اس کی برأت کی جھوٹی گواہی دی۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا: بے شک اللہ اس کو پسند نہیں کرتا جو بہت زیادہ خیانت کرنے والا اور گناہگار ہو۔ یہ الفاظ مبالغہ کے صیغے ہیں، جن سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ان خائن اور گناہگار لوگوں میں خیانت اور گناہ مستقل صفت کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ یہاں مبالغے کا مقصد یہ نہیں کہ یہ خصوصیت صرف انہی کے لیے ہے اور یہ کہ جس میں تھوڑی سی خیانت یا گناہ ہے اللہ اس سے راضی ہے، نہیں، بلکہ اس اسلوبِ بیان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان میں یہ برائیاں عادت اور مستقل صفت کے طور پر پائی جاتی ہیں۔

سوال اگر سوال کیا جائے کہ خَوَّانًا أَثِيمًا (بہت خیانت کرنے والا اور بہت گناہ کرنے والا) مبالغے کے صیغوں میں کیوں کہا گیا؟

جواب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ طعمہ بن ابیرق خیانت اور گناہوں میں حد سے زیادہ بڑھا ہوا ہے،

اور جس کی انجام کار یہی حالت ہو، اس کے بارے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی آدمی کی ایک برائی پر مطلع ہو جاؤ تو جان لو کہ اس کے ساتھ اور برائیاں بھی ضرور ہوں گی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، اس کی ماں آئی اور رونے لگی اور کہنے لگی یہ اس کی پہلی چوری تھی اسے معاف فرما دیجیے، اس کی یہ بات سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس چور کی ماں سے کہا کہ كَذَبْتِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُؤَاخِذُ عَبْدَهُ فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ، تم جھوٹ کہتی ہو، بے شک اللہ اپنے بندے کو پہلی مرتبہ (خطا کرنے پر) مواخذہ نہیں فرماتا۔ (تفسیر کشاف، تفسیر الوسیط)

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ: وہ لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے شرم نہیں کرتے، جو ان کے برے اور قبیح حالات کو ظاہر کرتا ہے، جو انہیں اللہ کے غضب اور اس کے قہر کا مستحق بناتے ہیں۔ يَسْتَخْفُونَ "استخفاء" سے ہے جس کا معنیٰ ہے چھپ جانا، پردہ اختیار کرنا۔ عربی محاورے میں یوں کہا جاتا ہے اِسْتَخْفَيْتُ مِنْ فُلَانٍ میں فلاں سے چھپ گیا یعنی جو لوگ کوئی برا کام کرتے ہیں تو لوگوں سے حیاء کرتے ہیں اور چھپ کر وہ کام کرتے ہیں یا لوگوں کے ضرر کے خوف سے چھپ کر وہ کام کرتے ہیں اور یہ لوگ اللہ سے حیاء نہیں کرتے یعنی اللہ کے خوف سے اور اس کے عذاب کے ڈر سے اس برائی کو ترک نہیں کرتے، یہ لوگ جن کی فطرت میں خیانت اور گناہوں میں پڑنا شامل ہے، برائیوں کے ارتکاب کے وقت لوگوں سے شرماتے ہیں اور ان کے نقصان کے ڈر سے چھپتے ہیں، لیکن اللہ سے نہیں چھپتے، یعنی وہ اللہ کی نگرانی اور اس کے ہر حال پر مطلع ہونے کا احساس نہیں کرتے، بلکہ بے حیائی کے ساتھ گناہوں میں مشغول رہتے ہیں، حالانکہ اللہ ہی سب سے زیادہ لائق ہے کہ اس سے شرم کی جائے اور اس کے عذاب سے ڈرا جائے۔

وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ: اور وہ (اللہ) ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو ایسی باتیں سوچتے ہیں جو اسے پسند نہیں، یہ اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ اللہ کا علم ان کی ہر حرکت و سکون کو شامل ہے۔ یعنی یہ خائن لوگ اللہ سے حیا نہیں کرتے اور برے کام کرتے ہیں، حالانکہ اللہ ہر وقت ان کے ساتھ ہے، ان کے ہر قول و فعل کو جانتا ہے، ان پر کوئی چیز چھپی نہیں

رہتی، جب وہ رات کو تدبیریں کرتے ہیں یعنی چھپ کر منصوبے بناتے ہیں اور اپنے دلوں میں وہ باتیں ٹھہراتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں، مثلاً برائی کرکے اس کا الزام دوسروں پر ڈال دینا تاکہ خود بدنام نہ ہوں۔

صاحبِ کشاف نے فرمایا: یہ آیت انسانوں پر ایک بڑی تنبیہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے بے حیائی اور بے خوفی کی حالت میں ہیں، حالانکہ اگر وہ ایمان رکھتے ہیں تو انہیں یقین ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہیں جہاں کوئی پردہ، غفلت یا غیر موجودگی نہیں ہے، بلکہ وہاں کھلا انکشاف اور رسوائی ہے۔

لفظ یُبَیِّتُونَ کے معنٰی ہیں تدبیر کرنا اور منصوبہ بنانا اور اصل میں یہ لفظ رات کے وقت کی سازش کے لیے بولا جاتا ہے، مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ سے مراد ہے طُعمہ بن ابیرق کی وہ تدبیر کہ اس نے زرہ کسی اور کے گھر پھینکنے کا منصوبہ بنایا۔

سوال اگر یہ سوال کیا جائے کہ "تدبیر" تو دل کا عمل ہے، اسے "قول" (بات) کیوں کہا گیا؟ تو **جواب** یہ ہے کہ چونکہ اس نے اپنے دل میں اس بات کو کہا اور سوچا، اس لیے اسے مجازاً "قول" کہا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ "قول" سے مراد وہ جھوٹی قسم ہو جو طُعمہ بن ابیرق نے منصوبہ بنا کر یہودی پر الزام لگانے کے لیے کھائی۔ (کشاف، الوسیط)

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا: اور اللہ ان کے اعمال کو گھیرے ہوئے ہے، یہ ایک جامع اور انجام سے ڈرانے والا کلام ہے، یعنی اللہ ان خائنوں اور دوسروں کے تمام اعمال پر پوری طرح محیط ہے، ان کا کوئی کام اس سے چھپا نہیں اور وہ قیامت کے دن ان سب کا حساب لے گا۔ مُحِیْطٌ کا مادہ "حوط" ہے، جس کے معنی ہیں چاروں طرف سے گھیر لینا۔ إِحَاطَةٌ میں علم، قدرت اور تصرف تینوں پہلو شامل ہیں، یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ اگر لوگوں سے اپنے جرم چھپا بھی لیں تو اللہ سے نہیں چھپا سکتے، کیونکہ اللہ ان کے ظاہر و باطن، نیت و عمل سب پر محیط ہے، اللہ ان کے جرم کو جانتا بھی ہے، قابو میں بھی رکھتا ہے اور اس کے مطابق سزا دینے پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے۔

یہاں سے علمِ الٰہی کی ہمہ گیری ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا عمل، دن یا رات میں ہو، پوشیدہ یا علانیہ ہو، سب اللہ کے علم میں ہے، یہاں قدرتِ الٰہی کی کامل محیطیّت (گھیراؤ) کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ کوئی شخص اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا، یہاں عدالتِ الٰہی کا اطمینان مل رہا ہے جس میں اہلِ ایمان

کو تسلی دی گئی کہ اگر بظاہر دنیا میں جھوٹے لوگ بچ نکلیں، تو آخرت میں اللہ کے سامنے ان کا کوئی فریب نہ چل سکے گا۔

هَاأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا: پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سختی کے ساتھ ملامت فرمائی جو خائنوں کی طرف داری کرتے اور ان کی باطل طور پر حمایت میں جھگڑتے تھے، ارشاد ہوا یہ تم ہی ہو جو دنیا کی زندگی میں ان (خائنوں) کے لیے جھگڑ گئے، تو قیامت کے دن اللہ کے مقابلے میں ان کے لیے کون جھگڑ سکتا ہے؟ یا ان کا وکیل بن کر ان کے معاملات سنبھال سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ خبر دار فرما رہے ہیں کہ اے وہ لوگو! جو طُعمہ اور اس جیسے خائنوں کا دفاع کرتے ہو، تم نے تو دنیا میں ان کی طرف سے باطل دلیلیں پیش کر کے انہیں بے گناہ ظاہر کرنے کی کوشش کی، لیکن قیامت کے دن کون ہے جو اللہ کے سامنے ان کا دفاع کرے گا؟ اور کون ہے جو اس دن ان کا کارساز اور وکیل بنے گا؟ یقیناً وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا، ہر شخص کو اپنے ہی عمل کا بدلہ ملے گا، نہ کسی کا جھگڑنا کام آئے گا نہ کسی کی سفارش۔

لفظ هَا تنبیہ کے لیے آیا ہے تاکہ ان جھگڑنے والوں کو اپنی غلطی پر متوجہ کیا جائے، أَنْتُمْ مبتدا ہے اور هٰؤُلَاءِ منادیٰ ہے جس کا حرف نداء محذوف ہے اور جملہ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ خبر واقع ہوا ہے، بعض اہلِ نحو نے هٰؤُلَاءِ کو خبرِ اول اور جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ کو خبرِ ثانی قرار دیا ہے، جَدَلَ، اصل میں مَتْ الحَبل، رسی کو بل دینا، موڑ دینا، پیچ دینا، کے معنی میں آتا ہے، اسی سے إِحكَامُ الفَتلِ، کسی چیز کو مضبوطی سے بُن دینا یا گٹھ دینا، مراد لیا گیا، جِدال، لغت میں مخاصمہ، مناظرہ، جھگڑنا، بحث و مباحثہ کے لیے آتا ہے، چونکہ بحث و مناظرے میں ہر فریق دوسرے کی بات کو مروڑتا ہے، تو اسے جِدَالٌ کہا گیا۔

ابن فارسی لغوی کہتے ہیں (ج دل) کا اصل معنی شدت اور قوت ہے۔ جَدَلْتُ الحَبلَ یعنی میں نے رسی کو مضبوطی سے بٹا، اسی سے جِدال ہے، جو کہ نزاع اور مخالفت کے طریقے پر بحث کرنے کو کہتے ہیں۔ (مقاییس اللغہ)

ابن منظور لغوی کہتے ہیں جَدَل رسی کو سختی سے بٹنے کو کہتے ہیں اور جدال جھگڑا، مخالفت اور کلام میں تکرار ہے۔ (لسان العرب) صاحب تاج العروس کہتے ہیں جِدال گفتگو میں بحث کرنا ہے، اور وہ

بھی اس طرح کہ غالب آنے کی خواہش ہو، بعض نے اسے جدالۃ یعنی زمین کی سطح سے ماخوذ بتایا ہے، گویا ہر فریق اپنے حریف کو زمین پر گرانے والا پہلوان بن کر جھگڑتا ہے۔ (الوسیط)

گناہ گار توبہ کرلے، اللہ بخشنے والا ہے

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر بیان کریں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۱۱۰} النساء

جواب جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، مہربان پائے گا۔

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص کسی برے عمل کا ارتکاب کرے یا اللہ تعالیٰ کے احکامات کے خلاف کوئی کام کرے اور اس کی شریعت کی نافرمانی کرے پھر اس کے بعد وہ شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرتے ہوئے، اللہ کی مغفرت اور اس کی طرف سے اپنے گناہ کی پردہ پوشی کرنے کی امید رکھے تو وہ اللہ کو اپنے لیے بہت زیادہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔

سچی توبہ کبھی مسترد نہیں ہوتی: اللہ تعالیٰ اپنے کرم اور اپنی مہربانی کو بیان فرماتا ہے کہ گناہ سے جو کوئی توبہ کرے اللہ اس کی طرف مہربانی سے رجوع کرتا ہے، ہر وہ شخص جو رب کی طرف جھکے رب اپنی مہربانی سے اور اپنی وسعت رحمت سے اسے ڈھانپ لیتا ہے اور اس کے صغیرہ کبیرہ گناہ کو بخشش دیتا ہے، چاہے وہ گناہ آسمان و زمین اور پہاڑوں سے بھی بڑے ہوں، بنو اسرائیل میں جب کوئی گناہ کرتا تو اس کے دروازے پر قدرتی حروف میں کفارہ لکھا ہوا نظر آجاتا جو اسے ادا کرنا پڑتا اور انہیں یہ بھی حکم تھا کہ ان کے کپڑے پر اگر پیشاب لگ جائے تو اتنا کپڑا کتر واڈالیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں كَانَ بَنُو إِسْرَائِيلَ إِذَا أَصَابَ أَحَدُهُم ذَنْبًا أَصْبَحَ قَدْ كُتِبَ كَفَّارَةُ ذٰلِكَ الذَّنْبِ عَلٰى بَابِهِ، وَإِذَا أَصَابَ الْبَوْلُ شَيْئًا مِّنْهُ قَرَضَهُ بِالْمِقْرَاضِ، بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ جب ان میں سے کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو صبح کے وقت اس گناہ کا کفارہ اس کے دروازے پر لکھ دیا جاتا، اور جب ان کے جسم یا کپڑے کو پیشاب لگ جاتا تو وہ قینچی سے

اسے کاٹ ڈالتے، جب کہ اللہ نے اس امت پر آسانی کر دی، پانی سے دھو لینا ہی کپڑے کی پاکی رکھی اور توبہ کر لینا ہی گناہ کی معافی رکھی۔

ایک عورت نے حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ عورت نے بدکاری کی پھر جب بچہ پیدا ہوا تو اسے مار ڈالا آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کی سزا جہنم ہے وہ روتی ہوئی واپس چلی تو آپ نے اسے بلایا اور وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا {۱۱۰} النساء پڑھ کر سنائی تو اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور واپس لوٹ گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر وہ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کر کے اللہ سے استغفار کرے تو اللہ اس کے اس گناہ کو بخش دیتا ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (آل عمران:۱۳۵)
{اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا گناہوں کو کون بخش سکتا ہے! اور وہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے درآنحالیکہ وہ جانتے ہیں۔}

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ مجلس میں سے اٹھ کر اپنے کسی کام کے لئے کبھی جاتے اور واپس تشریف لانے کا ارادہ بھی ہوتا جوتی یا کپڑا کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے، ایک مرتبہ آپ اپنی جوتی چھوڑے ہوئے اُٹھے ڈولچی پانی کی ساتھ لے چلے، میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہو لیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دور جا کر بغیر حاجت پوری کئے واپس آئے اور فرمانے لگے۔ میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اور مجھے یہ پیغام دے گیا، پھر آپ نے
وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا {۱۱۰} النساء پڑھی اور فرمایا میں اپنے صحابہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے راستے سے ہی لوٹ آیا ہوں۔

اس سے پہلے چونکہ مَن يَعْمَلْ سُوٓءًا يُجْزَ بِهِۦ یعنی ہر برائی کرنے والے کو اس کی برائی کا بدلہ ملے گا اتر چکی تھی اس لئے صحابہ بہت پریشان تھے، میں نے کہا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کسی نے زنا کیا ہو؟

چوری کی ہو؟ پھر وہ استغفار کرے تو اسے بھی اللہ بخش دے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے دوبارہ پوچھا آپ نے کہا ہاں! میں نے سہ بارہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ہاں! گو ابو درداء کی ناک خاک آلود ہو، پس حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ جب یہ حدیث بیان کرتے اپنی ناک پر مار کر بتاتے، پھر فرمایا گناہ کرنے والا اپنا ہی برا کرتا ہے جیسے دوسری جگہ ہے کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، ایک دوسرے کو نفع نہ پہنچا سکے گا، ہر شخص اپنے کرتوت کا ذمہ دار ہے، کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہو گا، اللہ کا علم، اللہ کی حکمت اور الٰہی عدل و رحمت کے خلاف ہے کہ ایک گناہ کرے اور دوسرا پکڑا جائے۔ پھر فرماتا ہے جو خود برا کام کر کے کسی بے گناہ کے سر تھوپ دے جیسے بنو ابیرق نے لبید کا نام لے دیا۔

گناہ گار کے گناہ کا نقصان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۱۱۱} وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا {۱۱۲} وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا {۱۱۳} النساء

جواب ترجمہ: اور جو شخص کوئی گناہ کمائے، تو وہ اس کمائی سے خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، اور اللہ پورا علم بھی رکھتا ہے، حکمت کا بھی مالک ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو، پھر اس کا الزام کسی بے گناہ کے ذمے لگا دے، تو وہ بڑا بھاری بہتان اور کھلا گناہ اپنے اوپر لاد لیتا ہے۔ اور (اے میرے حبیب ﷺ) اگر اللہ کا فضل اور رحمت آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو سیدھی راہ سے بھٹکانے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔ اور (درحقیقت) یہ اپنے سوا کسی کو نہیں بھٹکا رہے ہیں، اور یہ آپ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور آپ کو ان باتوں کا علم دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا فضل ہمیشہ

بہت زیادہ رہا ہے۔

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ: برے اعمال کا وبال اور نقصان صرف اسی پر پڑتا ہے جو ان کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور "کسب" کے معنی ہیں انسان کا کسی ایسی چیز کی کوشش کرنا جس میں نفع حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کا گمان ہو، جیسے مال کمانا، کبھی یہ لفظ اس پر بھی بولا جاتا ہے کہ آدمی کسی چیز کو نفع سمجھ کر اختیار کرے مگر اس کے نتیجے میں نقصان پالے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ نیکی اور بدی دونوں پر بولا گیا ہے۔ نیکی کے بارے میں فرمایا، **أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا** (الانعام، آیت ۱۵۸) یا اس نے اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی کمائی ہو اور برائی کے بارے میں فرمایا: **إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ**، (الانعام، آیت ۱۲۰) یقیناً جو لوگ گناہ کماتے ہیں۔ اسی طرح یہاں ارشاد ہوا، **وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ**، یعنی جو کوئی بھی اللہ کی نافرمانی اور گناہوں کا ارتکاب کرے، اس کا نقصان اور بوجھ صرف اسی کی جان پر پڑے گا، لہٰذا عقل مند کے لیے لازم ہے کہ گناہوں سے بچا رہے تاکہ آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جائے، اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کے کیے کا بدلہ دیں گے، اچھائی کرنے والے کا بدلہ اچھا اور برائی کرنے والے کا بدلہ سزا کی صورت میں دے گا۔

وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا: یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ دلوں کے حال، بندوں کے اقوال و اعمال سب کچھ جانتا ہے، اور اپنے ہر حکم و فیصلے میں کامل حکمت والا ہے۔

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا: اور جو کوئی خطیئہ یا گناہ کمائے، پھر اسے کسی بے گناہ پر ڈال دے تو اس نے یقیناً بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے ذمہ لے لیا۔ یہاں **خَطِيئَةً** اور **إِثْمًا** دونوں ہم معنی ہیں اور مختلف الفاظ لانے کا مقصد صرف معنوی تاکید ہے، لیکن بہت سے علماء نے اس رائے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ کہا ہے کہ دونوں میں فرق ہے، ان کے نزدیک، خطیئہ سے مراد چھوٹا گناہ ہے اور اثم سے مراد بڑا گناہ ہے اور بعض نے کہا کہ فرق یہ ہے کہ خطیئہ کبھی عمداً اور کبھی سہواً بھی ہو سکتی ہے، جبکہ اِثم ہمیشہ عمداً ہی ہوتا ہے۔

ہمیں قرآن کے اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خطیئہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو آدمی عادت

اور لاپرواہی سے کرتا ہے، کیونکہ وہ کثرت سے برائیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور بے پروائی کے ساتھ ان کا ارتکاب کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ، ہاں! جس نے برائی کمائی اور اس کو اس کے گناہ نے گھیر لیا اور ایک اور جگہ فرمایا: مِمَّا خَطِيْٓـَٔاتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا، ان کی خطاؤں کی وجہ سے وہ غرق کر دیے گئے، پھر آگ میں داخل کر دیے گئے۔

یہاں اِثم سے مراد وہ گناہ ہیں جو آدمی ضد اور اصرار کے ساتھ کرتا ہے، اور جو اسے اللہ کی طرف رجوع، استغفار اور توبہ سے روک دیتے ہیں، کیونکہ امام راغب اصفہانی کے بقول: اِثم اس فعل کو کہا جاتا ہے جو ثواب میں رکاوٹ بنے اور بہتان کے بارے میں امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بَهَتَ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے حیرانی اور سخت تعجب، اس لیے کہ جب کسی پر جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے تو اسے سننے والا حیران رہ جاتا ہے اور بہتان یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی کو ایسی چیز سے متہم کریں جس سے وہ بالکل پاک ہو۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ؟ کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ تم اپنے بھائی کو ایسی چیز کے ساتھ یاد کرو جو اسے ناگوار ہو، پوچھا گیا، اگر میرے بھائی میں وہ بات ہو جو میں کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ، اگر وہ بات اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان باندھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ نص صریح ہے کہ کسی بے گناہ پر الزام لگانا بہتان ہے، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو کوئی ایسا گناہ کرے جو عادت اور لاپرواہی سے صادر ہو، یا ایسا گناہ کرے جو ضد اور اِصرار سے صادر ہو اور پھر اسے کسی بے گناہ کے سر تھوپ دے، حالانکہ وہی اس کا مرتکب ہے، تو اس نے اپنے اوپر جھوٹ کا بوجھ لاد لیا جو الزام لگائے گئے کو حیرانی و پریشانی میں ڈال دیتا ہے اور اس نے اپنے اوپر کھلا اور واضح گناہ بھی لاد لیا جو اللہ کے غضب کا باعث ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

"بِهٖ" کی ضمیر کے بارے میں تین اقوال نقل کیے گئے، یہ ضمیر اِثم کی طرف لوٹتی ہے، اور

چونکہ "أو" سے معطوف چیزوں پر ضمیر کبھی معطوف پر اور کبھی معطوف علیہ پر آجاتی ہے، اس لیے یہاں بھی دونوں احتمال ہیں، یہ ضمیر "کسب" کے مفہوم کی طرف ہے، یعنی گناہ کا کمانا، یہ ضمیر ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف ہے جو "أو" کے ذریعے ذکر ہوئے ہیں، گویا معنی یہ ہوا "پھر ان دونوں میں سے کسی ایک کو کسی پر تھوپ دے"۔ (تفسیر الجمل)

امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا، جان لو کہ بہتان تراش دنیا میں سب سے زیادہ مذموم ہے اور آخرت میں سب سے زیادہ سخت عذاب کا مستحق ہے، چنانچہ فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا دنیا میں سخت ملامت کی طرف اشارہ ہے اور وَإِثْمًا مُّبِينًا آخرت کے سخت عذاب کی طرف، یوں یہ تینوں آیات (جو اس سلسلے میں نازل ہوئیں) نے گناہگاروں کے درجات اللہ کے سامنے واضح کر دیے، ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھول دیا تاکہ وہ رجوع کر سکیں اور جو اپنے گناہوں پر ضد کرتے رہیں ان کے لیے برے انجام کی وعید سنائی۔ (تفسیر کبیر للرازی)

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُّضِلُّوْكَ: اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی ﷺ پر اپنے فضل و کرم کے مظاہر کو نمایاں فرمایا اور ارشاد کیا، اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ ضرور ارادہ کرتا کہ آپ کو بہکا دے، مطلب یہ کہ اے میرے حبیب ﷺ! اگر اللہ کا خاص فضل اور اس کی مہربانی آپ ﷺ کے شامل حال نہ ہوتی، جس کے تحت اس نے آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمائی، لوگوں کے فریب اور ان کی سازشوں سے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا اور ان کی برائیوں کو وحی کے ذریعے آپ ﷺ پر ظاہر کیا، تو ایک گروہ آپ ﷺ کو حق کے فیصلے سے روکنے کا ارادہ کرتا، لیکن اللہ نے انہیں اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

وَمَا يُضِلُّوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ: حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو بہکا نہیں سکتے اور وہ آپ کو کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ تو اپنے آپ ہی کو گمراہ کرتے ہیں، یعنی یہ لوگ اپنے دِلی اَمراض اور باطل کی حمایت کے سبب اپنی ہی عاقبت کو برباد کر رہے ہیں، آپ ﷺ کو ان کی سازشیں ذرّہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتیں، کیونکہ آپ ﷺ تو ظاہر کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور باطن کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔

وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ: اور اللہ نے آپ ﷺ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور آپ ﷺ کو وہ سکھایا جو آپ ﷺ نہیں جانتے تھے اور اللہ کا فضل آپ ﷺ پر بہت ہی عظیم ہے، یعنی قرآن کریم جو سیدھے راستے کی راہنمائی کرتا ہے اور حکمت یعنی ایسا نافع علم جو ہر معاملے میں حق کو واضح کرتا ہے، یہ سب اللہ نے آپ ﷺ کو عطا کیا، اسی طرح اللہ نے آپ ﷺ کو سابقہ امتوں کی خبریں، مخفی حقائق اور شریعت کے تمام احکام سکھائے۔

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا: اللہ کا فضل آپ ﷺ پر بے حد عظیم ہے، ایسا فضل جس کی کوئی حد نہیں اور جسے کوئی زبان بیان کرنے پر قادر نہیں۔

یہ آیات دراصل رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبہ کی عظمت کا اظہار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و رحمت کا بیان بھی، اور جب غور کیا جائے تو یہ آیات انسانیت کو ہر زمانے اور ہر مقام پر زندگی کی اصل کامیابی کی راہ دکھاتی ہیں، بشرطیکہ وہ ان کی ہدایت کو اختیار کریں، یہ آیات حکم دیتی ہیں کہ آدمی ہمیشہ حق کا ساتھ دے، چاہے وہ حق اپنے قریبی کے خلاف ہو یا اپنے دشمن کے حق میں اور خبردار کرتی ہیں کہ خائنوں اور باطل پرستوں کا دفاع کرنا اللہ کے ہاں کوئی فائدہ نہیں دیتا، یہاں تک کہ اگر وہ دشمنانِ اسلام یہود ہی کیوں نہ ہوں، جو ہر موقع پر دینِ اسلام کی دشمنی میں پیش پیش رہے اور باوجود حق کو پہچاننے کے، اسے جھٹلایا اور مخالفت میں ہر حربہ اختیار کیا، پھر بھی اگر حق ان کے ساتھ ہو تو اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا، کہ عدل و انصاف کی روشنی کسی تعصب یا دشمنی سے داغدار نہیں ہو سکتی۔ ذرا سوچئے! کیا آپ نے اس سے بڑھ کر کوئی عدل دیکھا جو اپنی بلندی، پاکیزگی اور استقامت میں بے مثال ہو؟ یقیناً یہ قرآن ہی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، کیونکہ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی کتاب ہوتی تو اس میں بے شمار تضادات پائے جاتے۔

خیر والی سرگوشیاں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا {۱۱۴} النساء

جواب ترجمہ: ان لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر کوئی بھلائی نہیں ہوتی ہاں مگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ کرنے یا کسی نیک کام کرنے یا لوگوں میں صلح کرانے میں کی جائے تو یہ بھلی بات ہے اور جو شخص یہ کام اللہ کی رضاجوئی کے لیے کرے تو ہم اسے بڑا ثواب دیں گے۔

اچھے کاموں کی دعوت اور برے کاموں سے روکنے کے علاوہ تمام باتیں قابل مواخذہ ہیں، لوگوں کے اکثر کلام بے معنیٰ ہوتے ہیں سوائے ان کے جن کی باتوں کا مقصد دوسروں کی بھلائی اور لوگوں میں میل ملاپ کرانا ہو۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی عیادت کے لئے لوگ جاتے ہیں ان میں سعید بن حسان مخزومی رحمہ اللہ بھی ہیں تو آپ فرماتے ہیں سعید تم نے ام صالح رضی اللہ عنہا کی روایت سے جو حدیث بیان کی تھی آج اسے پھر سناؤ، آپ رحمہ اللہ سند بیان کرکے فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَلَامُ ابْنِ آدَمَ كُلُّهُ عَلَيْهِ لَا لَهُ مَا خَلَا أَمْرًا بِمَعْرُوفٍ أَوْ نَهْيًا عَنْ مُنْكَرٍ أَوْ ذِكْرَ اللهِ، انسان کی تمام باتیں قابل مواخذہ ہیں سوائے اللہ کے ذکر اور اچھے کاموں کے بتانے اور برے کاموں سے روکنے کے، حضرت سفیان رحمہ اللہ نے کہا یہی مضمون اس آیت میں ہے، یہی مضمون آیت يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النبأ:۳۸) میں ہے یہی مضمون سورۃ والعصر میں بھی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ لوگوں کی آپس میں محبت بڑھانے اور صلح صفائی کے لئے جو بھی بات کہے اِدھر اُدھر سے کہے یا قسم اٹھائے وہ جھوٹوں میں داخل نہیں ہوگا۔

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے آپ کو اِدھر کی بات اُدھر کہنے کی تین صورتوں میں اجازت دیتے ہوئے سنا ہے فِي الْحَرْبِ، وَالْإِصْلَاحِ بَيْنَ النَّاسِ، وَحَدِيثِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ وَحَدِيثِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا، جہاد کی ترغیب میں، لوگوں میں صلح کرانے اور میاں بیوی کو ملانے کی

صورت میں۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الصَّلَاةِ ، وَالصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ؟ قَالُوا: بَلَى، قَالَ: إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ قَالَ: وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ (ابوداؤد، ترمذی) کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاؤں؟ جو روزہ نماز اور صدقہ سے بھی افضل ہے لوگوں نے خواہش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ آپس میں اصلاح کرانا ہے فرماتے ہیں اور آپس کا فساد نیکیوں کو ختم کر دیتا ہے۔

آقائے نامدار ﷺ نے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے فرمایا آ میں تجھے ایک تجارت بتاؤں تَسْعَى فِي صُلْحٍ بَيْنَ النَّاسِ إِذَا تَفَاسَدُوْا، وتُقَارِبُ بَيْنَهُمْ إِذَا تَبَاعَدُوْا (مسند البزار) لوگ جب لڑ جھگڑ رہے ہوں تو ان میں مصالحت کرا دے جب ایک دوسرے سے رنجیدہ ہوں تو انہیں ملا دے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَالِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ایسی بھلی باتیں رب کی رضامندی خلوص اور نیک نیتی سے جو کرے وہ اجر عظیم پائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ النساء

جواب ترجمہ: اور جو شخص اپنے سامنے ہدایت واضح ہونے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے، اور مؤمنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے، اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کر دیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے، اور اسے دوزخ میں جھونکیں گے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

شان نزول: علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی لکھتے ہیں "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما قتادہ اور ابن زید وغیرہ نے کہا ہے کہ جب قرآن مجید نے طعمہ بن ابیرق کی تکذیب کر دی اور اس کے ظلم کا بیان کیا، تو اسے اپنی جان کا خطرہ اور رسوائی کا خوف ہوا، پھر وہ بھاگ کر مکہ چلا گیا اور

مشرکین سے جا ملا، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ طعمہ مکہ پہنچ کر حجاج بن علاط سلمی کے ہاں ٹھہرا، اس نے طعمہ کو اچھی طرح ٹھہرایا، طعمہ کو یہ پتا چلا کہ حجاج کے گھر میں سونا ہے، اس نے رات کو اٹھ کر گھر کی دیوار میں سوراخ کیا، گھر والوں کو معلوم ہو گیا انہوں نے اس کو موقع پر پکڑ لیا، انہوں نے اس کو سنگسار کرنے کا ارادہ کیا لیکن حجاج کو حیاء آئی کیونکہ وہ اس کا مہمان تھا پھر گھر والوں نے اس کو چھوڑ دیا، وہ وہاں سے نکل کر بنو سلیم کے علاقہ میں چلا گیا اور وہاں ان کے بت کی پرستش کرنی شروع کر دی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بُرے انجام کو بیان فرمایا جو باطل کے راستے پر چلتے ہیں اور حق کے راستے کو چھوڑ دیتے ہیں، ارشاد فرمایا اور جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی ہو، اَلْمُشَاقَّة، رسول کی مخالفت سے مراد جان بوجھ کر کی جانے والی مخالفت ہے، یہ لفظ شَقّ (دو حصے یا جانبیں) سے ماخوذ ہے، کیونکہ مخالف گویا ایک الگ طرف یا پہلو اختیار کرتا ہے جو دوسرے کے پہلو کے مخالف ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان **مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى** ہدایت واضح ہو جانے کے بعد، دو احتمال رکھتا ہے، ایک یہ کہ مراد ہو، ہدایت ظاہر ہونے کے بعد، یعنی رسول پر ایمان لانے کے بعد، تو اس صورت میں یہ آیت مرتد (اسلام سے پھر جانے والے) کے لیے وعید (سخت دھمکی) ہو گی۔

اور اس موقع پر اس آیت کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ بشیر بن اُبَیرق، جو پچھلے واقعے کا مرکزی کردار تھا، جب اس کی حقیقت ظاہر ہو گئی تو وہ مرتد ہو گیا اور مکہ جا کر مشرکین سے جا ملا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ مراد یہ ہو، جب رسول کی سچائی معجزات کے ذریعے ظاہر ہو چکی، لیکن اس کے باوجود اُس نے ضد اور اسلام دشمنی کی بنا پر رسول کی مخالفت کی۔

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: اور وہ مؤمنوں کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے کی پیروی کرے، تو ہم اسے اُسی پر چھوڑ دیں گے جس کی طرف وہ خود مائل ہوا ہے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ جہنم بہت ہی بُری ٹھکانے کی جگہ

ہے، یہاں فرمایا کہ اور وہ مؤمنوں کے راستے کے سوا کسی اور راہ پر چلے، یہ يُشَاقِقِ پر معطوف ہے۔ یعنی وہ ایسا راستہ اختیار کرے جو ایمان والوں کا راستہ نہ ہو، حالانکہ وہی راستہ ہے جو اسلام کا ہے اور جس کی صحت و سلامتی پر سب مؤمن متفق ہیں۔

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ہم اسے اُسی پر چھوڑ دیں گے جس کی طرف وہ جھک گیا، یعنی ہم اسے اُسی گمراہی کا والی بنادیں گے جسے اس نے اختیار کیا، یا یوں کہیے کہ ہم اس کو اُسی راستے پر چلنے دیتے ہیں جسے اس نے خود پسند کیا ہے، خواہ وہ دنیا کا باطل ہو یا آخرت میں اس کا سہارا بننے والے جھوٹے معبود۔

علامہ رشید رضا مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس آیت میں اللہ کی سنت کا بیان ہے کہ انسان کو ارادہ و اختیار دیا گیا ہے، وہ جس سمت کا انتخاب کرے گا اللہ اسی پر اس کی مدد کرے گا اور اسے اُسی طرف متوجہ کر دے گا، اللہ اگر چاہتا تو سب کو فرشتوں کی طرح ایک ہی حالت پر پیدا کر سکتا تھا، مگر اُس نے انسان کو مختلف اِستعداد، فہم اور اختیار دیا تاکہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے، کبھی دنیا کے فائدے کے لیے اور کبھی آخرت کے نفع کے لیے۔ (تفسیر المنار)

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے، اصل لفظ "صلی" آگ جلانے اور اس میں جلنے کے لیے آتا ہے، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ حق کے بجائے باطل کے پیچھے جائیں گے وہ جہنم میں ایسے بھونے جائیں گے جیسے بکری کو آگ پر بھونا جاتا ہے، جہنم کتنا ہی برا ٹھکانا ہے اُن کے لیے جو وہاں پہنچیں گے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی آیت سے اجماع (امت کے متفقہ فیصلے) کے حجت ہونے پر استدلال فرمایا ہے اور یہ اِستنباط نہایت مضبوط اور عمدہ ہے، اگرچہ بعض نے اس پر اشکال کیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان آیاتِ کریمہ میں ایک طرف اُن لوگوں کو بشارت دی گئی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے اور دوسری طرف اُن لوگوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے جو اہلِ حق کے راستے کو چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کے لیے جہنم کا دردناک عذاب ہے، تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل کے بعد زندہ رہے اور

بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

صاحب انوار البیان اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں" اس آیت میں دو باتوں میں دوزخ کے داخلہ کے خبر دی گئی اول یہ کہ جو شخص ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے وہ دوزخ میں داخل ہو گا، وہ تمام لوگ جن کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا علم ہوا اور پھر اسلام قبول نہ کیا اور ہر وہ شخص جس نے اسلام قبول کر لیا اور پھر اسلام قبول کر کے اسلام سے پھر گیا وہ سب لوگ اس آیت کی وعید میں شامل ہیں، چوری کرنے والا وہ شخص جس کا واقعہ ان آیات کا سبب نزول بنا، مرتد ہو کر چلا گیا تھا اس لیے اس بات کو یہاں ذکر کیا گیا لیکن مفہوم اس کا عام ہے ہمیشہ جب کبھی بھی کوئی شخص اسلام قبول کرے پھر مرتد ہو جائے اس آیت کا مضمون اس پر صادق آئے گا یعنی وہ دوزخ میں جائے گا۔ (انوار البیان)

اجماع امت بھی حجت ہے: دوسری بات یہ بتائی کہ جو شخص مومنین کے راستہ کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کرے گا، وہ دوزخ میں داخل ہو گا، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح دین اسلام میں قرآن و حدیث حجت ہیں، اسی طرح اجماع امت بھی حجت ہے کیونکہ قرآن مجید کا مطلب اور عقائد و اعمال کی تفصیلات جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر ہر زمانے کے علماء صلحا اور مشائخ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں ان کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ہی ذریعہ نجات ہے، ان ہی کے ذریعہ قرآن مجید کی تفسیر ہم تک پہنچی جو رسول اللہ ﷺ نے بتائی آپ سے سمجھ کر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے تابعین کو بتائی پھر انہوں نے آگے اس کی روایت کی۔

عقائد بھی انہی حضرات کے ذریعہ ہم تک پہنچے اور فرائض و واجبات کا بھی انہی کے ذریعہ پتہ چلا اب جو کوئی شخص ان حضرات کو بیچ میں سے نکال کر خود اپنے پاس سے قرآن کی تفسیر کرے گا اور آیات کے معانی و مفاہیم اپنے پاس سے تجویز کرے گا، اور احکام اسلام کی اپنے طور پر تشریح کرے گا یا حجیت حدیث کا منکر ہو گا یا امت مسلمہ کے مسلمہ عقائد کا انکار کرے گا وہ کافر ہو گا، دوزخی ہو گا، جو لوگ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں یا جو لوگ پانچ نمازوں کے منکر ہیں یا جو لوگ رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہونے کے منکر ہیں یا جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل ہونے یا ان کی طبعی موت واقع

ہونے کے قائل ہیں یہ سب لوگ کافر ہیں اور دوزخی ہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر اب تک پوری اُمت کے جو عقائد ہیں یہ لوگ ان کے منکر ہیں اپنے تراشیدہ عقیدہ کے حامل ہیں، (اہل السنۃ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے نہ طبعی موت سے دنیا سے تشریف لے گئے وہ قیامت سے قبل دنیا میں تشریف لا کر امن وامان اور عدل وانصاف قائم کریں گے)۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک شخص نے کہا کہ اجماع کے حجت ہونے کی کیا دلیل ہے، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے تین دن تک روزانہ رات اور دن میں تین تین بار پورا قرآن مجید پڑھا ان کو یہ آیت مل گئی جس سے انہوں نے اجماع امت کے حجت ہونے پر استدلال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرور عالم کا ارشاد ہے کہ بلاشبہ اللہ نے مجھ سے میری امت کے بارے میں تین وعدے فرمائے اور ان کو تین چیزوں سے امان دی۔ ① یہ کہ کبھی پوری امت قحط کے ذریعہ ہلاک نہ ہوگی۔ ② یہ کہ ان کا کوئی دشمن ان کو بالکل ہی ایک ایک فرد کر کے ختم نہ کر سکے گا۔ ③ یہ کہ اللہ ان کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے گا۔ (رواہ الدارمی کمافی المشکوۃ صفحہ ۵۱۴، روح المعانی، انوار البیان))

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تین چیزوں سے امان دی۔ ① یہ کہ تمہارا نبی تم پر بد دعا نہ کرے گا، جس سے تم سب ہلاک ہو جاؤ۔ ② یہ کہ اہل باطل اہل حق پر غلبہ نہ پائیں گے (جس سے حق مٹ جائے اور نور حق ختم ہو جائے) ③ یہ کہ تم لوگ گمراہی پر جمع نہ ہوگے۔ (مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۵۱۳: ج ۲)

سوال گمراہی کی دعوت دینے والے بعض لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم گمراہ ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاک کیوں نہیں فرما دیتا؟

جواب آیت بالا میں اس کا بھی جواب دے دیا گیا ہے، اللہ جل شانہٗ نے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى فرما کر یہ بتایا ہے کہ جو شخص گمراہی کے راستہ پر چلتا جائے ہم اسے اس راہ پر چلنے دیتے ہیں کیونکہ یہ دنیا ابتلاء اور امتحان کی جگہ ہے، دنیا میں ایمان بھی ہے اور کفر بھی ہے اگر کسی پر جبر کیا جائے تو اختیار باقی نہ رہنے کی وجہ سے دنیا دارالامتحان نہ رہے گی، جو شخص گمراہی کو اختیار کرتا ہے اور تنبیہ کرنے والوں کی تنبیہ پر بھی واپس نہیں آتا اللہ جل شانہٗ اس کے دل میں مزید زیغ اور گمراہی ڈال دیتے ہیں جیسا کہ سورۃ صف

میں ارشاد فرمایا فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ، پھر جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اور زیادہ ٹیڑھا کر دیا۔ (انوار البیان)

شرک اور شیطان کی دوستی کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا {۱۱۶} اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا {۱۱۷} لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا {۱۱۸} وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا {۱۱۹} يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا {۱۲۰} اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا {۱۲۱} النساء

جواب بیشک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اور اس سے کمتر ہر گناہ کی جس کے لیے چاہتا ہے بخشش کر دیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، وہ راہِ راست سے بھٹک کر بہت دُور جا گرتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر جن سے یہ دعائیں مانگ رہے ہیں وہ صرف چند زنانیاں ہیں، اور جس کو یہ پکار رہے ہیں وہ اس سرکش شیطان کے سوا کوئی نہیں۔ جس پر اللہ نے پھٹکار ڈال رکھی ہے۔

اور اس نے (اللہ سے) یہ کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک طے شدہ حصہ لے کر رہوں گا۔ اور میں انہیں راہِ راست سے بھٹکا کر رہوں گا، اور انہیں خوب آرزوئیں دلاؤں گا، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ چوپایوں کے کان چیر ڈالیں گے، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کریں گے۔ اور جو شخص اللہ کے بجائے شیطان کو دوست بنائے اس نے کھلے کھلے خسارے کا سودا کیا۔ وہ تو ان سے وعدے کرتا اور انہیں آرزوؤں میں مبتلا کرتا ہے جبکہ (حقیقت یہ ہے کہ) شیطان ان

سے جو بھی وعدے کرتا ہے وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان کو اس سے بچنے کے لیے کوئی راہ فرار نہیں ملے گی۔

شانِ نزول: بعض مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آیتِ مبارکہ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ایک بوڑھا عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "میں ایک ایسا بوڑھا شخص ہوں جو گناہوں میں ڈوبا رہا ہے، لیکن جب سے اللہ کو پہچانا اور اس پر ایمان لایا، کبھی بھی اس کے ساتھ شرک نہیں کیا، نہ اس کے سوا کسی کو ولی بنایا، نہ گناہ اس جرأت سے کیے کہ گویا میں اللہ سے بے خوف ہوں، اور نہ کبھی پلک جھپکنے کے برابر یہ گمان کیا کہ میں اللہ سے بھاگ کر بچ سکتا ہوں، میں اپنے گناہوں پر نادم اور تائب ہوں، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا حال کیا ہو گا؟" تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر الوسیط للقرآن الکریم)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ: یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے، یہاں شرک سے مراد مطلق کفر ہے، خواہ وہ اہل کتاب کا ہو یا عرب کا یا کسی اور کا، یعنی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کافر کو نہیں بخشتا جو کفر پر مرے اور کفر کے سوا باقی گناہ جس کے چاہے بخش دے، اگرچہ وہ بغیر توبہ کے مر گیا ہو، پس جو شخص بغیر توبہ کے مر گیا وہ اللہ کی مشیّت میں ہے، چاہے تو اس کو معاف فرما دے اور جنت میں داخل کرے اور چاہے تو سزا دے کر پھر جنت میں داخل کرے۔

جہاں تک تعلق ہے اس آیت مبارکہ کا جس میں اپنی جانوں پر زیادتی کرنے والے بندوں کو رب کی ذات سے مایوس نہ ہونے کی تسلی دی گئی ہے، قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ سارے گناہ بخش دیتا ہے، تو یہ آیت بھی مشیّتِ الٰہی سے مقیّد ہے، یعنی اللہ جس کے گناہ چاہے معاف کرے اور یہ بھی مقید ہے کہ شرک اس

سے مستثنیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دیتا ہے سوائے شرک کے، وہ اس شخص کو نہیں بخشتا جو شرک پر مرے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا، **ضَلٰلٌ** گمراہی، اس راستے پر چلنے کو کہتے ہیں جو نجات کی طرف نہ لے جائے، یعنی جو اللہ کے ساتھ شرک کرے، اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرے یا اس کا شریک ٹھہرائے، تو وہ برائیوں اور گناہوں کے ایسے راستے پر چل نکلا جو بالآخر اسے ہلاکت تک پہنچا دے گا اور ذلت والے عذاب تک لے جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر یہی پیغام سنایا ہے، جس میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اس کے علاوہ جسے چاہیں معاف کر دیں، وہاں کھلی گمراہی میں جا پڑنے کی بجائے یہ فرمایا گیا کہ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے بڑا جھوٹ گھڑ لیا، ارشاد ہے **إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا**، مفسرین کرام کہتے ہیں کہ پہلی آیت کے آخر میں **افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا**، اس نے بہت بڑا جھوٹ باندھا، اس لیے فرمایا گیا کہ وہ اہلِ کتاب کے بارے میں تھی، ان کے پاس نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی سچائی اور اس بات کا علم تھا کہ آپ ﷺ کی شریعت تمام پچھلی شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حسد کی بنا پر حق کا انکار کیا، تو ان کا یہ فعل اللہ پر بہت بڑا جھوٹ اور سخت جرأت تھی۔

اور سورۃ النساء کی پیش نظر اس آیت کے آخر میں **ضَلٰلًا بَعِيْدًا** (دور کی گمراہی) اس لیے فرمایا کہ یہ ان مشرکین کے بارے میں ہے جو پہلے کسی کتاب اور وحی کو نہیں جانتے تھے، اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو ان کے پاس ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا اور انہیں صحیح راستہ اور گمراہی کا فرق بتا دیا، لیکن انہوں نے اس کی پیروی نہ کی، اس لیے ان کا یہ طرزِ عمل کھلی ہوئی گمراہی اور صراطِ مستقیم سے سخت دُوری ہے۔

إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ إِنَاثًا: یہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی گمراہی کو تفصیل سے بیان فرمایا، اللہ کو چھوڑ کر جن سے یہ دعائیں مانگ رہے ہیں وہ صرف چند زنانیاں ہیں، یہاں إِنْ نافیہ ہے، اور يَدْعُوْنَ کا مطلب ہے پکارنا، یہاں پکارنے سے مراد عبادت کرنا ہے، کیونکہ جو کسی کی عبادت کرتا ہے وہ ضرورت کے وقت اسی کو پکارتا ہے، إِنَاث سے مراد وہ بت ہیں جنہیں مشرکین اللہ کے سوا پوجتے تھے، یہ مشرک اللہ کو چھوڑ کر صرف بتوں کی عبادت کرتے ہیں، یا اپنی حاجت روائی کے لیے صرف ان بتوں کو پکارتے ہیں جو نہ خود کو نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔

اصنام (بتوں) کو إِنَاث کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے زیادہ تر اپنے بتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھے ہوئے تھے، جیسے لات، عُزّیٰ، مناۃ وغیرہ، حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہر قبیلے کا ایک بت ہوتا تھا جسے وہ اپنی بیٹی کہا کرتے اور اس کو عورتوں کی طرح زیور سے آراستہ کرتے، بعض نے کہا کہ إِنَاث سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ کچھ مشرک فرشتوں کی عبادت کرتے اور انہیں اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، جیسا کہ قرآن میں ہے، وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا، کچھ نے کہا کہ مراد إِنَاث سے بے جان چیزیں ہیں، یعنی وہ جمادات جو کسی بھی قسم کی زندگی نہیں رکھتیں، پھر بھی لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں۔

راغب اصفہانی کے نزدیک عربوں کی اکثر بت وہ اشیاء تھیں جو خود کسی کے قابو میں تھیں اور کسی چیز پر قابو نہیں رکھتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ملامت کی کہ تم خود تو فاعل (اثر رکھنے والے) ہو، مگر تم ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہو جو سراسر منفعِل (یعنی بالکل بے اثر) ہیں، اسی حقیقت کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا تھا، يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئاً، اے ابا جان! آپ ان کی کیوں پوجا کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں اور نہ کچھ کام آسکتے ہیں؟ (البحر المحیط)

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے پہلا قول ہی راجح قرار دیا ہے کہ یہاں إِنَاث سے مراد وہ بت ہیں جنہیں عرب مشرکین إِنَاث کے نام سے پوجتے تھے، جیسے لات، عُزّیٰ، مناۃ وغیرہ، انہوں نے

فرمایا، یہ تاویل اس لیے زیادہ قوی ہے کہ عربی میں إِنَاث کا مشہور معنیٰ وہ ہے جو مؤنث کے طور پر معروف ہو، اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے، ان مشرکوں کے کفر اور گمراہی پر سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ یہ ان إِنَاث کی عبادت کرتے ہیں، حالانکہ إِنَاث ہر چیز میں کمزور اور حقیر شمار ہوتی ہیں، تو یہ جانتے بوجھتے ہوئے حقیر چیزوں کو معبود مانتے ہیں اور اس ذاتِ باری تعالیٰ کی عبادت سے انکار کرتے ہیں جس کے قبضے میں تمام کائنات اور حکم ہے۔ (تفسیر ابن جریر)

وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيْدًا: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان إِنَاث کی عبادت در حقیقت شیطان کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو انہیں اس گمراہی کی طرف کھینچ کر لایا، مَرِید کے معنی ہیں، سرکش، نافرمان اور شر و فساد میں حد سے گزرا ہوا، راغب کہتے ہیں: "مارد" اور "مرید" جن و انس کے ان شیطانوں کو کہا جاتا ہے جو بھلائی سے بالکل خالی ہوں، اصل لفظ "مرد" کا مطلب ہے کسی چیز کا چکنا اور خالی ہونا، جیسے درخت "أمرد" جب پتے جھاڑ دے، یا "رملہ مرداء" یعنی ایسی زمین جس پر کچھ اگا نہ ہو، "امرد" نوجوان کو بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کے چہرے پر ابھی بال نہ ہوں، تو شیطان کو "مرید" کہا گیا، کیونکہ وہ خیر سے بالکل خالی اور شر میں کھلا ہوا ہے، یا یوں کہا جائے کہ جس طرح پتوں کے بغیر درخت کی شاخیں بالکل نمایاں ہو جاتی ہیں، اسی طرح اس شیطان کا شر بھی بالکل ظاہر و عیاں ہے۔ (مفردات القرآن للراغب اصفہانی)

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مشرک اللہ کو چھوڑ کر صرف ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں جنہیں انہوں نے إِنَاث کے نام دیے تھے اور حقیقت میں وہ شیطانِ سرکش کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جس نے انہیں اس باطل پر لگا کر اللہ کے سوا ہر ایک کے سامنے جھکا دیا۔

لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: لَعَنَهُ اللّٰهُ یہ دوسری صفت ہے، یعنی اللہ نے اسے اپنی رحمت سے اس طرح دور کیا جو غضب اور قہر کے ساتھ ملا ہوا ہے و پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ شیطان نے قسم کھائی کہ وہ بنی آدم کو حق کے راستے سے ہٹانے سے کبھی باز نہ آئے گا،

شیطان کی بات قرآن نے نقل کی کہ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا، شیطان نے کہا، اس بات کو پختگی اور قسم کے ساتھ کہ تیرے بندوں (جو آدم کی اولاد ہیں) میں سے ایک معین حصہ کو ضرور اپنا بنالوں گا، یعنی ان میں سے ایک خاص تعداد کو، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، اپنے لیے مقرر کرلوں گا، وہ لوگ جنہیں میں حق کے راستے سے بھٹکادوں گا اور اپنی وسوسہ اندازی کے تابع اور اپنے حکم کا مطیع بنالوں گا۔

اور اس کا فرمان لَأَتَّخِذَنَّ اصل میں اتخاذ سے ہے، یعنی کسی چیز کو اپنے لیے خاص طور پر لے لینا اور لفظ مَّفْرُوضًا، فرض سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کاٹ دینا، یہاں اس سے مراد ایک خاص اور معین تعداد ہے جسے شیطان نیکوکار مومنوں سے کاٹ کر اپنے حصے میں لے لے گا، پس جو بھی آدم کی اولاد میں سے شیطان کی اطاعت کرے گا، وہ اس کا مقررہ اور کٹا ہوا حصہ شمار ہو گا۔

اور جملہ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا، اس جملے پر معطوف ہے جو اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، یعنی یہ مشرکین اپنی عبادت میں اللہ کے سوا جس کی اطاعت کرتے ہیں وہ در اصل ایک سرکش شیطان ہے جو ایک طرف تو اللہ کی لعنت کا مستحق ٹھہرا اور دوسری طرف یہ خبیث اور گستاخانہ دعویٰ بھی اس نے لعنت کے وقت ہی کیا تھا۔

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ: شیطان نے بنی آدم کو جن دوسرے اور تیسرے امور کے ذریعے دھمکایا ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ، میں انہیں راہِ حق سے بھٹکا دوں گا اور انہیں باطل کی راہ پر چلاتا رہوں گا یہاں تک کہ وہ آخر تک اسی پر جمے رہیں اور میں انہیں جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کروں گا، یعنی انہیں ایسے خوابوں کے پیچھے دوڑاؤں گا جو محض فریب ہیں، ایسی باطل امیدوں اور فاسد خیالات میں لگاؤں گا جو ان کے دل و دماغ پر قابض ہو جائیں، یوں وہ میرے لشکر میں شامل ہوں گے اور میرے حکم کے تابع بن جائیں گے۔

چوتھا کام جس پر شیطان نے بنی آدم کو اکسانے کا عزم کیا، اسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا: وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ، راغب کہتے ہیں بَتْك کا لفظ بَتّ سے قریب المعنی ہے، فرق یہ ہے کہ بَتْك اعضاء یا بال وغیرہ کے کاٹنے میں استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: بَتَكَ شَعره وأُذنه یعنی اس کے بال یا کان کاٹ دیے اور سَيْفٌ بَاتِكٌ اس تلوار کو کہتے ہیں جو اعضاء کو کاٹ ڈالے، جبکہ بَتّ کا استعمال زیادہ تر رسی یا ڈوری کاٹنے میں ہوتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں ان کا یہ دستور تھا کہ جب اونٹنی پانچ بچے جنتی اور پانچواں بچہ نر ہوتا، تو وہ اس کے کان کاٹ دیتے یا چاک کر دیتے تاکہ یہ علامت ہو کہ وہ اسے اپنے لئے حلال نہیں سمجھتے، بلکہ اسے بتوں اور طاغوت کے نام پر چھوڑ دیتے اور اسے "بحیرہ" کہتے تھے، یعنی پھاڑے ہوئے کان والی، مطلب یہ ہے کہ شیطان انہیں اللہ کے بجائے غیر اللہ کی عبادت، جھوٹی امیدوں اور باطل اوہام پر اکساتا ہے اور جانوروں کے کان چیرنے جیسے کاموں کو تقرب الٰہی یا معبودانِ باطل کے نام پر کراتا ہے اور وہ جلدی سے اس کی بات مان لیتے اور اس کے وسوسوں کے غلام بن جاتے۔

پانچواں کام جس پر شیطان نے بنی آدم کو اکسایا، اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا: وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ، ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا اس سے مراد اللہ کا دین ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، یعنی فطرتِ الٰہی میں تبدیلی نہ کرو اور لوگوں کو ان کی اصل فطرت پر رہنے دو۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، أَوَيُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَا تُنْتَجُ البَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَآءَ، هَلْ تُحِسُّونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَآءَ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسے جانور پورا سالم پیدا ہوتا ہے، کیا تم اس میں کوئی کان کٹا ہوا دیکھتے ہو؟

صحیح مسلم میں ایک حدیث قدسی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ

كُلَّهُمْ، وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ، وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ، وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُّشْرِكُوْا بِيْ مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا. میں نے اپنے سب بندوں کو سیدھی فطرت پر پیدا کیا تھا، پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور انہیں ان کے دین سے ہٹا دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لئے حلال کی تھیں، انہوں نے انہیں میرے ساتھ شرک کرنے کا کہا جس پر میں نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، کچھ لوگوں نے کہا، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی سے مراد اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلنا ہے، مثلاً بعض جانوروں کی آنکھ پھوڑ دینا، کان کاٹ دینا، بدن پر نقش و نگار (ٹیٹو، داغ) بنوانا اور اسی قسم کے جاہلیت کے افعال جو شیطان کی پیروی میں کیے جاتے تھے، آج کل عورتیں دو آنکھوں کے درمیان میں ہندو عورتوں کی نقالی کرتے ہوئے ایک بندیا بنواتی ہیں، یہ بھی شیطان کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے کہ مراد اللہ کے دین میں تبدیلی ہے اور یہی بات سب سے زیادہ درست ہے، کیونکہ دوسری آیت بھی اس کی تائید کرتی ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، اس کے تحت ہر وہ کام داخل ہے جس سے اللہ کے دین میں بگاڑ پیدا ہو، خواہ وہ غیر شرعی خصی کرنا ہو یا ناجائز نقش و نگار (ٹیٹو، بندیا، جسم کو سوئیوں کے ذریعے کرید کر ان میں اپنے پسندیدہ نام لکھوانا) بنوانا ہو یا کوئی اور معصیت۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے بہت ہی عمدہ طریقے سے لوگوں کے سامنے رکھی ہے، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے شیطان کی زبان حال یا زبان قال سے یہ سب کچھ بیان کر دیا تاکہ لوگ اس کے مکر و فریب سے ہوشیار رہیں، اسے دشمن سمجھیں اور اللہ کی رضا اور اس کے انعامات حاصل کرنے کی فکر کریں۔

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا: اللہ تعالیٰ نے اس بات کی مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا ولی بنائے، تو وہ یقیناً کھلا نقصان اٹھائے گا، یعنی جو شخص شیطان کو اپنا دوست اور مددگار بناتا ہے، اس کی پیروی کرتا ہے، اس سے دوستی رکھتا ہے، اس کے وسوسوں کے پیچھے چلتا ہے اور حق و ہدایت کے راستے کو چھوڑ دیتا ہے، وہ اپنے

اس عمل کے ذریعے بالکل واضح اور کھلے خسارے میں پڑ جاتا ہے، کیونکہ شیطان انسان کو صرف ہلاکت اور رسوائی کی طرف لے جاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور آخرت میں جب اس کے ساتھیوں پر عذاب نازل ہو گا تو وہ ان سے کہے گا، إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ، بیشک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا لیکن میں نے وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میری پکار پر لبیک کہا، پس اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد کو۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا: وہ (شیطان) ان سے وعدے کرتا ہے اور انہیں لمبی لمبی امیدوں میں ڈالتا ہے، حالانکہ شیطان ان سے جو وعدے کرتا ہے وہ محض دھوکہ اور فریب ہیں، یہ فرمان اس سے پچھلی وعید کو مزید پختہ کرتا ہے، یعنی شیطان اپنے دوستوں کو جھوٹے وعدوں میں الجھاتا ہے، انہیں باطل امیدوں میں ڈال دیتا ہے تاکہ وہ اس کی اطاعت پر قائم رہیں، حالانکہ اس کے وعدے دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "غرور" وہ چیز ہے جس کا ظاہر خوشنما اور پسندیدہ لگے مگر اس کا باطن ناپسندیدہ اور برا ہو اور شیطان "غرور" ہے کیونکہ وہ انسان کو نفس کی خواہشات کی طرف کھینچتا ہے اور اس کے پیچھے وہی کچھ ہوتا ہے جو انسان کے لیے نقصان دہ ہے اور "غروراً" یا تو وعدے کا دوسرا مفعول ہے، یا مفعول لہ (سبب) ہے، یا کسی محذوف مصدر کی صفت ہے، یعنی ایسا وعدہ جو سراسر فریب ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن)

أُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا: یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے نکلنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔ مَحِيصٌ کے معنی ہیں پناہ گاہ یا بھاگنے کی جگہ، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو شیطان کے پیچھے چلتے رہے اور اس کے قدم بہ قدم چلتے رہے، ان سب کا ٹھکانا جہنم ہی

ہے، وہاں سے نہ انہیں کوئی پناہ ملے گی اور نہ کوئی بھاگنے کا راستہ، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور نکل نہ سکیں گے۔

الغرض ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور شیطانی وسوسوں و دھوکے کی پیروی کرنے سے سخت ترین انداز میں خبر دار فرمایا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ جو شخص راہِ رشد کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چلے گا، اس کا انجام ایسا دردناک اور لازوال عذاب ہے جس سے بچنے کی نہ کوئی صورت ہے اور نہ کوئی راہِ فرار۔

ایمان و اعمال صالحہ پر جنت کی خوشخبری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا {۱۲۲} لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا {۱۲۳} وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا {۱۲۴} النساء

جواب ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں ہم ان کو ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟ نہ تمہاری تمنائیں (جنت میں جانے کے لیے) کافی ہیں، نہ اہل کتاب کی آرزوئیں۔ جو بھی برا عمل کرے گا، اس کی سزا پائے گا، اور اللہ کے سوا اسے اپنا کوئی یار و مددگار نہیں ملے گا۔ اور جو شخص نیک کام کرے گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف برابر بھی ان پر ظلم نہیں ہو گا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا : اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اس سے پہلے والی آیت "ان کا ٹھکانا جہنم ہے" پر عطف ہے، یہ قرآن کریم کا معمول ہے کہ ڈرانے کے بعد خوشخبری اور وعید کے بعد وعدہ ذکر فرماتا ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ پر سچا ایمان لائے اور اپنی زندگی میں نیک اعمال کیے ہم انہیں ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یعنی ان کے محلوں اور گھروں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یعنی دائمی طور پر مقیم رہیں گے، یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، یعنی وہ انعامات جن کا اللہ نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ فرمایا ہے وہ یقینی اور لازمی طور پر پورے ہوں گے، اس کے برعکس شیطان نے اپنے پیروکاروں سے جو وعدے کیے وہ جھوٹے اور باطل ہیں اور وَعْدَ اللّٰهِ نصب میں ہے اور یہ اس جملے "ہم انہیں باغات میں داخل کریں گے" کے مفہوم کی تاکید کے لیے مصدر ہے، گویا اپنے ہی مفہوم کو مزید پختہ کر رہا ہے اور حَقًّا بھی نصب میں ہے اور اس کا مطلب ہے "یقینا یہ وعدہ سچ ہے"۔

وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا : یہ استفہامِ انکاری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں۔ قِيلًا مصدر ہے جیسے "قول" مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے مؤمن بندوں سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہو گا، کیونکہ اللہ سے بڑھ کر کوئی بھی سچا قول کہنے والا نہیں، یہ آیت ایک جامع اور بلیغ اختتامی کلمہ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کے اپنے ایمان والے بندوں کو جنت کی بشارت کے وعدے کو مزید مضبوط اور یقینی بنایا گیا ہے۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ: اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ اُس کی رضا اور جنت کا حصول محض آرزوؤں اور خیالی باتوں سے ممکن نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے، ارشاد فرمایا "یہ معاملہ نہ تمہاری آرزوؤں سے ہو گا اور نہ اہلِ کتاب کی تمناؤں سے، جو کوئی بُرا عمل کرے گا اُس کو اُس کی سزا دی جائے گی، لفظ أَمَانِي، امنیہ کی جمع ہے اور امنیہ اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان چاہے، اُس کی خواہش کرے اور اُس کے حصول کی آرزو رکھے، مثلاً دنیا میں کثرتِ خیر پانے یا آخرت میں جنت کے داخلے کی آرزو۔

شانِ نزول: مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس آیت کے نزول کے بارے میں مختلف روایات بیان کی ہیں: ① قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، مسلمانوں اور اہلِ کتاب نے ایک دوسرے پر فخر کیا، اہلِ کتاب نے کہا، ہمارا نبی تمہارے نبی سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، اس لیے ہم تم سے بہتر ہیں، مسلمانوں نے کہا، ہم اللہ کے زیادہ قریب ہیں، ہمارا نبی خاتم النبیین ہے اور ہماری کتاب پچھلی سب کتابوں پر حاکم ہے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ② مجاہد کہتے ہیں: عرب نے کہا کہ ہم نہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور نہ ہمیں عذاب ہو گا اور یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہو گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (الوسیط للقرآن الکریم)

اس آیت کا خطاب اُن سب فرقوں کو ہے جن کے درمیان دینِ حق اور اس کے نتیجے میں ملنے والے اجر و ثواب کے بارے میں جھگڑا ہوا، مطلب یہ ہے کہ اللہ کا وعدہ محض دعوؤں اور خواہشات سے پورا نہیں ہو گا بلکہ ایمانِ صادق اور عملِ صالح سے پورا ہو گا، اللہ کی سنت یہ ہے کہ جو شخص بھلائی کرے گا وہ بھلائی پائے گا اور جو برائی کرے گا وہ اُس کی سزا ضرور پائے گا، چاہے مومن ہو یا کافر، البتہ اگر مومن توبہ کرے یا اللہ اپنے فضل سے اُس کو معاف کر دے تو یہ اور بات ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین نہ محض دعویٰ اور نہ ہی آرزوؤں کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، بلکہ اصل چیز وہ ہے جو دل میں جاگزیں ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے، محض دعویٰ سے کچھ نہیں ہوتا، نہ یہ کہ ہر شخص جو یہ کہے کہ وہ حق پر ہے، اس کا دعویٰ مان لیا جائے جب تک اُس کے پاس اللہ کی طرف سے دلیل نہ ہو، اس لیے اللہ نے فرمایا: لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ۔ (تفسیر ابن کثیر)

بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں یہ خطاب صرف مسلمانوں کو ہے، جیسا کہ صاحبِ کشاف نے فرمایا کہ وعدۂ الٰہی کا حاصل ہونا محض مسلمانوں کی خواہشات اور اہلِ کتاب کی تمناؤں پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور عمل پر ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت مشرکینِ قریش کے بارے میں ہے، کیونکہ پہلے شیطان کی طرف سے جھوٹی امیدیں دلانے کا ذکر آیا تھا، لہٰذا یہی مفہوم یہاں زیادہ مناسب ہے۔ (ابن جریر)

ان سب مفسرین کرام کے ارشادات سر آنکھوں پر لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ ابن کثیر کا موقف زیادہ جامع ہے کہ یہ آیت سب کو خطاب کرتی ہے، مسلمانوں، اہلِ کتاب اور مشرکین سب کو، کیونکہ اس آیت کا مقصد ایک عام قاعدہ بیان کرنا ہے کہ اللہ کی رضا اور جنت صرف ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے حاصل ہوگی، نہ کہ محض خیالی دعوؤں اور آرزوؤں کے ذریعے۔

مَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ: یہ ایک ایسا جملہ ہے جو شرط اور جزا پر مشتمل ہے۔ سُوْٓءًا، برائی، سے مراد وہ سب کچھ ہے جو کفر اور گناہوں کو شامل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں سُوْٓءًا سے صرف کفر مراد ہے۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان **مَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ** چاہے جلد ہو یا دیر سے برائی کرنے والے کو اس کے عمل کا بدلہ مل کر رہے گا۔

شانِ نزول: اس کے نزول کے بارے میں ترمذی وغیرہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں، میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے ابو بکر! کیا میں تمہیں وہ آیت نہ سناؤں جو مجھ پر اتری ہے؟ میں نے عرض کیا، کیوں نہیں یا رسول اللہ! تو آپ ﷺ نے مجھے پڑھ کر سنائی، مجھے ایسا لگا جیسے میری پیٹھ ٹوٹ گئی ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے ابو بکر! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، یا رسول اللہ! ہم میں کون ہے جس نے برائی نہ کی ہو؟ کیا ہم ہر برائی پر بدلہ دیے جائیں گے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے ابو بکر! تم اور تمہارے ساتھی مومن دنیا ہی میں ان برائیوں کا بدلہ پا لیتے ہو یہاں تک کہ جب اللہ کے حضور پہنچو گے تو تم پر کوئی گناہ باقی نہ رہے گا، لیکن دوسرے لوگوں کے گناہ جمع ہوتے رہیں گے اور ان سے قیامت کے دن بدلہ لیا جائے گا۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر یہ بہت گراں

گزری اور ان پر اس کا ایسا اثر ہوا جیسا اللہ نے چاہا، انہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے بیان کی تو آپ ﷺ نے فرمایا، سیدھے رہو اور قریب قریب عمل کرو، کیونکہ مسلمان کو جو کچھ بھی مصیبت پہنچتی ہے، وہ اس کے لیے کفارہ ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی جو اسے چُبھتا ہے، یا کوئی حادثہ جو اسے پیش آتا ہے۔ (مسلم)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس مفہوم کی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ شمار سے باہر ہیں، اسی لیے جمہور علما کا اس پر اتفاق ہے کہ بیماریوں، دکھوں، دنیا کی مصیبتوں اور فکروں کے ذریعے اگرچہ ان کی تکلیف بہت کم ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اکثر علما کی رائے ہے کہ ان سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں اور یہی قول صحیح اور قابل اعتماد ہے کیونکہ کئی صحیح طرق سے یہ روایت ثابت ہے، مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يُشَاكُ شَوْكَةً فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كُتِبَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ وَمُحِيَتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةٌ مسلمان کو جو کانٹا بھی چبھتا ہے یا اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے ذریعے اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔

وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: آیت کے اس حصہ کے ساتھ پچھلے مضمون کو پختہ کرنا ہے کہ اللہ کا ثواب صرف ایمان اور نیک عمل سے حاصل ہو سکتا ہے اور جو برائی کرے گا اس پر اللہ کا عذاب ضرور آئے گا، یعنی جو شخص برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور وہ اس برائی کرنے والے کو اللہ کے سوا کوئی ایسا سرپرست نہیں ملے گا جو اس کے کام آئے یا اس کا دفاع کرے اور نہ ہی کوئی مددگار ملے گا جو اسے اللہ کے عذاب سے نجات دلا سکے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا: یہاں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے اچھے انجام کو بیان فرمایا کہ جو شخص نیک اعمال میں سے کوئی عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ ایمان والا ہو، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے پر موجود چھوٹے سے چھوٹے دانے (نقیر) کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا یعنی جو بھی کچھ نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ

ایمان کی صفت سے متصف ہے، تو ان سب کو ان کے اعمال کے بدلے جنت میں داخل کیا جائے گا اور ان کے اجر و ثواب میں ذرا سی بھی کمی نہ ہو گی، خواہ وہ کمی مثال کے طور پر کھجور کی گٹھلی کی پشت پر موجود باریک نقطے جتنی ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں مِنَ الصّٰلِحٰتِ میں مِن تبعیض کے لیے ہے، یعنی سب نیک اعمال کا احاطہ نہیں بلکہ کچھ نیکیاں ہی مراد ہیں، کیونکہ انسان سب نیک اعمال بجالانے پر قادر نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق عمل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں ٹھہراتا۔

اور مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى میں مِن بیان کے لیے ہے، مطلب یہ کہ شرعی احکام اور ان پر مرتب ہونے والے ثواب میں مرد و عورت سب برابر کے شریک ہیں، الا یہ کہ کسی خاص دلیل سے کسی ایک کو دوسروں پر خصوصیت حاصل ہو، اس طرح اسلام نے عورت کو انصاف دیا کیونکہ اس سے پہلے زمانہ جاہلیت میں اس کے حقوق دبائے گئے تھے۔

آیت میں وَهُوَ مُؤْمِنٌ کی قید اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ صرف ایمان والے ہی اپنے نیک اعمال کا اجر پائیں گے، کیونکہ کافر اگرچہ دنیا میں بہت نیکیاں کرے، لیکن کفر کے سبب ان کا کوئی وزن آخرت میں نہ ہو گا پھر فرمایا اور ان پر ذرّے برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا، اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل و عدل کی خبر ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا، إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا، بیشک اللہ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف و خلیل ہیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرٰهِيمَ خَلِيلًا {۱۲۵} وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

مُّحِيْطًا {۱۲۶} النساء

جواب ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کا دین ہو گا جس نے اپنے چہرے (سمیت سارے وجود) کو اللہ کے آگے جھکا دیا ہو، جبکہ وہ نیکی کا خوگر بھی ہو، اور جس نے سیدھے سچے ابراہیم کے دین کی پیروی کی ہو، اور (یہ معلوم ہی ہے کہ) اللہ نے ابراہیم کو اپنا خاص دوست بنالیا تھا۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور اللہ نے ہر چیز کو (اپنی قدرت کے) احاطے میں لیا ہوا ہے۔

شان نزول: ① عبد اللہ بن عبد الرحمن ابزیٰ رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اچانک اپنے گھر میں داخل ہوئے، تو انہوں نے موت کے فرشتے کو ایک انجانے جوان کی شکل میں دیکھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تم کس کی اجازت سے گھر میں داخل ہوئے؟ اس نے جواب دیا کہ گھر کے مالک کی اجازت سے، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے پہچان لیا، موت کے فرشتے نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ بیشک تیرے رب نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اپنا خلیل بنالیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ موت کے فرشتے نے کہا کہ تم اس کا کیا کرو گے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں مرتے دم تک اس کا خادم رہوں گا تو موت کے فرشتے نے جواب دیا کہ وہ شخص آپ خود ہیں۔ (اسباب النزول علامہ واحدی)

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک سال لوگوں پر قحط آگیا، لوگ سخت مشکل اور مشقت میں پڑ گئے، تو وہ غذا کی تلاش میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دروازے پر جمع ہو گئے، انہیں ہر سال غلہ مصر سے ان کے دوست کی طرف سے آتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غلہ لینے کے لیے اونٹ دے کر اپنے آدمیوں کو اپنے دوست کے پاس مصر بھیج دیا، تو اس نے جواب دیا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذاتی ضرورت کے لیے غلہ مانگتے ہیں تو ہم یہ برداشت کر لیتے، ہم پر بھی وہی مصیبت آئی ہے جو لوگوں پر آئی ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھیجے ہوئے آدمی واپس آگئے، وہ بطحاء سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس وادی سے بجری بھر کر لے جائیں تا کہ لوگ دیکھیں کہ ہم غلہ لے آئے، خدا کی قسم!

ہمیں شرم آتی ہے کہ ہم لوگوں کے پاس سے خالی اونٹ لے کر گزریں، چنانچہ انہوں نے اپنے بوروں میں ریت اور بجری بھر لی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اس وقت حضرت سارہ سو رہی تھیں، آدمیوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صورت حال سے آگاہ کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کی حالت کے بارے میں فکر اور تشویش ہوئی، اسی دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گئے اور حضرت سارہ نیند سے بیدار ہو گئیں اور وہ اٹھ کر ان بوروں کی طرف چل دیں، انہوں نے ان بوروں کو کھولا تو انہوں نے ان میں بہترین آٹا پایا، انہوں نے نانبائیوں کو روٹیاں پکانے کا حکم دیا۔

چنانچہ انہوں نے روٹیاں پکائیں اور لوگوں کو کھلائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے تو انہیں کھانے کی خوشبو آئی، انہوں نے پوچھا کہ اے سارہ! یہ کھانا کہاں سے آیا؟ حضرت سارہ نے جواب دیا کہ یہ کھانا آپ علیہ السلام کے مصری دوست کی طرف سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ یہ کھانا میرے مصری خلیل کی طرف سے نہیں بلکہ میرے خلیل "اللہ" کی طرف سے آیا ہے، اس روز اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنالیا۔ (اسباب النزول)

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۸ کے ذیل میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس واقعہ کے ساتھ ملتا جلتا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمالیجیے "زید بن اسلم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ قحط سالی تھی، لوگ نمرود کے پاس جاتے تھے اور غلہ لے آتے تھے، خلیل اللہ بھی گئے، وہاں یہ مناظرہ ہو گیا بدبخت نے آپ علیہ السلام کو غلہ نہ دیا، آپ علیہ السلام خالی ہاتھ واپس آئے، گھر کے قریب پہنچ کر آپ علیہ السلام نے دونوں بوریوں میں ریت بھر لی کہ گھر والے سمجھیں کچھ لے آئے، گھر آتے ہی بوریاں رکھ کر سو گئے، آپ علیہ السلام کی بیوی صاحبہ سارہ اٹھیں بوریوں کو کھولا تو دیکھا کہ عمدہ اناج سے دونوں پر ہیں، کھانا پکا کر تیار کیا، آپ علیہ السلام کی بھی آنکھ کھلی دیکھا کہ کھانا تیار ہے، پوچھا اناج کہاں سے آیا، کہا دو بوریاں جو آپ بھر کر لائے ہیں، انہیں میں سے یہ اناج نکالا تھا، آپ علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اللہ جل شانہ کی طرف سے برکت اور اس کی رحمت ہے۔ (ابن کثیر)

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا: اور ایسے شخص سے اچھا دین کس کا ہو گا جو اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے یعنی جس نے اپنی ذات کو اللہ کے لیے خالص کر دیا کہ اس کے قلب کی کوئی علمی یا میلانی وابستگی اور آویختگی غیر خدا سے نہیں رہی، دل اور سارا بدن اللہ کے اوامر و نواہی کا پابند ہو گیا، یہاں تک کہ عالم امکان میں اپنا یا کسی اور کا کوئی وجود اصلی حقیقی اس کو نظر ہی نہیں آتا کسی کے مستقل وجود یا کسی کو معبود و محبوب ماننے کا تو ذکر ہی کیا ہے، انکار کو بصورت استفہام ذکر کرنے سے کمال انکار کی طرف اشارہ ہے۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ ایسی حالت میں کہ وہ اچھے کام کرنے والا بھی ہے یعنی نیک اعمال کرتا اور برے کام چھوڑ دیتا اور ہمیشہ حضور قلبی اور اخلاص رکھتا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے جب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ احسان (اعمال کی خوبی) کیا ہے تو آپ نے فرمایا (عبادت کی خوبی یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اللہ کو (اس وقت اپنی نظر سے) دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو وہ تو یقیناً تم کو دیکھتا ہے۔ (مظہری)

وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ: اور چلا ابراہیم علیہ السلام کے دین پر، یوں تو تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے، اپنی ذات اور اعضاء بدن اور اندرونی بیرونی قوتوں کو اللہ کی رضامندی میں لگا دینا ہی دین انبیاء ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا تذکرہ صرف اس وجہ سے کیا کہ آپ کی نبوت پر تمام اقوام کا اتفاق ہے اور ہر دین میں آپ کی حقانیت مسلم ہے، پھر دین اسلام بکثرت فروعی مسائل میں شریعت ابراہیمی کے موافق ہے مثلاً کعبہ کی طرف نماز، کعبہ کا طواف، مناسک حج، ختنہ، مہمان نوازی اور وہ محاسن فطریہ جن کی تکمیل کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا اور وہ اس امتحان میں پورے اترے اور یہ تمام احکام شریعت اسلامیہ میں باقی رکھے گئے۔ (مظہری)

حَنِيفًا: یعنی ابراہیم علیہ السلام یا ان کی ملت ابراہیم پر حنیف ہو کر چلنے والا مراد ہے، حنیف سے مراد ہے تمام باطل راستوں سے منہ موڑ کر راہ حق پر چلنے والا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی سے منہ موڑ لیا

تھا باوجودیکہ آپ کے باپ کے خاندان اور قوم والے سب کے سب بت پرست تھے مگر آپ نے سب کو چھوڑ کر راہ مستقیم اختیار کی۔ (مظہری)

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا: اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خالص دوست بنایا تھا، خلیل سچا دوست خالص محبت والا، لفظ خُلَّةٌ کا اشتقاق یا خلال سے ہے (خلال کا معنی ہے گھس جانا مخلوط ہو جانا) خُلَّت (اور باطنی محبت) بھی دل کے اندر گھس جاتی اور نفس میں مخلوط ہو جاتی ہے، یا خلل سے مشتق ہے (خلل کا معنی ہے رخنہ شگاف) دو گہرے دوستوں میں سے ہر ایک دوسرے کی حاجت روائی کرتا اور اس کی حالت کے بگاڑ کو درست کرتا ہے اس لیے دونوں کو خلیل کہا جاتا ہے۔

زجاج نے کہا خلیل وہ ہے جس کی محبت میں کوئی رخنہ نہ ہو یا خل سے مشتق ہے, خل اس راستہ کو کہتے ہیں جو ریت کے اندر ہو۔ دو خلیل بھی دوستی کے راستہ پر برابر گامزن اور ہم طریق ہوتے ہیں یا خلت سے ماخوذ ہے خلت کا معنی ہے خصلت دونوں دوستوں کی خصلت ایک ہی ہوتی ہے اس لیے ان کو خلیل کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل کہنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ صرف اللہ کے محتاج تھے مخلوق کے سامنے اپنی حاجت نہیں پیش کرتے تھے، آپ دیتے تھے لیتے نہ تھے اور اللہ کے سوا کسی کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے۔ (مظہری)

خلیل خلت سے ہے اور خلت صفائے مَوَدّت اور غیر سے اِنقطاع کو کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ الصلٰوۃ والتسلیمات یہ اوصاف رکھتے تھے اس لئے آپ کو خلیل کہا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ خلیل اس مُحِبّ کو کہتے ہیں جس کی محبت کاملہ ہو اور اس میں کسی قسم کا خَلل اور کمی نہ ہو یہ معنی بھی حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والتسلیمات میں پائے جاتے ہیں تمام انبیاء کے جو کمالات ہیں سب سید الانبیاء ﷺ کو حاصل ہیں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے خلیل بھی ہیں جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے اور حبیب بھی جیسا کہ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ میں اللہ کا حبیب ہوں اور یہ فخراً نہیں کہتا۔

امام رازی رحمہ اللہ خلیل کا معنی یوں بیان کرتے ہیں، **أَنَّ خَلِيلَ الْإِنْسَانِ هُوَ الَّذِي يَدْخُلُ فِي خِلَالِ أُمُورِهِ وَأَسْرَارِهِ، وَالَّذِي دَخَلَ حُبُّهُ فِي خِلَالِ أَجْزَاءِ قَلْبِهِ، وَلَا شَكَّ أَنَّ ذَالِكَ**

هُوَ الْغَايَةُ فِي الْمَحَبَّةِ (تفسیر کبیر) بے شک انسان کا خلیل وہ ہوتا ہے جو اس کے کاموں اور رازوں میں داخل ہو اور خلیل وہ ہوتا ہے جس کی محبت اس کے اجزاء دل کے اندر داخل ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انتہائی محبت ہے۔

اس کے بعد امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

لَمَّا أَطْلَعَ اللهُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى الْمَلَكُوتِ الْأَعْلَى وَالْأَسْفَلِ وَدَعَا الْقَوْمَ مَرَّةً بَعْدَ أُخْرَى إِلَى تَوْحِيدِ اللهِ وَمَنَعَهُمْ عَنْ عِبَادَةِ النَّجْمِ وَالْقَمَرِ وَالشَّمْسِ، وَمَنَعَهُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ ثُمَّ سَلَّمَ نَفْسَهُ لِلنِّيْرَانِ وَوَلَدَهُ لِلْقُرْبَانِ وَمَالَهُ لِلضِّيْفَانِ جَعَلَهُ اللهُ إِمَامًا لِلْخَلْقِ وَرَسُولًا إِلَيْهِمْ، وَبَشَّرَهُ بِأَنَّ الْمُلْكَ وَالنُّبُوَّةَ فِي ذُرِّيَّتِهِ، فَلِهٰذِهِ الِاخْتِصَاصَاتِ سَمَّاهُ خَلِيلًا، (تفسیر کبیر)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملکوت اعلیٰ اور اسفل کو جھانک کر دیکھا تو قوم کو اللہ کی توحید کی طرف یکے بعد دیگرے دعوت دی اور انہیں ستاروں، چاند، سورج اور بتوں کی پوجا سے روکا، پھر اپنے آپ کو آگ کے سپرد کیا، اپنے بیٹے کو قربانی کے لیے، اپنے مال کو مہمانوں کے لیے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کا پیشوا بنادیا اور ان کی طرف رسول بنادیا اور انہیں خوشخبری سنائی کہ بادشاہی اور نبوت ان کی اولاد میں ہوگی، انہی خصوصیات کی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کا نام اللہ نے خلیل رکھا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل ملکیت اور بادشاہت کو بیان فرمایا ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، چاہے وہ مخلوقات ہوں یا کائناتی نظام، سب کا خالق، مالک اور مدبّر صرف اللہ ہے، اس حقیقت کا مقصد بندوں کو یہ سمجھانا ہے کہ چونکہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے، لہٰذا اطاعت و بندگی بھی صرف اسی کی ہونی چاہیے، نہ کوئی چیز اس کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے اور نہ ہی کوئی اس کی ملکیت میں شریک ہے، اسی سے رزق ملتا ہے، وہی نفع و نقصان کا مالک ہے، اس لیے انسان کو دوسروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے صرف اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت دراصل ایک تنبیہ ہے کہ جب آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کی ہے تو اس کے احکام سے روگردانی اور نافرمانی سراسر خسارہ ہے، خلاصہ کلام یہ کہ یہ آیت اللہ کی ہمہ گیر ملکیت، اُلوہیت اور ربوبیت کا اعلان ہے اور بندوں کو یاد دہانی ہے کہ وہ اللہ کے احکام ماننے میں کسی قسم کی غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا: یہاں آیت کے اس حصہ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ کمال بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے علم، قدرت اور تدبیر کے ساتھ گھیرے ہوئے ہے، علم کے اعتبار سے اس طرح کہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، چھپی ہوئی اور ظاہر سب اس کے علم میں ہے، قدرت کے اعتبار سے اس طرح کہ کوئی مخلوق یا قوت اس کے قبضہ و تصرف سے باہر نہیں، تدبیر کے اعتبار سے اس طرح کہ ساری کائنات کے امور اسی کے حکم و مشیت کے مطابق چل رہے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نہ صرف زمین و آسمان بلکہ ہر مخلوق، ہر عمل اور ہر نیت پر محیط ہے، اس کے احاطہ سے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں، اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کے حکم سے بے پرواہ نہ ہو، کیونکہ اس کے اعمال و احوال سب اللہ کے علم و قدرت کے دائرے میں ہیں، خلاصہ کلام یہ کہ اللہ ہر چیز پر علم و قدرت کے ساتھ حاوی ہے، اسی لیے اس کی اطاعت لازم اور نافرمانی سے بچنا ضروری ہے۔

یتیم بچے بچیوں کے حقوق، بیوی خاوند میں مصالحت، بیویوں میں عدل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا {۱۲۷}
وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا {۱۲۸} وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۱۲۹} وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا {۱۳۰} النساء

جواب ترجمہ: اور وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو کتاب میں تم پر تلاوت کیا جاتا ہے ان یتیم عورتوں کے بارے میں جن کو تم وہ حق نہیں دیتے ہو جو ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور تم رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کرو۔ اور ضعیف بچوں کے بارے میں بھی تم پر آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور یہ کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف کے ساتھ قائم رہو۔ اور جو کوئی خیر کا کام کروگے سو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے۔ اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی طرف سے بد مزاجی کا یا بے رخی کا اندیشہ کرے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی خاص طریقہ پر صلح کرلیں اور صلح اچھی چیز ہے۔ اور انسانوں کے نفسوں میں کنجوسی حاضر کر دی گئی ہے اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو اور پرہیز گاری اختیار کرو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اور تم ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہو کہ عورتوں کے درمیان عدل قائم رکھو اگرچہ تم حرص کرو۔ لہٰذا تم بالکل ہی نہ ڈھل جاؤ۔ جس کی وجہ سے ایک عورت کو ادھر میں لٹکی ہوئی چھوڑ دو۔ اور اگر تم اصلاح کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے۔ اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی عطا کی ہوئی وسعت کے ذریعہ بے نیاز کر دے گا اور اللہ تعالیٰ وسعت والا حکمت والا ہے۔

شان نزول: ① جابر رضی اللہ عنہ کی ایک چچازاد بہن تھی اس کا مال تھا جو اسے اپنے باپ کی میراث میں ملا تھا جابر رضی اللہ عنہ کو اس سے اپنا نکاح کرنا منظور نہ تھا لیکن کسی دوسرے سے بھی اس ڈر سے کہ اس کا شوہر مال لے جائے گا نکاح کرنا نہیں چاہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا گیا اس پر یہ آیت بالا نازل ہوئی۔ (فتح الباری، ابن ابی حاتم)

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی پرورش میں کوئی یتیم بچی ہو جس کا ولی وارث بھی وہی مال میں شریک ہو گیا ہو اب چاہتا یہ ہو کہ اس یتیم سے میں نکاح کر لوں اس بنا پر اور جگہ اس کی شادی روکتا ہو ایسے شخص کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔

③ اس سورت کے اول میں تاکید فرمائی تھی یتیموں کے حق ادا کرنے کی اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی جس کا والی مثلاً چچا کا بیٹا ہو اگر جانے کہ میں اس کا حق پورا ادا نہ کر سکوں گا تو خود اس لڑکی سے نکاح نہ کرے بلکہ کسی اور سے اس کا نکاح کر دے اور آپ اس کا حمایتی بنا رہے۔ اس پر مسلمانوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنا موقوف کر دیا تھا مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بعضی جگہ لڑکی کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا ولی ہی اپنے نکاح میں لائے جیسی رعایت وہ کرے گا غیر نہ کرے گا۔ تب مسلمانوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی اجازت مانگی اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور رخصت مل گئی اور فرمایا کہ وہ جو پہلی ممانعت سنائی گئی تھی وہ خاص اس صورت میں تھی کہ ان کا حق پورا ادا نہ کرو اور یتیموں کے حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی تھی اور جو یتیموں کے ساتھ سلوک اور بھلائی کرنے کے ارادہ سے ایسا نکاح کیا جائے تو اجازت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَآءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ: بخاری اور مسلم میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب لوگوں نے عورتوں اور یتیموں کے حقوق میں کوتاہی کی تو اس پر سورۃ نساء کی شروع کی آیتیں نازل ہوئیں، بعد چندے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر عورتوں کے متعلق کچھ مسائل دریافت کیے اس پر یہ آیت نازل ہوئی، غالباً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوبارہ سوال سے مقصد یہ ہو گا کہ شاید احکام سابقہ میں کوئی ترمیم و تنسیخ یا تخفیف ہو جائے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس باب میں جو حکم نازل ہو چکا ہے وہ قطعی ہے اور وہ اسی طرح قائم رہے گا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو گا، عورتوں کے نکاح اور ان کی میراث اور یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کا جو حکم پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ بدستور قائم ہے، اسی پر عدل و انصاف اور ایمانداری کے ساتھ عمل کرو اور اللہ اور اس کی

کتاب نے تم کو جو فتوی دیا ہے اس کی پابندی کرو غرض یہ کہ ان آیات میں عورتوں کے متعلق کچھ احکام بیان فرماتے ہیں، میراث کی تخصیص نہیں اور بعض مفسرین نے جو میراث کا ذکر کیا ہے وہ بطور تخصیص نہیں بلکہ بطور تمثیل ہے، اس لیے ان آیات میں میراث کے علاوہ اور بھی احکام بیان کیے ہیں۔ شیخ الاسلام ابوالسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے متعلق مختلف مسائل دریافت کیے جن امور کا حکم پہلے نازل ہو چکا تھا اس آیت میں ان کا حوالہ دے دیا گیا اور جو مسائل اور امور ایسے تھے جن کا حکم پہلے بیان نہ ہوا تھا ان کا حکم ان آیات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس مقام پر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں " قرآن کریم کی ترتیب میں اللہ تعالیٰ کا اسلوب یہ ہے کہ پہلے چند احکام بیان فرماتا ہے، پھر ان احکام کے عمل پر اجر و ثواب کی بشارت دیتا ہے اور ان احکام کی معصیت کرنے پر عذاب کی وعید سناتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے علم اور قدرت کی کبریائی بیان فرماتا ہے تاکہ واضح ہو کہ کسی کی معصیت اس کے علم سے باہر نہیں اور اس پر گرفت اس کی قدرت سے خارج نہیں پھر اس کے بعد دوبارہ ان احکام کا بیان شروع فرما دیتا ہے اور اس اُسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ مسلسل ایک ہی قسم کی عبارت سے بعض اوقات قاری کا ذہن اکتا جاتا ہے اس لیے قاری کے ذہن کو اکتاہٹ غفلت اور بے توجہی سے دور رکھنے اور اس کے ذہن کو بیدار، اس کے ذوق و شوق کو تازہ اور اس کی توجہ کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کلام میں تنوع ہو اور ایک مضمون کو مختلف پیرایوں سے بیان کیا جائے، اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور یتیم بچوں کے حقوق کو بیان فرمایا تھا، پھر اس کے بعد اور مختلف نوعیت کے احکام بیان فرمائے وعدہ اور وعید، ترغیب اور ترہیب اور اپنی عظمت اور کبریائی کے متعلق آیات نازل فرمائیں اس کے بعد اب بھی عورتوں کے حقوق کے متعلق احکام بیان فرما رہا ہے۔ (الکبیر، تبیان القرآن، معارف)

اس آیت میں استفتاء اور افتاء کا لفظ استعمال ہوا ہے، استفتاء کا معنی ہے فتوی معلوم کرنا اور افتاء کا معنی ہے فتوی دینا، فتوی کا لفظ فتی سے ماخوذ ہے، فتی کا معنی ہے جوان آدمی اور جوان آدمی قوی ہوتا ہے اس لیے فتوی کا معنی ہے قوی حکم، اس آیت میں مذکور ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتوی معلوم کیا اور فتوی اللہ تعالیٰ نے دیا۔ (تبیان القرآن)

سوال رسول اللہ ﷺ سے کیا گیا اور اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاملہ اللہ کے ساتھ معاملہ ہے، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نائب مطلق ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فتوی دیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو مفتی کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے افعال کے اطلاق سے مشتقات کا اطلاق لازم نہیں آتا مثلاً علم کا اطلاق معلم کے اطلاق کو مستلزم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات سماع شرع پر موقوف ہیں جن اسماء صفات کا قرآن مجید اور احادیث میں اطلاق آگیا ہے ان ہی کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنا جائز ہے، از خود اللہ تعالیٰ پر کسی اسم صفت کا اطلاق کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اسم ذات کا اطلاق کرنا جائز ہے، مثلا اللہ تعالیٰ کو خدا کہہ سکتے ہیں۔

فتوی میں جب کسی سوال کا جواب ذکر کیا جائے تو اگر اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیت مل جائے تو پہلے اس کو ذکر کیا جائے، پھر حدیث شریف کو ذکر کیا جائے اور اس کے بعد آثار صحابہ اور اپنے امام کا قول ذکر کیا جائے، ہمارے زمانہ میں مفتی حضرات بعض اُردو یا عربی کی فقہ کی کتابوں کی عبارات کو نقل کر دینا فتویٰ کے لیے کافی سمجھتے ہیں، یہ درحقیقت مفتی نہیں ہیں بلکہ ناقل مذہب ہیں اگر یہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرنے کے بعد امام کا قول ذکر کریں گے تو لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ ہمارے امام کا قول محض رائے اور قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ پر مبنی ہے اور تب ہی یہ واضح ہو گا کہ یہ قوی جواب ہے اور صحیح معنی میں فتوی کا مصداق ہے، پیش آمدہ مسائل میں اہل علم سے رجوع کر کے فتوی لینا اور اس مسئلہ کا حل معلوم کرنا قرآن مجید، احادیث صحیحہ اور صحابہ و تابعین کے تعامل سے ثابت ہے۔ (تبیان)

اس آیت میں یتیم لڑکیوں کے جس حق کا ذکر کیا گیا ہے اس حق کے متعلق دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان کی میراث ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان کا مہر ہے اور اس آیت کے مخاطبین کے متعلق بھی دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کے سرپرست ہیں وہ عورتوں کے مہر پر خود قبضہ کر لیتے تھے اور ان عورتوں کو ان کا مہر نہیں دیتے تھے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یتیم لڑکی کا ولی ہے، جب وہ اس یتیم لڑکی سے نکاح کرتا تھا تو اس کے مہر میں

انصاف نہیں کرتا تھا، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تم ان سے نکاح کی رغبت رکھتے ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ تم ان یتیم لڑکیوں کے حسن و جمال اور ان کے مال و دولت کی وجہ سے ان کے ساتھ نکاح کرنے میں رغبت رکھتے ہو اور حسن نے اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ تم ان کی بدصورتی کی وجہ سے ان کے ساتھ نکاح میں رغبت نہیں رکھتے اور ان کے مال و دولت میں رغبت کی وجہ سے ان کو اپنے پاس روکے رکھتے ہو اور ان کو کہیں اور نکاح نہیں کرنے دیتے۔ (تبیان القرآن)

تَرْغَبُوْنَ کا لفظ رغبت سے ہے، رَغبَت عربی زبان میں دو متضاد معنوں کے لیے آتا ہے، چاہنا اور نہ چاہنا، عربی گرامر کی رو سے اگر اس کے بعد "فی" آئے تو چاہنے اور راغب ہونے کے معنی ہیں اور "عن" آئے تو رغبت نہ ہونے اور نہ چاہنے کے معنی ہیں، یہاں یہ لفظ "فی" اور "عن" کے بغیر آیا ہے، اس لیے دونوں معنوں کی گنجائش ہے، شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ، شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ اور شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ نے چاہنے کے معنی لیے ہیں، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ تم لڑکیوں کا حق تو ادا نہیں کرتے، لیکن نکاح صرف اس لیے کرنا چاہتے ہو کہ ان کی جائیداد اپنے قبضہ میں رہے، مولانا تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا دریابادی رحمہ اللہ نے دوسرے معنی کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کا کسی سے نکاح نہیں کرتے، تاکہ دولت ہاتھ سے نہ جائے اور خود شکل و صورت کی وجہ سے ان سے اپنا نکاح کرنا نہیں چاہتے۔ (تفسیر رحمانی المعروف آسان تفسیر)

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتَامٰى بِالْقِسْطِ: اور یتیم بچوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ان کی پرورش نیک نیتی سے کرو اور ان کے مال کی حفاظت کرو، جیسا کہ ابتدائے سورۃ میں مفصل احکام نازل کیے جا چکے ہیں، یتیم بچوں کے ساتھ بھی دو طرح کی زیادتی ہوتی تھی، ایک تو انہیں وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا اور اگر ان کے حصے میں کچھ مال آجائے تو بچے کے سرپرست حیلے بہانے سے وہ مال ہضم کرنے کی کوشش کرتے تھے، تو اللہ نے فرمایا کہ یتیم کا مال کھانا اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرنے کے مترادف ہے، لہٰذا اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ

احکام کی سختی سے پابندی کرو، یتیموں کو وراثت میں حصہ دو اور ان کے مال کی حفاظت بھی کرو، نیز یہ وان تقوموا للیتمی بالقسط یتیموں کے بارے میں انصاف کے ساتھ قائم رہو۔

ان آیات کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ کمزور طبقات کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے، عورتیں، چھوٹے بچے یتیم لڑکے اور لڑکیاں سب ضعفا میں شمار ہوتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا یہ حکم مسلمانوں کے ہر صاحب اقتدار طبقہ کے لیے ہے خواہ وہ خاندان یا قبیلے کا سربراہ ہو یا وقت کا حاکم، جو بھی کسی معاملہ میں صاحب اختیار ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کمزور طبقات کے معاملات میں انصاف کی بالادستی کو قائم رکھے، ظاہر ہے کہ اگر ان طبقوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی انصاف بطریق اولیٰ ہو گا، اور اگر کمزور طبقے ظلم کی چکی میں پس گئے تو دوسروں کے ساتھ بھی انصاف کی توقع نہیں رکھی جاسکتی، لہٰذا کمزور طبقات کے ساتھ انصاف کرنے کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے۔

شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ غنیۃ الطالبین میں لکھتے ہیں کہ عدل و انصاف کا قیام تقویٰ کی علامت ہے اور تقویٰ کا خلاصہ اور لب لباب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (سورۃ نحل) بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کے حق ادا کرنے کا، اور منع کرتا ہے بے حیائی اور سرکشی سے، فرماتے ہیں تقویٰ کا لب لباب اور مرکزی نقطہ عدل ہے، جس قوم میں عدل نہیں وہ فاسق قوم ہے، جس سوسائٹی میں خلاف شرع اور خلاف عقل باتیں رائج ہیں وہ گندی سوسائٹی ہے، اسی لیے فرمایا کہ یتیموں کے ساتھ عدل قائم کرو، ان کا مال تلف نہ کرو، ان کے حقوق ادا کرو، عدل، طہارت، خشوع و خضوع، اخبات اور فیاضی مسلمان کا ورثہ ہیں، انہیں کوئی مسلمان ضائع نہیں کرتا۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن للشیخ سواتی رحمہ اللہ)

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا: یتیموں، بیواؤں، نادار بچوں کے جو حقوق ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں، جنہیں درست طریقے سے بجالانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے یا ان میں سے علی

الاطلاق جس اچھائی کا تم لوگ ارتکاب کروگے، جو جو بھلائی ان احکامات کے ذیل میں آتی ہے اگر تم لوگ وہ بجالاتے رہوگے تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا، ہے اور آئندہ بھی رہے گا، وہ ان اعمال پر تمہیں بدلہ دے گا، یہاں خیر کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ خیر ہی ایسی چیز ہے جس میں دلچسپی لی جاتی ہے، جس میں رغبت رکھی جاتی ہے، ان سب باتوں کا اللہ کو علم ہے۔

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا: اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بد دماغی کا غالب احتمال ہو یعنی علامات و قرائن سے معلوم ہو کہ شوہر اس کو طلاق دے دے گا۔ **أَوْ إِعْرَاضًا** یا رخ پھیر لینے کا اندیشہ ہو کہ شوہر اس کے ساتھ نشست برخاست اور گفتگو میں کمی کر دے اور اس کے حقوق ادا نہ کرے اور عورت طلاق نہ چاہتی ہو، **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا** تو کوئی جرم نہیں کہ وہ آپس میں (کسی جائز شرط پر) صلح کرلیں، مثلاً عورت اپنے کل مہر یا جزء مہر یا لازمی نفقہ یا مقررہ باری سے دست بردار ہو جائے یا شوہر کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے کچھ ہبہ کر دے۔ (تفسیر مظہری)

بغوی نے لکھا ہے کہ اگر شوہر اپنی بی بی سے کہے تیری عمر زیادہ ہوگئی، میں کسی جوان خوبصورت عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور باری کی تقسیم میں میں اس کو تجھ پر ترجیح دوں گا اگر تو اس پر رضامند ہے تو میرے پاس رہتی رہ اگر تجھے ناگوار ہو تو میں تجھے طلاق دے دوں گا، ایسی حالت میں اگر عورت (اپنی باری کا حق سوخت ہو جانے پر) رضامند ہو جائے، تو یہ اس کا احسان ہوگا اس معاملہ میں اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا اور رضامند نہ ہو تو مرد پر لازم ہے کہ یا تو اس کے مصارف اور باری کا حق پورا ادا کرے ورنہ حسن سلوک کے ساتھ آزاد کر دے، اگر اس کو نکاح میں رہنے دے گا اور اس کا حق ادا کرتا رہے گا (خواہ) بکراہت خاطر ہی ہو تو اس کو محسن (حسن سلوک کرنے والا) کہا جائے گا (گویا اوّل صورت میں عورت اپنے حق سے دست بردار ہونے کی وجہ سے محسن قرار پائی اور دوسری صورت میں مرد نے اپنے حق طلاق کا استعمال نہیں کیا تو محسن قرار پایا) (بغوی، مظہری)

مقاتل بن حبان رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر کوئی بوڑھی عورت کسی مرد کے نکاح میں ہو پھر کسی جوان عورت سے مرد نکاح کرلے اور بوڑھی عورت سے کہے میں تجھے اتنا مال دوں گا بشرطیکہ تو اپنے حق کی باری میں کمی کردے اور دوسری عورت کو اپنی باری دے دے اور بوڑھی عورت رضامند ہو جائے تو بہتر اور اگر راضی نہ ہو تو مرد پر دونوں میں مساوات رکھنی لازم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا اگر کوئی عورت کسی کے نکاح میں ہو لیکن بدصورتی یا زیادتی عمر کے سبب مرد کی نظر میں نہ جچے اور عورت اس مرد سے جدا ہونا بھی پسند نہ کرے اور (نکاح میں قائم رہنے کے لئے) مرد کو کچھ مال دے دے تو یہ مال اس شخص کے لیے حلال ہے اور اگر اپنی باریوں میں سے کوئی باری دے دے تب بھی درست ہے۔ آیت میں لفظ بَيْنَهُمَا سے اس طرف اشارہ ہے کہ بغیر کسی تیسرے کے دخل دیئے میاں بی بی کو خود ہی باہم صلح کر لینی مناسب ہے تاکہ ان کے آپس کی کوئی بری بات تیسرے آدمی کو معلوم نہ ہو۔ (تفسیر مظہری)

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ: اور صلح بہتر ہے (صلہ محذوف) جدا ہو جانے سے یا جھگڑا کرنے سے یا سوء معاشرت سے یا (خیر کا صلہ محذوف نہیں ہے اور) یہ معنی ہے کہ صلح ایک طرح کی بھلائی ہے جیسے باہم جھگڑا ایک طرح کی برائی ہے چونکہ لاجناح کا معنی ہے گناہ نہ ہونا اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ مکروہ ہے اس خیال کو دور کرنے کے لیے والصلح خیر جملہ معترضہ کے طور پر فرمایا اس کے علاوہ عورت کا اپنے حق میں کچھ دینا رشوت کی مشابہت رکھتا ہے اس وہم کو دفع کرنے کے لیے بھی والصلح خیر فرمایا، یہ آیت اگرچہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرنے کے سلسلہ میں خصوصیت سے نازل ہوئی تھی لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں لہٰذا صحیح دعوے کے بعد جو بھی مصالحت ہو اس کو حکم آیت شامل ہے۔ (تفسیر مظہری)

اقسام صلح: صلح تین قسم کی ہوتی ہے ① اقرار کے ساتھ صلح ② سکوت کے ساتھ صلح ③ انکار حق کے ساتھ صلح۔ چونکہ آیت مطلق ہے اس لیے امام شافعی رحمہ اللہ کے علاوہ باقی اماموں کے نزدیک ہر

طرح کی صلح جائز ہے، امام شافعی رحمہ اللہ مؤخر الذکر دونوں صورتوں کو ناجائز کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی صلح جائز ہے، مگر وہ صلح ناجائز ہے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے اور مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں، مگر اس شرط کے پابند نہیں جو حلال کو حرام کر دے۔ (حاکم)

توضیح دلیل یہ ہے کہ بدل کی رقم دینے والے (یعنی مدعیٰ علیہ) کے لیے حلال تھی (کیونکہ دعویٰ جھوٹا تھا) لینے والے کے لیے حرام تھی (کیونکہ اس کا حق نہ تھا) لیکن صلح کے بعد معاملہ الٹ گیا (مدعی کے لیے حلال ہو گئی اور مدعیٰ علیہ کو دینا پڑ گئی) دوسری وجہ یہ ہے کہ مدعیٰ علیہ جھگڑا کاٹنے کے لیے (دعوے کی) رقم دیتا ہے تو یہ دینا رشوت کے مشابہ ہوتا ہے اور (رشوت ناجائز ہے لہٰذا وہ صلح بھی جس سے رشوت کی مشابہت پیدا ہو جائے ناجائز ہے)

تینوں اماموں نے فرمایا یہ حدیث تو ہمارے خلاف نہیں جاتی بلکہ ہمارے مسلک کو ثابت کر رہی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی شرط کے فرمایا کہ ہر صلح جائز ہے رہا استثناء تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو صلح کسی قطعی حرام (مثلاً شراب وغیرہ) کو حلال یا کسی قطعی حلال کو حرام بنا دے وہ جائز نہیں ہے مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے اس شرط پر صلح کر لے کہ اس کی سوکن سے صحبت نہیں کرے گا (سوکن سے صحبت قطعی طور پر حلال ہے اگر بیوی سے صلح اس کی سوکن سے ترک صحبت کی شرط پر کرے گا تو یہ صلح باطل ہو گی) دیکھو اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے اور بیوی شوہر سے اس شرط پر صلح کر لے کہ میں اپنی باری سوکن کو دیتی ہوں مجھے طلاق نہ دو تو یہ مصالحت باجماع علماء صحیح ہے باوجودیکہ مصالحت سے پہلے بعض عورتوں کو باری کی تقسیم میں ترجیح دینا حرام تھا مگر مصالحت کی وجہ سے حلال ہو گیا۔

سکوت اور انکار کے بعد (کچھ لینے دینے پر) صلح کرنا جائز ہے کیونکہ مدعی تو اپنے گمان کے مطابق اپنا حق وصول کرے گا اور مدعی علیہ اپنی طرف سے جھگڑا کاٹنے کے لیے دینے پر رضامند ہو جائے گا اور یہ جائز ہے جان بچانے کے لیے مال دینا درست ہے، ظلم کو دور کرنے کے لیے رشوت دینا مباح ہے

ہاں اگر مدعی اپنا حق ثابت کرنے سے عاجز ہو اور مدعیٰ علیہ واقف ہو کہ مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور اس کے باوجود وہ اقرار نہ کرے بلکہ دعوے کا کچھ حصہ لینے دینے پر مصالحت ہو جائے تو دعوے کا بقیہ حصہ عند اللہ مدعی علیہ کے لیے حلال نہ ہو گا کیونکہ کسی کے حق کو دانستہ ہضم کر جانا جائز نہیں، ہاں اگر دعوے کی صحت سے واقف نہ ہو اور (کچھ دینے لینے پر) مصالحت کرلے تو تینوں اماموں کے نزدیک جائز اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ (مظہری)

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ: میں بتایا ہے کہ چونکہ نفوس انسانیہ میں ایک طرح کی حرص ہے اور خرچ نہ کرنے کے جذبات بھی ہیں اس لیے صلح میں آسانی ہو گی، جب شوہر دیکھے گا کہ عورت پورا یا آدھا اپنا مالی حق چھوڑ رہی ہے یا یہ کہ دوسری عورت کو اپنی باری کا حق سپرد کر رہی ہے تو اس طرح سے میری طبعی حرص میں کچھ خلل نہیں آتا اور عورت بھی مفت میں میرے نکاح میں رہ جاتی ہے تو وہ نکاح میں رکھنے پر راضی ہو جائے گا اور عورت کو جو حرص ہے کہ وہ پرانے شوہر ہی کے نکاح میں رہے اس کی یہ حرص بھی پوری ہو جائے گی اور اس طرح سے صلح آسان ہو گی اگر بچے ہیں تو کسی فریق کو بچوں سے جدا ہونا بھی نہ پڑے گا اور مل جل کر سب کی خوشگوار زندگی گزرے گی۔ (انوار البیان)

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: کہ اگر تم بھلائی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے وہ تمہیں نیکی اور تقویٰ کا اچھا بدلہ دے گا، اس میں مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اختیار کرنے اور پرہیز گاری کرنے کی ترغیب دی ہے۔ (انوار البیان)

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: صلح کا ذکر فرمانے کے بعد ایک بہت اہم بات کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ تم سے ہر گز یہ نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں ہر طرح کی برابری کرو کیونکہ رغبت قلبی غیر اختیاری چیز ہے، اس لیے اس میں برابری نہ کر سکو گے، پس اگر

کسی بیوی کی طرف قلبی میلان زیادہ ہو تو اس کی وجہ سے کسی دوسری بیوی کے حقوق تلف نہ کریں جس سے وہ دوسری بیوی مظلوم ہو جائے اور وہ درمیان میں لٹک کر رہ جائے نہ اس کے حقوق ادا ہوں تاکہ وہ خاوند والی سمجھی جائے اور نہ اس کو طلاق دی جائے تاکہ وہ بے خاوند والی ہو کر کسی اور جگہ اپنا نکاح کر سکے، اسے رکھنا ہے تو اچھی طرح سے رکھو اور اگر اصلاح کرو گے اور پرہیز گاری اختیار کرو گے (جس میں گزشتہ حق تلفی کی تلافی بھی ہو) تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے وہ سب کچھ بخش دے گا۔ (انوار البیان)

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا: یعنی اگر دونوں میاں بیوی میں کسی طرح موافقت نہ ہو پائے اور خلع یا طلاق کے ذریعہ آپس میں جدائی ہو ہی جائے، تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو ایک دوسرے سے بے نیاز فرما دے گا، کوئی فریق یہ نہ سمجھے کہ میرے بغیر اس کا کام چلے گا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ سب کا کارساز ہے، ہر ایک کے لیے جو مقدر فرمایا ہے وہ اس کے لیے میسر فرمائے گا، اس میں فریقین کو تسلی دی ہے کہ آپس میں صلح نہ کر سکیں اور جدا ہی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ دونوں کے لیے خیر فرمائے گا، مرد کو کوئی دوسری بیوی مل جائے گی اور عورت کا بھی کوئی ٹھکانا ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے وہ اپنی وسعت اور قدرت سے دونوں کا کام بنا دے گا۔

جو لوگ دوسری شادی کر لیتے ہیں اور پہلی بیوی کے ساتھ نہ برابری کا برتاؤ کرتے ہیں نہ طلاق دیتے ہیں اور ظلم کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تو ایسے ہی پڑی پڑی سڑتی رہے گی، ایسے ظالموں کو اس آیت کے مضامین پر خاص توجہ دینا لازم ہے، دنیا میں وہ مظلوم اگر کچھ نہیں کر سکتی تو آخرت تو سامنے ہے اگر انصاف نہیں کر سکتے اور برابری کے ساتھ دونوں کو نہیں رکھ سکتے تو ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارہ کریں۔ (تفسیر انوار البیان)

آسمانوں اور زمینوں میں سب کچھ کا مالک اکیلا اللہ ہے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

غَنِيًّا حَمِيْدًا {۱۳۱} وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا {۱۳۲} اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا {۱۳۳} مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا {۱۳۴} النساء

جواب ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ ہم نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اور تمہیں بھی یہی تاکید کی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اگر تم کفر اپناؤ گے تو (اللہ کا کیا نقصان ہے؟ کیونکہ) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور اللہ ہر ایک سے بے نیاز اور بذات خود لائق تعریف ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور کام بنانے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو اے لوگو! تم سب کو (دنیا سے) لے جائے اور دوسروں کو (تمہاری جگہ یہاں) لے آئے، اللہ اس بات کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص (صرف) دنیا کا ثواب چاہتا ہو (اسے یاد رکھنا چاہیے کہ) اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے۔ اللہ ایسا ہے کہ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس آیت کریمہ میں بیان کیے گئے مضمون کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو سات آسمانوں اور سات زمینوں میں ہے وہ سارے کا سارا اللہ کی ملکیت میں ہے، اللہ ہی ان ساری اشیاء کا مالک ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت **وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ** کے بعد اس مضمون کا ذکر کیا ہے اپنی مخلوق کی تنبیہ کے لیے، بیوی اور خاوند کی جدائی کے موقع پر یہ ڈر اور خوف کا مقام ہے، تاکہ یہ لوگ حاجت، فاقہ اور وحشت کے موقع پر، اپنے مسکن سے جدائی کے موقع پر اللہ ہی کی طرف رجوع کریں، کہ ایک اللہ ہی کی ذات ہے جس کے قبضہ قدرت میں ساری کائنات ہے، اسی کی سدا بادشاہی ہے، اس کے لیے کوئی مشکل و محال نہیں ہے کہ وہ آج کے فقیروں کو کل مالدار و غنی کردے، آج کے حاجت مندوں کی حاجت کل پوری کردے، آج خوف و وحشت کے سائے میں رہنے والوں کا کل مونس و غمخوار بن جائے۔

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ: اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! جو اس وقت مخاطب ہو تمہیں اور تم سے پہلے والے اہل کتاب اور ان کے علاوہ سابقہ امتوں کو ہم نے تاکید کی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، تقویٰ اختیار کرو، جنہیں کتاب دی گئی سے مراد یہود و نصاریٰ اور ان سے پہلے کی امتیں ہیں، کتاب سے مراد جنس کتاب ہے جو ان پہلی امتوں کے لیے بھیجی گئی تھیں، تقویٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان کرنا، اس کا خوف سامنے رکھنا، اس کے احکامات کو اپنے اوپر لاگو کرنا، احکامات کی پیروی کرتے چلے جانا، اس نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکتے چلے جانا۔

وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہیں، امم سابقہ، اہل کتاب کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ اللہ سے ڈرتے رہنا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کفر نہیں کرنا، اگر تم نے کفر کیا تو یاد رکھنا وہ ذات عالی مالک الملک ہے، وہ ساری بادشاہیوں کی مالک ہے، اسے تمہارا کفر نقصان نہیں دے سکتا، اسے تمہاری نافرمانی نقصان نہیں دے سکتی، جس طرح تمہارا شکر کرنا، تمہارا تقویٰ اختیار کرنا اسے فائدہ نہیں دے سکتا اسی طرح تمہاری نافرمانی، ناشکری اور کفر بھی اسے نقصان نہیں دے سکتا، اس نے جو تمہیں یہ تاکیدی حکم جاری کیا ہے یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے تم سے اسے کوئی کام اور مطلب نہیں ہے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے اگر تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کروگے تو وہ ذات تم سے بے نیاز ہے، وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری اور کفر کو پسند نہیں کرتا، اگر تم اس کے شکر گزار رہوگے تو وہ تم سے خوش ہوگا۔

وَكَانَ اللَّهُ غَنِيًّا حَمِيدًا: اللہ تعالیٰ بے پرواہے، حمدوں والا ہے، وہ ہمیشہ سے اپنی مخلوق سے بے پروا ہے، ان کی عبادت سے بے نیاز ہے، وہ اس بات کا مستحق اور لائق ہے کہ حمد کرنے والے اس کی حمد میں رطب اللسان رہیں، کیونکہ ان پر اس کی بہت زیادہ نعمتیں ہیں۔

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے اس کا مالک اللہ ہی ہے، وہ اکیلا مالک ہے، اکیلا متصرف ہے، اکیلا ایجاد کرنے والا ہے، اکیلا ان اشیاء کو ختم کرنے والا ہے، وہ

اکیلا ہی زندگی دینے والا ہے، اکیلا ہی موت دینے والا ہے۔

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: وہ ذات اپنی مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر کرنے والی ہے، ان کی مصلحتوں کی حفاظت کرنے والی ہے، وکیل نگران ہوتا ہے، وہ ان اُمور کا کفیل ہوتا ہے جو اسے سونپے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تین بار یہاں اس بات کا ذکر فرمایا کہ وہ ذات عالی زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب کی مالک ہے، یہ اس بات کی تاکید ہے کہ اس کی سلطنت، اس کی قدرت، اس کے غنا کی وسعت، اس کی رحمت بے پایان ہے، تاکہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات رچ بس جائے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں، اللہ کی ذات سے ڈریں۔

سوال اس تکرار کا کیا فائدہ؟

جواب اس کے دو جواب ہیں۔ ① تاکید کے لیے تکرار فرمایا تاکہ بندے متنبہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی ملک و ملکوت میں جو کچھ ہے اس میں غور و فکر کریں وہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

② دوسرا جواب یہ ہے کہ تکرار کے کئی فوائد ہیں، پہلے میں یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو وسیع بخشش سے غنی کر دے گا کیونکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اس کے خزانے ختم نہیں ہوتے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِيْنَ: گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظیم سلطنت کا ذکر کیا گیا، اللہ کی عظیم قدرت کا ذکر کیا گیا، اللہ تعالیٰ کی بے نیازی و بے پروائی کا ذکر کیا گیا، یہاں اسی کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو تمہیں فنا کے گھاٹ اتار دے، تمہیں ہلاکت کی وادی میں پھینک دے، تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا کر تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو بسیرے کروائے، اسے ہمیشہ سے تمہارے فنا اور دوسرے کی تخلیق و ایجاد پر بلیغ قدرت حاصل ہے، کیونکہ وہ ذات عالی وہ ہے جسے دنیا کی کوئی چیز عاجز و بے بس نہیں کر سکتی، لیکن وہ ذات عالی ایسا کرتی نہیں ہے، وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی، عاجزی اور بے بسی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ تمہیں باقی رکھے تاکہ تمہیں آزمائش کی بھٹی سے گزارے

کہ تم میں کون ہے جو اچھائی اور عمدگی بجالاتا ہے، تاکہ وہ ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے، تم جو اپنی نافرمانی اور عصیان کے باوجود صفحہ ہستی پر موجود ہو تو یہ اس کا کمال بے نیازی ہے کہ اسے تمہاری بندگانی وعبادت کی کوئی پروا نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے عرب دشمنوں سے ہے کہ اگر وہ ذات عالی چاہے تو تمہیں موت دے دے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو کھڑا کر دے، دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ اگر تم اعراض وروگردانی کرو تو تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو تبدیل کرلائے، پھر تمہارا نشان تک نہ چھوڑے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں "الناس" سے مراد مشرکین ومنافقین ہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيرًا: اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے، یعنی تمہیں فنا کرنے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لانے پر، یہ سب کچھ کرنے پر اسے بلیغ قدرت حاصل ہے، جب وہ کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو کوئی بھی اس کے ارادے اور کام میں رکاوٹ ڈالنے کی مجال نہیں رکھتا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: اللہ سے آخرت کا ثواب مانگے اور اس کی آرزو بھی رکھے، جو شخص دنیا کا طالب ہے اسے بتادو کہ اللہ کے پاس دونوں جہاں کا ثواب ہے، اشرف ترین چیز یعنی ثواب آخرت کا طالب ہونا چاہیے۔ (روح المعانی، انوار البیان)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا مقصد آخرت ہی بن جائے اللہ تعالیٰ اس کے منتشر اُمور کو جمع فرمادے گا اور اس کے دل کو غنی کر دے گا اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آئے گی اور جس کی نیت حصول دنیا ہو اس کے کاموں کو منتشر فرما دے گا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تنگی کر دے گا اور دنیا اسے اتنی ہی ملے گی جتنی اس کے لیے لکھ دی گئی۔ (الترغیب والترہیب، انوار البیان)

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا: یعنی اللہ تعالیٰ تمام اقوال کو سنتا ہے اور تمام احوال کو دیکھتا ہے۔ جو لوگ طالب دنیا ہیں صرف دنیا کے لیے عمل کرتے ہیں آخرت کی طرف نہیں بڑھتے اللہ تعالیٰ کو ان

سب کا علم ہے جو لوگ ریاکاری کے طور پر عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ان کا حال پوشیدہ نہیں ہے وہ اپنے علم کے مطابق بدلہ دے گا۔ (انوارالبیان)

سچی گواہی دینے کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا {۱۳۵} النساء

جواب اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اللہ کی طرف گواہی دو اگرچہ اپنی جانوں پر ہو یا اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں پر اگر کوئی مالدار ہے یا فقیر ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے سو تم انصاف کرنے میں دل کی خواہش کی پیروی نہ کرو اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اے اہل ایمان! جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ کی تصدیق کی، اس کی شریعت پر عمل کیا، انہیں چاہیے کہ وہ عدل وانصاف سے کام لیں، اللہ کی رضاجوئی کے لیے گواہی دیں اگرچہ یہ گواہی ان کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو، ان کے والدین کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو، ان کے قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔

إِنْ يَّكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقِيْراً فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا: جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہے، وہ امیر ہو یا غریب ہو، اس کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں سے زیادہ اپنے بندے کے قریب ہے، اس گواہی میں مصلحت کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا: گواہی دینے میں کسی قسم کا تعصب اور نفسانی خواہش تمہیں عدل وانصاف کا دامن ترک کرنے پر مجبور نہ کردے، تعصبات اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے

تمہاری زبانوں پر خلاف حقیقت بات نہیں آنی چاہیے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں "اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ عدل وانصاف پر مضبوطی سے جمے رہیں، اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہ سرکیں، ایسا نہ ہو کہ ڈر کی وجہ سے یا کسی لالچ کی بنا پر یا کسی خوشامد میں یا کسی پر رحم کھا کر یا کسی سفارش سے عدل و انصاف چھوڑ بیٹھیں، سب مل کر عدل کو قائم و جاری کریں ایک دوسرے کی اس معاملہ میں مدد کریں اور اللہ کی مخلوق میں عدالت کے سکے جمادیں، اللہ کے لئے گواہ بن جائیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق:۲) یعنی گواہیاں اللہ کی رضاجوئی کے لئے دو جو بالکل صحیح صاف سچی اور بے لاگ ہوں، انہیں بدلو نہیں، چھپاؤ نہیں، چبا کر نہ بولو، صاف صاف سچی شہادت دو چاہے وہ تمہارے اپنے ہی خلاف ہو، تم حق گوئی سے نہ رکو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرماں بردار غلاموں کی مخلصی کی بہت سی صورتیں نکال دیتا ہے کچھ اسی پر موقوف نہیں کہ جھوٹی شہادت سے ہی اس کا چھٹکارا ہو، گو سچی شہادت ماں باپ کے خلاف ہوتی ہو گو اس شہادت سے رشتے داروں کو نقصان پہنچتا ہو، لیکن تم سچ ہاتھ سے نہ جانے دو، گواہی سچی دو، اس لئے کہ حق ہر ایک پر غالب ہے، گواہی کے وقت نہ تونگر کا لحاظ کرو نہ غریب پر رحم کرو، ان کی مصلحتوں کو اللہ اعلیٰ و اکبر تم سے بہت بہتر جانتا ہے، تم ہر صورت اور ہر حالت میں سچی شہادت ادا کرو، دیکھو کسی کے برے میں آکر خود اپنا برا نہ کرلو، کسی کی دشمنی میں عصبیت اور قومیت میں فنا ہو کر عدل و انصاف ہاتھ سے نہ جانے دو بلکہ ہر حال ہر آن عدل و انصاف کا مجسمہ بنے رہو، جیسے اور جگہ فرمان باری ہے۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ:۸) کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل کرنے پر آمادہ نہ کردے عدل کرتے رہو یہی تقویٰ کی شان کے قریب تر ہے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رحمہ اللہ کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں کی کھیتیوں اور باغوں کا اندازہ کرنے کو بھیجا تو انہوں نے آپ کو رشوت دینا چاہی کہ آپ مقدار کم بتائیں تو آپ نے فرمایا سنو

اللہ کی قسم نبی ﷺ مجھے تمام مخلوق سے زیادہ عزیز ہیں اور تم میرے نزدیک کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو لیکن باوجود اس کے حضور ﷺ کی محبت میں آکر یا تمہاری عداوت کو سامنے رکھ کر ناممکن ہے کہ میں انصاف سے ہٹ جاؤں اور تم میں عدل نہ کروں، یہ سن کر وہ کہنے لگے بس اسی سے تو زمین و آسمان قائم ہے۔

وَإِن تَلْوُوٓا۟ أَوْ تُعْرِضُوا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا: پھر فرماتا ہے اگر تم نے شہادت میں تحریف کی یعنی بدل دی غلط گوئی سے کام لیا واقعہ کے خلاف گواہی دی دبی زبان سے پیچیدہ الفاظ کہے واقعات غلط پیش کر دئے یا کچھ چھپالیا کچھ بیان کیا تو یاد رکھو اللہ جیسے باخبر حاکم کے سامنے یہ چال چل نہیں سکتی وہاں جا کر اس کا بدلہ پاؤ گے اور سزا بھگتو گے، رسول مقبول ﷺ کا ارشاد ہے بہترین گواہ وہ ہیں جو دریافت کرنے سے پہلے ہی سچی گواہی دے دیں، گواہی چھپانے کی کوشش نہ کرو اور نہ ہی گواہی دینے سے انکار کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی گہرائیوں اور باریکیوں سے اچھی طرح باخبر ہے تمہیں سچی گواہی دینے پر وہ جزا دے گا۔

اللہ، رسولوں، کتابوں، فرشتوں اور یوم آخرت پر ایمان لانے کا حکم

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾ النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو، اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری تھی۔ اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور یوم آخرت کا انکار کرے وہ بھٹک کر گمراہی میں بہت دور جا پڑا ہے۔

شان نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن سلام، اسد اور اسید کعب کے بیٹے ثعلبہ بن قیس اور سلام عبد اللہ بن سلام کے بھانجے اور سلمہ بھتیجے اور یامین بن یامین رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی کتاب پر موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ پر اور عزیر علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور ہم انکار کرتے رہے ان کے علاوہ کتابوں کا اور رسولوں کا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلکہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول محمد ﷺ پر اور اس کی کتاب قرآن پر اور ہر کتاب پر جو اس سے پہلے تھی، انہوں نے کہا ہم ایسا تو نہیں کرتے اس پر یہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ نازل ہوئی، تو سب پر سب ایمان لے آئے۔ (در منثور)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ: ارشاد ہوتا ہے اے ایمان والو اللہ پر ایمان لاؤ، یہاں پر اٰمَنُوا اور آمِنُوا دو لفظ اکٹھے ہیں اور یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان والوں کو خطاب کر کے پھر انہی سے ایمان لانے کا مطالبہ کیے جا رہا ہے، بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اٰمَنُوا سے عام مومنین مراد ہیں، خواہ وہ مخلص ہوں یا غیر مخلص اور آمِنُوا کا حکم صرف غیر مخلص مومنوں سے ہے، جو ابھی تک اپنے ایمان میں خلوص پیدا نہیں کر سکے بلکہ ڈانواں ڈول ہیں، کبھی ایمان کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف۔

منافقین جو محض زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور دل میں ایمان کیخلاف بغاوت ہے اور جس کے نتیجے میں اسلام کے خلاف ظاہری اور باطنی تدبیریں کرتے رہتے ہیں، وہ بھی اس خطاب کے مخاطبین ہیں اور انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ گومگو کی کیفیت کو چھوڑ کر ایمان کو مکمل طور پر اختیار کر لو اور اس خطاب کی دوسری توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ خطاب عہد الست کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ازل میں پورے عالم ارواح سے دریافت کیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب نے بیک زبان جواب دیا تھا قَالُوْا بَلٰى مولا کریم! کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے، تو اب اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو یہ عہد یاد دلایا ہے کہ جب ازل میں تم مجھ پر ایمان لا چکے ہو تو اب اس

مادی جہاں میں پہنچ کر بھی مجھ پر دل و جان سے ایمان لاؤ تاکہ اس ایمان کا صحیح نتیجہ مرتب ہو سکے۔(معالم العرفان فی دروس القرآن)

ایمان والوں سے فرمایا جارہا ہے کہ اے اہل ایمان! اپنے ایمان پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی جو تصدیق تم نے کی ہے اس پر دوام اختیار کرو، تم نے رسول کریم ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی ہے، اتاری گئی کتاب یعنی قرآن کریم پر ایمان لائے ہو، اس سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام پر جو کتابیں اتاری گئی ہیں تم ان پر ایمان رکھتے ہو، تورات، زبور اور انجیل کو مانتے ہو بس اس پر تم جمے رہو، ثابت قدمی اختیار کرو۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا: یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت والوہیت کا انکار کرے گا، اس کی بندگانی اخلاص سے نہیں بجالائے گا، جو اس کے ملائکہ کا انکار کرے گا، ان کے بندگان مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کا انکار کرے گا، جو ان کے معصوم ہونے کا انکار کرے گا، جو اس کی کتابوں کا انکار کرے گا، جو اس کے انبیاء اور رسولوں کا انکار کرے گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی رشد وہدایت کے لیے مبعوث فرمایا، جو یوم آخرت کا انکار کرے گا، اس میں ملنے والے ثواب وعذاب کا انکار کرے گا، جو ان ساری باتوں کا انکار کرے گا وہ راہ ہدایت کو چھوڑ بیٹھے گا، وہ راہ مستقیم سے ہٹ جائے گا، جس نے ایسا کیا اس نے فطرت اسلام کا انکار کیا، ایسا شخص دور کی گمراہی میں جا پڑے گا۔

مرتد کی بدنصیبی

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا {۱۳۷} النساء۔

جواب ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر کفر میں

بڑھتے رہے تو اللہ ان کو ہر گز نہیں بخشے گا اور نہ انہیں راہ دکھائے گا۔

تفسیر: ارشاد ہو رہا ہے کہ جو ایمان لا کر پھر مرتد ہو جائے پھر وہ مومن ہو کر کافر بن جائے پھر اپنے کفر پر جم جائے اور اسی حالت میں مر جائے تو نہ اس کی توبہ قبول نہ اس کی بخشش کا امکان، نہ اس کا چھٹکارا، نہ فلاح، نہ اللہ اسے بخشے گا، نہ راہ راست پر لائے گا۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں" اس سے مراد منافق بھی ہو سکتے ہیں جن کا ذکر چل رہا ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے پاس آکر مسلمان ہونے کا اعلان کرتے تھے، مگر تنہائی میں کفر اختیار کر لیتے تھے، پھر کبھی مسلمانوں کا سامنا ہوتا تو دوبارہ ایمان لانے کا مظاہرہ کرتے، مگر پھر اپنے لوگوں کو اپنے کفر کا یقین دلاتے اور اپنے عمل سے کفر ہی میں بڑھتے چلے جاتے، نیز بعض روایات میں کچھ ایسے لوگوں کا بھی ذکر آیا ہے جو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہوئے، پھر توبہ کر کے مسلمان ہوئے، مگر بالآخر دوبارہ مرتد ہو کر کفر ہی کی حالت میں مرے، آیت کے الفاظ میں دونوں قسم کے لوگوں کی گنجائش ہے اور ان کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نہ ان کو بخشے گا، نہ راستے پر لائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے اختیار سے کفر اور اس کے نتیجے میں دوزخ کی راہ کو چن لیا تو اللہ ان کو زبردستی ایمان اور جنت کے راستے پر نہیں لائے گا کیونکہ دنیا دار الامتحان ہے اور ہر شخص کا انجام اس کے اپنے اختیار سے چنے ہوئے راستے کے مطابق ہونا ہے، اللہ نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے نہ کافر۔ (توضیح القرآن)

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس آیت کی تلاوت فرما کر فرماتے تھے مرتد سے تین بار کہا جائے کہ توبہ کر لے، پھر فرمایا یہ منافقوں کا حال ہے کہ آخرش ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے پھر وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستیاں گانٹھتے ہیں، ادھر بظاہر مومنوں سے ملے جلے رہتے ہیں اور کافروں میں بیٹھ کر ان مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو انہیں بیوقوف بنا رہے ہیں دراصل ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، پس اللہ تعالیٰ ان کے مقصود اصلی کو ان کے سامنے پیش کر کے اس میں ان کی ناکامی کو بیان فرماتا ہے کہ تم چاہتے ہو ان کے پاس تمہاری عزت ہو مگر یہ تمہیں دھوکا ہوا ہے اور تم غلطی کر رہے ہو بگوش ہوش سنو عزتوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے، وہ جسے چاہے عزت

دیتا ہے اور آیت میں ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (فاطر :۱۰) یعنی عزت اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول اور مومنوں کا حق ہے۔

لیکن منافق بے سمجھ لوگ ہیں، مقصود یہ ہے کہ اگر حقیقی عزت چاہتے ہو تو اللہ کے نیک بندوں کے اعمال اختیار کرو اس کی عبادت کی طرف جھک جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے عزت کے خواہاں بنو، دنیا اور آخرت میں وہ تمہیں وقار بنا دے گا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص فخر و غرور کے طور پر اپنی عزت ظاہر کرنے کے لئے اپنا نسب اپنے کفار باپ دادا سے جوڑے اور نو تک پہنچ جائے وہ بھی ان کے ساتھ دسواں جہنمی ہو گا۔ (مسند احمد)

پھر ارشاد نبوی ہے جب میں تمہیں منع کر چکا کہ جس مجلس میں اللہ کی آیتوں سے انکار کیا جا رہا ہو اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اس میں نہ بیٹھو، پھر بھی اگر تم ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے رہو گے تو یاد رکھو میرے ہاں تم بھی ان کے شریک کار سمجھے جاؤ گے، ان کے گناہ میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے جیسے ایک حدیث میں ہے کہ جس دستر خوان پر شراب نوشی ہو رہی ہے اس پر کسی ایسے شخص کو نہ بیٹھنا چاہیے جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس آیت میں جس ممانعت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سورۃ انعام کی یہ آیت ہے جو مکی ہے، وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ، جب تو انہیں دیکھے جو میری آیتوں میں غوطے لگانے بیٹھ جاتے ہیں تو تو ان سے منہ موڑ لے۔ الانعام:۶۸)

حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں اس آیت کا یہ حکم اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (النسآء :۱۴۰) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (الانعام :۶۹) سے منسوخ ہو گیا ہے یعنی متقیوں پر ان کے احسان کا کوئی بوجھ نہیں لیکن نصیحت ہے کیا عجب کہ وہ بچ جائیں۔

پھر فرمان باری ہے اللہ تعالیٰ تمام منافقوں کو اور سارے کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے، یعنی جس طرح یہ منافق ان کافروں کے کفر میں یہاں شریک ہیں قیامت کے دن جہنم میں بھی اور

ہمیشہ رہنے والے وہاں کے سخت تر دل ہلا دینے والے عذابوں کے سہنے میں بھی ان کے شریک حال رہیں گے، وہاں کی سزاؤں میں وہاں کی قید و بند میں طوق و زنجیر میں گرم پانی کے کڑوے گھونٹ اتارنے میں اور پیپ کے لہو کے زہر مار کرنے میں بھی ان کے ساتھ ہوں گے اور دائمی سزا کا اعلان سب کو ساتھ سنا دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے حق میں نازل ہوئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر بچھڑا پوج کر کافر ہوئے پھر اس کے بعد ایمان لائے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اِنجیل کا انکار کر کے کافر ہو گئے پھر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا انکار کر کے اور کفر میں بڑھے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے حق میں نازل ہوئی کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے ایمان کے بعد پھر ایمان لائے یعنی انہوں نے اپنے ایمان کا اظہار کیا تاکہ ان پر مؤمنین کے احکام جاری ہوں، پھر کفر میں بڑھے یعنی کفر پر ان کی موت ہوئی۔

منافقوں کے حالات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ {۱۳۸} الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا {۱۳۹} وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ {۱۴۰} الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا {۱۴۱} اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا {۱۴۲} مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا {۱۴۳} النساء

جواب ترجمہ: منافقوں کو یہ خوشخبری سنادو کہ ان کے لیے ایک دکھ دینے والا عذاب تیار ہے۔ وہ منافق جو مسلمانوں کے بجائے کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کر رہے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کی ہے۔ اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقین رکھو کہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔ (اے مسلمانو) یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے (انجام کے) انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح ملے تو (تم سے) کہتے ہیں کہ: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو (فتح) نصیب ہو تو (ان سے) کہتے ہیں کہ: کیا ہم نے تم پر قابو نہیں پالیا تھا؟ اور کیا (اس کے باوجود) ہم نے تمہیں مسلمانوں سے نہیں بچایا؟ بس اب تو تو اللہ ہی قیامت کے دن تمہارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، اور اللہ کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کا ہرگز کوئی راستہ نہیں رکھے گا۔ یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کرتے ہیں، حالانکہ اللہ نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور جب یہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں، اور اللہ کو تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں۔ یہ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں، نہ پورے طور پر ان (مسلمانوں) کی طرف ہیں، نہ ان (کافروں) کی طرف۔ اور جسے اللہ گمراہی میں ڈال دے، تمہیں اس کے لیے ہدایت پر آنے کا کوئی راستہ ہرگز نہیں مل سکتا۔

تفسیر: مومن اسے کہتے ہیں کہ زبان سے اقرار کرے اور دل میں یقین اور تصدیق موجود ہو اور نماز روزہ حج زکوۃ ادا کر کے اس کا عملاً ثبوت دے، کافر وہ ہے کہ نہ دل کی تصدیق ہے نہ زبان سے اقرار ہے، منافق اسے کہتے ہیں جو زبان سے ایمان کا اقرار کرتا ہے مگر دل میں یقین و تصدیق موجود نہیں ہے یہ گروہ سب سے زیادہ خطرناک ہے، کھلے کافر سے بچنا آسان ہے منافق سے بچنا مشکل ہوتا ہے جس طرح کھلے دشمن سے آدمی بچنے کا انتظام کرتا ہے اور کر بھی سکتا ہے اور جو دوست نما دشمن ہو

اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، یہ منافق بھی دوست نما دشمن ہوتے ہیں، ظاہری طور پر کلمہ پڑھتے ہیں اور اندر ان کے کفر ہوتا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: منافقوں کو خوشخبری سنادو اس امر کی کہ ان کے لیے بڑی دردناک سزا ہے۔ عربی زبان میں جس خبر کے سننے کی وجہ سے چہرہ پر تبدیلی و تغیر رونما ہو جائے، چہرے پر خوشی و مسرت کی لہر دوڑ جائے اسے بشارت کہتے ہیں، خوشخبری کا معنیٰ ہوتا ہے اچھی خبر دینا، منافقین کے لیے دردناک عذاب کی اطلاع کوئی اچھی خبر نہیں ہے، لیکن یہاں بطور مزاح واستہزا اس خبر بد کو خوشخبری کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں خوشخبری سنا دیجیے کا مطلب ہے ڈرایئے، انہیں خبر سنا دیجیے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا: یہاں اللہ تعالیٰ منافقین کی ایک قبیح اور بری حرکت کا ذکر فرمارہے ہیں کہ یہ منافقین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں، یہ ان کے پاس معزز بننا چاہتے ہیں، ان کے ہاں عزت کے متلاشی ہیں، جب کہ عزتوں کا مالک تو اللہ ہے، انہی قبیح حرکت کے مرتکبین کو دردناک عذاب کی ڈراؤنی خبر سنایئے، یہ مومنین کے مقابلے میں کافروں کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہیں، یہ کافروں سے مودت و دوستی کی رشتے بڑھاتے ہیں جب کہ اہل ایمان کے ساتھ لڑائی جھگڑے کرتے ہیں، یہاں کافروں سے مراد راجح قول کے مطابق یہودی ہیں، چونکہ مدینہ منورہ کے رہائشیوں میں جو غیر مسلم رہتے تھے وہ یہودی تھے، ان سے یہ منافقین کہتے تھے کہ محمد ﷺ کا کام تمام ہو چکا ہے، اس لیے وہ یہودیوں سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوْا فِي حَدِيْثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ إِنَّ اللهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيْعًا: مطلب یہ کہ اے اہل ایمان! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اپنی محکم کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم کفار کی طرف سے قرآنی آیات کا انکار ہوتے سنو، استہزا کرنے والوں کی طرف سے استہزا ہوتے دیکھو تو ان حالات میں تم پر لازم ہے کہ ان

کی مجالس کو چھوڑدو، ان سے روگردانی کرو، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھو جب تک وہ کسی اور گفتگو میں مشغول نہ ہو جائیں، قرآنی آیات کا انکار اور استہزا جب بھی کریں تو تمہارے لیے یہی حکم ہے، ہاں کسی اور بات میں ان کی گفتگو کے دوران یہ حکم نہیں ہے، علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں آیت نازل ہو چکی تھی کہ جب تم ان لوگوں کو ہماری آیات میں گھستے دیکھو تو ان سے روگردانی کرو، یہاں تک کہ یہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں کفار ومشرکین قرآنی آیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا مزاق اڑاتے تھے، استہزا کرتے تھے، اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مجلس میں بیٹھنے پر پابندی لگادی، جب تک وہ استہزا کے موڈ میں ایسا کرتے رہیں مسلمانوں کو یہاں بیٹھے رہنے کی اجازت نہیں ہے۔

مدینہ منورہ میں یہودی علماء بھی وہی کام کرتے تھے جو مکہ مکرمہ میں مشرکین کرتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو ان کے پاس اس صورت میں بیٹھنے پر پابندی عائد کی گئی، جیسے اس سے پہلے مکہ میں مشرکین کی مجالس میں جانے پر پابندی لگادی گئی تھی۔

اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ کہ اس حالت میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے، یعنی اے مسلمانو! جب تم کافروں اور آیات خداوندی کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ ان کے کفر واستہزاء کی حالت میں بیٹھو گے اور اس پر راضی رہو گے تو انہی جیسے کافر ہو جاؤ گے، ہاں اگر زبان سے کلمہ کفر نہ کہا جائے اور دل سے کفر پر راضی ہو تو منافق ہو جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا کافروں اور منافقوں کو اللہ جہنم میں اکٹھا کرے گا، کیونکہ یہ دنیا میں بھی اکٹھے تھے، وہاں بھی اکٹھے ہوں گے، یہاں مل کر دین اسلام اور قرآن کریم کے خلاف شر پھیلاتے تھے وہاں انہیں اپنے ہاتھوں کے آگے بھیجے ہوئے کرتوتوں کا بدلہ دینے کے لیے دوزخ میں اکٹھا کیا جائے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ

بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا: یہاں منافقین کی مزید منافقانہ اداؤں کا ذکر کیا جارہا ہے کہ وہ ایسے ہیں کہ تم پر اُفتاد اور مصیبت پڑنے کے منتظر رہتے ہیں، اگر من جانب اللہ لڑائی میں تمہاری جیت ہوگئی اور مال غنیمت حاصل ہوگیا، تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے یعنی کیا دین اور جہاد میں تمہارے ساتھی نہ تھے لہٰذا ہم کو بھی مال غنیمت کا حصہ دو اور اگر کافروں کو کچھ نصیب ہوگیا یعنی مسلمانوں پر کچھ غلبہ مل گیا، تو کہتے ہیں کیا ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر تم پر غالب نہیں آنے لگے تھے مگر ہم نے تم کو چھوڑ دیا۔

اِستحواذ کا معنی ہے غلبہ پانا اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا، یعنی کیا ہم نے مسلمانوں کو بے مدد نہیں چھوڑ دیا اور کیا تم کو ان کی خبریں نہیں بتائیں اور ان کے واقعات کی اطلاع نہیں دی (جس سے تم ہوشیار ہوگئے اور تم نے تیاری کرلی) (مظہری)

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا: یہاں منافقین کی مزید شریرانہ صفات بیان کی جارہی ہیں، فرمایا بلاشبہ منافق اللہ سے چالبازی کرتے ہیں اور اللہ چال بازی کی سزا ان کو دینے والا ہے۔ اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ساتھ تو سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کوئی جبریہ کھڑا ہو، اس طرح یہ ناگواری کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں نہ نماز کو ترک کرنے پر عذاب سے ڈرتے ہیں۔ لوگوں کو (اپنی نماز) دکھاتے ہیں تاکہ لوگ ان کو مومن خیال کریں۔ اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت مختصر، یا بہت تھوڑے وقت۔ ذکر سے مراد نماز ہے۔ اس تقلیل کی علت یہ ہے کہ دکھاوٹ کرنے والا دکھاوٹ کے لیے جو کام کرتا ہے وہ دیکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے اور ایسا وقت بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ (مظہری)

ابو یعلیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں کے سامنے تو نماز اچھی طرح پڑھے اور جب لوگ نہ دیکھتے ہوں تو نماز کو خراب پڑھے تو یہ نماز کو حقیر سمجھنا ہے ایسی نماز سے یہ شخص اپنے رب کی استہانت کرتا ہے۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَا إِلٰى هٰؤُلَآءِ وَلَا إِلٰى هٰؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا :
مذبذبین بین ذلک یعنی ایمان و کفر دونوں میں متردد ہیں، ذبذبۃ کسی چیز کو مضطرب بنا دینا، اصل مادہ مجرد ذب ہے جس کا معنی ہے نکال دینا، دھکے دینا، مذبذب وہ شخص جس کو دونوں جانب سے دھکے دیئے جائیں کسی ایک طرف وہ ٹھہر نہ سکے۔ نہ ان کو اقرار و اطمینان ہے ان کی طرف یعنی مومنوں کی طرف کہ ظاہر باطن میں انہی کی طرف ہو جائیں اور مومنوں کے ساتھ آخرت میں پورا اجر پانے کے مستحق بن جائیں۔ اور نہ کافروں کی طرف ان کو پورا اقرار ہے کہ دوسرے کافروں کی طرح ان سے بھی دنیا میں سلوک کیا جائے۔ اور جس کو (راہِ حق سے) اللہ بھٹکا دے۔ (اے مخاطب) تجھے اس کے لیے (حق و صواب کی) راہ ہرگز نہیں ملے گی۔ ایسی ہی اس مفہوم کی ایک اور آیت آئی ہے وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا منافق کی حالت ایسی ہے جیسے ریوڑ سے بچھڑی ہوئی بکری جو دو گلوں کے درمیان کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف گھومتی ہے۔ (مسلم، مظہری)

کفار سے دوستی کی ممانعت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا {۱۴۴} اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا {۱۴۵} اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا {۱۴۶} مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا {۱۴۷} النساء

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کے پاس اپنے خلاف (یعنی اپنے مستحق عذاب ہونے کی) ایک کھلی کھلی وجہ پیدا کر دو؟ یقین جانو کہ

منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، اور ان کے لیے تم کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ البتہ جو لوگ توبہ کرلیں گے، اپنی اصلاح کرلیں گے، اللہ کا سہارا مضبوطی سے تھام لیں گے اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لیے بنالیں گے تو ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے، اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا کرے گا۔ اگر تم شکر گزار بنو اور (صحیح معنی میں) ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر آخر کیا کرے گا؟ اللہ بڑا قدر دان ہے (اور) سب کے حالات کا پوری طرح علم رکھتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ: حق جل شانہ اب مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ تم ان لوگوں سے دوستی نہ کرنا، ورنہ جو ان کی سزا ہے وہی سزا تمہاری ہو گی جیسا کہ حدیث میں ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کیونکہ ان کی دوستی سے تمہارے دلوں سے اللہ کی محبت جاتی رہے گی آخرت کو بھول جاؤ گے اور ان کی طرح دنیا کے شیدائی اور فدائی بن جاؤ گے کیونکہ ایک دل دو طرف نہیں رہ سکتا مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ، اللہ اپنی پناہ میں رکھے اے ایمان والو ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح نہ دو اور منافقوں کی طرح مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ مبادا کہ ان کی دوستی سے کفر کے جراثیم تم کو نہ لگ جائیں، ایک دوست دوسرے دوست کی خصلتوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کا صریح الزام اپنے اوپر قائم کرلو یعنی اگر تم کافروں اور منافقوں کو دوست بناؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی حجت تم پر قائم ہو جائے گی کیونکہ اللہ نے تم کو ان کی دوستی کی ممانعت کی ہے اور قیامت کے دن تم پر اللہ یہ حجت قائم کریں گے کہ دعویٰ تو ایمان کا تھا مگر دوست رکھتے تھے میرے دشمنوں کو اور اجتماع ضدین باتفاق عقلاء محال ہے، خوب سمجھ لو کہ کافروں اور منافقوں کی دوستی سے تم کو کوئی نفع نہ ہو گا۔ (معارف القرآن)

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا: منافقین کو دوست نہ بنانے کی جہاں بہت سی اور وجوہات ہیں وہاں ایک وجہ اور بھی بیان کی گئی ہے، انہیں دوست کیوں نہ بنایا جائے؟ اس لیے کہ بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے جس کا عذاب

تمام طبقوں سے بڑھا ہوا ہے دوزخ کے سات طبقے ہیں ایک کے نیچے ایک سب سے نیچے کے طبقہ میں سب سے زیادہ سخت عذاب ہے اور یہ طبقہ خاص منافقوں کے لیے ہے اس لیے کہ کھلے کافر صرف کھلے کافر تھے مسلمانوں کو فریب نہ دیتے تھے اور منافق کفر کے علاوہ جھوٹ بھی بولتے تھے اور مسلمانوں کو فریب بھی دیتے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب منافقین اور اصحاب مائدہ اور آل فرعون کو ہو گا اور قرآن کریم میں اس کی تصدیق موجود ہے، اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ اور اصحاب مائدہ کے بارے میں ہے فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اور آل فرعون کے بارے میں ہے اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (تفسیر قرطبی ص ۴۲۵ ج ۵، بحوالہ معارف القرآن)

اور اے مخاطب تو ان منافقین کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہ پائے گا جو ان کو نیچے کے طبقہ سے نکال سکے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی) یہاں جہنم کے لیے درجات کی بجائے درکات کا لفظ استعمال کیا گیا، اس لیے درجات جنت کے ہوں گے، درجات نیچے سے اوپر جانے کو اور درکات اوپر سے نیچے اترنے کو کہا جاتا ہے۔ جہنم کے سات طبقات ہیں ① جہنم ② لظیٰ ③ حطمہ ④ سعیر ⑤ سقر ⑥ جحیم ⑦ ھاویہ، کبھی کبھی دوزخ کے ان سارے طبقات پر ایک ہی نام ''جہنم'' بول دیا جاتا ہے کیونکہ دوزخ کا لفظ ان سب کو شامل ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا: یہاں جہنم سے بچنے، نچلے طبقات میں گرنے سے بچاؤ کی استثنائی صورت بیان کی گئی کہ کون لوگ دوزخ میں جانے سے بچ جائیں گے؟ فرمایا کہ ''ہاں ان میں جو لوگ نفاق سے توبہ کر لیں اور اپنے عقائد اور اعمال کی اصلاح کر لیں اور اللہ کے دین کو مضبوط پکڑ لیں یعنی تذبذب اور تردد میں نہ رہیں بلکہ اللہ کی باتوں پر پورا یقین رکھیں اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لیے کر دیں یعنی دین سے مقصود محض اللہ کی رضا اور خوشنودی ہو، ریا و نمود اور دنیاوی غرض کا اس میں شائبہ نہ ہو، پس ایسے لوگ جنہوں نے نفاق سے سچی توبہ کر لی اور عقائد و اعمال کی اصلاح کر لی

اور بلا کسی تردد اور تذبذب کے مضبوطی کے ساتھ دین کی رسی کو پکڑ لیا اور اخلاص اور صدق نیت کے ساتھ اللہ کے مطیع اور فرمان بردار بن گئے، تو ایسے لوگ جہنم کے کسی طبقہ میں نہ ہوں گے بلکہ جنت میں ان مومنین کاملین کے ساتھ ہوں گے جو از اول تا آخر صدق اور اخلاص کے ساتھ ایمان پر قائم رہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان کا ایمان نفاق اور ریاء کے شائبہ سے محفوظ رہا۔

یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نفاق سے توبہ کرنے والوں کو مومنین کی جماعت میں شمار کرے گا اور عنقریب اللہ تعالیٰ ان مومنین اور صادقین اور مخلصین کو جو از اول تا آخر صدق اور اخلاص کے ساتھ ایمان اور اسلام پر قائم رہے ان کو آخرت میں اجر عظیم دے گا، جو ان تائبین کے اجر اور ثواب سے بڑھ کر ہو گا یا یہ معنی ہیں کہ نفاق سے سچی توبہ کرنے والوں کو مومنین صادقین (سچے مومنوں) اور عباد مخلصین (مخلص بندوں) کے ساتھ اجر اور ثواب میں شریک کر دیا جائے گا۔ (معارف القرآن)

منافقین سے عذاب ٹلنے کی چار ہی صورتیں ہیں، ① وہ سچے دل سے توبہ کریں۔ ② وہ اپنے عمل کو ٹھیک کریں کیونکہ توبہ نام ہے قبیح و بری حرکات چھوڑنے کا۔ ③ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا: کیونکہ توبہ سے اس کی غرض عمل کی درستگی ہونا چاہیے جو اللہ کی رضا طلب کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ ④ اخلاص: کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے اخلاص بہت ضروری ہے جس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ ہو۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ: اور اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ۔ استفہام انکاری اور تقریری ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ شکر گزار مومن کو عذاب نہیں دے گا کیونکہ بندوں کو عذاب دینے سے نہ اس کے اقتدار میں اضافہ ہو جاتا ہے نہ عذاب دینے سے حکومت میں کوئی کمی آجاتی ہے، کسی فائدہ کا حاصل کرنا یا ضرر کو دفع کرنا تو عذاب دینے کا مقصد ہی نہیں ہے، اللہ ہر نفع و نقصان سے پاک ہے البتہ اس کا دستور ہے کہ اس نے نتیجہ کو سبب سے وابستہ کر دیا ہے، بندوں کو عذاب دینے کے معاملہ میں بھی اس کا یہی دستور ہے جیسے مزاج کے بگڑنے سے مرض پیدا ہوتا ہے اگر ایمان اور شکر کی وجہ سے آدمی کی قلبی بیماری (دل کی

بیماری) یعنی نفاق و کفر کا ازالہ (خاتمہ) ہو جائے اور دل کو پاک کر لیا جائے تو آدمی ہر برے نتیجہ سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ شکر کو ایمان سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ شروع میں آدمی نعمت کو دیکھ کر مبہم طور پر شکر گزار ہوتا ہے پھر گہری نظر کرتا ہے تو منعم کو پہچانتا ہے اور اس پر ایمان لاتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”میں کہتا ہوں شاید شکر سے مراد ہے ایمان مجازی عامی جو کفر کی ضد ہے اور ایمان سے مراد ہے ایمان حقیقی (اور ایمان مجازی ایمان حقیقی کا زینہ ہے ظاہری مجازی ایمان سے ہی ترقی کر کے آدمی ایمان حقیقی تک پہنچتا ہے اسی لیے شکر کو ایمان سے پہلے ذکر کیا)

وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا: اور اللہ بڑی قدر کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے یعنی شکر کا ثواب عطا کرتا ہے، تھوڑا سا عمل بھی قبول فرمالیتا ہے اور زیادہ عطا کرتا ہے اور تمہارے ایمان کی حقیقت کو خوب جانتا ہے، وہ تمہارے اعمال اور احوال کو بہت اچھی طرح جانتا ہے، اسی پر وہ تمہیں آخرت میں بدلہ دے گا۔

مظلوم کو اُونچا بولنے کا حق دیا گیا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا {۱۴۸} النساء

جواب ترجمہ: اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بد گوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

شانِ نزول: مجاہد کا قول ہے کہ ایک شخص کسی قوم کے ہاں بطور مہمان اترا، انہوں نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا، اس نے ان کی شکایت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اسے شکایت کرنے کی اجازت دی گئی۔ (اسباب النزول)

بری بات کا بیان کرنا، پھیلانا اور تجھ مجھ سے کہتے ہوئے پھرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، ہاں اگر

کسی پر کوئی ظلم ہوا ہو تو وہ اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کے لیے ظالم کا ظلم اور زیادتی بتائے تو یہ جائز ہے، اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد بھی ہو جائے گی اور خود ظالم کو بھی اپنی زیادتی اور بدنامی کا احساس ہو گا جس کی وجہ سے وہ ظلم سے باز آجائے گا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے تکلیف دیتا ہے، آپ نے فرمایا تو اپنا سامان نکال کر راستے میں رکھ دے چنانچہ اس شخص نے ایسا کیا اب ہر شخص جو وہاں سے گزرتا تھا پوچھتا تھا کہ کیا بات ہے (تم نے سامان یہاں کیوں ڈالا) وہ کہتا تھا میرا پڑوسی مجھے تکلیف دیتا ہے اس پر گزرنے والے اس کے پڑوسی پر لعنت بھیجتے تھے اور اس کی رسوائی کے لیے بد دعا کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پڑوسی آیا اور کہنے لگا کہ تم اپنے گھر واپس چلے جاؤ اللہ کی قسم میں تمہیں کبھی تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔

آیت کے عموم میں یہ سب باتیں شامل ہیں کہ کسی کی غیبت کی جائے کسی پر بہتان باندھا جائے کسی کے عیب اور گناہ کو مجھ سے بیان کیا جائے یہ سب چیزیں حرام ہیں، اگر کسی کا عیب اور گناہ معلوم ہو جائے تو اس کی پردہ پوشی کرے نہ یہ کہ اسے اڑائے اور ادھر ادھر پہنچائے، بہت سے لوگوں کو غیبت کرنے اور دوسروں کی پردہ دری کرنے اور گناہوں کو مشہور کرنے اور ادھر ادھر لیے پھرنے کا ذوق ہوتا ہے ایسے لوگ اپنی بربادی کرتے ہیں اور آخرت میں اپنے لیے عذاب تیار کرتے ہیں، اگر کسی شخص سے کوئی زیادتی ہو جائے اول تو یہ ہے کہ اسے معاف کر دے اور اگر معاف کرنے کی ہمت نہیں ہے تو بدلہ لے سکتا ہے، معلوم ہوا کہ مظلومیت کا بدلہ بقدر مظلومیت ہی لیا جا سکتا ہے، اگر بدلہ لینے والے نے زیادتی کر دی تو اب وہ ظالم ہو جائے گا۔ (انوار البیان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوسرے کو بد دعا دینا جائز نہیں، ہاں جس پر ظلم کیا گیا ہو اسے اپنے ظالم کو بد دعا دینا جائز ہے اور وہ بھی اگر صبر و ضبط کر لے تو افضل یہی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ کی کوئی چیز چور چرا لے گئے تو آپ ان پر بد دعا کرنے لگیں، حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا! کیوں اس کا بوجھ ہلکا کر رہی ہو؟ (ابو داؤد)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس پر بد دعا نہ کرنی چاہیے بلکہ یہ دعا کرنی چاہیے اَللّٰھُمَّ اَعِنِّی عَلَیْہِ وَاسْتَخْرِجْ حَقِّی مِنْہُ، یا اللہ اس چور پر تو میری مدد کر اور اس سے میرا حق دلوا دے، آپ سے ایک اور روایت میں مروی ہے کہ اگرچہ مظلوم کے ظالم کو کوسنے کی رخصت ہے مگر یہ خیال رہے کہ حد سے نہ بڑھ جائے۔ عبد الکریم بن مالک جزری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں گالی دینے والے کو یعنی برا کہنے والے کو برا تو کہہ سکتے ہیں لیکن بہتان باندھنے والے پر بہتان نہیں باندھ سکتے۔

ایک اور آیت میں ہے وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ (الشوری:۴۱) جو مظلوم اپنے ظالم سے اس کے ظلم کا انتقام لے، اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، ابو داؤد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں دو گالیاں دینے والوں کا وبال اس پر ہے، جس نے گالیاں دینا شروع کیا، ہاں اگر مظلوم حد سے بڑھ جائے تو اور بات ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص کسی کے ہاں مہمان بن کر جائے اور میزبان اس کا حق مہمانی ادا نہ کرے تو اسے جائز ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنے میزبان کی شکایت کرے، جب تک کہ وہ حق ضیافت ادا نہ کرے۔

صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ آپ ہمیں اِدھر اُدھر بھیجتے ہیں، بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ ہماری مہمانداری نہیں کرتے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ میزبانی کریں تو درست، ورنہ تم ان سے لوازمات میزبانی خود لے لیا کرو۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ)

ارشاد رسول ﷺ ہے کہ جو مسلمان کسی اہل قبلہ کے ہاں مہمان بن کر جائے اور ساری رات گذر جائے لیکن وہ لوگ اس کی مہمانداری نہ کریں تو ہر مسلمان پر اس مہمان کی نصرت ضروری ہے تاکہ میزبان کے مال سے اس کی کھیتی سے بقدر مہمانی دلائیں۔ (مسند احمد) آپ ﷺ نے فرمایا ضیافت کی رات ہر مسلمان پر واجب ہے، اگر کوئی مسافر صبح تک محروم رہ جائے تو یہ اس میزبان کے ذمہ قرض ہے، خواہ ادا کرے خواہ باقی رکھے۔ (احمد)

زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنے والے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا {۱۴۹} النساء

جواب ترجمہ: اگر تم کوئی نیک کام علانیہ کرو یا خفیہ طور پر کرو، یا کسی برائی کو معاف کرو تو (بہتر ہے کیونکہ) اللہ بہت معاف کرنے والا ہے (اگرچہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو مزید مؤکد کیا اور عفو و درگزر اور بھلائی کے کاموں پر ابھارا، چنانچہ فرمایا: اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، یا کسی برائی کو معاف کر دو، تو یقیناً اللہ بہت زیادہ معاف فرمانے والا، بڑی قدرت والا ہے، یعنی اے لوگو! اگر تم بھلائی ظاہر کرو، خواہ وہ طاعت ہو، نیکی ہو، اچھی بات ہو یا اچھا عمل، یا وہ بھلائی تم چھپاؤ اور اسے خفیہ طور پر انجام دو، یا کسی برائی کو معاف کر دو اور ان لوگوں سے درگزر کرو جنھوں نے تمہارے ساتھ برا کیا، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے بہترین انعام عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہوں سے درگزر کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے حالانکہ وہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ بندوں کو پکڑ لے اور سزا دے، پس تم بھی ان اعلیٰ صفات کو اپناؤ تاکہ اللہ کی محبت اور رضا حاصل کر سکو۔

یہ آیت کریمہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بھلائی کرنے کی دعوت دیتی ہے، خواہ وہ نیکی علانیہ کی جائے یا پوشیدہ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ دوسروں کی خطاؤں کو معاف کیا جائے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں، صحیح حدیث میں ہے، صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور جو بندہ اللہ کے لیے معاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھا دیتا ہے اور جو بندہ اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ اسے بلند مقام عطا فرماتا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جان لو کہ خیر کے سارے اصول باوجود کثرت کے، دو باتوں میں سمٹ جاتے ہیں، ① حق تعالیٰ کے ساتھ سچائی اور اخلاص۔ ② مخلوق کے ساتھ حسن اخلاق اور مخلوق کے ساتھ تعلق دو چیزوں میں منحصر ہے۔ ① ان کو نفع پہنچانا۔ ② ان سے نقصان

دور کرنا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ”اگر تم بھلائی ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ“ نفع پہنچانے کی طرف اشارہ ہے، اور فرمان ”یا برائی کو معاف کر دو“ نقصان کو دور کرنے کی طرف اشارہ ہے، پس ان دو مختصر جملوں میں ہر قسم کی نیکی اور تمام اعمالِ خیر جمع کر دیے گئے ہیں۔

اللہ پر اور بلا تفریق تمام رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾ النساء

جواب ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر ایمان لائے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ کفر اور ایمان کے درمیان ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے واسطے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور رسولوں پر ان میں سے کسی کو جدا نہ کیا ان لوگوں کو اللہ جلد ان کا ثواب دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ: منافقین کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی برائیوں، ان کے باطل عقائد اور ان کے برے انجام کو بیان فرمایا، یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں، یعنی اللہ کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں اور اس کے رسولوں کی سچائی کو جھٹلاتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں، یعنی وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ پر ایمان کو تو مان لیں لیکن اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے انکار کر دیں، اس طرح وہ بظاہر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں اور

یہ کہ وہی کائنات کا خالق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے رسولوں یا ان میں سے بعض کا انکار کرتے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کر دیا کہ اللہ پر ایمان اور رسولوں پر ایمان کے درمیان فرق کرنا کفر ہے اور یہ اس لیے کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لازم کیا ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں لیکن وہ عبادت اسی طریقے سے کریں جسے اس نے اپنے رسولوں کی زبان سے شریعت کی صورت میں نازل فرمایا ہے، لہٰذا جب کسی نے رسولوں کی رسالت کا انکار کیا تو گویا اس نے ان کی شریعتوں کو رد کر دیا اور انہیں قبول نہ کیا اور یہ دراصل اس عبادت اور بندگی سے انکار ہے جس کا حکم دیا گیا تھا، پس یہ ایسے ہی ہے جیسے خالق (اللہ) کا انکار کیا جائے اور خالق کا انکار کفر ہے کیونکہ اس میں اطاعت اور بندگی کے ترک کا پہلو پایا جاتا ہے، اسی طرح رسولوں میں سے بعض کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جو ایک نبی کو بھی نہ ماننے کافر ہے، یہودی سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تمام نبیوں کو مانتے تھے، نصرانی افضل الرسل خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام انبیاء پر ایمان رکھتے تھے، سامرہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے بعد کسی کی نبوت کے قائل نہ تھے، حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے خلیفہ تھے، مجوسیوں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ اپنا نبی زردشت کو مانتے تھے لیکن جب یہ بھی ان کی شریعت کے منکر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے وہ شریعت ہی ان سے اٹھالی۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ: اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض (رسولوں) پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، یہ ان کے کفر اور انکار کی خبر ہے، یعنی وہ ڈٹ کر اور ضد کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، جیسے یہود نے کہا کہ ہم موسیٰ اور تورات کو مانتے ہیں مگر اس کے بعد آنے والے (رسولوں) کو نہیں مانتے اور جیسے نصاریٰ نے کہا کہ ہم عیسیٰ اور انجیل کو مانتے ہیں مگر اس کے علاوہ کو نہیں مانتے۔

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا: اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے اس قول کے ذریعے ایمان اور کفر کے درمیان کوئی درمیانی راستہ اختیار کریں، اور ایسا دین بنالیں جس پر وہ چل سکیں، حالانکہ یقیناً ان دونوں کے درمیان کوئی درمیانی راہ نہیں ہے، کیونکہ تمام رسولوں کو اللہ تعالیٰ نے اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی وحدانیت کی دعوت دیں، صرف اسی کی عبادت کی طرف بلائیں اور زمین میں اعلیٰ اخلاق کو پھیلائیں، پس جو کسی ایک رسول کا انکار کرے وہ درحقیقت سب ہی کا منکر ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "وَالْمَقْصُودُ أَنَّ مَنْ كَفَرَ بِنَبِيٍّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ، فَقَدْ كَفَرَ بِسَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ، فَإِنَّ الْإِيمَانَ وَاجِبٌ بِكُلِّ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللهُ إِلَى أَهْلِ الْأَرْضِ، فَمَنْ رَدَّ نُبُوَّتَهُ لِلْحَسَدِ أَوِ الْعَصَبِيَّةِ أَوِ التَّشَهِّي تَبَيَّنَ أَنَّ إِيمَانَهُ بِمَنْ آمَنَ بِهِ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ لَيْسَ إِيمَانًا شَرْعِيًّا، إِنَّمَا هُوَ عَنْ غَرَضٍ وَهَوًى وَعَصَبِيَّةٍ (تفسیر ابن کثیر) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک نبی کو نہ ماننے والا اللہ کے نزدیک تمام نبیوں کا منکر ہے، اس لئے کہ اگر اور انبیاء کو بوجہ نبی ہونے کے مانتا تو اس نبی کو ماننا بھی اسی وجہ سے اس پر ضروری تھا، جب وہ ایک کو نہیں مانتا تو معلوم ہوا کہ جنہیں وہ مانتا ہے انہیں بھی کسی دنیاوی غرض اور خواہشات کی وجہ سے مانتا ہے، ان کا شریعت ماننا یا نہ ماننا دونوں بے معنیٰ ہے، ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں، کسی نبی پر ان کا شرعی ایمان نہیں بلکہ تقلیدی اور تعصبی ایمان ہے جو قابل قبول نہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا: یعنی وہ لوگ جو ان بری صفات کے ساتھ متصف ہیں، پورے کے پورے کافر ہیں، کفر کی تاریکیوں میں جمے ہوئے ہیں۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا: اور ہم نے سب کافروں کے لیے ایک ایسا عذاب تیار کر رکھا ہے جو انہیں ذلیل و خوار کرے گا، یہ ان کے کفر اور انکار کا بدلہ ہو گا، پس ان کفار کو رسوائی آمیز عذاب کئے جائیں گے، کیونکہ جن پر یہ ایمان نہ لا کر ان کی توہین کرتے تھے اس کا بدلہ یہی ہے کہ انہیں ذلت والے عذاب میں ڈالا جائے گا، ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ خواہ غور و فکر کے بغیر نبوت کی تصدیق نہ کرنا ہو، خواہ حق واضح ہو چکنے کے بعد دنیوی وجہ سے منہ موڑ کر نبوت سے انکار کرنا ہو،

جیسے اکثر یہودی علماء کا شیوہ حضور ﷺ کے بارے میں تھا کہ محض حسد کی وجہ سے آپ ﷺ کی عظیم الشان نبوت کے منکر تھے اور آپ ﷺ کی مخالفت اور عداوت میں آکر مقابلے پر تل گئے، پس اللہ نے ان پر دنیا کی ذلت بھی مسلط کر دی اور آخرت کی ذلت کی مار بھی ان کے لئے تیار کر رکھی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ: رہے سچے ایمان والے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح خوشخبری دی ہے کہ "اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے، حقیقی ایمان کے ساتھ، اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہ کیا، انہوں نے کسی میں تفریق نہیں کی، سب پر ایمان لاتے ہیں، سب کا ادب واحترام بجالاتے ہیں، ان کو اللہ کی طرف سے کیا ملنے والا ہے، اس کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔

یہاں پر امت محمد ﷺ کی تعریف ہو رہی ہے کہ **أُمَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِنَّهُمْ يُؤْمِنُونَ بِكُلِّ كِتَابٍ أَنْزَلَهُ اللّٰهُ وَبِكُلِّ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ،** (ابن کثیر) یہ اللہ پر ایمان رکھ کر تمام انبیاء علیہم السلام کو اور تمام آسمانی کتابوں کو بھی الہامی کتابیں تسلیم کرتے ہیں، جیسے ایک اور آیت میں ہے **كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ،** وہ سب پر ایمان رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ: وہ لوگ جن کے دلوں میں کامل ایمان جم گیا ہے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان اوصافِ حمیدہ سے متصف فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اجر ضرور عطا فرمائے گا جن کا وعدہ اس نے کیا ہے۔ یہاں "سوف" کا لفظ اس اجر کے پختہ وعدے کو مزید مؤکد کرنے کے لیے ہے، تاکہ ظاہر ہو کہ یہ اجر لازماً ملنے والا ہے، اگرچہ بظاہر کچھ تاخیر ہو۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اور اللہ ہمیشہ سے نہایت بخشنے والا اور بے حد رحم کرنے والا ہے۔

یوں ان آیاتِ کریمہ نے کافروں اور مؤمنوں کے انجام کا تقابل پیش کیا ہے، تاکہ لوگ کفر اور گناہوں سے باز آجائیں اور اللہ کے احکام کو قبول کریں تاکہ وہ اس کی رضا حاصل کر سکیں۔

یہود و نصاریٰ کے جرائم کی فہرست

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا {۱۵۳} وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا {۱۵۴} فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا {۱۵۵} وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا {۱۵۶} وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا {۱۵۷} بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا {۱۵۸} وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا {۱۵۹} فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا {۱۶۰} وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا {۱۶۱} النساء

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب ﷺ) اہل کتاب آپ سے (جو) مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی کتاب نازل کرواؤ، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ) یہ لوگ تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے (موسیٰ سے) کہا تھا کہ ہمیں اللہ کھلی آنکھوں دکھاؤ، چنانچہ ان کی سرکشی کی وجہ سے ان کو بجلی کے کڑکے نے آپکڑا تھا، پھر ان کے پاس جو کھلی کھلی نشانیاں آئیں، ان کے بعد بھی انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا تھا۔ اس پر بھی ہم نے انہیں معاف کر دیا، اور ہم نے موسیٰ کو واضح اقتدار عطا کیا۔

اور ہم نے کوہ طور کو ان پر بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان سے کہا تھا کہ (شہر کے) دروازے میں جھکے ہوئے سروں کے ساتھ داخل ہونا، اور ان سے کہا تھا کہ تم ہفتہ کے دن کے بارے

میں حد سے نہ گزرنا اور ہم نے ان سے بہت پکا عہد لیا تھا۔ پھر ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس لیے کہ انہوں نے اپنا عہد توڑا، اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا، اور یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اس لیے وہ تھوڑی سی باتوں کے سوا کسی بات پر ایمان نہیں لاتے۔ اور اس لیے کہ انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، اور مریم پر بڑے بھاری بہتان کی بات کہی۔ اور یہ کہا کہ: ہم نے اللہ کے رسول مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا تھا، حالانکہ نہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا تھا، نہ انہیں سولی دے پائے تھے، بلکہ انہیں اشتباہ ہو گیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس سلسلے میں شک کا شکار ہیں، انہیں گمان کے پیچھے چلنے کے سوا اس بات کا کوئی علم حاصل نہیں ہے، اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کر پائے۔ بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس اٹھا لیا تھا، اور اللہ بڑا صاحب اقتدار، بڑا حکمت والا ہے اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے ضرور بالضرور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے، اور قیامت کے دن وہ ان لوگوں کے خلاف گواہ بنیں گے۔

غرض یہودیوں کی سنگین زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال کی گئی تھیں۔ اور اس لیے کہ وہ بکثرت لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔ اور سود لیا کرتے تھے، حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے تھے۔ اور ان میں سے جو لوگ کافر ہیں، ان کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

شان نزول: ① یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے نبی ﷺ سے کہا کہ اگر آپ ﷺ نبی ہیں تو ہمیں آسمان سے یکبارگی ایک کتاب لا کر دیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام لے آئے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

② یہود نے نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر کہا کہ اے محمد! ﷺ موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے تختیاں لے

کر آئے تھے، آپ ﷺ بھی اللہ کی طرف سے تختیاں لے کر آئیں، تاکہ ہم آپ ﷺ کی تصدیق کریں، ان کے اس مطالبے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر الوسیط للقرآن الکریم)

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۳ میں بیان کیے گئے مضمون کا خلاصہ یہ ہے، یہود و نصاریٰ نبی اکرم ﷺ سے ہٹ دھرمی کے طور پر مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ﷺ آسمان سے ہمارے لئے لکھی ہوئی کتاب اتار لائیں، قرآن یاد دلاتا ہے کہ ان کے آباء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا کہ ہم اللہ کو سامنے دیکھیں، جس پر بجلی نے ان کو پکڑا، پھر واضح دلائل دیکھنے کے باوجود انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی، مگر اللہ نے ان کو فوراً ہلاک نہ کیا اور معاف فرمایا، ساتھ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کھلی دلیل اور قوت عطا کی، یہاں اہل کتاب کی ضد، ہٹ دھرمی اور ان کی تاریخ کے جرائم کو واضح کیا گیا تاکہ وہ اپنی حیثیت پہچانیں۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۴ میں یہ بیان کیا گیا کہ بنی اسرائیل سے بار بار عہد لیا گیا، طور پہاڑ کو ان پر اٹھا کر عہد کی سختی ظاہر کی گئی، حکم دیا گیا کہ بیت المقدس کے دروازے میں عاجزی و سجدے کے ساتھ داخل ہوں، ہفتے کے دن شکار اور تجاوز سے باز رہیں، یہ سب احکام ان کو دیے گئے تھے، یہ سخت عہد کا حصہ تھے، لیکن ان کے وعدے صرف زبان تک تھے، عملی وفا نہیں تھی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۵ میں بیان کیے گئے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار عہد توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل پردہ دار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، اب وہ ایمان نہیں لاتے سوائے چند کے، بنی اسرائیل کے دل پر مہر لگ جانا بد عملی اور ضد کا نتیجہ ہے اور اللہ کی طرف سے سزا ہے۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا: سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۶ میں بیان کیے گئے مضمون کا منظر اور پس منظر یوں ہے "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرّہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس

بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا، جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی، اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آ گئے، تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا، مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے، مگر یکایک وہ بچہ گویا ہوا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (سورۃ مریم) اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادت مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریم علیہا السلام پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا، لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بد اعمالیوں پر ملامت کرنا شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے، اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولد الزنا، حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں، پس در حقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللّٰهِ: سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۷ میں یہودیوں کے ایک بے بنیاد اور بے سروپا دعویٰ قتل مسیح کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا، قرآن نے سختی سے رد کیا، حقیقت یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل ہوئے نہ سولی پر چڑھائے گئے، بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ کر دیا گیا، جو اختلاف کرتے ہیں وہ محض شک اور گمان میں ہیں، یہ بات یہاں ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت پر یقین صرف وحی سے ممکن ہے، محض قیاس یا تاریخ سے نہیں۔

نصاریٰ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہوئے اور تین دن قبر میں مردہ رہ کر زندہ ہو گئے اور اٹھ کر آسمان پر چڑھ گئے نصاریٰ کا یہ مسئلہ سراسر خلاف عقل ہے اس لیے کہ قتل اور صلب اور موت سب مخلوق کے لیے ہے نہ کہ خالق کے لیے اور اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب بلکہ صحیح وسالم اسی جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے اور یہود بے بہود کی جو جماعت ان کے قتل کے ارادہ سے ان کے مکان میں داخل ہوئی تھی انہی میں کا ایک شخص بحکم خداوندی حضرت مسیح علیہ السلام کی ہم شکل بنا دیا گیا، دشمنوں نے اسی کو مسیح سمجھ کر قتل کر ڈالا۔

قرآن کریم اس دعوے کی نہایت شدومد سے تردید کرتا ہے کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا مَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ اور قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ اللہ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا اور اہل کتاب کو اصل حقیقت کا علم ہی نہیں یہ لوگ شک اور اختلاف کی وادی تیہ میں سرگرداں ہیں۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۸ میں واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا اور وہ آسمان پر ہیں، یہ قرآن کریم کی شہادت ہے جو سب سے بڑی شہادت ہے اور نصاریٰ کے متعدد فرقے بھی اسی کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ: سورۃ النساء کی آیت ۱۵۹ میں واضح کیا گیا کہ ”اہل کتاب میں سے ہر ایک موت سے قبل ضرور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے گا (یعنی حقیقت واضح ہو جائے گی) اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان پر گواہ ہوں گے، دنیا میں ضد کے باعث لوگ جھٹلاتے ہیں، مگر موت کے وقت یا قیامت کے دن سب پر حقائق کھل جائیں گے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ: سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶۰ میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی نامناسب باتوں اور قباحتوں کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا کہ ”یہود کے ظلم اور اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے اللہ نے ان پر بہت سی پاک چیزیں حرام کر دیں جو پہلے حلال تھیں، یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ کے احکام میں سختی، ان کی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر آئی۔

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا: یعنی اپنے آپ کو اور دوسروں کو حق سے روکنا یہ بھی ان کے جرائم کی فہرست میں اضافہ ہے، یہ مصدر اگر صَدَّ يَصِدُّ سے ہو تو اس کا مطلب ہے ان کا سبیل اللہ (راہ خدا) سے اعراض وروگردانی کرنا، اگر یہ مصدر صَدَّ يَصُدُّ سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تقویٰ سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سَيُغْفَرُ لَنَا ہماری بخشش کر دی جائے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں حرام کر دی گئی تھیں، موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد وہ لوگوں کو روکتے تھے، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ دشمنی رکھتے تھے، ان کے پند و نصائح کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے، انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا، انہوں نے نبی کریم، رؤف ورحیم کی دعوت و تبلیغ کے لیے مشکلات کھڑی کرنے کی کوشش کی، علی الاعلان اور منافقانہ طور پر لوگوں کو جاہلیت پر کمربستہ رہنے کی کوشش کی، جن یہودیوں کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا یہ لوگوں کو جبت وطاغوت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے، ان کی انہی کارستانیوں کی فہرست مختلف پیرایہ بیان میں مختلف مقامات پر ذکر کی گئی ہے

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ: سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶۱ میں یہود کی ایک اور سرکشی کا بیان کیا جا رہا ہے، فرمایا ”یہود نے سود لیا حالانکہ اس سے سختی سے

روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال ناحق کھائے، ان کافروں کے لئے اللہ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، یہ بات یہاں عالم آشکار ہوگئی کہ معاشی ظلم، سود خوری اور حرام خوری ان کے گناہوں میں شامل تھے جن پر سخت وعید سنائی گئی۔

اہل کتاب راسخین فی العلم کا مقام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا {۱۶۲} النساء

جواب ترجمہ: البتہ ان (بنی اسرائیل) میں سے جو لوگ علم میں پکے ہیں اور مومن ہیں وہ اس (کلام) پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو (میرے حبیب) آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا تھا اور قابل تعریف ہیں وہ لوگ جو نماز قائم کرنے والے ہیں، زکوٰۃ دینے والے ہیں اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ الخ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کی مزید تاکید فرمائی کہ جنہیں ان کے اخلاص اور سچائی کی بنا پر عزت و تکریم کا مستحق بنایا، ان کو اجرِ عظیم کی بشارت دی۔ چنانچہ فرمایا: لیکن ان میں سے علم میں پختہ لوگ اور وہ اہلِ ایمان، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل کیا گیا اور جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔

رَاسِخُوْنَ: راسخ کی جمع ہے اور رسوخ کے معنی ہیں کسی چیز کا مضبوطی اور پائیداری کے ساتھ جم جانا، جیسے کہا جاتا ہے شَجَرَةٌ رَاسِخَةٌ یعنی ایسا مضبوط اور ثابت درخت جسے آندھیاں اور طوفان بھی اکھاڑ نہ سکیں، پس رَاسِخ فِي العِلم وہ ہے جو علم میں کامل ہو، جسے شبہات متزلزل نہ کر سکیں اور جو اپنے علم پر پوری طرح مہارت اور بصیرت رکھتا ہو، ایسا شخص جو حق سے نہ ہٹے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہود کی اکثریت برے اخلاق اور بدترین انجام پر ہے، لیکن ان میں ایسے بھی ہیں جو علم میں پختہ اور حق شناس ہیں، جنہوں نے اللہ کے دلائل کو سمجھا، ان کی تصدیق کی اور دل سے قبول کیا۔

راسخون فی العلم سے مراد وہ علماہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے، جو عقیدہ اور عمل ہر چیز میں راسخ اور کردار و اخلاق ہر پہلو سے جادہ مستقیم پر استوار تھے، یہود میں علما کم نہیں تھے، بے شمار تھے، لیکن شریعت ان کے لیے بس ایک نمائشی جامے کی حیثیت رکھتی تھی جس کو پہن کر وہ باہر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے، ان کے فکر و نظر اور ان کے قلب و روح سے اس علم کو کوئی تعلق نہیں تھا، یہ علماء ان تمام جرائم میں، جو اوپر مذکور ہوئے، اپنی قوم کے نہ صرف شریک تھے بلکہ وہی ان میں ان کے مرشد تھے اس وجہ سے ان سے تو اگر کسی چیز کی توقع کی جاسکتی تھی تو صرف اسی چیز کی کہ وہ قرآن اور پیغمبر ﷺ کی مخالفت میں اپنی قوم کی پیشوائی کریں، البتہ ان میں جو نفوس قدسیہ حکمت دین کی لذت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے، اس وجہ سے ان کو اپنی قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی، یہاں انہی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علما کے بجائے "راسخون فی العلم" کے لقب سے مشرف فرمایا ہے، یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پر جمنے والے ہیں۔ (انوار البیان)

وَالْمُؤْمِنُوْنَ: یعنی ان میں سے وہ لوگ جو ایمان لائے، ان کو پہلے علم میں رسوخ کی صفت سے متصف کیا اور پھر ایمان کے ساتھ یاد کیا تاکہ دونوں کا امتیاز واضح ہو، یہی لوگ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور پچھلی کتابوں پر بھی جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں۔

وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ: یہ جملہ اعراب میں "نصب علی المدح" ہے، یعنی ان نمازیوں کی تعریف اور مدح کے لیے بطورِ خاص ذکر کیا گیا، جیسا کہ امام زمخشری نے فرمایا کہ یہ نماز کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے اور یہ اسلوبِ عرب میں معروف ہے، لہٰذا کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مصحف میں غلطی ہے، کیونکہ ایسے گمان اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں۔

وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: یعنی وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، یہ سب صفات راسخون فی العلم کے ساتھ مل کر ذکر ہوئیں۔

اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا: یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو اس صفت کے مالک ہیں، جنہیں ہم قیامت کے دن عظیم اجر عطا کریں گے، یہ اجر وہ ہے جس کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، کیونکہ یہ لوگ ایمانِ کامل اور عملِ صالح دونوں میں ممتاز ہوئے۔

غور و فکر و تدبر کرنے سے یہاں اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ یہ آیات نہایت جامع ہیں، جن میں یہود کے حالات و اخلاق کا مفصل ذکر ہے، سب سے پہلے ان کی بداعمالیوں کا ذکر کیا گیا، ان کے ضدی سوالات، اللہ کی گستاخی، بچھڑے کی پوجا، اللہ کے احکام کی نافرمانی، عہد شکنی، انبیاء علیہم السلام کا قتل، آیاتِ الٰہی کا انکار، دلوں پر قفل ہونے کا دعویٰ، مریم پاکباز پر بہتان، اور مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کا جھوٹا دعویٰ وغیرہ۔

پھر اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کی یاد دہانی بھی دلائی، تاکہ وہ شکر کریں اور توبہ کریں، پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کی پاکدامنی کا دفاع کیا اور یہ بتایا کہ یہود کے جھوٹے دعوے محض گمان ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر سکے، نہ سولی دے سکے، بلکہ اللہ نے معاملہ ان کے گمان کے برعکس کیا، پھر وضاحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سب کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ عدل فرماتا ہے، لہٰذا یہود کی اکثریت بداعمال ہے، لیکن جو ان میں سے علم میں پختہ، سچے اور مخلص مومن ہیں، ان کی تعریف فرمائی، اور انہیں بڑے اجر کی بشارت دی، آخر میں فرمایا یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کرے اور اللہ بڑے فضل والا ہے، یہ آیات ہر صاحبِ دل اور غور کرنے والے کے لیے عبرت و نصیحت سے بھری ہوئی ہیں۔

چند جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا {۱۶۳} وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا {۱۶۴} رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا {۱۶۵} النساء

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب) ہم نے آپ کے پاس اسی طرح وحی بھیجی ہے جیسے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کے پاس بھیجی تھی، اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کے پاس، اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی۔ اور بہت سے رسول ہیں جن کے واقعات ہم نے پہلے تمہیں سنائے ہیں اور بہت سے رسول ایسے ہیں کہ ہم نے ان کے واقعات تمہیں نہیں سنائے۔ اور موسیٰ سے تو اللہ براہ راست ہم کلام ہوا۔ یہ سب رسول وہ تھے جو (ثواب کی) خوشخبری سنانے اور (دوزخ سے) ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تاکہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔

اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ: الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶۳ میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ پر جو وحی نازل کی گئی ہے یہ کوئی نیا سلسلہ نہیں بلکہ سنتِ الٰہی ہے کہ ہم نے پہلے انبیاء علیہم السلام پر بھی وحی اتاری، حضرت نوح علیہ السلام کو بطور خاص ذکر کیا کیونکہ وہ اولوالعزم انبیاء علیہم السلام میں سب سے پہلے ہیں اور ان کے بعد کے سب انبیاء علیہم السلام بھی وحی کے ذریعے ہی آسمانی ہدایات سے فیض یاب ہوتے رہے اور اللہ کی مخلوق کو ربانی پیغام سے آگاہ کرتے رہے، یہاں چند جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کے نام لیے گئے، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اسباط (یعقوب علیہ السلام کی اولاد اور ان کے قبائل کے انبیاء علیہم السلام)، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان علیہم السلام، یہاں خصوصی طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کو "زبور" جیسی کتاب عطا کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے، یہاں نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمایا گیا کہ آپ ﷺ کی نبوت سابقہ انبیاء علیہم السلام کے مشن سے جڑی ہوئی ہے، یہ الگ یا منقطع نہیں ہے۔

سوال دوسرے انبیاء علیہم السلام کے نام ذکر فرما کر صرف حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ "زبور" کا خصوصی ذکر کیوں کیا گیا؟

جواب مفسرین نے اس کی کئی حکیمانہ وجوہات بیان کی ہیں: ① حضرت داؤد علیہ السلام کو کتاب دیے جانے کا خاص اعزاز، بہت سے انبیاء علیہم السلام کو وحی اور صحیفے عطا ہوئے، لیکن زبور ایک مستقل آسمانی کتاب تھی جو حضرت داؤد علیہ السلام کو ملی، اس کا ذکر اس لیے نمایاں کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو کہ وہ بھی "صاحبِ کتاب" نبی تھے جیسے موسیٰ علیہ السلام کو تورات، عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن ملا۔

جواب ② تسلسل اور تقابل کا پہلو، اس سے پہلے ذکر ہوا: **أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِن بَعْدِهٖ... وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ**، یہاں صرف وحی کا بیان ہے، لیکن چونکہ اہل کتاب خصوصاً یہود کے سامنے خطاب تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاں معروف نبی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ان کی کتاب "زبور" کا ذکر بطور شہادت پیش کیا تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں کہ داؤد علیہ السلام صاحبِ کتاب نہیں تھے۔

جواب ③ زبور کا ذکر اس کے خاص مضامین کی وجہ سے کیا گیا ہے، زبور میں بنیادی طور پر ذکر، حمد و ثناء، مناجات اور مواعظ ہیں، شریعت کے تفصیلی احکام نہیں، قرآن نے زبور کو بطور دلیل اس لیے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی صرف "احکام شریعت" کے لیے نہیں آتی، بلکہ اللہ کے ذکر و توحید کے لیے بھی آتی ہے، اس سے وحی کی جامعیت ثابت ہوتی ہے۔

جواب ④ داؤد علیہ السلام کی خصوصیات کے سبب ذکر کیا گیا، حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ نے نبوت، حکمرانی اور زبور تین عظیم نعمتیں دیں (دیکھیے: سورۃ ص، ۲۶، ۱۷)۔ یہاں صرف "زبور" کا ذکر کیا گیا تاکہ اہل کتاب کو یاد دلایا جائے کہ ایک عظیم بادشاہ اور نبی کو بھی اللہ نے کتاب دی تھی، لہٰذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن ملنا کوئی نئی بات نہیں۔

جواب ⑤ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، داؤد علیہ السلام کا ذکر بطور خاص اس لیے آیا کہ یہود داؤد علیہ السلام کو نبی مانتے تھے اور ان کی کتاب کو بھی جانتے تھے، تو اللہ نے ان پر حجت قائم کرنے کے لیے ذکر کیا۔

جواب ⑥ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کا نام خاص طور پر ذکر فرما کر ان پر ہونے والی نعمت "زبور" کو واضح کیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ اللہ اپنی وحی جسے چاہے دیتا ہے۔

جواب ⑦ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، زبور ایسی کتاب تھی جس میں زیادہ تر ذکر و مواعظ تھے، اس کا ذکر کر کے اللہ نے وحی کے تنوع اور جامعیت کو ظاہر فرمایا۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ... وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بعض کا نہیں، امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق قرآن میں تقریباً ۲۵ انبیاء علیہم السلام کے نام آئے ہیں، لیکن صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

انبیاء ورسل علیہم السلام کی تعداد: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ! انبیاء علیہم السلام کی تعداد کتنی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مِائَةُ أَلْفٍ وَأَرْبَعَةٌ وَعِشْرُونَ أَلْفًا، الرُّسُلُ مِنْهُمْ ثَلَاثُمِائَةٍ وَخَمْسَةَ عَشَرَ، جَمًّا غَفِيرًا**، (یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں سے رسول تین سو پندرہ ہیں جو ایک بہت بڑی جماعت ہے۔ (مسند احمد، مستدرک حاکم، مشکوٰۃ المصابیح) اس روایت کو بعض محدثین نے حسن کہا ہے اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے، مگر محدثین و مفسرین کے نزدیک یہی مشہور قول ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور رسل کی تعداد ۳۱۵ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت بیان کی گئی کہ اللہ نے ان سے براہِ راست کلام کیا (بغیر کسی واسطہ کے)، یہ **تَكْلِيمًا** تاکید کے ساتھ آیا تاکہ ان کا یہ امتیاز واضح ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ: الخ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶۴ میں ارشاد ہے کہ تمام رسول دو کاموں کے لیے مبعوث کیے گئے، مبشرین: ایمان لانے والوں کے لیے جنت اور رحمت کی بشارت دینا، ثواب کی خوشخبری سنانا، منذرین: کافروں اور گناہگاروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا، مقصد یہ تھا

کہ قیامت کے دن کوئی یہ حجت نہ کرسکے کہ ہمیں تو حق کا پیغام پہنچا ہی نہیں، ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے مطابق یہ اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: یعنی اللہ غالب بھی ہے اور اپنے فیصلوں میں حکمت والا بھی، کوئی اس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتا اور نہ ہی وہ ظلم کرتا ہے۔

جامع نکات: وحی اللہ کی طرف سے نبیوں کے ساتھ ہمیشہ کا تعلق ہے اور نبی ﷺ کا منصب اسی تسلسل کی کڑی ہے، سب انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی تھا، توحید اور اطاعتِ الٰہی، شریعتوں میں اختلاف ہوا لیکن مقصد ایک ہی رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلامِ الٰہی سے شرف بیان کرکے نبی ﷺ کو تسلی دی گئی کہ آپ ﷺ بھی اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں کے قافلے میں شامل ہیں، رسالت کا مقصد: بشارت، انذار اور اتمامِ حجت۔ اس کے بعد کسی قوم کے پاس انکار کا عذر باقی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ اپنی عزت اور حکمت کے ساتھ تمام امور کو انجام دیتا ہے، اس کی شریعت اور فیصلوں میں کوئی نقص نہیں۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے اسماء، عمریں، مدت نبوت و میدان کار

نبی کا نام	نبی کی عمر	بوقت نبوت عمر	مدت نبوت	علاقہ، قوم
① آدم علیہ السلام	۹۳۰ سال			
② ادریس علیہ السلام	۳۶۵سال		قریباً ۱۲۰سال	بابل۔ مصر
③ نوح علیہ السلام	۹۵۰سال	۴۰سال	۹۵۰سال	عراق
④ ہود علیہ السلام	۱۵۰سال		۱۲۰سال	عاد (یمن، احقاف)
⑤ صالح علیہ السلام	۱۵۸ سال		۲۰سال	مدائن صالح، حجر
⑥ ابراہیم علیہ السلام	۱۷۵سال	۴۰سال	کئی دہائیاں	بابل، شام فلسطین، مکہ
⑦ لوط علیہ السلام	۸۰سال		۳۰سال	سدوم، اردن، فلسطین
⑧ اسماعیل علیہ السلام	۱۳۷سال		۵۰سال	مکہ مکرمہ

⑨ اسحاق علیہ السلام	۱۸۰ سال		دہائیاں	فلسطین
⑩ یعقوب علیہ السلام	۱۴۷ سال		دہائیاں	کنعان، فلسطین
⑪ یوسف علیہ السلام	۱۲۰ سال	۳۰ سال	۷۰ سال	مصر
⑫ شعیب علیہ السلام	۱۰۵ سال		۵۰ سال	مدین، اردن، اطراف
⑬ ایوب علیہ السلام	۱۴۰ سال		کئی دہائیاں	شام یا حوران
⑭ ذوالکفل علیہ السلام	۷۵ سال		مختصر	عراق یا شام
⑮ موسیٰ علیہ السلام	۱۲۰ سال	۴۰ سال	۴۰ سال	مصر، مدین، سینا
⑯ ہارون علیہ السلام	۱۲۳ سال	۸۳ سال	۴۰ سال	مصر، سینا
⑰ داؤد علیہ السلام	۱۰۰ سال	۳۰ سال	۴۰ سال	بیت المقدس، فلسطین
⑱ سلیمان علیہ السلام	۶۰ سال	نوجوانی میں نبی	۴۰ سال	فلسطین
⑲ الیاس علیہ السلام	عمر نامعلوم	نامعلوم	کئی سال	بعلبک (لبنان)
⑳ الیسع علیہ السلام	عمر نامعلوم	معلوم نہیں	کئی سال	شام
㉑ یونس علیہ السلام	۱۰۰ سال	معلوم نہیں	۴۰ سال	نینویٰ (عراق)
㉒ زکریا علیہ السلام	۱۲۰ سال	معلوم نہیں	کئی دہائیاں	بیت المقدس
㉓ یحییٰ علیہ السلام	۳۰ سال	بچپن میں ہی نبوت ملی	مختصر	فلسطین
㉔ عیسیٰ علیہ السلام	۳۳ سال	بچپن میں ہی نبی	تقریباً ۳ سال تبلیغ	فلسطین، بیت المقدس
㉕ محمد صلی اللہ علیہ وسلم	۶۳ سال	۴۰ سال	۲۳ سال	مکہ و مدینہ

رسالت محمدی کے سب سے بڑے گواہ

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز شان نزول بھی بیان کیجیے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا {۱۶۶}

النساء

جواب ترجمہ: لیکن اللہ اس پر شاہد ہے جو آپ پر نازل کیا کہ اسے اپنے علم سے نازل کیا اور فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ گواہی دینے والا کافی ہے۔

شان نزول: ① روساء اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ ہم نے آپ ﷺ کے بارے میں یہود سے دریافت کیا، ان کا خیال ہے کہ وہ آپ ﷺ کو نہیں پہچانتے آپ ﷺ ہمیں کوئی ایسی دلیل لادیں جس سے ثابت ہو کہ اللہ نے آپ ﷺ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول) ② جب یہودیوں سے آپ ﷺ کی نبوت کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو یہودیوں نے آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی دیتا ہے جس نے آپ ﷺ پر ایک معجز کتاب قرآن کریم کی شکل میں نازل فرمائی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی آپ ﷺ کے بارے میں گواہی دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دَخَلَ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جماعةٌ مِنَ الْيَهُودِ، فَقَالَ لَهُمْ: إِنِّي لَأَعْلَمُ وَاللهِ إِنَّكُمْ لَتَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللهِ، فَقَالُوا مَا نَعْلَمُ ذَالِكَ، فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: {لٰكِنِ اللهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَآئِكَةُ يَشْهَدُونَ وَكَفٰى بِاللهِ شَهِيدًا (تفسیر ابن کثیر ج ۲/ ۴۷۶)

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہود کی ایک جماعت حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں اور اللہ کی قسم! بے شک تم بھی جانتے ہو کہ بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، انہوں نے کہا: ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

لٰكِنِ اللهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ: اللہ تعالیٰ واضح فرمارہے ہیں کہ اگر یہود آپ ﷺ کے دعوائے رسالت کی تصدیق نہیں کرتے تو نہ کریں اللہ تو اس معجز کتاب قرآن کریم کی شہادت دے رہا ہے جو آپ ﷺ کی نبوت پر شاہد ہے، اگر یہ انکار کر رہے ہیں آپ ﷺ کی تکذیب کر رہے

ہیں تو یہ کتاب ہدایت اپنی فصاحت و بلاغت کے ایسے دلائل اور براہین پیش کر رہی ہے جس کی نظیر اور مثال پیش کرنے سے پہلے اور پچھلے سب عاجز اور درماندہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی گواہی کا مطلب واضح ہے کہ وہ معجزات اور براہین قاطعہ کے ذریعے یہ بات ثابت کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ: اسی طرح اللہ کے فرشتے بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں، جب اللہ اور ملائکۃ اللہ آپ ﷺ پر نازل کی جانے والی کتاب اور آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی دے رہے ہیں تو کسی اور کی ضرورت ہی نہیں ہے، آپ ﷺ پرواہ نہ کریں، اس لیے کہ اللہ رب العالمین ہے، وہ سارے جہانوں کا پالنہار ہے، اسی طرح آسمانی فرشتے آپ ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں، جس کی تصدیق رب العالمین کرے، عرش کے فرشتے، کرسی کے فرشتے، ساتوں آسمانوں کے فرشتے تصدیق کریں تو ایسے شخص کو چاہیے کہ یہود جیسے کمینے لوگوں کی تصدیق و تکذیب کی پرواہ نہ کرے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: یہ جملہ بہت عظیم حقیقت بیان کرتا ہے کہ اگر ساری دنیا انکار کرے تب بھی اللہ کی گواہی کافی ہے، اللہ سب سے بڑا سچا گواہ ہے، اللہ کی گواہی کے بعد کسی اور گواہی کی حاجت نہیں، مخلوق کی تصدیق یا تکذیب سے حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ابن کثیر لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی نبوت پر خود گواہ ہے کہ وہ سچا ہے اور یہ سب سے بڑی گواہی ہے، اس کے بعد فرشتوں کی گواہی بھی ہے، پھر فرمایا کہ اللہ کی گواہی کافی ہے یعنی اگر کوئی اور نہ بھی مانے تب بھی اللہ کی گواہی کامل اور کافی ہے، علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس آیت میں نبی ﷺ کی دلجوئی ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ اور مشرکین آپ کی رسالت نہ مانیں تو غمگین نہ ہوں، کیونکہ اللہ نے گواہی دے دی اور یہی سب سے بڑی حجت ہے۔

کفار اور راہِ حق سے روکنے والوں کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلٰلًا بَعِيدًا {۱۶۷} إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا {۱۶۸} إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللهِ يَسِيرًا {۱۶۹} النساء

جواب ترجمہ: یقین جانو کہ جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے وہ بھٹک کر گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے (اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روک کر ان پر) ظلم کیا ہے اللہ ان کو بخشنے والا نہیں ہے، اور نہ ان کو کوئی اور راستہ دکھانے والا ہے۔ سوائے دوزخ کے راستے کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بات اللہ کے لیے بہت معمولی بات ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلٰلًا بَعِيدًا: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور (خود بھی) اللہ کے راستے سے روکا، وہ یقیناً دور کی گمراہی میں جا پڑے۔ یہاں دو جرم بیان ہوئے، کفر کرنا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو نہ ماننا۔ صدّ عن سبیل اللہ: دوسروں کو ایمان لانے سے روکنا، حق کے مقابل باطل پھیلانا۔ اللہ تعالیٰ نے اس رویے کو "ضلالاً بعیداً" (بہت دور کی گمراہی) کہا، یعنی یہ صرف عام بھٹکاؤ نہیں بلکہ ایسی گمراہی ہے جس سے واپسی مشکل ہے، کیونکہ انہوں نے خود بھی حق نہ مانا اور دوسروں کے لیے بھی رکاوٹ بنے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا: بے شک جنہوں نے کفر کیا اور (اپنے کفر کے ساتھ دوسروں پر) ظلم بھی کیا، اللہ ان کو نہ معاف کرنے والا ہے اور نہ ہی انہیں کسی راہِ ہدایت پر چلائے گا۔ یہاں "کفر" کے ساتھ "ظلم" کا اضافہ ہوا۔ ظلم سے مراد: اپنے اوپر ظلم (ایمان نہ لا کر خود کو ہلاکت میں ڈالنا)، دوسروں پر ظلم (ان کو گمراہ کرنا، حق چھپانا، نبی ﷺ کو ایذا دینا وغیرہ)۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، کیونکہ انہوں نے جان بوجھ کر کفر اور ظلم کو اختیار کیا، اللہ انہیں راستہ نہیں دکھائے گا، یعنی وہ ہمیشہ گمراہی میں رہیں گے اور ان کے لیے ہدایت کے دروازے بند کر دیے گئے۔

اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا : مگر جہنم کا راستہ (ہی ان کے لیے ہے)، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اللہ پر آسان ہے، جب اللہ نے فرمایا کہ ان کے لیے کوئی راستہ نہیں، تو وضاحت کر دی کہ ان کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے، جہنم کا راستہ، یہ عذاب ہمیشہ کا ہے خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا کیونکہ ان کا کفر دائمی ہے اور انہوں نے توبہ کے دروازے بند کر دیے، آخر میں فرمایا: وَكَانَ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا یعنی اللہ کے لیے یہ فیصلہ بالکل آسان ہے، وہ سب پر غالب ہے، اس کے لیے کافروں کو جہنم میں ڈالنا کوئی مشکل نہیں۔

رسول برحق پر ایمان لانے میں ہی بہتری ہے

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر بیان کریں

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۱۷۰} النساء

جواب اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ٹھیک بات لے کر رسول آچکا سو مان لو تا کہ تمہارا بھلا ہو اور اگر انکار کرو گے تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ : الخ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہارے پاس ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ دین اسلام اور دین حق تمہارے رب کی طرف سے لے کر آچکے ہیں اس لیے تم ان کی تصدیق کرو اور ان کی پیروی بھی کرو، آپ ﷺ پر ایمان لانا ہی تمہارے لیے بہتری اور بھلائی کی بات ہے، اگر تم اپنے کفر وانکار پر ہی جمے رہے تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں کہ تم ایمان لاؤ، اس لیے کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے وہ تمہاری باتوں اور تمہارے کرتوتوں کو اچھی طرح جانتا ہے، وہ اپنی شریعت اور اپنے امر میں حکیم ہے، جب زمین اور آسمان دونوں ہی اس کے لیے عاجزی سے جھکے ہوئے ہیں تو تمہیں بدرجہ اَولیٰ اس کی ذات پر ایمان لانا چاہیے

اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا چاہیے اور قرآن کریم پر ایمان لانا چاہیے جو نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر اُتارا گیا ہے، اس آیت میں دلیل ہے نبی کریم ﷺ کی رسالت کے عموم پر۔

نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر ایمان لانے میں ہی ہر شخص کے لیے عافیت اور بہتری کا پیغام ہے، جو آپ ﷺ پر ایمان لائے گا وہ دونوں جہانوں میں کامیابی کے تمغے پائے گا، جو انکار اور جحود سے کام لے گا وہ دونوں جہانوں میں ناکامی کا منہ دیکھے گا، کوئی ایمان لائے گا تو اس کا اپنا ہی بھلا ہو گا، ورنہ اللہ بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کون ایمان میں سچا ہے اور کون منافق، کون اس کے دین کے لیے قربانی دیتا ہے اور کون محض زبانی دعویٰ کرتا ہے، جنت، نبوت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت کے مقامات وہی لوگوں کو عطا کرتا ہے جو اس کے علم میں اہل اور مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں حکمت ہے، وہ جسے جس درجے پر فائز کرتا ہے، محض اتفاق یا ناانصافی سے نہیں بلکہ اپنی حکمتِ کاملہ اور عدل کے مطابق کرتا ہے، کسی کو انعام دینا، کسی کو بلند درجہ عطا کرنا، یا کسی کو محروم رکھنا، سب حکمت اور مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔

غلو اور انتہا پسندی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ۬ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا {۱۷۱} النساء

جواب ترجمہ: اے اہل کتاب تم اپنے دین میں حد سے نہ نکلو اور اللہ کی شان میں سوائے پکی بات کے نہ کہو بیشک مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا ایک کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہے سو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ خدا

تین ہیں اس بات کو چھوڑ دو تمہارے لیے بہتر ہو گا بیشک اللہ اکیلا معبود ہے وہ اس سے پاک ہے اس کی اولاد ہو اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز کافی ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ: الخ اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں سچے عقیدے سے تجاوز نہ کرو، اللہ کے بارے میں سچی بات کے علاوہ کچھ نہ کہو، اللہ کے لیے بیوی اور اولاد تجویز نہ کرو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ کے رسول ہیں جنہیں اللہ نے حق کے ساتھ بھیجا ہے اور انہیں ایک ایسے کلمے کے ذریعے پیدا کیا ہے جو حضرت جبریل علیہ السلام حضرت مریم کی طرف لے کر آئے تھے اور وہ کلمہ لفظ: کن: ہے، یہ اللہ کی طرف سے ایک پھونک تھی جو جبریل نے اس کے حکم سے حضرت مریم میں پھونکی، اس لیے تم اس بات کو مان لو کہ اللہ ایک ہی ہے، اس کے تابعدار بن جاؤ، اس کے رسولوں کی تصدیق کرو جو کچھ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف لے کر آئے ہیں اس پر عمل کرو، حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کو اللہ کا شریک مت ٹھہراؤ، اس جملے سے باز آجاؤ جو تم کہتے ہو، یہی تمہارے لیے بہتری ہے، بے شک اللہ اکیلا معبود ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اسی کی ملکیت ہے، اس کے لیے بیوی اور اولاد کہاں سے آگئی ہے؟

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حد سے نکل گئے تھے اور نبوت سے بڑھا کر الوہیت تک پہنچا رہے تھے، بجائے ان کی اطاعت کے عبادت کرنے لگے تھے، بلکہ اور بزرگان دین کی نسبت بھی ان کا عقیدہ خراب ہو چکا تھا، وہ انہیں بھی جو عیسائی دین کے عالم اور عامل تھے معصوم محض جاننے لگ گئے تھے اور یہ خیال کر لیا تھا کہ جو کچھ یہ ائمہ دین کہہ دیں اس کا ماننا ہمارے لئے ضروری ہے، جھوٹ، باطل، ہدایت و ضلالت کے پرکھنے کا کوئی حق ہمیں حاصل نہیں، جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ (التوبہ: ۳۱) مسند احمد میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا، لَا تَطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ، مجھے تم ایسا نہ بڑھانا جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا، میں تو صرف ایک بندہ ہوں پس تم مجھے عبد اللہ اور رسول اللہ کہنا۔

ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے آپ سے کہا اے محمد ! ﷺ اے ہمارے سردار اور سردار کے لڑکے، اے ہم سب سے بہتر اور بہتر کے لڑکے ! تو آپ نے فرمایا، يَا أَيُّهَا النَّاسُ، عَلَيْكُمْ بِقَوْلِكُمْ، وَلَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ، أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ، وَاللهِ مَا أُحِبُّ أَنْ تَرْفَعُونِي فَوْقَ مَنْزِلَتِي الَّتِي أَنْزَلَنِي اللهُ عَزَّ وَجَلَّ، لوگو ! اپنی بات کا خود خیال کر لیا کرو تمہیں شیطان بہکانہ دے، میں محمد بن عبد اللہ ہوں، میں اللہ کا غلام اور اس کا رسول ہوں، قسم اللہ کی میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے مرتبے سے بڑھا دو، جو اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔

قرآن کی ایک اور آیت میں ہے مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (المائدہ:۷۵) یعنی مسیح بن مریم صرف رسول اللہ ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں، ان کی والدہ سچی ہیں، یہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران:۵۹) عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے جسے مٹی سے بنا کر فرمایا ہو جا پس وہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی اور ہم نے اپنی روح پھونکی اور خود اسے اور اس کے بچے کو لوگوں کے لئے اپنی قدرت کی علامت بنایا۔ (الانبیآء:۹۱)

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (التحریم :۱۲) سے آخر سورت تک، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت ایک اور آیت میں ہے اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الزخرف:۵۹) وہ ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا، پس یہ مطلب نہیں کہ خود کلمہ الٰہی عیسیٰ بن گیا بلکہ کلمہ الٰہی سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے آیت اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (آل عمران :۴۵) کی تفسیر میں جو کچھ کہا ہے اس سے یہ مراد ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ جو حضرت جبریل کی معرفت پھونکا گیا، اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

صحیح بخاری میں ہے جس نے بھی اللہ کے ایک اور لاشریک ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عبد و رسول ہونے کی، عیسیٰ کے عبد و رسول ہونے کی اور یہ کہ آپ اللہ کے کلمہ سے تھے جو مریم کی طرف پھونکا گیا تھا اور اللہ کی پھونکی ہوئی روح تھے اور جس نے جنت دوزخ کو برحق مانا وہ خواہ کیسے ہی اعمال پر ہو، اللہ پر حق ہے کہ اسے جنت میں لے جائے، ایک روایت میں ہے کہ جنت کے آٹھوں دروازوں میں سے جس سے چاہے داخل ہو جائے۔

جیسا کہ جناب عیسیٰ کو آیت و حدیث میں (روح منہ) کہا ہے ایسے ہی قرآن کی ایک آیت میں ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:۱۳) اس نے مسخر کیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، تمام کا تمام اپنی طرف ہے، یعنی اپنی مخلوق اور اپنے پاس کی روح سے، پس لفظ من تبعیض (اس کا حصہ) کے لئے نہیں جیسے ملعون نصرانیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا ایک جزو تھے بلکہ من ابتداء کے لئے ہے، جیسے کہ دوسری آیت میں ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں روح منہ سے مراد رسول منہ ہے اور لوگ کہتے ہیں آیت (محبتہ منہ) لیکن زیادہ قوی پہلا قول ہے یعنی آپ پیدا کئے گئے ہیں، روح سے جو خود اللہ کی مخلوق ہے، پس آپ کو روح اللہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے (ناقۃ اللہ) اور بیت اللہ کہا گیا ہے یعنی صرف اس کی عظمت کے اظہار کے لئے اپنی طرف نسبت کی اور حدیث میں بھی ہے کہ میں اپنے رب کے پاس اس کے گھر میں جاؤں گا، پھر فرماتا ہے تم اس کا یقین کر لو کہ اللہ واحد ہے بیوی بچوں سے پاک ہے اور یقین مان لو کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلام اللہ کی مخلوق اور اس کے برگزیدہ رسول ہیں، تم تین نہ کہو یعنی عیسیٰ اور مریم کو اللہ کا شریک نہ بناؤ اللہ کی الوہیت شرکت سے مبرا ہے۔

سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدہ :۷۳) یعنی جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے وہ کافر ہو گئے، اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے، اس کے سوا

کوئی اور لائق عبادت نہیں۔

سورۃ مائدہ کے آخر میں ہے کہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال ہو گا کہ اپنی اور اپنی والدہ کی عبادت کا حکم لوگوں کو تم نے دیا تھا؟ آپ صاف طور پر انکار کر دیں گے، نصرانیوں کا اس بارے میں کوئی اصول ہی نہیں ہے، وہ بری طرح بھٹک رہے ہیں اور اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں، ان میں سے بعض تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود اللہ مانتے ہیں، بعض شریک الوہیت مانتے اور بعض اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اگر دس نصرانی جمع ہوں تو ان کے خیالات گیارہ ہوں گے۔

سعید بن بطریق اسکندری جو سن ۴۰۰ھ کے قریب گذرا ہے اس نے اور بعض ان کے اور بڑے علماء نے ذکر کیا ہے کہ قسطنطین بانی قسطنطنیہ کے زمانے میں اس وقت کے نصرانیوں کا اس بادشاہ کے حکم سے اجتماع ہوا، جس میں دو ہزار سے زیادہ ان کے مذہبی پیشوا شامل ہوئے تھے، ان کے باہم اختلاف کا یہ حال تھا کہ کسی بات پر ستر اسی آدمیوں کا اتفاق مفقود تھا، دس کا ایک عقیدہ ہے، بیس کا ایک خیال ہے، چالیس اور ہی کچھ کہتے ہیں، ساٹھ اور طرف جا رہے ہیں، غرض ہزار ہا کی تعداد میں سے بہ مشکل تمام تین سو اٹھارہ آدمی ایک قول پر جمع ہوئے، بادشاہ نے اسی عقیدہ کو لے لیا، باقی کو چھوڑ دیا اور اسی کی تائید و نصرت کی اور ان کے لئے کلیساء اور گرجے بنا دئے اور کتابیں لکھوا دیں، قوانین ضبط کر دیئے، یہیں انہوں نے امانت کبریٰ کا مسئلہ گھڑا، جو دراصل بدترین خیانت ہے، ان لوگوں کو ملکانیہ کہتے ہیں، پھر دوبارہ ان کا اجتماع ہوا، اس وقت جو فرقہ بنا اس کا نام یعقوبیہ ہے۔

پھر تیسری مرتبہ کے اجتماع میں جو فرقہ بنا اس کا نام نسطوریہ ہے، یہ تینوں فرقے اقانیم ثلثہ کو حضرت عیسیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں، ان میں بھی باہم دیگر اختلاف ہے اور ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک تو تینوں کافر ہیں۔

اللہ فرماتا ہے اس شرک سے باز آؤ، باز رہنا ہی تمہارے لئے اچھا ہے، اللہ تو ایک ہی ہے، وہ توحید والا ہے، اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہو، تمام چیزیں اس کی مخلوق ہیں اور اس کی ملکیت میں ہیں، سب اس کی غلامی میں ہیں اور سب اس کے قبضے میں ہیں، وہ ہر چیز پر وکیل ہے، پھر مخلوق میں سے کوئی اس کی بیوی اور کوئی اس کا بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟

دوسری آیت میں رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (الانعام:۱۰۱) یعنی وہ تو آسمان و زمین کی ابتدائی آفرینش کرنے والا ہے، اس کا لڑکا کیسے ہو سکتا ہے؟

سورۃ مریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا {۸۸} لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا {۸۹} تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا {۹۰} أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا {۹۱} وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا {۹۲} إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا {۹۳} لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا {۹۴} وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا {۹۵} مریم)

اور کہتے ہیں کہ رحمان نے بیٹا بنالیا، البتہ تحقیق تم سخت بات زبان پر لائے ہو کہ جس سے ابھی آسمان پھٹ جائیں اور زمین چر جائے اور پہاڑ ٹکڑے ہو کر گر پڑیں۔ اس لئے کہ انہوں نے رحمان کے لیے بیٹا تجویز کیا۔ اور رحمان کی یہ شان نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان میں سے ایسا کوئی نہیں جو رحمان کا بندہ بن کر نہ آئے۔ البتہ تحقیق اس نے انہیں شمار کر رکھا ہے اور ان کی گنتی گن رکھی ہے۔ اور ہر ایک ان میں سے اس کے ہاں اکیلا آئے گا۔

مسیح و ملائکہ کو عبد کہلوانے میں عار نہیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا {۱۷۲} فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا {۱۷۳} النساء

جواب ترجمہ: مسیح کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھ سکتے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں، اور نہ مقرب

فرشتے (اس میں کوئی عار سمجھتے ہیں) اور جو شخص اپنے پروردگار کی بندگی میں عار سمجھے، اور تکبر کا مظاہرہ کرے تو (وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ) اللہ ان سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔ پھر جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے ان کو ان کا پورا پورا ثواب دے گا، اور اپنے فضل سے اس سے زیادہ بھی دے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے (بندگی کو) عار سمجھا ہو گا اور تکبر کا مظاہرہ کیا ہو گا، تو ان کو دردناک عذاب دے گا، اور ان کو اللہ کے سوا اپنا کوئی رکھوالا اور مددگار نہیں ملے گا۔

شانِ نزول: کلبی کا قول ہے کہ وفد نجران نے کہا کہ اے محمد! آپ ہمارے صاحب پر عیب لگاتے ہیں آپ ﷺ نے پوچھا کہ آپ کا صاحب کون ہے انہوں نے جواب دیا کہ عیسیٰ۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ میں ان کے بارے میں کیا کہتا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ انہیں اللہ کا بندہ اور رسول کہتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو ان کے لیے باعث عار بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں یعنی ان کے لیے اللہ کا بندہ ہونا کوئی عیب دار اور عار کی بات تو نہیں ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ: عیسیٰ ابن مریم کبھی یہ عار نہیں سمجھیں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں، اور نہ ہی وہ فرشتے جو اللہ کے مقرب ہیں اور جن کا مقام بلند ہے، یہ بات ناپسند کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں، پھر تم کیسے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مان سکتے ہو؟! اور مشرکین فرشتوں کو کیسے معبود بنا سکتے ہیں؟ جو شخص اللہ کی عبادت سے تکبر کرے گا اور اس سے بلند ہونے کی کوشش کرے گا، تو اللہ قیامت کے دن سب کو اپنی طرف جمع کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا اور جب یہ بات بیان کر دی گئی کہ سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے تو پھر آگے اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی اور نیک اعمال اخلاص کے ساتھ اللہ کے لیے کیے اور اس کی شریعت کے مطابق عمل کرتے رہے، اللہ انہیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا اور اس پر اپنے فضل و احسان سے مزید بھی عطا فرمائے گا اور جو لوگ اللہ کی عبادت اور اطاعت سے تکبر اور

برتری کے باعث منہ موڑیں گے، اللہ انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ اللہ کے سوا نہ کوئی مدد گار پائیں گے جو انہیں فائدہ پہنچائے، اور نہ کوئی ایسا ہو گا جو انہیں عذاب سے بچا سکے۔

وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: اللہ تعالیٰ جب اہل جنت کو ان کے اعمال کا پورا پورا اجر عطا فرما دیں گے تو اس کے بعد اپنے فضل سے اور کس چیز کا اضافہ فرمائیں گے؟ اس بارے میں ارباب تفسیر اپنی اپنی آراء رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ مزید اپنی خاص رحمت اور فضل سے وہ چیزیں عطا فرمائے گا جو ان کے اعمال کے مطابق واجب نہ تھیں، بلکہ خالص اس کے کرم اور مہربانی کی وجہ سے ملیں گی۔

بعض فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی نیکیاں دے گا، پھر اس سے بڑھ کر اپنی طرف سے عطا کرے گا، جیسے جنت کی نعمتوں کا دوام، اور وہ درجات جو اعمال سے بڑھ کر ہیں۔ بعض فرماتے ہیں یہ "زیادہ" وہ چیز ہے جس کا انسان کے عمل سے استحقاق نہیں بنتا بلکہ اللہ کے فضل سے ملے گی، اور یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔

بعض فرماتے ہیں اس زیادتی سے مراد "اللہ تعالیٰ کا دیدار" ہے جو اہلِ جنت کو جمعہ کے دن عطا ہو گا، یہی سب سے بڑی زیادتی ہے، بعض فرماتے ہیں جنت کی نہ ختم ہونے والی نعمتیں، مزید بلند درجات اور سب سے بڑھ کر رب تعالیٰ کی رضا اور دیدار اس "فضل" میں داخل ہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: اور جن لوگوں نے اللہ کی اطاعت اور بندگی سے عار کی اور تکبر کیا تو اللہ ان کو دکھ کا عذاب دے گا، عذاب الیم کیسا ہو گا؟ اس کی کوئی مقدار اور صفت بیان نہیں کی جا سکتی۔

وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو اپنے لیے نہ کوئی کارساز ملے گا جو ان سے عذاب الیم کو ٹال سکے اور ان کے معاملات کو دیکھ سکے اور نہ ہی کوئی مدد گار جو ان سے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور پکڑ کو ہٹا سکے گا۔

برھان اور نور سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کریمہ میں برھان اور نور سے کیا مراد ہے؟

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا {۴/۱۷۴} النساء

جواب ترجمہ: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک ظاہر روشنی اتاری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: الخ اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک کھلی حجّت آچکی ہے جو ہر عذر کو کاٹ دیتی ہے اور ہر شبہ کو دور کر دیتی ہے، اور وہ (حجّت) محمد ﷺ ہیں۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایک روشن نور (قرآن مجید) نازل فرمایا ہے۔

تفسیر مجاہد میں ہے کہ برھان سے مراد حجت ہے۔ تفسیر طبری میں ہے کہ برھان سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اور نور مبین سے مراد قرآن کریم ہے جو حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ تفسیر ابن ابی حاتم میں بھی برھان سے مراد نبی کریم ﷺ اور نور مبین سے مراد قرآن کریم لیا گیا ہے۔ علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں برھان سے مراد حضرت محمد ﷺ اور نور مبین سے مراد قرآن کریم بیان کی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں برھان سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں، آپ ﷺ کا نام برھان اس لیے رکھا کہ آپ ﷺ کے ساتھ برھان ہے اور وہ معجزہ ہے اور مجاہد نے کہا کہ یہاں برھان سے مراد حجت ہے، دونوں قریب المعنی ہیں، اس لیے کہ معجزات آپ ﷺ کی دلیل ہیں اور نور سے مراد قرآن ہے، قرآن کو نور اس لیے فرمایا کہ اس کے ساتھ احکام بیان کیے جاتے ہیں اور گمراہی سے ہدایت پائی جاتی ہے، یہ نور مبین ہے یعنی واضح نور ہے۔

ایمان باللہ اور اعتصام باللہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا {۴/۱۷۵} النساء

جواب ترجمہ: چنانچہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اسی کا سہارا تھام لیا ہے، اللہ ان

کو اپنے فضل اور رحمت میں داخل کرے گا اور انہیں اپنے پاس آنے کے لیے سیدھے راستے تک پہنچائے گا۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ: اللہ تعالیٰ نے پھر ان لوگوں کے اچھے انجام کو بیان فرمایا جو حق کی بات قبول کرتے ہیں اور سیدھی راہ پر چلتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول کو بھیجا اور اس کے ذریعے اپنی کتاب نازل فرمائی، اب ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو ایمان لائے اور ہدایت یافتہ ہوئے، اور کچھ وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور گمراہی میں پڑ گئے، پس جو لوگ اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لائے اور صرف اسی کو اپنا سہارا بنایا، نہ اس کے سوا کسی سے مدد مانگی، نہ اس کے علاوہ کسی کے سامنے جھکے اور نہ اس کے سوا کسی پر بھروسہ کیا، تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل میں داخل فرمائے گا۔ وہ انہیں اپنی جنت اور اپنی رضا سے نوازے گا، اپنے انعامات اور احسانات ان پر نچھاور کرے گا، ان کے سینوں کو کشادہ کرے گا، ان کے دلوں کو خوشی عطا کرے گا اور ان کے حالات درست فرمادے گا۔

وَیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں سچی راہ، یعنی اسلام کے راستے پر چلنے کی توفیق دے گا اور یہ راستہ انہیں آخرت میں کامیابی، امن، اور اپنی رضا و خوشنودی تک پہنچادے گا۔ یہاں آیت میں صرف ایمان والوں کا بدلہ ذکر کیا گیا ہے اور کافروں کا انجام بیان نہیں کیا گیا، گویا انہیں نظر انداز کر دیا گیا، کیونکہ وہ اللہ کی رحمت سے دور اور اس کی بارگاہ سے مردود ہیں، یا اس لیے کہ ان کی بری عاقبت ہر عقل والے کے نزدیک ظاہر و عیاں ہے۔

لفظ "سین" فَسَیُدْخِلُهُمْ تاکید کے لیے ہے، یعنی ضرور اور یقینی طور پر اللہ انہیں اپنی رحمت اور اپنے عظیم فضل میں داخل کرے گا۔ اور لفظ صراطاً یہاں "مفعول ثانی" ہے، کیونکہ یَهْدِیْهِمْ میں پہچان کرانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔

چنانچہ ان آیات کریمہ نے اہلِ کتاب کو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کرنے سے روکا، انہیں ان کی حقیقت بتائی، اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کی دعوت دی اور یہ واضح کر دیا کہ نہ مسیح علیہ السلام اور نہ

ہی مقرب فرشتے اللہ کی عبادت سے انکار کریں گے اور جو کوئی عبادتِ الٰہی سے تکبر کرے گا، اللہ تعالیٰ اس سے سخت حساب لے گا اور اسے اس کے اعمال کے مطابق سزا دے گا، لیکن جو اللہ پر ایمان لائے گا اور اس کے رسولوں پر اتری ہوئی سچی بات کی پیروی کرے گا، وہ اللہ کی بے پایاں رحمت، اس کے عظیم فضل اور ایسی کامیابی پائے گا جس کے بعد کوئی غم نہیں۔

کلالہ کی میراث

سوال اس آیت کی تفسیر بیان کریں

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ {۱۷۶} النساء

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب) لوگ آپ سے (کلالہ کے بارے میں) حکم (خدا) دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجیے کہ خدا کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مرد مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ ماں باپ) اور اس کے بہن ہو تو اس کی بہن کو بھائی کے ترکے میں سے آدھا حصہ ملے گا اور اگر بہن مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو تو اس کے تمام مال کا وارث بھائی ہو گا اور اگر (مرنیوالے بھائی کی) دو بہنیں ہوں تو دونوں کو بھائی کے ترکے میں سے دو تہائی اور اگر بھائی اور بہن یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے وارث ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے۔ (یہ احکام) خدا تم سے اس لئے بیان فرماتا ہے کہ بھٹکتے نہ پھرو۔ اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سورتوں میں سب سے آخری سورت سورۃ برأت اتری ہے اور آیتوں میں سب سے آخری آیت (یستفتونک) اتری ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں بیماری کے سبب بے ہوش پڑا تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور وہی پانی مجھ پر ڈالا، جس سے مجھے افاقہ ہوا اور میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم وارثوں

کے لحاظ سے میں کلالہ ہوں، میری میراث کیسے بٹے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت فرائض نازل فرمائی (بخاری و مسلم)

لفظ کلالہ اکیل سے ماخوذ ہے جو کہ سر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ اکثر علماء نے کہا ہے کہ کلالہ وہ ہے جس میت کے لڑکے پوتے نہ ہوں اور بعض کا قول یہ بھی ہے کہ جس کے لڑکے نہ ہوں، جیسے آیت میں ہے (ولیس لہ ولد)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مشکل مسائل آئے تھے، ان میں ایک یہ مسئلہ بھی تھا، چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا تین چیزوں کی نسبت میری تمنا رہ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ہماری طرف کوئی ایسا عہد کرتے کہ ہم اسی کی طرف رجوع کرتے دادا کی میراث، کلالہ اور سود کے ابواب۔

ایک اور روایت میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کلالہ کے بارے میں میں نے جس قدر سوالات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے، اتنے کسی اور مسئلہ میں نہیں کئے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے میرے سینے میں کچوکا لگا کر فرمایا کہ تجھے گرمیوں کی وہ آیت کافی ہے، جو سورۃ نساء کے آخر میں ہے ایک اور حدیث میں ہے اگر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید اطمینان کر لیا ہوتا تو وہ میرے لئے سرخ اونٹوں کے ملنے سے زیادہ بہتر تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت موسم گرما میں نازل ہوئی ہوگی۔ اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سمجھنے کی طرف رہنمائی کی تھی اور اسی کو مسئلہ کا کافی حل بتایا تھا، لہٰذا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس کا معنیٰ پوچھنا بھول گئے، جس پر اظہار افسوس کر رہے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں جو آیت سورۃ نساء کے شروع میں فرائض کے بارے میں ہے، وہ ولد و والد کے لئے ہے اور دوسری آیت میاں بیوی کے لئے ہے اور ماں زاد بہنوں کے لئے اور جس آیت سے سورۃ نساء کو ختم کیا ہے وہ سگے بہن بھائیوں کے بارے میں ہے جو رحمی رشتہ عصبہ میں شمار ہوتا ہے (ابن جریر)

پھر فرمایا اس کا ولد نہ ہو، اس سے بعض لوگوں نے دلیل لی ہے کہ کلالہ کی شرط میں باپ کا نہ ہونا نہیں بلکہ جس کی اولاد نہ ہو وہ کلالہ ہے، بروایت ابن جریر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی

مروی ہے لیکن صحیح قول جمہور کا ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کا نہ ولد ہو، نہ والد اور اس کی دلیل آیت میں اس کے بعد کے الفاظ سے بھی ثابت ہوتی ہے جو فرمایا وَلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ (النسآء:۱۷۶) یعنی اس کی بہن ہو تو اس کے لئے کل چھوڑے ہوئے مال کا آدھوں آدھ ہے اور اگر بہن باپ کے ساتھ ہو تو باپ اسے ورثہ پانے سے روک دیتا ہے اور اسے کچھ بھی اجماعاً نہیں ملتا، پس ثابت ہوا کہ کلالہ وہ ہے جس کا ولد نہ ہو جو نص سے ثابت ہے اور باپ بھی نہ ہو یہ بھی نص سے ثابت ہوتا ہے لیکن قدرے غور کے بعد، اس لئے کہ بہن کا نصف حصہ باپ کی موجودگی میں ہوتا ہی نہیں بلکہ وہ ورثے سے محروم ہوتی ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا جاتا ہے کہ ایک عورت مر گئی ہے اس کا خاوند ہے اور ایک سگی بہن ہے تو آپ نے فرمایا آدھا بہن کو دے دو اور آدھا خاوند کو جب آپ سے اس کی دلیل پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا میری موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی صورت میں یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا (احمد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے ابن جریر میں منقول ہے کہ ان دونوں کا فتویٰ اس میت کے بارے میں جو ایک لڑکی اور ایک بہن چھوڑ جائے، یہ تھا کہ اس صورت میں بہن محروم رہے گی، اسے کچھ بھی نہ ملے گا، اس لئے کہ قرآن کی اس آیت میں بہن کو آدھا ملنے کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ میت کی اولاد نہ ہو اور یہاں اولاد ہے، لیکن جمہور ان کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی آدھا لڑکی کو ملے گا اور بہ سبب فرض اور عصبہ آدھا بہن کو بھی ملے گا۔

ابراہیم اسود رحمہ اللہ کہتے ہیں ہم میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فیصلہ کیا کہ آدھا لڑکی کا اور آدھا بہن کا۔ صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے لڑکی اور پوتی اور بہن کے بارے میں فتویٰ دیا کہ آدھا لڑکی کو اور آدھا بہن کو پھر فرمایا ذرا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ہو آؤ وہ بھی میری موافقت ہی کریں گے، لیکن جب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بھی انہیں سنایا گیا تو آپ نے فرمایا لَقَدْ ضَلَلْتُ

إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ، أَقْضِي فِيهَا بِمَا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ان سے اتفاق کی صورت میں گمراہ ہو جاؤں گا اور راہ یافتہ لوگوں میں میرا شمار نہیں رہے گا، سنو میں اس بارے میں وہ فیصلہ کرتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے آدھا تو بیٹی کو اور چھٹا حصہ پوتی کو تو دو ثلث پورے ہو گئے اور جو باقی بچا وہ بہن کو۔ ہم پھر واپس آئے اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ خبر دی تو آپ نے فرمایا لَا تَسْأَلُونِي مَا دَامَ هَذَا الْحِبْرُ فِيكُمْ، جب تک یہ علامہ تم میں موجود ہیں، مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔ (بخاری)

پھر فرمان ہے کہ یہ اس کا وارث ہو گا اگر اس کی اولاد نہ ہو، یعنی بھائی اپنی بہن کے کل مال کا وارث ہے جبکہ وہ کلالہ مرے یعنی اس کی اولاد اور باپ نہ ہو، اس لئے کہ باپ کی موجودگی میں تو بھائی کو ورثے میں سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ ہاں اگر بھائی کے ساتھ ہی اور کوئی مقررہ حصے والا اور وارث ہو جیسے خاوند یا ماں جایا بھائی تو اسے اس کا حصہ دے دیا جائے گا اور باقی کا وارث بھائی ہو گا۔ (ابن کثیر)

صحیح بخاری میں ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں فرائض کو ان کے اہل سے ملا دو، پھر جو باقی بچے وہ اس مرد کا ہے جو سب سے زیادہ قریب ہو۔ پھر فرماتا ہے اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں مال متروکہ کے دو ثلث ملیں گے۔ یہی حکم دو سے زیادہ بہنوں کا بھی ہے، یہیں سے ایک جماعت نے دو بیٹیوں کا حکم لیا ہے۔ جیسے کہ دو سے زیادہ بہنوں کا حکم لڑکیوں کے حکم سے لیا ہے جس آیت کے الفاظ یہ ہیں فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (النسآء:۱۱)

پھر فرماتا ہے اگر بہن بھائی دونوں ہوں تو ہر مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، یہی حکم عصبات کا ہے خواہ لڑکے ہوں یا پوتے ہوں یا بھائی ہوں، جب کہ ان میں مرد و عورت دونوں موجود ہوں، تو جتنا دو عورتوں کو ملے گا اتنا ایک مرد کو اللہ اپنے فرائض بیان فرما رہا ہے، اپنی حدیں مقرر کر رہا ہے، اپنی شریعت واضح کر رہا ہے، تاکہ تم بہک نہ جاؤ، اللہ تعالیٰ تمام کاموں کے انجام سے واقف اور ہر مصلحت سے دانا، بندوں کی بھلائی برائی کا جاننے والا، مستحق کے استحقاق کو پہچاننے والا ہے۔ ابن کثیر)

ابن جریر کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کہیں سفر میں جا رہے تھے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ

سواری کے دوسرے سوار کے پاس تھے جو یہ آیت اتری پس حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو سنائی اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو، اس کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس کے بارے میں سوال کیا تو کہا واللہ تم بے سمجھ ہو، اس لئے کہ جیسے مجھے حضور ﷺ نے سنائی ویسے ہی میں نے آپ کو سنا دی، واللہ میں تو اس پر کوئی زیادتی نہیں کر سکتا، پس حضرت فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے الٰہی اگرچہ تو نے ظاہر کر دیا ہے مگر مجھ پر تو کھلا نہیں۔

اسی روایت کی دوسری سند میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ یہ سوال اپنی خلافت کے زمانے میں کیا تھا اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا تھا کہ کلالہ کا ورثہ کس طرح تقسیم ہو گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لیکن چونکہ حضرت کی پوری تشفی نہ ہوئی تھی، اس لئے اپنی صاحبزادی زوجہ رسول ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ خوشی میں ہوں تو تم پوچھ لینا۔ چنانچہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے ایک روز ایسا ہی موقع پا کر دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا شاید تیرے باپ نے تجھے اس کے پوچھنے کی ہدایت کی ہے میرا خیال ہے کہ وہ اسے معلوم نہ کر سکیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو فرمانے لگے جب حضور ﷺ نے یہ فرما دیا تو بس میں اب اسے جان ہی نہیں سکتا۔ (ابن کثیر)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا تو آپ نے ایک کنگھے پر یہ آیت لکھوا دی، پھر فرمایا کیا عمر رضی اللہ عنہ نے تم سے اس کے پوچھنے کو کہا تھا؟ میرا خیال ہے کہ وہ اسے ٹھیک ٹھاک نہ کر سکیں گے۔ کیا انہیں گرمی کی وہ آیت جو سورۃ نساء میں ہے کافی نہیں؟ وہ آیت وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً (النسآء) ہے پھر جب لوگوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا تو وہ آیت اتری جو سورۃ نساء کے خاتمہ پر ہے اور کنگھی پھینک دی۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے کنگھے کے ایک ٹکڑے کو لے کر فرمایا میں کلالہ کے بارے میں آج ایسا فیصلہ کر دوں گا کہ پردہ نشین عورتوں تک کو معلوم رہے، اسی وقت گھر میں سے ایک سانپ نکل آیا اور سب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے، پس آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر اللہ عزوجل کا اِرادہ اس کام کو پورا کرنے کا ہوتا تو اسے پورا کر لینے دیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کاش میں تین مسئلے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلیتا تو مجھے سرخ اونٹوں کے ملنے سے بھی زیادہ محبوب ہوتا، ایک تو یہ کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا؟ دوسرے یہ کہ جو لوگ زکوٰۃ کے ایک تو قائل ہوں لیکن کہیں کہ ہم تجھے ادا نہیں کریں گے ان سے لڑنا حلال ہے یا نہیں؟ تیسرے کلالہ کے بارے میں ایک اور حدیث میں بجائے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے سودی مسائل کا بیان ہے۔ (مستدرک حاکم، ابن کثیر)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری وقت میں نے آپ رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے قول وہی ہے جو میں نے کہا، تو میں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا یہ کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو۔

ایک اور روایت میں ہے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان کلالہ کے بارے میں اختلاف ہوا اور بات وہی تھی جو میں کہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سگے بھائیوں اور ماں زاد بھائیوں کو جبکہ وہ جمع ہوں، ثلث میں شریک کیا تھا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس کے خلاف تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک رقعہ پر دادا کے ورثے اور کلالہ کے بارے میں کچھ لکھا پھر استخارہ کیا اور ٹھہرے رہے اور اللہ سے دعا کی کہ پروردگار! اگر تیرے علم میں اس میں بہتری ہے تو تو اسے جاری کر دے پھر جب آپ کو زخم لگایا گیا تو آپ نے اس رقعہ کو منگوا کر مٹا دیا اور کسی کو علم نہ ہوا کہ اس میں کیا تحریر تھا پھر خود فرمایا کہ میں نے اس میں دادا کا اور کلالہ کا لکھا تھا اور میں نے استخارہ کیا تھا پھر میرا خیال یہی ہوا کہ تمہیں اسی پر چھوڑ دوں جس پر تم ہو۔ (ابن جریر، ابن کثیر)

ابن جریر میں ہے میں اس بارے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلاف کرتے ہوئے شرماتا ہوں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فرمان تھا کہ کلالہ وہ ہے جس کا ولد و والد نہ ہو۔ اور اسی پر جمہور صحابہ اور تابعین اور ائمہ دین ہیں اور یہی چاروں اماموں اور ساتوں فقہاء کا مذہب ہے اور اسی پر قرآن کریم کی دلالت ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے واضح کر کے فرمایا اللہ تمہارے لئے کھول کھول کر بیان فرما رہا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

(خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی)